خلافت و امامت

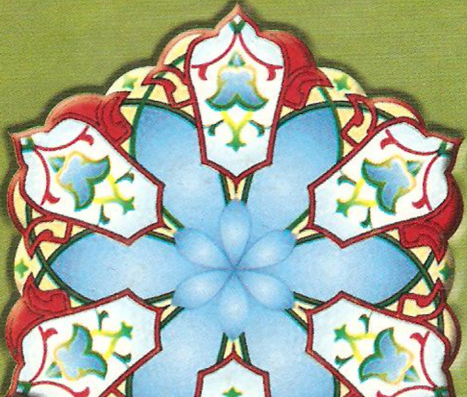

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں
مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

خلافت و اِمامت

ملنے کا پتہ:

امامیہ مشن انارکلی لاہور،

حق برادرز،

تمھارا [illegible]

عرضِ ناشر

مسئلہ خلافت و امامت پر ۱۹۳۵؁ میں ایک ہندو "ہرنام" کی طرف سے ماہنامہ نگار لکھنؤ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے ہر مکتبِ فکر کے ذمہ دار اہلِ قلم حضرات نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کو نہایت اچھے لفظوں میں بیان کیا۔ ہمارے خیال میں اِس خاص علمی مسئلہ پہ پہلی بار بڑی سنجیدگی اور متانت کیساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ تمام تحریریں گھٹیا مناظرہ سے مبرا ہیں بہت عرصہ ہوا امامیہ مشن لکھنؤ نے ان تمام تحریروں کو چھ جلدوں میں شائع کیا تھا جو آج کل نایاب۔ ہم اِن تمام حصص کو یکجا کر کے شائع کر رہے ہیں۔

ہمیں توقع ہے کہ ہماری یہ خدمت بھی علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

خلافت و امامت

لکھنے والے:۔

آزام
ابوسعید بزمی ایم۔ اے
نیاز فتحپوری
فاروق کانپوری
عینی شاہ نظامی
سید جلیل الرحمٰن اعظمی
سید علی نقی النقوی
ذاکر حسین
احتشام حسین
م ۔ ح
آزاد خیال شیعہ کے قلم سے
ابوالکلام آزاد

ترتیب

عرضِ ناشر		
	مولانا مرتضیٰ حسین صاحب	
دیباچہ		
مسئلۂ خلافت و امامت	بنام	۳
مسئلۂ خلافت و امامت	ابوسعید بزمی	۴۱
مسئلۂ خلافت	بنام	۵۷
مسئلۂ خلافت و امامت	نیاز فتح پوری	۷۱
مسئلۂ خلافت و امامت	نیاز فتح پوری	۱۰۹
خلافت و امامت	بنام	۱۱۳
مسئلۂ خلافت و امامت	مولانا فاروق کانپوری	۱۲۹
بحثِ خلافت و امامت پر ایک نظر	علامہ غنی شاہ نظامی	۱۴۷
خلافت اور جانشین رسولؐ	مولانا جلیل الرحمٰن اعظمی	۱۹۳
فضائلِ جنابِ امیرؑ کے امتیازی خصوصیات	سید العلماء سید علی نقی النقوی	۲۱۳
مسئلۂ خلافت و امامت	ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے	۲۳۳
قیامِ امامت کی ضرورت	سید علی نقی النقوی	۳۰۷
نگار کا ادارتی نوٹ	نیاز فتح پوری	۳۱۸
مسئلۂ خلافت و امامت	سید ابوسعید بزمی	۳۲۱
مسئلۂ خلافت و امامت	م۔ ح کے قلم سے	۳۶۹
مسئلۂ خلافت و امامت	ذاکر حسین	۴۱۷
مسئلۂ خلافت و امامت	سید احتشام حسینؒ	۴۷۱
مسئلۂ خلافت و امامت	ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے	۴۹۳
استحقاقِ خلافت کے شرائط کیا ہیں؟	ایک آزاد خیال [illegible] کے قلم سے	۵۷۳

بسمہ تعالیٰ

پیش لفظ

عماد الکلام سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل

علم و تحقیق کے پھیلے ہوئے وادیِ بے آب و گیاہ میں نتائج کے لطیف و شیریں پھل وہ لذت دیتے ہیں جنھیں من و سلویٰ کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے تو شاید مناسب ہو۔ انسانی تہذیب کے ابتدائی آثار سے آج کے ترقیاتی مسائلِ فلسفہ تک بنی آدم تحقیق کے سہارے بڑھا ہے۔ مذاہب کا مطالعہ اور عقیدوں کا تضاد بھی تحقیق طلب ہے اور آج کے زمانے میں خصوصیت کے ساتھ اس کی اہمیت روز افزوں ہے۔

شیعہ سنی عقیدے توحید سے لیکر قیامت تک ایک ہی لکیر پر چلتے ہیں۔ راستے کی ناہمواریاں مانیے یا پیچ و خم مگر اس سے انکار نہیں کہ چلتے دونوں ایک ہی ڈگر پر ہیں، دونوں ابتدائے اختلاف سے ایک دوسرے کو اپنے پیچھے چلانے کی کوشش میں سرگرم کاوش ہیں اور بلاشبہ بہت سے لوگ ان اختلافات کا حل اور منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ اس کوشش کو کامیابی تک پہنچانے کی شرط یہ ہے کہ تعصب کو نظر انداز کر کے لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے۔ مفروضات و اشتباہات سے بچا جائے پھر خلوص کے ساتھ غور کریں، خدا ساتھ دیگا اور مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔

مسلمانوں کے عقیدے میں سب سے بڑا اختلاف "امامت و خلافت" پر ہے۔ یہ مسئلہ اگر فقط ذہنی و قلبی ہوتا تو شاید بہت سے مسائل کی طرح دب چکا ہوتا، مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے فیصلے پر ساری شریعت و عمل کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔ اللہ، نبی اور اس کے بعد خلیفۂ نبیؐ یعنی شارحِ سنت محافظِ شریعت و ذمہ دار اسلام کا سوال ٹھہری ہے۔ رسول مقبولؐ کے دینی تعلیمات کا مدرسہ مکہ و مدینہ تھا

ان پھیلے ہوئے شہروں اور ملکوں کے مسلمانوں نے تعلیمات اسلام کو اپنایا، ان پر کاربند ہوئے ہر ایک نے اپنی دسترس بھر ان پر عمل کیا، لیکن یہ سب مساوی حیثیت کے مالک، یکساں اعتبارات کے حامل اور برابر کے افراد تھے، ان کے اختلافات میں ایک بالاتر حاکم مسلم الثبوت عالم مشکوٰۃ نبوت سے منورتر فرد کامل کی ضرورت پڑتی ہے یہ حاکم و قاضی کون تھا؟ ابوبکر ــــ یا علیؓ بن ابی طالب۔

تاویل و تشریح، اعتبار و فرض کے لحاظ سے کہہ لیجئے۔

”کچھ فرق نہیں ان چاروں میں“

لیکن تاریخ و حدیث، قرآن مجید اور حقائق کی روشنی میں یہ خیال کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے جن کے بارے میں فرق کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کے بیانات محفوظ ہیں۔ ایسے شواہد موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے یہ کہنا ناممکن ہے۔ پھر دو عظیم اختلافی گروہوں کے دلائل اس پر مستزاد ہیں۔

کبھی کبھی یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ”ایرانیت“ نے اس اختلاف کو ہوا دی ہے گویا اختلاف مانتے ہیں مگر وسعت دامن پر اعتراض ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ”ایرانیت“ کا نام لے کر خوش ہونے والے یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ وہ خود خالص عرب، نجیب الاصل ہاشمی و اموی کب ہیں۔ مکے اور مدینے کے مسلمانوں نے کون سے صحیفے لکھ کر چھوڑے جو ان مخلص حضرات کی رہنمائی کرتے ہیں۔ شامی ثقافت اور رومی تہذیب، یہودی ماحول اور نصرانی پڑوسیوں کے تاثرات کا انکار کرنا آسان ہے۔ ہندی رسم و رواج، ترکی دستور و قواعد، اسپینی تاثرات، افریقی و مصری خصوصیات پر تحقیق کسی عقیدے کی حقیقت کو عیاں نہیں کرتی، مگر عقیدۂ امامت، حدیث، تفسیر، تاریخ و واقعات، ایرانی پیداوار کہہ کر بڑی آسانی سے مسترد کر دیے جاتے ہیں۔

مغالطہ کا یہ عنوان کچھ تو غلط فہمی کا باعث ہو جاتا ہے، کچھ بات ختم کرنے میں آسانی پیدا کرتی ہے۔ محقق و باخبر آدمی کے لیے یہ بات مضحکہ خیز ہے، وہ سوچتا ہے کہ رسم کتابت قرآن سے جمع حدیث تک، تدوین تاریخ سے تشریح فقہ تک سب ایرانی ہے تو عربیت کہاں سے آ گئی؟

دین عربی ہے — فقط قرآن کی حد تک صحیح ہے لیکن نہ مسلمان سب کے سب عربی۔ نہ احکام عربی۔ قرآن خود مدعی ہے کہ ادیانِ سابقہ اور کتبِ انبیاء کا جوہر اسلام و قرآن ہے۔ یہ کتابیں اور ان کے دین سامی اسرائیلی اور عبرانی۔ غرض خدا جانے کیا کیا تھے؟ پھر اگر یہ سب اسلام میں داخل ہو کر اسلام کو نقصان نہ پہنچا سکے تو ایران کے اسلام نے کیا قیامت ڈھا دی۔ خالص حجازیوں میں نبوت کے دعویدار ہوئے۔ اسلامی علاقۂ عرب میں مرتد ہونے والوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ منافقین کی ریشہ دوانیوں کے ذکر سے قرآن خالی نہیں، مگر یہ کوئی کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ "اسلام اوس و خزرج، قریش و غیر قریش کی روایت سے متاثر ہوا" — یہ بات مہمل ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بہ نفسِ نفیس قبول روایت یا بانیِ ثقافت، نافذ احکامِ الٰہی اور موسّسِ دین تھے جو انھوں نے فرمایا وہ حق، جو انھوں نے کیا وہ درست جو وہ کہہ گئے وہ انھیں سے شروع ہوا۔ سابقہ تاریخ الٹ گئی، گذشتہ روایتیں کالعدم قرار پائیں۔ دین اللہ کا دستور اللہ کا روایت اسلام کی۔

ایرانی و غیر ایرانی، یہودی و غیر یہودی روایت کا فیصلہ کیجیے مگر مجموعی حیثیت سے ایماندارانہ طریقہ پہ پوری طرح بحث و نظر کے بعد اور یہ سوچنے سمجھنے کے بعد کہ اس فیصلہ پر کوئی ٹھوس دلیل بھی ہے — "امامت" خلافت اور نیابت رسولؐ کا مسئلہ حل کرتے ہوئے ہماری مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک مرتبہ الکشن ہوا اور دوسری مرتبہ نامزدگی اور یہی نامزدگی جب کوئی اور کرے تو قابلِ مضحکہ و تمسخر ایرانیت ہے جب قرآن ذوی القربیٰ کو خمس دلائے تو دین جب ہم ذوی القربیٰ کا نام لیں تو خاندان پرستی قرار پائے۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ مطالعہ میں ہمارے لٹریچر کا داخلہ ممنوع ہے۔ اگر براہِ راست ہم سے ہماری سنی جاتی تو بات یوں نہ بگڑتی، ہوتا یہ ہے کہ لوگ "تاریخ ملل و نحل" پڑھ کر فیصلہ کر لیتے کہ بات کیا ہے، حالانکہ وہ بیچارے علماء مورخین فرق کی اس مجبوری سے ناواقف ہیں کہ ابن حزم ہو یا شہرستانی دونوں شیعہ نہیں، پھر عقیدہ کا بیان بڑی بصیرت و واقفیت طلب بات ہے۔ یورپ کے مستشرق اور ہند و ایران و عرب کے جداگانہ نظریوں سے کام کرنے والے من و طنبورہ کی مثال بن جاتے ہیں۔

"نگار" لکھنؤ کا ایک مشہور علمی مجلہ ہے۔ اس کے مدیر نیاز فتحپوری، مذہبیات کے عالم اور ادبیات میں سندی درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا ماہنامہ مدتوں سے ادبا کی نظر میں باوقعت ہے چونکہ اس رسالہ کا حلقۂ مطالعہ ملا اور علماء دین کے حلقے سے الگ ہے اس لیے اس میں کبھی کبھی اگر مذہبی مباحث چھڑ جاتے ہیں تو ان کا انداز گفتگو کچھ اور ہوتا ہے، وہ رسمی مباحثے اصطلاحی باتیں، ناراضگی اور سب سے بڑی بات یہ کہ پرانا طریقۂ بحث و نظر نہیں ہوتا۔ ۱۹۳۵ء میں نگار نے "امامت" کی بحث پر عام دعوتِ فکر و نظر دی، چنانچہ فریقین کے روشن خیال حضرات نے خامہ فرسائی کی علوم جدیدہ کے ماہرین اور کلام و عقائد کے واقف کار اپنا اپنا مدعا سمجھانے کے لیے مضمون نگار بنے، مختلف حیثیت سے لوگوں نے مسئلہ میں دلچسپی لی۔ اس لیے ہر شخص نے دلچسپی لی۔ امامیہ مشن لکھنؤ نے مضامین کی افادیت کے پیش نظر جناب مولانا علی نقی صاحب کے افادات کے ساتھ شائع کیا تھا۔

اس مجموعے میں پرانے مسائل و ماخذ و مباحث کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے، کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جنھیں عصر جدید میں بڑے شد و مد سے لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ مدیر نگار، ابو سعید بزمی فاروق کانپوری، عینی شاہ نظامی، خلیل الرحمن اعظمی جیسے حضرات کے مضامین اپنے اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ پھر احتشام حسین، ہزآم، اور مولانا علی نقی صاحب کے مضامین ان پر بھرپور نظر کرتے ہیں، جن سے ہر قاری کے لیے راہ فیصلہ صاف اور گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

"مکتبۂ امامیہ" کی یہ چوتھی مؤقر پیشکش لائق تحسین و داد ہے۔

"خلافت بر مقام ما گواہی است
حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ
خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است"

"علامہ اقبالؒ"

مسئلہ خلافت و امامت

{ایک غیر مُسلم کے نقطۂ نظر سے}

ہرنام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسئلۂ خلافت و امامت

(ایک غیر مسلم کے نقطۂ نظر سے)

محترم مدیرِ نگار! میں ایک عرصہ سے نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس میں کلام نہیں کہ مذہب کے باب میں آپ کی بے لاگ تنقیدوں سے میں نے کافی استفادہ کیا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک آپ نے اس مسئلہ پر توجہ نہیں کی جو یقیناً جماعتِ اسلامی کے ہر فرد کی اوّلین توجہ چاہتا ہے۔

مجھے شیعہ سُنی کسی جماعت سے تعلق نہیں ہے کیونکہ میں ایک غیر مسلم شخص ہُوں لیکن میں نے ہمیشہ جماعتِ اسلامی کے ان دونوں فریقوں کے اختلاف کو نہایت افسوس کے ساتھ دیکھا ہے اور حیران ہوں کہ اس وقت تک کیوں اس تفریق کے مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

ممکن ہے آپ نے مسئلۂ خلافت و امامت پر صرف اس لیے اظہارِ خیال نہ کیا ہو کہ یہ نزاع عرصہ سے چلی آ رہی ہے اور اس کا فیصلہ دشوار ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ماضی کا عقدۂ لاینحل مستقبل و حال میں بھی بدستور معمہ بنا رہے۔ بہر حال میں عرصہ سے متمنی تھا کہ آپ کے خیالات اس باب میں معلوم کروں اور اس کی تدبیر میں نے یہی مناسب سمجھی کہ خود اپنی تحقیق اس مسئلہ میں آپ کے سامنے پیش کروں اور اگر آپ کو اس سے اختلاف یا اتفاق ہو تو "باب المراسلۃ والمناظرۃ" کے وساطت

سے جو غالباً اسی غرض کے ساتھ نگار میں قائم کیا گیا ہے آپ مجھے جواب دے سکیں۔
آپ دیکھیں گے کہ میں نے اس مقالہ کی تیاری میں تاریخ اسلام کے اصل ماخذوں کو سامنے رکھا ہے۔ اور اس لیے مجھے امید ہے کہ جواب دینے میں آپ بھی اس کا التزام رکھیں گے۔"

"ہمنام"

* * *

فلسفہ کے کیسے کیسے عمیق مسائل طے ہو گئے، ریاضی کے کیسے کیسے دقیق نظریے حل ہو گئے۔ نظامِ بطلیموسی کی جگہ نظامِ فیثاغورث نے لے لی۔ نیوٹن کے نظریۂ کشش کو آئنسٹین نے بدل کر رکھ دیا۔ لیکن خلافت کا جھگڑا مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو برس گزرنے کے بعد بھی اسی طرح الجھا ہوا پڑا ہے۔

"خلافت" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "جانشینی یا قائم مقامی" کے ہیں لیکن "جانشینی" کا مفہوم صرف جگہ پر بیٹھ جانا نہیں ہے۔ بلکہ "جانشینی" بہ حیثیت عہدہ، بہ حیثیت منصب، بہ حیثیت فرائض، بہ حیثیت اخلاق واعمال اور بہ حیثیت مراتب وکمال ہوا کرتی ہے۔

ایک شاعر کا جانشین شاعر، طبیب کا جانشین طبیب، قاضی کا جانشین قاضی اور وکیل کا جانشین وکیل ہوا کرتا ہے۔ ایک شاعر کی جگہ حکیم اور حکیم کی جگہ قاضی اور قاضی کی جگہ وکیل سے پُر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ایک ہی نوع میں صنف کے بدلنے سے بھی خصوصیت مختلف ہو جاتی ہے۔ یعنی خود شعراء میں مرثیہ گو کا جانشین غزل گو اور غزل گو کا جانشین قصیدہ گو نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ [illegible] شاعر کی جگہ لوہار اور قاضی کی جگہ معمار صحیح جانشین سمجھا جائے۔

اور یہ بات مسلم ہے اور ظاہر ہے کہ خلیفہ "حقیقتاً" وہ ہے جو اپنے کمالات وخصوصیات میں اپنے پیش رو کے کمالات وخصوصیات کا زیادہ سے زیادہ شریک وحصہ دار ہو۔

اس اصول کے تحت ہمارے سامنے قدرتاً یہ "تنقیح" پیش ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ

کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی تھی یا ایک معلم روحانی کی یعنی آپ کا مقصود صرف حکومت و سلطنت قائم کرنا تھا یا لوگوں کے اخلاق کو درست کرنا۔ ظاہر ہے کہ آپ کسی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو اور بجائے تیغ و خنجر کے اپنی شرافتِ نفس سے روحانی حکومت دنیا میں قائم کرے۔

اگر آپ کی حیثیت صرف ایک دنیاوی بادشاہ کی سی ہوتی تو بیشک آپ کی خلافت کے لیے ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت کافی تھی اور جو کوئی آپ کا خلیفہ مقرر کر دیا جاتا کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہ تھا لیکن اگر رسولؐ کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی، بلکہ معلمِ روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی۔

اب آیئے واقعاتِ تاریخی پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ ان کا فیصلہ اس مسئلہ میں کیا ہے؟

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اسلام قبول کرنے کی حیثیت سے کس کو کس پر تفوق حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ منصبِ نبوت ملنے کے بعد آنحضرتؐ نے اول اول اپنے ہی گھر والوں سے تبلیغ کی ابتداء کی ہوگی جن میں جناب خدیجہ اور علیؑ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اور اگر اہلسنت کی مستند کتابوں پر اعتماد کیا جائے تو یہ فیصلہ دشوار نہیں کہ سب سے پہلے جس انسانی ہستی نے قبول کیا وہ جناب امیرؑ کی ذات تھی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی تقریب التہذیب[1] میں لکھتے ہیں:۔

المراجح انہ اول من اسلم "یعنی ترجیح اسی امر کو ہے کہ سب سے پہلے آپ اسلام لائے"

اسی کتاب کے باب الالقاب[2] سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا سابق الاسلام ہونا اتنا مشہور تھا کہ آپ کا خطاب ہی "سابق العرب" (اہلِ عرب میں سب سے پہلے اسلام لانیوالا)

---

[1] مطبوعہ دہلی صفحہ ۸۴
[2] تقریب التہذیب صفحہ ۳۳۱

کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی تھی یا ایک معلّم روحانی کی یعنی آپ کا مقصود صرف حکومت و سلطنت قائم کرنا تھا یا لوگوں کے اخلاق کو درست کرنا۔ ظاہر ہے کہ آپ کسی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو اور بجائے تیغ و خنجر کے اپنی شرافتِ نفس سے روحانی حکومت دنیا میں قائم کرے۔

اگر آپ کی حیثیت صرف ایک دنیاوی بادشاہ کی سی ہوتی تو بیشک آپ کی خلافت کے لیے ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت کافی تھی اور جو کوئی آپ کا خلیفہ مقرر کر دیا جاتا کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہ تھا۔ لیکن اگر رسولؐ کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی، بلکہ معلّمِ روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی۔

اب آئیے واقعاتِ تاریخی پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ ان کا فیصلہ اس مسئلہ میں کیا ہے؟

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اسلام قبول کرنے کی حیثیت سے کس کو کس پر تفوق حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ منصبِ نبوّت ملنے کے بعد آنحضرتؐ نے اوّل اوّل اپنے ہی گھر والوں سے تبلیغ کی ابتداء کی ہو گی جن میں جناب خدیجہ اور علیؑ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اور اگر اہلسنت کی مستند کتابوں پر اعتماد کیا جائے تو یہ فیصلہ دشوار نہیں کہ سب سے پہلے جس انسانی ہستی نے قبول کیا وہ جناب امیرؑ کی ذات تھی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی "تقریب[1] التہذیب" میں لکھتے ہیں:-

المرجح انه اوّل من اسلم "یعنی ترجیح اسی امر کو ہے کہ سب سے پہلے آپ اسلام لائے۔"

اسی کتاب کے باب الالقاب[2] سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا سابق الاسلام ہونا اتنا مشہور تھا کہ آپ کا خطاب ہی "سابق العرب" (اہلِ عرب میں سب سے پہلے اسلام لانیوالا)

---

[1] مطبوعہ دہلی صفحہ ۸۴ [2] تقریب التہذیب صفحہ ۳۳۱

قرار پا گیا تھا۔

واقعات سے بھی اس قول کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ عفیف کندی کی روایت ملاحظہ ہو:۔

> "میں تاجر تھا، حج کے لیے مکہ آیا تو عباس ابن عبدالمطلب کی ملاقات کو جایا کرتا تھا۔ ایک دن اُن کے پاس بیٹھا ہُوا تھا کہ میں نے دیکھا ایک شخص پردہ سے نکلا اور پھر عبادت میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد ایک خاتون پردہ سے باہر آئیں اور اس شخص کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے عباس سے پُوچھا یہ کون ہیں؟ اُنھوں نے کہا یہ محمدؐ ابن عبداللہ ہیں۔ میں نے پُوچھا وہ خاتون کون ہیں؟ کہا، اُن کی بیوی خدیجہ بنت خویلد۔ تھوڑی دیر میں ایک کمسن نوعمر صاحبزادہ آیا اور وہ بھی اُن کے ساتھ مصروفِ عبادت ہو گیا میں نے پوچھا، یہ کون ہیں؟ عباس نے کہا کہ یہ محمدؐ کا چچازاد بھائی علیؑ ہے میں نے کہا یہ کرتے کیا ہیں؟ جواب ملا کہ نماز پڑھتے ہیں۔ محمدؐ کا خیال ہے کہ خدا نے اُن کو پیغمبر بنایا ہے اور اس وقت تک سوائے ان کی بیوی اور چچازاد بھائی کے کسی نے اُن کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے باوجود محمدؐ کا خیال ہے کہ وہ قیصر و کسریٰ کے ممالک کو فتح کریں گے۔"

عفیف اس واقعہ کے بعد اسلام لائے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "لو کان رزقنی الاسلام یومئذ کنت ثانیا مع علی ابن ابی طالب" (یعنی اگر اُس دن مجھے اسلام لانے کی توفیق ہو جاتی تو علیؑ کے بعد دوسرا میں ہوتا)

اس روایت کو علامہ ابن عبدالبر قرطبی نے استیعاب[1] میں، ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ[2] میں، ابن جریر طبری نے تاریخ کبیر[3] میں اور ابن اثیر نے کامل[4] میں درج کیا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آنحضرتؐ مخفی طور پر تبلیغ اسلام کر رہے تھے لیکن جب

---

[1] مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن جلد ۲ صفحہ ۲۲۵ [2] مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۱۴۱ [3] مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۱۲
[4] جلد ۲ صفحہ ۲۰

آیت "وانذر عشیرتک الاقربین" نازل ہوئی اور ایک محدود دائرہ کے اندر تبلیغ کا حکم نازل ہوا تو آنحضرتؐ نے اپنے اقربا اور اولاد عبدالمطلب و ہاشم کو جمع کیا اور اس وقت جو تقریر آپ نے کی وہ خلافت کے مسئلہ کو بھی ہمیشہ کے لیے حل کر گئی۔ ارشاد ہوتا ہے :-

یا بنی عبد المطلب انی واللہ	اے فرزندانِ عبدالمطلب باور کرو
ما اعلم شابا فی العرب جاء	کہ میں نہیں سمجھتا عرب کے کسی جوان نے
قومہ بافضل مما قد جئتکم	اپنی قوم کے سامنے وہ تحفہ پیش کیا ہو جو
انی قد جئتکم بخیر الدنیا	میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میں
والاٰخرۃ وقد امرنی اللہ تعالیٰ	دنیا اور آخرت کی بہتری کا تحفہ پیش
ان ادعوکم الیہ فایکم یوازرنی	کرتا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے
علیٰ ھٰذا الامر علیٰ ان یکون	کہ میں تم کو اس کی دعوت دوں۔ پھر کون
اخی، ووصیی وخلیفتی فیکم۔	ہے جو اس امر میں میرا ساتھ دے تاکہ
	وہی میرا بھائی میرا ولی عہد اور میرا جانشین
	قرار پائے۔

یہ سن کر مجمع پر خاموشی کا عالم طاری ہو گیا اور کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ آخر کار علیؑ اٹھے اور باآوازِ بلند کہا کہ "انا یا نبی اللہ ان اکون وزیرک علیہ" (اے رسول اللہؐ میں آپ کی اعانت و ہمدردی کے لیے آمادہ ہوں) حضرتؐ نے یہ سنکر فرمایا۔ "ان ھٰذا اخی ووصیی وخلیفتی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوہ" (دیکھو یہی میرا بھائی میرا ولیعہد اور میرا جانشین ہے۔ تم سب کو اس کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا چاہیے)[1]

---

[1] تاریخ کبیر طبری جلد ۲ صفحہ ۲۱۷ ۔ ابو الفداء مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۱۶ ۔ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۲۲ ۔ باب التاویل خازن البغدادی مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۰۶ ۔ معالم التنزیل برحاشیہ تفسیر خازن مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۰۵ ۔

چلیئے معاہدہ ہوگیا، قرار داد پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ علیؑ نے بیعت کی، رسولؐ نے بیعت لی، کس بات پر؟ نصرتِ اسلام پر، اعلاءِ کلمۃ الحق پر، اور رسولؐ نے اسی وقت اپنی خلافت و جانشینی کا مسئلہ بھی طے کر دیا۔

بے شک اگر خود علیؑ اس کے بعد اپنے فرائض میں کوتاہی کرتے، اپنے اقرارِ وفا میں ثابت قدم نہ ٹھہرتے، اپنے عہدِ نصرت میں کمزور ثابت ہوتے تو یہ معاہدہ بھی کالعدم ہو جاتا، لیکن چونکہ آپ کی خدمات شروع سے اخیر تک یکساں طور پر اسی طرح قائم رہتی ہیں، اس لیے ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ وہ معاہدہ منسوخ ہو گیا۔

اب آئیے اس کی تحقیق بھی کر لیں کہ آپ نے کسی وقت کوئی کمزوری تو نہیں دکھائی۔ اعانتِ رسولؐ سے کبھی منہ تو نہیں پھیرا۔ اور جو قول و قرار ایک بار ہو چکا تھا اس سے کبھی انحراف تو نہیں کیا؟

یہ امر تاریخ اسلام کے دیکھنے والوں سے مخفی نہیں کہ جب رسول اللہؐ نے تبلیغ شروع کی تو کفار کی ایذا رسانیاں بڑھنے لگیں، آپ کے قتل کی تدبیریں ہونے لگیں اور مسلمانوں کی جماعت ہجرت پر آمادہ ہو گئی۔ چنانچہ حد یہ ہے کہ قبائلِ عرب میں سے چند لوگ اس بات پر تُل گئے کہ گھر کا محاصرہ کر کے آپ کو قتل کر ڈالیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وقت کتنا نازک تھا اور ایسے وقت میں مدد دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن رسول اللہؐ جانتے تھے کہ کون کام آنے والا ہے۔ اس لیے آپ نے بلا تامل مکہ سے پوشیدہ طور پر ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ اور کفار کے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے آپ نے جنابِ امیرؑ سے یہ خیال ظاہر کر کے کہا کہ:-

"نم علی فراشی واتشح ببردی الحضرمی الاخضر فنم فیہ"

(تم میرے بچھونے پر سو رہو اور میری سبز چادر اوڑھ کر لیٹ جاؤ)

کتنا سخت مرحلہ تھا، کیسی دشوار گزار منزل تھی، مگر وہ جو ایک بار جان نثاری و وفاداری کا عہد و پیمان کر چکا تھا اپنی جان دینے کے لیے چادر تان کر سو رہا اور رسالتمآبؐ

تشریف لے گئے۔

قسطلانی نے کہا۔

"وکان اوّل من شری نفسہ" (وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنی جان بیچ ڈالی)[1]

امام غزالی[2] لکھتے ہیں کہ اس موقعہ کے لیے علیؑ کے باب میں یہ آیت نازل ہوئی۔:-

"ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ" (ایسے بھی لوگ ہیں جو خدا کی مرضی پر اپنی جان بیچ ڈالتے ہیں)

اکثر مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ رسالتمآبؐ اپنے بعد علیؑ کو اس لیے چھوڑ گئے تھے کہ وہ لوگوں کی امانتیں جو رسول اللہؐ کے پاس تھیں واپس کردیں[3]

آنحضرتؐ کی معیت میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لے گئے اور غار میں پناہ لی جب کفار قریش تعاقب میں یہاں تک پہنچ گئے تو حضرت ابوبکر کو فکر دامنگیر ہوئی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے:-

ثانی اثنین اذھما فی الغار اذ	وہ وقت جب ہمارا رسولؐ اپنے ایک
یقول لصاحبہ لاتحزن ان اللہ	ساتھی کے ساتھ تھا اور دونوں غار میں
معنا، فانزل اللہ السکینۃ	تھے، وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم
علی رسولہ ؕ	نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ تو خدا نے
	اطمینان و سکون نازل کیا اپنے رسولؐ پر

اس واقعہ پر حضرت ابوبکر کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں کہ خدا نے انھیں "صاحب" کے لفظ سے یاد کیا۔ اور آنحضرتؐ نے (ان اللہ معنا) کہہ کر اپنے ساتھ اُن کو بھی شامل کر لیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص کو محض لفظ "صاحب" یا ساتھی سے

---

[1] مواہب لدنیہ جلد ا صفحہ ۸۰ ۔ [2] تاریخ خمیس جلد ا صفحہ ۳۶۷ ۔ [3] ابوالفدا جلد ا صفحہ ۱۲۶ ۔ تاریخ خمیس دیار بکری جلد ا ص ۳۶۶ ۔ کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۳۹ ۔ مواہب لدنیہ قسطلانی مطبوعہ قسطنطنیہ جلد ا صفحہ ۸۰

سے یاد کرنا جبکہ وہ واقعی ساتھ ہو کس فضیلت کو ثابت کرتا ہے۔ لفظ (صاحب) تو ایسا ہے جس میں ہر شخص شامل ہو سکتا ہے، چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ کسی مومن و غیر مومن کی گفتگو کے سلسلہ میں لفظ (صاحب) اسی طرح نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

" اذ قال لصاحبه وهو یُحاوره اکفرت بالّذی خلقك ۰"

الغرض ایک ساتھی کو ساتھی کہنا کوئی ایسی بات نہیں جس سے کوئی فضیلت ظاہر ہو رہا خدا کا ساتھ ہونا، سو ظاہر ہے کہ جس جگہ رسولؐ ہوں گے وہاں خدا کی معیت بھی ہوگی۔

غار والی آیت میں سب سے زیادہ قابلِ غور آخری الفاظ ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے صرف اپنے نبیؐ پر اطمینان و سکون نازل کیا۔ یہاں ان کے ساتھی کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ اگر جناب ابوبکر کے اطمینان و سکون کو بھی ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو (علی رسولہ) کی بجائے (علیھما) ارشاد ہوتا۔

بہرحال اس واقعۂ ہجرت و واقعۂ غار میں حضرت علیؑ نے جس ایثار و قربانی، جس دلیری و بے نفسی کا ثبوت دیا وہ بجائے خود اتنا اہم ہے کہ حضرت ابوبکر کی معیت وغیرہ کا کوئی سوال اس کے مقابلہ میں لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اب اور آگے چلیئے۔

مدینہ میں آنے کے بعد آنحضرتؐ نے مہاجرین و انصار کے درمیان دوبارہ مواخاۃ قائم کی۔ ظاہر ہے کہ بھائی چارا انہیں دو آدمیوں میں قائم کیا جاتا ہے جو اپنی خصوصیات مزاجی و عادات و خصائل کے لحاظ سے باہمدگر بہت ملتے جلتے ہوں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر کو حضرت عمر کے ساتھ بھائی بھائی قرار دیا۔ حضرت حمزہ کو زید ابن حارثہ کے ساتھ، حضرت عثمان کو عبدالرحمٰن ابن عوف کے ساتھ، زبیر کو ابن مسعود کے ساتھ، عبیدہ ابن حارث کو بلال کے ساتھ، مصعب ابن عمیر کو سعد ابن ابی وقاص کے ساتھ، ابو عبیدہ جراح کو سالم مولیٰ ابن حذیفہ کے ساتھ اور سعید ابن زید کو طلحہ کے ساتھ۔ رہ گئے علیؑ، سو ان کا بھائی چارا اپنے ساتھ کیا۔ چنانچہ مؤرخ ابوالفدا[1] لکھتا ہے:۔

---

[1] تاریخ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۷

اٰخی رسول اللہ فاتخذ رسول	آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب میں مواخات
اللہ علی ابن ابی طالب اخا وکان	قرار دی اور علیؑ ابن ابی طالب کو اپنا بھائی
علیؑ یقول علی منبر الکوفۃ ایام	قرار دیا ۔ اور علیؑ اپنے زمانۂ خلافت میں
خلافتہ انا عبد اللہ و اخو	کوفہ کے منبر پر کہا کرتے تھے کہ میں خدا
رسول اللہ ۔	کا بندہ اور رسولِ خداؐ کا بھائی ہوں ۔

ایک دوسرے موقعہ پر بھی رسول اللہؐ نے سب کو ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بنایا تھا اور علیؑ کو اپنے ساتھ رکھا تھا ۔ ابن عبد البر نے استیعاب[۱] میں لکھا ہے :-

اٰخی رسول اللہ بین المھاجرین	رسول اللہؐ نے ایک بار مہاجرین کے
ثم اٰخی بین المھاجرین والانصار	درمیان مواخاۃ قائم کی اور دوسری بار
وقال فی کل واحد منھما لعلی	مہاجرین و انصار کے درمیان ۔ اور ہر مرتبہ
انت اخی فی الدنیا والاخرۃ ۔	یہی فرمایا کہ علیؑ دنیا و آخرت میں میرا بھائی
	ہے ۔

اس کا تذکرہ ابن حجر مکی کی صواعق[۲] محرقہ اور تاریخ خمیس[۳] میں بھی موجود ہے ۔

⁂

مسجدِ نبوی کی صورت یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف صحابہ کے گھر تھے اور ان سب کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے جس سے لوگوں کی آمد و رفت صحن مسجد میں رہتی تھی ۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ سب دروازے چُن دیے جائیں مگر علیؑ کے مکان کا دروازہ نہ چُنا جائے ۔ اس حکم پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں تو حضرت نے منبر پر جا کر فرمایا کہ "مجھے جو حکم خدا کی طرف سے ہوا وہ میں نے کیا ۔ میں نے اپنی مرضی سے نہ اُن دروازوں کو بند کیا ۔ نہ اس کو کھلا رکھا ۔"[۴]

---

[۱] مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد ۲ ص۲۷۳ ۔ [۲] مطبوعہ مصر ص۷۵ [۳] جلد ۱ ص۴۹۵

[۴] خصائص نسائی ص۳۷ ۔ ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۹۲ ۔

اس واقعہ سے اور اس قسم کے بہت سے نظائر سے جن کا ذکر آگے آئے گا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ رسول ؐ کی ان توجہات کو جو جناب علیؑ کے ساتھ تھیں اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے۔ اور جناب رسالتمآبؐ کی موجودگی میں بھی نکتہ چینی سے باز نہ آتے تھے۔ اور یہ وہ جذبات تھے جن کا آہستہ آہستہ قوی ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ رسول اللہ ؐ کے الطاف جناب امیرؑ پر برابر بڑھتے ہی جاتے تھے۔ اور جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا حضرت علیؑ اپنی خصوصیاتِ اخلاق کی وجہ سے رسول اللہ ؐ کے دل میں گھر کرتے ہی جاتے تھے۔

سنہ ۲ھ میں اسلام کی سب سے پہلی لڑائی ہوئی جس کا نام جنگِ بدر ہے۔ مسلمانوں کی تعداد کم تھی، ساز و سامان بھی موجود نہ تھا۔ اور رسول اللہ ؐ کے لیے میدانِ جنگ سے کچھ علیحدہ ایک عریش بنا دیا گیا تھا تاکہ وہاں سے جنگ کی حالت کا مشاہدہ فرماتے رہیں۔

حضرت ابوبکر نے اس لڑائی میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ وہیں عریش پر بیٹھے رہے[1] حضرت عثمان اپنی بیوی کی علالت کی وجہ سے مدینہ ہی میں رہ گئے تھے[2] میدانِ جنگ اس دن چند آدمیوں کے ہاتھ رہا۔ جن میں نمایاں حصہ رسول اللہ ؐ کے قرابتداروں نے لیا۔ مثلاً حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب، عبیدہ بن حارث اور حضرت علیؑ۔ عبیدہ شہید ہو گئے اور حضرت علیؑ کے ہاتھ سے بڑے بڑے کفار قتل ہوئے۔[3]

اسی سال حضرتؐ نے علیؑ ابن ابی طالب کو اپنی دامادی سے سرفراز کیا۔ اور اپنی محبوب صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؑ کا عقد اُن سے کر دیا۔ تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں نے خواستگاری کی مگر رسول اللہ ؐ نے کوئی جواب نہ دیا۔[4] لیکن جب حضرت علیؑ نے خواہش ظاہر کی تو حضرتؐ نے فرمایا کہ:۔

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۰ - ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۸ - تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۲۷ - طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۹۔ [2] طبری جلد ۳ صفحہ ۲۹۶ - ابوالفدا جلد ۱ ص ۱۲۹ - تاریخ خمیس جلد ۱ ص ۴۱۸ - طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۶

[3] تاریخ ابوالفدا جلد ۱ ص ۱۲۹۔ [4] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص ۸۲ - تاریخ خمیس جلد ۱ ص ۴۰۸ - مواہب لدنیہ جلد ۱ ص ۸۹

قد امرنی ربی بذالک (اس کا تو مجھے خدا نے حکم دیا ہے)

جب عقد ہو چکا تو حضرتؐ نے جناب فاطمہؓ سے فرمایا:۔

اما ترضین یا فاطمۃ ان اللہ	اے فاطمہؓ کیا تم اس بات سے خوش
اختار من اھل الارض رجلین	نہیں ہو کہ خدا نے تمام اہلِ زمین میں دو
جعل احدھما اباک والاٰخر	شخصوں کا انتخاب کیا جن میں سے ایک
لبعلک[1]	تمہارا باپ ہے اور دوسرا شوہر۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس شادی کی بنیاد صرف ذاتی قرابت پر نہیں تھی بلکہ انتخاب الٰہی اور فضیلتِ ذاتی پر تھی۔ مصالح اسلامی کے لحاظ سے لڑکیاں لے لینا اور خود داماد بن جانا دوسری بات تھی۔ لیکن جب لڑکی دینے کا وقت آیا تو بڑے بڑے صحابہ کی خواہش رد کر دی گئی اور حضرت علیؓ کا انتخاب کیا گیا۔ یہ واقعہ ایسا نہ تھا جس کا اثر زائل ہو جاتا، رہا اور عمر بھر رہا، چنانچہ حضرت عمر فرماتے تھے:۔

لقد اعطی علی ثلث خصال	علیؓ کو تین باتیں ایسی حاصل ہوئیں کہ
لان تکون لی خصلۃ منھا	اگر اُن میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہوتی
احب الی من حمر النعم فسئل	تو سُرخ اونٹوں سے زیادہ مجھے محبوب
ماھی قال تزویج ابنتہ[2]	ہوتی۔ پوچھا گیا وہ کیا ہیں؟ کہا کہ ایک تو یہی ہے کہ رسولؐ کی صاحبزادی کا عقد اُن سے ہوا۔

⁂

۳ھ میں اُحد کی جنگ ہوئی۔ یہ وہ سخت و فیصلہ کُن جنگ تھی جسے قدرت کو مسلمانوں کے عزم و ثبات کی کسوٹی بنانا منظور تھا۔ اوّل اوّل حالات بہت امید افزا

---

[1] ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۲۔ [2] صواعق محرقہ صفحہ ۷۸۔ تاریخ الخلفاء سیوطی صفحہ ۱۷۱۔

تھے کیونکہ لشکرِ کفار کے علمدار طلحہ بن عثمان کو حضرت علیؑ نے قتل کر کے دشمنوں کو شکست دے دی۔ لیکن جب کفار بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمان مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے پس وپیش سے بے خبر ہو گئے تو خالد ابن ولید نے (جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے) پشت کی طرف سے پھر حملہ کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اُسے شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کی زبان سے سُن لیجئے۔ مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں کہ:۔

> "مسلماں رو بہ ہزیمت آوردند و حضرت رسولؐ را تنہا گذاشتند، حضرتؐ در غضب آمد و عرق از پیشانی ہمایونش متقاطر گشت، دراں حالت نظر کرد، علیؑ ابن ابی طالب راکہ ز پہلوئے مبارکش ایستادہ است۔ فرمود کہ تو چرا بہ برادران خود لحق نہ گشتی یعنی فرار نہ کردی۔ علیؑ گفت۔ اکفر بعد الایمان انّ لی بلکؐ اسوۃ۔ یعنی آیا کافر شوم بعد از ایمان۔ بہ تحقیق کہ مرا بتو اقتداست بایاراں مفرور چہ سروکار باشد۔ دریں اثنا جمعے از کفار متوجہ آنحضرتؐ شدند آنحضرتؐ فرمود، اے علیؑ، مرا ازیں جمع نگہدار، وحق خدمت بجا آر کہ وقت نصرت ست پس علیؑ متوجہ آں قوم شد۔ چناں قلع قمع نمود کہ جمعے کثیر بہ دوزخ افتادند و باقی ماندگاں متفرق گشتند۔ می گویند کہ دراں روز شانزدہ زخمہا برتنِ مبارک جنابِ امیرؑ رسیدند۔"

دل تھرّاتا ہے۔ قلم لرزتا ہے، جی چاہتا ہے مورّخوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں تاریخ کے صفحات سے ان حروف کو چھیل کر پھینک دوں۔ کس طرح دیکھوں اور کیونکر لکھوں کہ کس کس نے فرار کیا۔ لیکن حاکم کو کیا کروں، امام فخرالدین رازی، محمد ابن جریر طبری، ابن اثیر جزری، شیخ الاسلام سیوطی، ان سب کے بیانات کو کہاں لے جاؤں۔ جدھر دیکھیے اُس طرف سے "رو بہ ہزیمت آوردند رسول اللہؐ را تنہا گذاشتند" کی آواز آرہی ہے اور لطف یہ کہ ایک ایک کا نام بھی لکھ دیا ہے۔

تاریخ خمیس (جلد ا صفحہ ۴۸۵) میں ہے کہ حضرت عمر فرماتے ہیں:-

لمّا صرف الناس یوم اُحد عن رسول اللہ کنت اول من جاء النبیؐ

(یعنی) جب لوگوں نے اُحد کے دن رسول اللہؐ سے روگردانی کی تو میں رسالت مآبؐ کے پاس سب سے پہلے واپس آیا۔

تفسیر جامع البیان ابن جریر طبری (جلد ۴ صفحہ ۹۶) میں لکھا ہے:-

"قال عمر لما کان یوم اُحد هزمنا ففررت حتی صعدت الجبل فلقد رأیتنی انزو کانی اروی"

یعنی حضرت عمر نے فرمایا کہ "جب اُحد کے دن لوگوں نے شکست کھائی تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ وغیرہ وغیرہ"

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر (جلد ۳ صفحہ ۴۷) میں لکھتے ہیں:-

ومن المنهزمین عمر الا انه لم یکن فی اوائل المنهزمین ولم یبعد بل ثبت علی الجبل الی ان صعد النبی ومنهم ایضاً عثمان انهزم مع رجلین یقال لهما سعد وعقبة انهزموا حتی بلغوا موضعاً بعید اثم رجعوا بعد ثلثة ایام فقال لهم النبی لقد ذهبتم فیها عریضة۔

(فراریوں میں حضرت عمر بھی تھے، مگر وہ سب سے پہلے فرار کرنے والوں میں نہ تھے اور بہت دور بھی نہ گئے تھے، بلکہ پہاڑ پر چلے گئے تھے۔ فراریوں میں سے حضرت عثمان بھی تھے اور سعد و عقبہ کے ساتھ فرار کیا تھا۔ اور یہ لوگ بہت دور نکل گئے تھے۔ اور جب تین دن کے بعد واپس آئے تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم لوگ بہت لمبے نکل گئے تھے)

حضرت عثمان مقام اعوص کے حدود تک پہنچ گئے تھے۔ اور جب وہاں سے تین دن کے بعد واپس آئے تو رسول اللہؐ نے وہ فقرہ فرمایا جس کا ذکر اوپر آیا ہے[1]

---

[1] طبری جلد ۳ صفحہ ۲۱ - استیعاب جلد ۲ صفحہ ۵۰۲ - تفسیر جامع البیان جلد ۴ صفحہ ۹۶۔

خود قرآن مجید میں جو تصویر اس جنگ کی پیش کی گئی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اذ تصعدون ولا تلوون علی احد والرسول یدعوکم فی اخراکم۔	وہ وقت جب تم پہاڑ پر چڑھے چلے جا رہے تھے اور مڑ کے بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسولؐ تمھیں پیچھے سے آواز دے رہا تھا۔

یہ تھا وہ عبرت انگیز سماں اور یہ تھا وہ امتحانِ محبت و صداقت جس میں سوائے ایک ذاتِ علیؑ کے اور کوئی دوسرا کامیاب ثابت نہ ہوا۔

رسول اللہؐ کو اس دلشکن طرزِ عمل کی وجہ سے اتنی بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی کہ آپؐ نے خاتمۂ جنگ پر قتل ہو جانے والوں کے متعلق فرمایا۔ ھؤلاء اشھد علیھم (یہ وہ ہیں جن کے ایمان کی گواہی میں دیتا ہوں)

حضرت ابوبکر نے کہا۔ "یا رسول اللہؐ کیا ہم ان کے بھائی نہیں ہیں اور کیا ہم اسلام نہیں لائے اور کیا ہم نے کبھی آپؐ کے ساتھ جہاد نہیں کیا؟"

حضرتؐ نے فرمایا۔ "بلی ولا ادری ما تحدثون بعدی" (ہاں۔ مگر کیا معلوم میرے بعد تم لوگ کیا کرو گے)[1]

* * *

۵ھ میں جنگ خندق واقع ہوئی۔ اُحد کے واقعہ کا دھبہ دامنوں پر موجود تھا اور اس کے چھڑانے کا یہ موقع اچھا تھا۔ لیکن عمرو ابن عبدود کا سا بہادر پورے جوش و خروش سے مبارز طلبی کر رہا تھا کس کی ہمت تھی کہ موت کے منہ میں چلا جائے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ:۔ طلب المبارزۃ والاصحاب ساکتون کانما علی رؤوسھم الطیر لانھم

---

[1] مُوطا امام مالک مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی صفحہ ۱۷۴۔

كانوا يعلمون شجاعته" (اس نے مقابل طلب کیا اور اصحاب تمام خاموش تھے گویا کہ اُن کے سروں پر طائر بیٹھا ہوا ہے کیونکہ وہ سب اس کی شجاعت سے آگاہ تھے)

جناب امیرؑ پہلی ہی آواز میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر رسول اللہؐ نے اُنھیں روک دیا لیکن جب ہر طرف خاموشی چھائی رہی اور عمر ابن عبدود کی لن ترانیاں بڑھنے لگیں تو رسول اللہؐ نے جناب امیرؑ ہی کو اجازت دی اور آخرکار اُنھیں کی تلوار نے اس مہم کو بھی سر کیا۔[1]

⁂

۶ھ میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔ رسول اللہؐ بظاہر حج کے ارادہ سے تشریف لے گئے تھے لیکن مشرکین کے سد راہ ہونے سے آپ نے حج کا ارادہ ترک فرما دیا۔ اور چند شرائط کے ماتحت صلح کر لینا منظور فرما لیا۔ یہ شرطیں ایسی تھیں جن سے رسول اللہؐ کی طرف ایک قسم کی کمزوری کا پہلو نمایاں تھا۔ اس صلحنامہ کے کاتب حضرت علیؑ تھے لیکن دوسرے اصحاب کو اس موقعہ پر طرح طرح کے شکوک پیدا ہو گئے اور اس رواداری پر عجب قسم کے غصہ و غم کی لہر دوڑ گئی۔

طبری نے لکھا ہے :۔

قد كان رسول الله خرجوا وهم
لا يشكون في الفتح لرؤيا رآها
رسول الله، فلما راوا ما رأوا من
الصلح والرجوع وما تحمل
عليه رسول الله في نفسه
دخل الناس من ذلك امر عظيم
حتى كادوا ان يهلكوا[2]

جو صحابہ رسول اللہؐ کے ساتھ آئے تھے اُنھیں یقین تھا کہ فتح ہو گی کیونکہ رسول اللہؐ نے ایک خواب دیکھا تھا لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ حضرتؐ نے صلح کر لی ہے اور تحت شرائط منظور کر کے واپس جا رہے ہیں تو اُن کے دلوں میں ایسی بُری باتیں پیدا ہوئیں کہ قریب تھا وہ ہلاکت یعنی گمراہی میں مبتلا ہو جائیں۔

---

[1] تاریخ خمیس جلد ۱ ص ۵۴۴۔ [2] تاریخ طبری جلد ۳ ص ۷۹

حضرت عمرؓ کا جو عالم تھا وہ خود اُن کی زبان سے سُنیئے :۔

اتیت النبی فقلت الست نبی اللہ قال بلیٰ قلت السنا علی الحق وعدونا علی الباطل قال بلیٰ قلت فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا اذاً قال انی رسول اللہ ولست اعصیہ وھو ناصری قلت اولیس کنت تحدثنا انا سنأتی البیت فنطوف بہ قال بلیٰ افاخبرت انا ناتیہ العام قلت لا قال فانک اتیہ وتطوف بہ قال فاتیت ابابکر فقلت یا ابابکر الیس ھٰذا نبی اللہ حقاً قال بلیٰ قلت السنا علی الحق وعدونا علی الباطل قال بلیٰ قلت فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا اذاً قال ایھا الرجل انہ رسول اللہ ولیس یعصی ربہ وھو ناصرہ فاستمسک بغرزہ فواللہ انہ علی الحق قلت ولیس کان یحدثنا انا سناتی

میں رسول اللہؐ کے پاس آیا اور کہا، کیا آپ رسولِ خدا نہیں ہیں؟ کہا، کیوں نہیں میں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن ناحق پر نہیں ہے؟ فرمایا ہاں ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا، پھر ہم اس ذلت کو کیوں برداشت کریں۔ فرمایا میں خدا کا رسولؐ ہوں اور خدا کے حکم کے خلاف نہیں کرتا۔ اور وہی میرا مددگار رہے۔ میں نے کہا، کیا آپ نے ہم سے نہیں کہا تھا کہ ہم عنقریب خانہ کعبہ کی طرف جائیں گے اور اُس کا طواف کریں گے حضرتؐ نے فرمایا کیوں نہیں۔ لیکن کیا میں نے اسی سال کے لیے کہا تھا؟ میں نے کہا کہ یہ تو نہیں کہا تھا۔ فرمایا پھر میں اب بھی وہی کہتا ہوں کہ میں خانہ کعبہ آؤں گا اور یہاں کا طواف کروں گا۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں ابوبکر کے پاس گیا اور اُن سے بھی وہی گفتگو کی جو رسول اللہؐ سے کی تھی۔

البیت فنطوف بہ قال بلی افاخبرتک
انک تاتیہ العام قلت لا فقال
فانک اٰتیہ فتطوف بہ[1]

طبری کی روایت میں آپ کا پہلے حضرت ابوبکرؓ کے پاس اور پھر آنحضرتؐ کے پاس جا کر سوال و جواب کرنا تحریر ہے۔ تاریخ خمیس (جلد ۲ ص ۲۴) میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا:۔

واللہ ما شککت منذ اسلمت الا یومئذ (جب سے میں اسلام لایا کبھی مجھے شک نہیں ہوا جیسا اُس دن ہوا)

یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر فرماتے تھے "کہ میں نے اس جسارت کے کفارہ میں بہت نمازیں پڑھیں اور روزے ادا کیے"

الغرض صلح حدیبیہ کی وجہ سے صحابہ رسول اللہؐ سے اس قدر خفا ہو گئے تھے کہ جب صلح کے بعد رسول اللہؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ "قوموا، فانحروا ثم احلقوا" (اٹھو قربانیاں کرو اور سر منڈواؤ) تو اُن میں سے ایک بھی آمادہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ حضرتؐ نے تین مرتبہ فرمایا۔ اور جب اس کے بعد بھی کسی نے تعمیلِ حکم نہ کی تو حضرتؐ کبیدہ خاطر ہو کر حضرت امِ سلمہ کے خیمہ میں تشریف لے گئے۔[2]

جب رسول اللہؐ قربانی کرنے کے بعد سر منڈوا چکے تو لوگوں نے بادلِ ناخواستہ خود بھی قربانیاں شروع کیں۔ "بادلِ ناخواستہ" کا حال ابنِ عباس کی روایت ذیل سے معلوم ہو سکتا ہے:۔

حلق رجال یوم الحدیبیۃ و	کچھ لوگوں نے حدیبیہ کے دن سر منڈوایا
قصر اخرون فقال رسول اللہؐ	اور بعض نے بال ترشوا لیے۔ رسول اللہؐ

---

[1] مواہب لدنیہ قسطلانی جلد ۱ ص ۱۳۱۔ [2] تاریخ طبری جلد ۳ ص ۸۰؛ تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۲۵

يرحم الله المحلقين قالوا والمقصرين يارسول الله قال يرحم المحلقين قالوا والمقصرين يارسول الله قال يرحم المحلقين قالوا يارسول الله والمقصرين قال والمقصرين قالوا يارسول الله فلم ظاهرت الرحم للمحلقين دون المقصرين قال لانهم لم يشكوا	نے فرمایا سر منڈوانے والوں پر خدا رحمت کرے۔ لوگوں نے کہا اور بال ترشوانے والوں پر۔ آپؐ نے پھر وہی کہا۔ آخر تیسری مرتبہ کہا کہ بال ترشوانے والوں پر بھی رحمت ہو۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپؐ نے اُنکو کیوں ترجیح دی۔ فرمایا کہ اُنھوں نے شک نہیں کیا تھا[1]

محمد ابن سعد کاتب واقدی کی روایت ہے کہ حضرت عثمان اور ابوقتادہ نے سر نہیں منڈوایا تھا[2]

* * *

سنہ ۷ھ میں خیبر کی مہم درپیش ہوئی۔ اتفاق سے جناب امیرؑ کی آنکھیں آشوب کر آئی تھیں۔ اور آپ مدینہ ہی میں رہ گئے تھے۔ خیبر کے قلعوں میں جو سب سے زیادہ مضبوط قلعہ تھا وہ دشمن کا مرکز تھا۔

تین روز تک متواتر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پرچم اسلام لے کر تشریف لے گئے لیکن ہر بار ناکام واپس آئے[3]

تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے عَلَم حضرت عمر کو دیا اور بہت سے لوگ آپ کے ساتھ گئے لیکن خیبر والوں سے مقابلہ ہوا تو آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور رسالتمآبؐ کے پاس واپس آگئے۔ اس حال میں کہ ساتھ والے اُن پر بزدلی کا الزام لگاتے تھے اور آپ ساتھیوں پر[4]

---

[1] تاریخ طبری جلد۳ ص۸۱، تاریخ خمیس جلد۲ ص۲۵۔ [2] طبقات ابن سعد جلد۲ مطبوعہ لیڈن صفحہ ۷۵
[3] تاریخ خمیس جلد۲ ص۵۳، السیرۃ النبویہ عبدالملک ابن ہشام برحاشیہ روض الانف جلد۲ صفحہ ۲۳۹
[4] تاریخ طبری جلد۳ صفحہ ۹۳۔

جب یہ صورت دیکھی تو رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

اما واللہ لاعطین الرایۃ	کل میں عَلَم اس شخص کو دوں گا جو بھاگنے
غداً رجلاً کراراً غیر فرار	والا نہیں ہے جو اللہ اور رسولؐ کو دوست
یحب اللہ ورسولہ ویحب اللہ	رکھتا ہے اور جسے اللہ و رسولؐ دوست
ورسولہ یفتح اللہ علی یدیہ[1]	رکھتے ہیں۔ خدا اسی کے ہاتھوں سے فتح کرائے گا۔

بعض روایات میں "کرار غیر فرار" کا ٹکڑا نہیں ہے (ملاحظہ ہو صحیح بخاری جلد ۳ ص ۲۳ و طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۸۰) لیکن اگر اس ٹکڑے کو علیحدہ کر دیا جائے تو معنی تشنہ رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ صورت حال یہ تھی کہ برابر تین دن سے اصحاب کی سرکردگی میں مہمیں بھیجی جا رہی تھیں اور برابر وہ لوگ شکست کھا کر واپس آجاتے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے یہی کہا ہوگا کہ کل میں اُس کو عَلَم دوں گا جو بھاگ کر واپس نہ آئے ورنہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ علاوہ اس کے اس فقرہ کو علیحدہ کر دینے سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ "کل میں عَلَم اُس کو دوں گا جو خدا و رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور جسے خدا و رسولؐ دوست رکھتے ہیں۔ گویا وہ لوگ جو اس سے قبل پرچم اسلام لے کر خیبر فتح کرنے گئے تھے، وہ خدا و رسولؐ کے دوست نہ تھے۔ اور اس صورت میں صحابہ کی اور زیادہ توہین ثابت ہوتی ہے۔

بہرحال "کرار غیر فرار" کا ٹکڑا ہو یا نہ ہو، یہ امر مسلّم ہے کہ رسول اللہؐ تین دن کی مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے کسی اور شخص کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جس کا اظہار آپؐ نے ان الفاظ میں فرمایا۔

---

[1] تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۵۳، خصائص نسائی ص ۱۱۔ الریاض النضرہ جلد ۲ ص ۱۸۷، سیرۃ نبویہ عبدالملک روض الانف جلد ۲ ص ۲۳۹، استیعاب جلد ۲ ص ۴۷۳۔

اس خبر کے سننے کے بعد صحابہ پر کیا اثر ہوا؟ اس کا حال بخاری کے الفاظ میں سنیے:۔

فبات الناس یدوکون لیلتھم	تمام رات لوگوں نے چہ میگوئیوں میں بسر
ایّھم یعطاہ فلما اصبح النّاس	کردی اور جب صبح ہوئی تو ہر شخص یہ تمنّا
غدوا کلھم یرجوان یعطاہ	لیے ہوئے تھا کہ عَلَم اُسے ملے گا۔

طبقات ابن سعد کاتب واقدی میں ہے "حضرت عمر کا بیان ہے کہ مجھے کبھی اس دن سے پہلے سرداری کی خواہش نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس دن میں اونچا ہو ہو کر دیکھ رہا تھا اور منتظر تھا کہ عَلَم مجھ کو دیا جائے گا۔"[1]

طبری نے لکھا ہے کہ "جب دوسرا دن ہوا تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر عَلَم کے واسطے گردنیں اونچی کر کر کے دیکھنے لگے۔"

لیکن اس دوسرے دن صبح کو کیا ہوا؟ حضرتؐ نے عَلَم کو لے کر جنبش دی اور فرمایا کون اس کو لیتا ہے، ایک صاحب آگے بڑھے اور کہا میں۔ آپ نے فرمایا "جاؤ جاؤ آگے بڑھو، قسم اس خدا کی جس نے محمدؐ کے چہرہ کو عزت دی ہے میں یہ عَلَم اس شخص کو دوں گا جو بھاگنے والا نہیں ہے۔ اے علیؑ، اٹھو اور عَلَم لو۔"[2]

چنانچہ آپ نے عَلَم لیا، قلعہ فتح کیا اور کامران و بامراد واپس آئے۔

* * *

س۸ھ میں مکہ معظمہ فتح ہوا اور مسلمان خوشیاں منا رہے تھے لیکن نبیؐ اور علیؑ دو ہستیاں ایسی تھیں جو اسلام کی خدمت سے غافل نہ تھیں۔ وہ اصنام جو خانۂ کعبہ میں نصب کردیے گئے تھے، رسالت مآبؐ اور علیؑ ابن ابی طالب ان بتوں کو توڑنے کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ وہ بُت جو سب سے بڑا تھا اور خانۂ کعبہ کے اوپر نصب تھا اس کے توڑنے کے لیے رسول اللہؐ نے علیؑ کو اپنے کاندھے پر بلند کیا اور

---

[1] طبقات جلد۲ ص۴۸، تاریخ طبری جلد۳ ص۹۳، [2] الریاض النضرہ جلد۲ صفحہ ۱۸۷۔

آپ نے اس کو توڑ ڈالا۔

مورّخ دیار بکری نے لکھا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلعم نے حضرت علیؓ سے فرمایا:۔

طوبیٰ لک تعمل للحق وطوبیٰ لی احمل للحق۔	مبارک ہو تم کو کہ تم حق کے لیے کام کر رہے ہو اور خوشحال میرا کہ میں حق کے لیے تمھارا بار اٹھائے ہوئے ہوں[1]۔

یہ باتیں بظاہر دیکھنے میں بہت معمولی حیثیت رکھتی ہیں لیکن انہی جزئی واقعات سے عمومی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ اور ایک مورّخ انھیں واقعات سے صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اسی سال کے آخر میں حنین کی جنگ ہوئی۔ یہ رسول اللہ صلعم کی آخری لڑائی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد جنگ تبوک ہوئی جس میں رسول اللہ بغیر جنگ کیے ہوئے واپس آگئے تھے۔

اس لڑائی کی کیفیت بڑی حسرت خیز و حیرت انگیز ہے۔ اور قرآن مجید میں اس کی کیفیت حسب ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہے:۔

ویوم حنین اذا عجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئاً وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین۔	اور حنین کے دن کو یاد کرو جبکہ تمھاری کثرت نے تمھیں مغرور بنا دیا تھا مگر اس نے تمھیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ اور زمین تم پر تنگ ہو گئی اور تم نے جنگ میں پیٹھ دکھا دی۔

صورت یہ ہوئی کہ دشمن کی فوج کمین گاہ میں تھی اُس نے اچانک حملہ کر دیا اور مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ سوائے سات آٹھ آدمیوں کے کوئی باقی نہ رہا[2]۔

ان آٹھ آدمیوں کی فہرست میں اکثر کتابوں میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا نام

---

[1] تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۹۵۔ [2] الروض الانف سہیلی جلد ۲ ص ۲۹، مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۳۔

بھی نظر آتا ہے۔ لیکن صحیح بخاری میں ابو قتادہ کی روایت یہ ہے:۔

> تمام مسلمانوں نے راہِ فرار اختیار کی اور میں بھی اُن کے ساتھ بھاگا ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ سب کے ساتھ حضرت عمر بھی ہیں۔ میں نے کہا یہ کیا ہوا، آپ نے فرمایا کیا بتاؤں خدا کی مرضی۔ پھر اس کے بعد رفتہ رفتہ لوگ رسالتمآبؐ کے پاس واپس آ گئے۔[1]

محدّث ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ:۔

> آنحضرتؐ کے ساتھ صرف چار آدمی رہ گئے تھے۔ تین بنی ہاشم میں سے اور ایک اور جن کی تفصیل یہ ہے۔ علیؑ و عباس آپ کے آگے تھے، ابوسفیان لگام پکڑے ہوئے تھے اور ابن مسعود پہلو میں تھے اور کوئی شخص دشمنوں میں سے حضرت کی طرف نہ بڑھتا تھا۔ مگر یہ کہ وہ قتل ہو جاتا تھا۔[2]

ان فرار کرنے والوں پر ایک عورت امّ سلیم بنت ملحان نے انتہائی غم و غصّہ کا اظہار کیا۔ وہ رسالتمآبؐ کے پاس سے بالکل جدا نہیں ہوئی۔ حضرت نے پکار کر فرمایا "امّ سلیم" اس نے کہا۔ "جی حضور، میرے ماں باپ آپ پر نثار، آخر آپ فرار ہونے والوں کو قتل کیوں نہیں کر ڈالتے۔" حضرت نے اس کے جواب میں صرف اس قدر ارشاد فرمایا کہ "یہ بھاگ جاتے ہیں تو کیا ہوا، خدا کافی ہے۔[3]"

استیعاب میں حضرت عباس کے حالات میں لکھا ہے کہ:۔

> "حنین کے دن آنحضرتؐ کے پاس سے سب فرار کر گئے، سوا عباس، عمر، علیؑ اور ابوسفیان کے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ سات آدمی حضرتؐ ہی کے گھر کے رہ گئے تھے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ یہ سات آدمی علیؑ

---

[1] صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۴۲ ، [2] مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۲۳ ، [3] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲۹۔

عباس، فضل ابن عباس، ابو سفیان، جعفر بن ابی سفیان، ربیعہ ابن حارث
اور اسامہ بن زید ہیں اور ان کے علاوہ آٹھویں ایمن ابن عبید۔

> بعض مورخوں نے ابو سفیان کے بجائے حضرت عمرؓ کا نام لیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابو سفیان تو یقیناً حضرتؐ کے ساتھ تھے حضرت عمر کے متعلق بے شک اختلاف ہے۔"[1]

اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہؐ نے طائف کا محاصرہ کیا کیونکہ مشرکین وہاں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں ایک دن رسول اللہؐ نے جناب امیرؑ کو بلا کر بڑی دیر تک راز کی گفتگو کی۔ اس پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور کہا۔ لقد طال نجواہ مع ابن عمہ (آج تو رسول اللہؐ اپنے ابن عم سے بڑے طولانی مشورے کر رہے ہیں) رسول اللہؐ نے سنا تو فرمایا "ما انتجیتہ ولکن اللہ انتجاہ" (میں نے علیؑ کو مشورے کے لیے منتخب نہیں کیا ہے بلکہ خدا نے کیا ہے) اس روایت کو حافظ ترمذی نے درج کیا ہے۔ اور حسن صحیح قرار دیا ہے[2]

* * *

سنہ ۹ھ میں غزوہ تبوک واقع ہوا۔ رسول اللہؐ کی زندگی کو صرف ایک سال باقی ہے۔ اور یہ غزوہ آخری غزوہ ہے۔ گرمی کا زمانہ ہے شدت کی لو چل رہی ہے۔ اور رسالت مآبؐ نے اپنے ساتھ چلنے کے لیے تمام اصحاب کو حکم دیا ہے۔ لیکن حضرت علیؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ تم مدینہ میں قیام کرو اور میری جگہ رہو۔ حضرت علیؑ کبیدہ خاطر ہو کر کہتے ہیں:۔

> اتخلفنی فی الصبیان والنساء (کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ جائیں گے؟)

حضرتؐ جواب دیتے ہیں:۔ اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ھارون

---

[1] طبقات ابن جلد ۲ ص ۴۹ [2] الریاض النضرہ جلد ۱ صفحہ ۲۰۰

من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی (کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے[1])

اگر آخری جملہ "لا نبی بعدی" کا نہ ہوتا تو ہارونؑ کی منزلت کو صرف وقتی جانشینی اور عارضی خلافت تک محدود سمجھا جا سکتا تھا لیکن اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی میں اور بعد وفات دونوں حالتوں میں جناب امیرؑ کو اسی جانشینی اور خلافت کا درجہ حاصل ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ کے بعد حاصل ہوا۔

دنیا کو معلوم ہے کہ ہارونؑ موسیٰؑ کے شریک کار، معاون اور وزیر و جانشین تھے اور اگر ان کی زندگی موسیٰؑ کے بعد باقی رہتی تو خلافت کا حق سوائے اُن کے کسی کو نہ پہنچتا بالکل اسی طرح جناب امیرؑ کے لیے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حیات و ممات ہر حالت میں رسول اللہؐ کے جانشین تھے۔ اور اگر ہارونؑ سے کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ ہارونؑ نبی تھے اور رسول اللہؐ کے بعد سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا لیکن اگر یہ سلسلہ ختم نہ ہوتا تو نبی بھی سوائے حضرت علیؑ کے دوسرا نہ ہوتا۔

⁂

اسی سال کا واقعہ ہے کہ سورۂ برأت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن کا اعلان مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر ہونا تھا۔ اس واقعہ کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ نسائی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حضرت ابوبکر کو ان آیات کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد ان کو واپس بلا کر یہ خدمت حضرت علیؑ کے سپرد کی۔ دوسری روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۴۳۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۴۰۔ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴۴۔ الریاض النضرۃ جلد ۲ صفحہ ۱۶۲۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۱۷۔ مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۷۳۔ تاریخ الخلفاء سیوطی ۱۶۷ و ۱۶۸۔

کہ ان کو واپس نہیں بلایا بلکہ خود حضرت علیؑ کو روانہ کیا کہ حضرت ابوبکر سے وہ آیات لے کر خود اس خدمت کو انجام دیں۔ بہرحال ان تمام روایات میں رسول اللہؐ کا یہ قول قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے کہ "علی منی وانا منہ ولا یؤدی عنی الا انا وعلی" یعنی علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ادا میری ترجمانی یا میں خود کر سکتا ہوں یا علیؑ۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ اس طرح پائے جاتے ہیں "انی امرت ان ابلغہ انا او رجل من اھل بیتی" (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ یا میں خود اس کو پہنچاؤں یا ایسا شخص جو میرے اہل بیت میں داخل ہو)[1]

بہرحال حضرت ابوبکر روانہ ہو چکے تھے یا نہیں، وہ واپس بلائے گئے یا نہیں یہ مسلم ہے کہ آیات قرآنی کی تبلیغ کے لیے حضرتؐ نے جناب امیرؑ کو منتخب کیا اور یہ کہہ کر کہ اس خدمت تبلیغ کا اہل میں ہوں یا پھر وہ جو میرے اہل بیت میں داخل ہو۔

سنہ ۱۰ھ میں رسول اللہؐ نے جناب امیرؑ کو یمن کی طرف تبلیغ کے لیے روانہ کیا اور اس شان سے کہ "عقد لواءً وعممہ بیدہ وارخی طرفہا من قدامہ نحو ذراع ومن خلفہ قید شبر" (حضرتؐ نے ان کے لیے علم طیار کیا، خود اپنے ہاتھ سے ان کے سر پہ عمامہ باندھا اور عمامہ کا ایک سرا آگے کی طرف قریب ایک ہاتھ کے سینہ پر ڈال دیا۔ اور دوسرا سرا پشت کی طرف ایک بالشت لٹکا دیا۔[2]

اس مہم کی سرکردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قبیلۂ ہمدان اور اکثر اہل یمن ایک ہی دن میں آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور آپ مدینہ واپس لوٹے۔ اس مہم پر پہلے خالد بن ولید کی نامزدگی ہو چکی تھی اور چونکہ حضرت علیؑ کے بھیجے جانے سے وہ معزول ہوئے۔ اس لیے بعض حضرات کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔[3] اور اس کا انتقام یوں لیا گیا کہ چند لوگ جناب علیؑ کی یہ شکایت لے کر مدینہ پہنچے کہ آپ نے اموال خمس میں سے ایک کنیز پر بغیر اجازت

---

[1] خصائص نسائی صفحہ ۶۱-۶۴ - روض الانف جلد ۲ ص ۳۲۸ ، طبری جلد ۳ ص ۱۵۴ ، تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۱۵۷ - ریاض نضرہ ص ۱۷۴

[2] تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۱۶۰ [3] بخاری مطبوعہ مصر جلد ۲ ص ۲۳ ۔

رسولؐ تصرف کیا۔ اس کا جو جواب رسول اللہؐ نے دیا ہے وہ کتب احادیث میں اب تک محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

عمران بن حصین کی روایت ہے کہ "اقبل رسول اللہ والغضب یعرف فی وجهه فقال ما تریدون من علی ثلاثًا ان علیا منی وانا منه وهو ولی کل مومن بعدی؟ (حضرت مخاطب ہوئے مگر اس طرح کہ غصہ آپ کے چہرے سے نمایاں تھا اور کہا تم لوگ علیؑ سے کیا چاہتے ہو، آخر؟ علیؑ مجھ سے ہے میں علیؑ سے ہوں اور وہ ہر مومن کا میرے بعد ولی ہے)[1]

(بریدہ کی روایت میں ہے:۔

لما اتیت النبی دفعت الکتاب فقرأه علیه فرأیت الغضب فی وجهه فقال لا تقع فی علی فانه منی وانا منه وهو ولیکم بعدی

(یعنی جب میں آیا اور حضرتؐ کو خط دیا تو آپ نے پڑھنا شروع کیا اور چہرہ پر غصہ کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا، علیؑ کی برائی نہ کرو، وہ مجھ سے ہے میں اس سے ہوں اور وہ تمہارا حاکم ہے میرے بعد)[2]

علامہ ابن حجر مکی شرح قصیدۂ ہمزیہ[3] میں لکھتے ہیں:۔

ما صح عنه صلی الله علیه وسلم وهو اللهم وال من والاه وعاد من عاداه ان علیا منی وانا منه وهو ولی کل مومن بعدی۔

(صحیح اسناد سے ثابت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا خداوندا دوست رکھ اُسے جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اس کو جو علیؑ کو دشمن رکھے اور یہ کہ علیؑ مجھ سے ہے، میں علیؑ سے ہوں اور وہ ولی ہے ہر مومن کا میرے بعد)

---

[1] ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۷۱، خصائص نسائی صفحہ ۲۳، ۲۵۔ [2] استیعاب مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۴۷۰۔ [3] مطبوعہ مصر صفحہ ۲۳۷۔

اسی سنہ کے آخر میں رسالتمآبؐ نے آخری حج کیا ہے۔ جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جناب رسالتمآبؐ کی زندگی کا آخری زمانہ ہے اور صرف چند ماہ آپ کی رحلت کو باقی ہیں۔

جناب امیرؑ زکوٰۃ و خمس لینے یمن چلے گئے تھے، جب رسول اللہؐ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ لیکن آپ وہاں سے واپس آکر رسول اللہؐ سے مل گئے تھے۔ اس موقع پر بھی جناب امیرؑ کی دیانت و امانت سے فوج والوں کو شکایت پیدا ہوگئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب آپ یمن سے واپس ہوئے اور مکہ معظمہ کے قریب پہنچے تو آپ فوج سے علیحدہ ہوکر پہلے پہنچ گئے اور صحابہ میں سے ایک شخص کو فوج کا سردار بنا آئے۔ اس قائم مقام سردار نے تمام اسباب و اموال میں سے جو یمن سے آیا تھا لباس فاخرہ نکلوا کر فوج کے تمام سپاہیوں کو پہنوا دیا۔ جب فوج کا داخلہ ہونے لگا تو حضرت علیؑ معائنہ کے لیے گئے اور یہ دیکھ کر بہت برہم ہوئے اور تمام لباس اتروا کر اموال میں پھر شامل کر دیا۔ یہ بات بھی لوگوں کو بہت ناگوار گزری اور رسول اللہؐ سے شکایت کی گئی تو آپؐ نے ایک عام تقریر کی اور فرمایا۔ لا تشکوا علیا فواللہ انہ لاخشن فی ذات اللہ من ان یشکی (یعنی علیؑ کی شکایت نہ کرو، خدا کی قسم وہ اللہ کی مرضی کے لیے اتنا بے لوث ہے کہ اس کی شکایت کا موقعہ ہی نہیں ہے)[1]

یہ حج سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اب وہ وقت ہے کہ رسول اللہؐ حج سے فارغ ہو کر مدینہ واپس تشریف لا رہے ہیں۔ حضرتؐ چلتے چلتے غدیر خم تک پہنچتے ہیں۔ پورا قافلہ روک دیا جاتا ہے اور اعلان ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ تقریر فرمائیں گے۔ ہزاروں آدمی خطبۂ نبوی سننے کیلئے مجتمع ہیں۔ اور آپؐ منبر پر تشریف لے جا کر ایک مبسوط خطبہ کے ذریعہ سے اپنے قرب وفات کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ اپنی خدمات و ہدایات کا ذکر فرماتے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام برحاشیہ روض الانف جلد ۲ ص ۳۵۱، طبری جلد ۳ ص ۱۶۹ - استیعاب مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۷۵۷، صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۶۔

ہیں، لوگوں سے اصولِ اسلام و ایمان کی گواہی لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ کچھ فرماتے ہیں جس سے انکار کی گنجائش نہیں اور جس نے ہمیشہ کے لیے آپ کی جانشینی کے مسئلہ کو طے فرما دیا۔

اس سلسلہ میں حافظ طبرانی کی روایت جو بسند صحیح منقول ہے، حسب ذیل ہے:-

ایہا الناس انی یوشک ان ادعیٰ فاجیب وانی مسئول وانکم مسئولون فماذا انتم قائلون (مسلمانو، عنقریب مجھے بلایا جائے گا اور میں تم سے رخصت ہو جاؤں گا، میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو اس لیے بتاؤ کہ جب یہ وقت آئے گا تو تم کیا کہو گے؟)

فقال الیس تشہدون ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ وان جنتہٗ حق وان نارہٗ حق وان البعث حق بعد الموت وان الساعۃ اٰتیۃ لاریب فیہا وان اللہ یبعث من فی القبور، قالوا بلیٰ نشہد بذالک قال اللھم اشہد۔ ثم قال یا ایہا الناس ان اللہ مولای وانا مولی المومنین وانا اولیٰ بہم من انفسہم فمن کنت مولاہ فہذا مولاہ یعنی علیاً اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ (حضرتؐ نے فرمایا کیا تم لوگ اس بات کی گواہی نہ دو گے کہ سوائے اللہ کے کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمدؐ خدا کا بندہ اور رسولؐ ہے اور جنت حق ہے، جہنم حق ہے اور موت حق ہے اور زندگی بعد موت کے حق ہے اور قیامت آنے والی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اور خدا مُردوں کو زندہ کرے گا۔ سب نے کہا، ہاں ہم اس کی گواہی دیتے ہیں، حضرتؐ نے فرمایا، خداوندا گواہ رہنا۔ پھر فرمایا، اے لوگو خدا میرا مولا ہے، اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں اور اُن کے نفسوں کا خود اُن سے زیادہ حقدار ہوں۔ اس کے بعد جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ مولا ہے (علیؑ کی طرف اشارہ کیا)

خداوندا دوست رکھ اس کو جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اُس کو جو علیؑ کو دشمن رکھے)
ثم قال ایھا الناس انی فرطکم وانتم واردون علی الحوض وانی اسئلکم حین تردون علیّ عن الثقلین فانظرونی کیف تخلفون فیھما الثقل الاکبر کتاب اللہ سبب طرفہ بید اللہ وطرفہ بایدکم فاستمسکوبہ لا تضلوا ولا تبدلوا وعترتی اھل بیتی فانہ قد نبأنی اللطیف الخبیر انھما لن ینقضیا حتی یردا علی الحوض (پھر حضرتؐ نے فرمایا اے لوگو میں تمھارے آگے جاتا ہوں اور تم حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچو گے تو میں تم سے دریافت کروں گا کہ تم نے میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ایک ان میں سے کتابِ خدا ہے جو ایک زنجیر ہے جس کا ایک سرا خدا سے متصل اور دوسرا سرا تمھارے پاس ہے اس کو پکڑے رہو، گمراہ نہ ہو اور ادل بدل نہ کرو۔ دوسرے میری عترت میرے اہلبیتؑ، خدا نے مجھے بتایا ہے کہ یہ دونوں فنا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوضِ کوثر پر وارد نہ ہوں)

علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ (مطبوعہ مصر صفحہ ۲۶،۲۵) میں اس روایت کو درج کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ حضرتؐ نے تین مرتبہ صحابہ سے دریافت کیا۔ الست اولیٰ بکم من انفسکم (کیا میں تم پر تم سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا) سب نے کہا، بے شک بیشک، بیشک اور پھر اس کے بعد رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا:۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ وادر الحق حیث دار (یعنی جس کا میں مولیٰ ہوں علیؑ اس کا مولیٰ ہے۔ خداوندا دوست رکھ اس کو جو اُسے دوست رکھے اور دشمن رکھ اس کو جو اُسے دشمن رکھے، مدد کر اُس کی جو اُس کی مدد کرے، ساتھ چھوڑ اُس کا جو اُس کا ساتھ چھوڑے اور حق کو اُس طرف گردش دے جس طرف وہ گردش کرے)

اس کے بعد اس روایت پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ حدیث صحیح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اور ترمذی، نسائی، احمد بن حنبل وغیرہ ایک جماعت نے اس کی تخریج کی ہے اور اس کے طرق و اسناد بہت زیادہ ہیں، چنانچہ ۱۶ صحابیوں نے اس کی روایت کی ہے اور احمد بن حنبل کی ایک روایت میں ہے کہ ۳۰ صحابیوں نے اس کے سننے کی گواہی دی ہے۔ اور اس کے اسناد اکثر صحیح و حسن ہیں[1]"

استیعاب ابن عبدالبر[2]، اسد الغابہ ابن اثیر جزری[3] میں متعدد مقام پر یہ روایت مذکور ہے، حافظ محب طبری نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:۔

"اس واقعہ کے بعد حضرت عمر، جناب علیؑ سے ملے اور کہا کہ مبارک ہو آپ کو کہ آپ ہو گئے ہر مومن و مومنہ کے مولا[4]۔"

* * *

اب رسولؐ کی زندگی صرف دو ماہ چند دن کی باقی رہ گئی ہے۔ اور مسلمانوں کی شب یلدا جب ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے گا، نزدیک ہے، آئیے واقعات کا ذرا جائزہ لے لیں۔ شاید رسول اللہؐ کے بیانات سے کوئی شمعِ ہدایت ایسی مل جائے جو تجلیاتِ نبویؐ کے اوجھل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے دلیلِ راہ بن سکے۔

گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شروع سے اخیر تک ہر موقع پر رسولؐ کے ساتھ مواسات و ہمدردی میں پیش پیش رہنے والا، کسی موقع پر قدم میں تزلزل نہ آنے دینے والا اور سخت سے سخت وقت میں اطاعتِ رسولؐ سے سرِ مُو

---

[1] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵۔ [2] مطبوعہ حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۴۷۳

[3] جلد ۵ صفحہ ۲۰۵ جلد ۳ صفحہ ۹۲، ۳۰۷، ۳۲۱۔ [4] ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۹

انحراف نہ کرنے والا کون تھا؟ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جناب امیرؑ کی اس اطاعت و جان نثاری کی بنا پر رسولؐ کی بارگاہ میں جو رسوخ ان کو حاصل تھا وہ دوسرے صحابہ کو گراں گزرتا تھا۔ اور وہ اپنے جذبات سے مجبور ہو کر شکوہ و شکایت بھی کر گزرتے تھے۔

مسجدِ نبویؐ میں صحابہ کے مکانوں کے جو دروازے کھلتے تھے ان کے بند کر دیے جانے کا واقعہ، طائف میں رسولؐ اور علیؑ کی رازدارانہ گفتگو کا حال، بریدہ کا واقعہ اور حجۃ الوداع سے قبل یمن سے واپسی کا واقعہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا اور رسالتمآبؐ کی طرف سے جناب امیرؑ کے خلاف اعتراض یا شکوہ کا جو جواب ملتا تھا وہ بھی آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نفسیات کے لحاظ سے یہ تمام واقعات اور زیادہ صحابہ کی برہمی کا باعث ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ رسالتمآبؐ کو احساس تھا کہ جب میری زندگی میں یہ ہو رہا ہے تو بعد میں خدا جانے کیا ہو۔ اُحد میں صرف اتنی سی افواہ پر کہ رسول اللہؐ قتل ہو گئے سب کے قدم میدان سے اُٹھ گئے اور زبانوں پر یہی تھا کہ پیغمبرؐ نہ رہے تو اسلام کیسا اور لڑائی کیسی۔ انسؓ بن نضر نے لوگوں سے پوچھا "تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو؟" جواب ملا کہ "رسولؐ تو ہیں نہیں پھر ہم کیا کریں"۔ انسؓ نے کہا۔ "رسولؐ نہیں تو نہ سہی تم اُن کے دین پر تو قائم ہو، اُٹھو اور جہاد کرو"۔ مگر بیٹھ رہنے والے بیٹھے ہی رہے اور انسؓ نے جان دی۔ قرآن مجید کی جو آیتیں اس موقع سے تعلق رکھتی ہیں غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:-

ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیه فلن یضر اللّٰه شیئًا

(محمدؐ نہیں ہیں مگر ایک رسولؐ، جن کے پہلے بہت رسول گزر چکے تو کیا وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم اسلام سے پلٹ جاؤ گے اور جو شخص ایسا کرے گا تو خدا کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا)

اس کے علاوہ رسالتمآبؐ نے اپنی بے اطمینانی کا جن الفاظ میں اظہار کیا وہ بھی گوش گذار ہو چکے ہیں۔ جب آپؐ نے شہدائے اُحد کے متعلق فرمایا کہ میں اُن کا گواہ ہوں تو حضرت ابوبکر نے کہا، کیا ہم نے کبھی ان کی طرح جہاد نہیں کیا؟ یہ سُن کر رسول اللہؐ نے فرمایا۔ "ہاں مگر کسے خبر ہے تم لوگ میرے بعد کیا کرو۔"

دوسرے موقعوں پر حضرت نے اس خطرہ کے وقوع کی صریح پیشین گوئی کی ہے بخاری کی حدیث ہے کہ:۔

> "آنحضرتؐ نے فرمایا: میں تم سے پہلے حوض کوثر پر پہنچوں گا، کچھ لوگ تم میں سے میری طرف لائے جائیں گے اور جب میں چاہوں گا کہ انھیں اپنے قریب بلاؤں تو وہ مجھ سے جدا کر دیے جائیں گے۔ میں کہوں گا خداوندا یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ ارشاد ہوگا تمھیں معلوم نہیں انھوں نے تمھارے بعد کیا گل کھلائے ہیں[1]۔"

آنحضرتؐ کو جن چیزوں کے متعلق یہ خطرہ تھا ان کو صاف طور پر حجۃ الوداع کے خطبہ میں ظاہر فرما دیا۔ جس کی اصل عبارت پہلے درج ہو چکی ہے۔ اس میں آنحضرتؐ نے اس تمہید کے ساتھ کہ انا فرطکم علی الحوض (میں حوض کوثر پر تمھارا پیش رو ہوں) یہ فرمایا ہے کہ میں تم میں دو چیزیں بہت گرانقدر چھوڑے جاتا ہوں، ایک کتاب خدا دوسرے اپنی عترت و اہل بیتؑ، دیکھوں میرے بعد تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ اسی طرح حضرتؐ نے اس پہلی بیعت کے موقعہ پر جو "انذر عشیرتک الاقربین" کا حکم نافذ ہونے پر لی گئی تھی، علیؑ کی وزارت و وصایت و خلافت کا اعلان فرما دیا تھا۔ پھر اس کے بعد مختلف طرح سے علیؑ کے کمالات کو روشن کیا، علمی حیثیت سے "انا مدینۃ العلم و علیٌ بابھا" فرما کر یہ ثابت کیا کہ میرے علوم اگر دستیاب ہو سکتے ہیں، تو

---

[1] بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۳۶۔

صرت علیؑ کے ذریعہ سے "اقضاکم علی" کہہ کر فصل مقدمات کا بہترین ماہر بتایا "علیؑ منی" کہہ کر انتہائی یگانگت و وابستگی کا اظہار فرمایا اور سب سے آخر میں غدیر خم کے میدان میں "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کہکر علیؑ کی حکومت ولایت و خلافت کا صریح اعلان فرمادیا۔ یہاں تک کہ صحابہ نے علیؑ کو مبارکباد بھی دی۔ لیکن کیا رسول اللہؐ کو اطمینان ہوگیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ واقعات تبلاتے ہیں کہ آپ مطمئن نہ ہوئے تھے۔

حضرت اس خطبہ کے بعد غدیر خم سے روانہ ہوکر مدینہ پہنچے محرم کے مہینہ بھر آپ اچھے رہے صفر میں بیمار پڑے اور اس بیماری میں مبتلا ہوئے جو آپ کیلئے مرض الموت ثابت ہوئی۔ حضرت نے اس بیماری کی حالت میں تقریر کی اور فرمایا:۔

ایھا الناس یوشک ان اقبض قبضا سریعا فینطلق بی وقد قدمت الیکم القول معذرۃ الیکم الا انی مخلف فیکم کتاب ربی وعترتی اھل بیتی (اے لوگو بہت قریب ہے وہ وقت کہ میں دنیا سے اُٹھ جاؤں اور تم سے رخصت ہوں۔ میں نے اس سے قبل تم سے سب کچھ کہدیا ہے اور حجت تمام کر دی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں تمھارے درمیان خدا کی کتاب اور اپنی عترت اہل بیتؑ کو چھوڑے جا رہا ہوں)

یہ کہہ کر حضرتؐ نے جناب امیرؑ کا ہاتھ پکڑا اور اُسے بلند کر کے فرمایا:۔

"ھذا علی مع القرآن والقرآن مع علی لا یفترقان حتی یردا علی الحوض فاسئلھما ما خلفت فیھما" (علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ، یہ دونوں جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پہ پہنچیں۔ میں ان سے دریافت کروں گا کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا)[1]

اب مرض کی شدت اور زیادہ بڑھ گئی۔ حضرتؐ نے اسی عالم میں ایک عَلَم اسامہ

---

[1] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷۔

بن زید کے لیے تیار کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ کو اسامہ کی ماتحتی میں جنگ کے لیے روانگی کا حکم دیا۔ تاریخیں متفق ہیں کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر بھی اسامہ کے ساتھ جانے پر مامور ہوئے تھے۔

لوگوں کو بڑا ناگوار ہوا کہ رسالتمآب نے اتنے بڑے بڑے صحابہ پر اسامہ بن زید کو حاکم بنا دیا۔ حضرتؐ کو معلوم ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور اسی حالت میں چادر اوڑھے، سر پر رومال باندھے باہر آ گئے اور منبر پر جا کر فرمایا:۔

> ”تم لوگ اسامہ کی امارت پر معترض ہو، یہ نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے تم اس کے باپ (زید بن حارثہ) کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو۔ بخدا وہ امارت کے لائق تھا۔ اور یہ اس کا بیٹا بھی امارت کے لائق ہے[1]“

بیشک ان اشخاص میں جو ساتھ جانے پر مامور تھے۔ حضرت علیؑ کا نام نظر نہیں آتا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں تصریح کر دی ہے کہ:۔

> ”حکم عالی چناں صادر شد کہ از اعیان مہاجر و انصار مثل ابوبکر صدیق و عمر فاروق و عثمان ذی النورین و سعد بن ابی وقاص و ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہم الا علیؑ مرتضیٰ را کہ ہمراہ نہ کرد دراں لشکر ہمراہ اسامہ باشند“

واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کو اپنی زندگی کے آخر ہونے کا یقین تھا وہ اپنی موت کی اطلاع رکھتے تھے اور اس کے لیے تیاریاں کر رہے تھے۔ اس موقعہ پر حضرتؐ کا خاص طور سے لشکرِ اسامہ کی روانگی کا حکم دینا اسی لیے تھا کہ وہ ان تمام لوگوں کے وجود سے مدینہ کو خالی کر دینا چاہتے تھے۔

اگر آپ کا منشا کسی حیثیت سے یہ ہوتا کہ آپ کے بعد امورِ خلق کی ذمہ داری ان اشخاص میں سے کسی کے سپرد ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے وقتِ آخر میں ان لوگوں کو

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۳۶۔ مواہب لدنیہ جلد ۱ ص ۱۷۹۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۷۱۔

لشکرِ اسامہ کے ساتھ جانے کی تاکید نہ فرماتے۔ حضرتؐ کو اس امر میں اتنا اہتمام تھا کہ شدتِ مرض میں جب آنکھ کھلتی تھی تو بار بار یہی تاکید فرماتے تھے کہ لشکر فوراً روانہ ہو جائے۔ لوگ رسولِ خداؐ کے اس منشاء کو سمجھتے تھے اور اسی لیے تعمیلِ حکم میں پس و پیش ہو رہا تھا۔ لیکن اسامہ کا لشکر نہ جانا تھا نہ گیا۔ اور گیا اس وقت جب رسول اللہؐ کی وفات ہو چکی اور خلافت کا مسئلہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

اب رسالتمآبؐ کا مرض انتہائی شدت تک پہنچ گیا ہے۔ مگر اب بھی اگر کوئی خیال آپؐ کو ہے تو صرف وہی ایک، کوئی اندیشہ ہے تو وہی ایک۔ ایک بار غش سے آنکھ کھلتی ہے تو فرماتے ہیں: "ذرا دوات و قلم منگواؤ، میں تمہارے لیے ایک نوشتہ چھوڑ جاؤں تاکہ میرے بعد تم گمراہی میں نہ مبتلا ہو۔" مگر حضرت عمر نے انکار کر دیا۔ فرمایا، کہ "پیغمبرؐ پر مرض کا غلبہ ہے اور ہم کو کتابِ خدا کافی ہے۔" صحیح بخاری میں متعدد روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت ابن عباس سے ہے کہ:-

> ابن عباس کہتے تھے، ہائے پنجشنبہ کا دن، تم جانتے ہو کہ پنجشنبہ کے دن کیا ہوا، رسالتمآبؐ پر مرض کی شدت ہوئی، حضرتؐ نے فرمایا، لاؤ میں تمھیں ایک نوشتہ تحریر کر دوں۔ تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو۔ لوگوں نے اختلاف شروع کیا اور کہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ذرا پھر پوچھو، لوگ آپ کے قریب گئے کہ پھر آپ سے دریافت کریں۔ حضرتؐ نے فرمایا "جاؤ چھوڑ دو مجھ کو، میں جس حال میں ہوں اسی حال میں رہنے دو[1]"

دوسری روایت یہ ہے کہ:-

> جب رسالتمآبؐ کا آخر وقت تھا، اس وقت گھر میں بہت سے آدمی موجود تھے۔ حضرتؐ نے فرمایا، "آؤ میں تمھیں ایک نوشتہ تحریر

---

[1] بخاری مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۵۸

کردوں تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو۔" ان میں سے بعض نے کہا کہ حضرتؐ پر مرض کا غلبہ ہے اور تمھارے پاس قرآن تو موجود ہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو لوگ گھر میں موجود تھے ان میں اختلاف شروع ہوگیا، کچھ لوگ کہتے تھے قلم دوات دے دو، کچھ اس کے مخالف تھے، جب بہت شور ہوا تو حضرتؐ نے فرمایا کہ اُٹھ جاؤ میرے پاس سے۔"

ان دونوں روایتوں میں اختلاف کرنے والوں کا نام درج نہیں ہے۔ لیکن تیسری روایت سے یہ ابہام بھی دور ہو جاتا ہے اور اس میں صاف صاف تحریر ہے کہ مخالفت کرنے والے حضرت عمر تھے (ملاحظہ ہو بخاری، باب قول المریض قوموا عنی[1])

* * *

رسالت مآبؐ کو اس واقعہ سے جتنا صدمہ بھی پہنچا ہو، کم ہے، چنانچہ اسی صدمہ کا نتیجہ تھا کہ آپؐ نے برہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیا لیکن اس منظر کی ایک آخری کڑی اور ہے جو دیکھنے کے قابل ہے اس داستان کا ایک ٹکڑا اور ہے جو سننے کے قابل ہے اور یہ کسی اور کے منہ کی بات نہیں ہے۔ بلکہ خود جناب عائشہ کا بیان ہے:۔

قالت قال رسول الله	حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ
لما حضرته الوفاة ادعوا	جب حضرت کا بالکل وقت آخر تھا
الی حبیبی فدعوا له ابابکر	تو آپ نے فرمایا بلاؤ میرے حبیب
فنظر الیه ثم وضع راسه	کو، کوئی جا کر حضرت ابوبکر کو بلا لیا
ثم قال ادعوا الی حبیبی	آپ نے تکیہ سے سر اٹھا کر دیکھا

---

[1] بخاری جلد ۴ ص ۵

فدعواله عمر فنظر الیه ثم
وضع راسه ثم قال ادعوالی
حبیبی فدعواله علیا فلما
رآه ادخله معه فی الثوب
الذی کان علیه فلم یزل
یحتضنه حتی قبض ویده
علیه اخرجه الرازی۔

اور پھر تکیہ پر سر رکھ دیا۔ دوبارہ فرمایا بلاؤ میرے حبیب کو، اب جاکر حضرت عمرؓ کو بلا لائے۔ آپ نے ان کو بھی دیکھ کر تکیہ پر سر رکھ لیا، تیسری مرتبہ پھر آپؐ نے فرمایا، کسی نے علیؑ کو بلا لیا۔ جب آپؐ نے علیؑ کو دیکھا تو انھیں اپنی چادر میں لے لیا، جس کو آپؐ اوڑھے ہوئے تھے، اور برابر اسی طرح لیٹے رہے۔ یہاں تک کہ حضرتؐ کی روح مبارک نے جسم سے پرواز کی تو آپؐ کا ہاتھ علیؑ کے اوپر تھا۔[1]

* * *

---

[1] ریاض نضرہ مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۸۰

مسئلہ خلافت و امامت

بزمی

مسئلہ خلافت و امامت[1]

"نگار" مارچ ۳۵ء کی اشاعت میں "خلافت و امامت" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کو کسی ہندو اہل قلم جناب "ہرنام" کی کاوش دماغی کا نتیجہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس طرح سے دیکھنے والے پر بظاہر یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک بے تعلق غیر مسلم کے خیالات ہونے کی بنا پر بحث میں غیر جانبداری کے ساتھ خالص تحقیقی نقطۂ نگاہ کو پیش نظر رکھا گیا ہوگا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محترم موصوف باوجود ہندو ہونے کے "شیعیت" کے ساتھ جذباتی ہمدردی رکھتے ہیں، اور اس لحاظ سے گو بظاہر اُن کا اسم گرامی "ہرنام" ہے لیکن شاید وہ اپنے اس مضمون میں اس حقیقت کو چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکے کہ دل کی گہرائیوں سے وہ حضرت علیؓ کی امامت کو ایک مذہبی کے تمام جذباتی رنگ کیساتھ تسلیم کر چکے ہیں۔ تحریر کا رنگ قدم قدم پر ان کی اس شکست پر غمازی کرتا ہے۔ بالخصوص جہاں ان کا "دل تھراتا ہے، قلم لرزتا ہے، جی چاہتا ہے مورخوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں، کس طرح دیکھیں اور کیونکر لکھیں کہ کس کس نے فرار کیا۔" (صفحہ ۱۴) بہرحال جو کچھ بھی ہو اُن کی تحقیقی کاوش کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس مبحث پر قلم اٹھاتے وقت موصوف نے واقعات پر فلسفۂ تاریخ" کی روشنی میں نفسیاتی

---

[1] "نگار" جولائی ۱۹۳۵ء

اعتبار سے کوئی نظر نہیں ڈالی نیز فلسفۂ نبوت" اور عام اخلاق انسانی کے فلسفہ کے پہلو سے بھی اس سوال پر تفصیلی غور نہیں فرمایا۔ ممکن ہے کہ میری یہ حقیر کوشش کسی حد تک حقیقت کے چہرہ کو بے نقاب کرنے میں مدد دے۔

افسوس ہے کہ میں یہاں تفصیل کے ساتھ مقالہ نگار کے استدلال کے ہر ہر جزو پر نظر نہیں ڈال سکتا۔ میں جو کچھ کروں گا وہ ایک ایسے مورخ کے اجمالی تبصرہ کے مترادف ہوگا جو واقعات کو منطقی علل و اسناد کے ساتھ ساتھ دُنیا کے عملی فلسفہ کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ بہرحال میں مسلمان ہوں اور پھر اہل سنّت اس لیے میں حتی الوسع کوشش ضرور کروں گا کہ اپنی تحریر میں جذباتی رنگ نہ آنے دوں۔ لیکن پھر بھی کسی بے راہ روی کا پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔

"بزمی"

فلسفہ کے تمام عمیق مسائل طے ہو سکتے ہیں، ریاضی کے دقیق سے دقیق نظریے حل کیے جا سکتے ہیں، نظامِ بطلیموسی کی جگہ نظامِ فیثا غورث لے سکتا ہے۔ نیوٹن کے نظریہ کشش کو انیشٹن بدل کر رکھ سکتا ہے، لیکن اگر بلند نظری اور بے لوث تحقیقی نگاہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی اعراض کر لیا جائے تو نہ یہ مسائل طے ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو برس گزر جانے کے باوجود خلافت و امامت کا مسئلہ سلجھ سکتا ہے:

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نبی کریمؐ کی سب سے بڑی حیثیت ایک اخلاقی مؤدب کی حیثیت ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں لیے جا سکتے کہ آپ کی اس حیثیت سے "سیاستِ ملکی" خارج ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں عام طور پر اخلاقی درس دینے والے مصلحین کی زندگی میں سیاست بہت کم داخل ہوتی ہے لیکن رسول عربیؐ کا مسئلہ ان سب سے جدا ہے۔ آپ کی تعلیم کا کوئی جزو اس وقت تک حقیقی معنی میں مکمل نہیں ہو سکتا جب تک حکومت و سیاست کی اعانت اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔

پھر یہ کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جس کو اہل سنت مسلمان تعصب کی بنا پر کہتے ہوں۔ بلکہ یورپ کے بے تعلق مستشرقین بھی متفقہ طور پر اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔ اگر گولڈزیہر فان کریمر، نولڈکی، دی ساسی، کاترمیر، نکلسن اور براؤن جیسے مسلمہ فاضل مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو قدم قدم پر اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ محمدؐ کی تعلیمات میں "چرچ" اور "اسٹیٹ" دو جدا جدا چیزیں نہیں ہیں۔

غور کیجئے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیا جائے کہ نبی کریمؐ سیاست سے بالکل علیحدہ رہ کر اخلاقی تعلیم دینا چاہتے تھے تو پھر قرآن و حدیث کی اُن سینکڑوں ہدایات کی کیا تاویل کی جائے گی جن میں خالص سیاسی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً جزیہ، ذمی، حربی، جہاد، حدِ زنا، سرقہ وغیرہ وغیرہ۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا۔ (سورۃ المائدہ آیۃ ۳) کی آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ اگر نبی کریمؐ کے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کے پروگرام میں حکومت و سیاست داخل نہ ہوتی تو اس آیت میں "الیوم" کا مفہوم ہی کچھ باقی نہ رہتا۔ اس لیے کہ اگر فتح مکہ کے بعد سے نبی کریمؐ کی سیاسی حیثیت کا مسلّم ہو جانا آپ کے "درس" کی تکمیل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تو پھر "الیوم" کا لفظ بھی کچھ زیادہ بامعنی نہیں رہتا۔

پھر اخلاقی اور معاشرتی اصلاح (سوشل ریفارم) کو سیاست کے ساتھ ساتھ رکھنے کا نظریہ کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کو عقل باور نہ کر سکے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا مصلح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ معاشرتی اصلاح اس وقت تک ناممکن ہے۔ جب تک ملکی سیاست کے اربابِ حل و عقد اس میں دستگیر و معاون نہ ہوں۔ گاندھی ہندوستان کا بلندترین سیاسی رہبر سمجھا جاتا ہے لیکن وہ ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ اس حقیقت کو تقریروں اور تحریروں میں آشکارا کر چکا ہے کہ میرا حقیقی مشن معاشرتی اصلاح ہے۔ لیکن وہ اس وقت تک

حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہ ہو۔

حقیقتاً وہ لوگ اسلام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے جو یہ کہتے ہیں کہ اس کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام صرف ریاضت کرنے یا گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے کا ایک نظام نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ ایک ایسا عملی پروگرام ہے جو انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں صحیح مسلک پر کاربند رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کا صحیح حصول اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملکی نظام پر صحیح معنی میں پورا پورا اختیار نہ ہو۔

پھر اگر یہ باور بھی کر لیا جائے کہ نبی کریمؐ کا مقصد سیاست سے بالکل علیحدہ تھا اور یہ بعد کی بدعت ہے تو پھر وہ جماعت جو حضرت علیؓ کو نبی کریمؐ کا صحیح جانشین قرار دیتی ہے اس کا کیا جواب دے گی کہ خود حضرت علیؓ نے بھی مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ بلکہ اس کے علی الرغم اپنی سیاسی اہمیت کے قیام و بقا کے لیے جنگ جمل میں صف آرائی کی طلحہ و زبیر کو قتل کرایا۔ معاویہ کے مقابلہ کے لیے میدان صفین میں پڑاؤ ڈالا اور پھر نہروان میں تقریباً تین ہزار[1] کلمہ گو اہلِ عرب کو تہ تیغ کرایا میں پوچھتا ہوں کہ ان تمام مقتولین کے خلاف اگر "بغاوت" کا الزام نہ تھا جو خالص سیاسی الزام ہے تو پھر حضرت علیؓ کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، اگر ان کی حیثیت ایک "بڑے پیر" سے زیادہ نہ تھی تو آج کل کے مجتہد کی طرح انھوں نے ان مواقع پر صرف خاموشی کا اظہار کیوں نہ کیا۔ یا زیادہ سے زیادہ اُن سے اپنی برأت کا اعلان کر کے خاموش کیوں نہ ہو گئے۔

بہرحال خلافت و امامت کے مسئلہ میں اگر بے تعصبی کے ساتھ ذرا سے غور سے بھی کام لیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ نبی کریمؐ کا صحیح جانشین

---

[1] ملاحظہ ہو الکامل للمبرد۔ مطبوعہ مصر جلد سوم ص۱۰۵۔ فان کریمر وغیرہ مستشرقین یورپ نے اس کتاب کو حضرت علیؓ کی خلافت کے واقعات میں نہایت ہی مستند مرتبہ دیا ہے۔

وہی ہوسکتا ہے جو ایک طرف تو اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو اور دوسری طرف سیاسی حل وعقد میں دنیا کا مہذب ترین فرماں روا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں حیثیتوں کے اعتبار سے صحابۂ کرام کے گروہ میں سے نبی کریمؐ کا صحیح جانشین کون ہوسکتا تھا، اگرچہ دنیا کا عام اصول تو یہ ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے، اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے اور اس لیے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی اہلیت میں تو کوئی شک ہونا ہی نہ چاہیئے۔ جبکہ دنیا کا ہر بلند نظر مورخ ان حضرات کی اخلاقی پاکیزگی، سیاسی بلند نظری اور عام معاشرتی رفعت و برتری کا بھی قائل ہے۔

لیکن یہاں پہنچ کر ہم کو جس پُرخار وادی میں داخل ہونا پڑتا ہے وہ یہ ہے "کیا نبی کریمؐ حضرت علیؓ کو اپنے بعد اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے"؟

حضرت علیؓ ایک متقی، زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ آپ کے چچیرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپ کے رفیق ومعاون رہے۔ بعد میں داماد بھی بن چکے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ نبی کریمؐ نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر آپ کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ لیکن اگر ان اوصافی الفاظ کی منطقی اور لغوی تحلیل سے یہ نتیجہ نکالا جائے، کہ نبی کریمؐ آپ کو اپنا جانشین بنانے کے خواہشمند تھے۔ تو منصب نبوت کو سمجھنے میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بنیادی غلطی نہیں ہوسکتی۔ غور تو کیجیے جس شخص کو محمد عربی کے الہامی نبی ہونے پر ایمان ہو وہ یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر فی الواقع آپ الہامی طور پر حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے تھے۔ تو پھر آپ نے علیٰ رؤس الاشہاد اس کا اعلان کیوں نہ فرمایا؟ جو بے خوف اور نڈر پیغمبرؐ اپنے عزم وثبات کے مقابلہ میں ساری دنیا کو چیلنج دے سکتا ہے، اُن کے بت خانوں کو چکنا چور کر سکتا ہے، شراب کے قرابوں کو تڑوا کر پھنکوا سکتا ہے۔ اہلِ عرب کے نسبی فخر کو پاؤں کے نیچے کچل سکتا ہے، کیا اس کی اس

اخلاقی کمزوری کا کسی حیثیت سے بھی اعتراف کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ محض چند لوگوں کے ڈر سے اپنے جانشین کا اعلان کرتے ہوئے ڈرتا ہے؟ ہر وہ شخص جس کو الہام اور وحی پر ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح عقیدہ ہو وہ یہ باور نہیں کرسکتا کہ دنیا دارانہ مصلحتوں کے ماتحت ایک عظیم المرتبت نبیؐ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک "خلافت" جیسی عظیم حقیقت کے اظہار سے جان چُراتا رہے؟

علاوہ ازیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نبی کریمؐ قدم قدم پر اشارۃً اور بالواسطہ طور پر حضرت علیؑ کو اپنا قائم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے تو اس سے رسولؐ کی پوزیشن جس درجہ نازک ہوجاتی ہے وہ زیادہ توضیح کی محتاج نہیں ہے۔

اگر ابوبکر اور عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتۂ قرابت و عزیزداری کے صرف اس لیے رسولؐ پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا رہنما ہے اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسولؐ کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان لختِ جگر صاحبزادیوں کو اس کے حبالۂ ازدواج میں دے دیتے ہیں۔ اس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اس کے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لُٹا دیتے ہیں ــــ غرضیکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ رسولؐ کی بارگاہ میں صرف اس لیے نظروں سے گرے ہوئے ہیں کہ ان کے مقابلے میں رسولؐ کا چچیرا بھائی اور اس کا داماد ہے ــــ تو پھر اس کا نام متعصبانہ اعزہ پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بیرحمانہ جانبداری" اور "غیر منصفانہ پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟

لیکن تاریخ اسلامی کا ہر اسٹوڈنٹ جانتا ہے کہ نبی کریمؐ کی ذاتِ گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے۔

اب ہم بحث کے اُس رُخ کی طرف آتے ہیں جہاں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ "حضرت

علیؑ تمام صحابہ سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے" اس حقیقت کو بے لوث تحقیقی نگاہ سے جانچنے کے لیے ایک بہترین طریقہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مستشرقین یورپ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم یہاں صرف نکلسن کے الفاظ کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو تقریباً تمام ذی رتبہ مستشرقین کی آراء کی طرف سے نمائندگی کر سکتے ہیں:۔

"حضرت علیؑ میں ایک حکمران ہونے کے علاوہ اور تمام صفات موجود تھیں"[1]

اس کے بعد ہمارے سامنے جو چیز ابوبکر و عمر کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کے شرف و فضیلت کا صحیح معیار پیش کرسکتی ہے وہ ان دونوں کے عہدِ خلافت کا مقابلہ ہے۔

خلفاء کی زندگی کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کُن جواب ہونا چاہیئے تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقابلہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے۔ اس لیے "مویدینِ امامت" نے اس میدان میں اپنی شکست کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنی رزمگاہ کے دو اور میدان تلاش کیے ہیں۔ یعنی ایک تو یہی کہ آیا خلافت کے مفہوم میں سیاست داخل ہے یا نہیں اور دوسرے یہ کہ نبی کریمؐ کے اقوال سے حضرت علیؑ کی بے انتہا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ پہلے مسئلہ پر ایک اجمالی تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس لیے اب ہمارے سامنے صرف دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ خود نبیٔ کریم کے اقوال سے حضرت عمر و ابوبکر کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کی کیا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں "مویدینِ امامت" انا مدینۃ العلم وعلیٌ بابھا کی حدیث کو نہایت شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عمر کے متعلق صحیح بخاری کی ان احادیث کو ملاحظہ فرمایا جائے:۔

> رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں میرے سامنے کچھ لوگ پیش کیے گئے جو کُرتے پہنے ہوئے تھے ان میں سے کسی کا کُرتہ سینہ تک تھا کسی کا اس کے نیچے۔ پھر عمر میرے سامنے لائے گئے

---

[1] لٹریری ہسٹری آف عرب مصنفہ نکلسن صفحہ ۱۹۱

اُن کا کُرتہ اتنا لمبا تھا کہ اس کا دامن زمین پر گھسٹتا جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا "اس کی تعبیر؟" آپؐ نے فرمایا "عمر کی دین داری"[1]

اسی قسم کی ایک دوسری حدیث ہے جس میں آپؐ نے خواب میں ایک گلاس سے کچھ دودھ پیا اور باقی حضرت عمر کو دے دیا۔ اور لوگوں کو اس کی تعبیر "علم" بتائی۔[2]

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ گزر چکے ہیں جو اگرچہ پیغمبر نہ تھے لیکن ان پر خدا کی جانب سے الہام ہوتا تھا۔ اگر میری امت میں سے کسی شخص کو یہ مرتبہ حاصل ہے تو وہ عمر ہیں"[3]

حضرت ابن عباس سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر کی وفات کے وقت حضرت علیؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ "مجھے یقین تھا کہ خدا تجھ کو تیرے دونوں ساتھیوں (رسول کریم و ابوبکر صدیق) کے ساتھ رکھے گا۔ کیونکہ میں نے اکثر نبی کریم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے "کنت انا و ابوبکر و عمر، وفعلت انا و ابوبکر و عمر، و انطلقت انا و ابوبکر و عمر"[4]

ممکن ہے کہ پہلی حدیث کو محض اس لیے زیادہ قابلِ وثوق نہ سمجھا جائے کہ وہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، لیکن دوسری حدیث کے رواۃ کو تو یقیناً اس سے بلند ہونا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں بخاری کی وہ حدیث بھی قابلِ تذکرہ ہے جس میں رسول کریمؐ سے ایک عورت نے پوچھا ہے۔ "آپؐ کے بعد میں مسائل کس سے پوچھوں گی" آپؐ نے فرمایا، "ابوبکر سے"

ایک موقعہ پر رسول کریمؐ نے حضرت علیؓ کے متعلق یہ فرمایا تھا۔ "علیؓ دنیا اور آخرت میں میرا بھائی ہے" اس سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ نبی کریمؐ اس طرح آپ کو اپنا جانشین بنا رہے تھے۔ حضرت علیؓ واقعۃً آپؐ کے بھائی تھے اور اس لیے یہ بالکل ایسا ہی ہے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان

[2] صحیح بخاری، کتاب العلم

[3] صحیح بخاری کتاب فضائل اصحاب النبیؐ

[4] صحیح بخاری کتاب فضائل اصحاب النبیؐ۔

جیسے آپ کہتے "آمنہؓ دنیا اور آخرت میں میری ماں ہیں"۔ یا "عبداللہؓ دنیا اور آخرت میں میرے باپ ہیں"۔

حضرت ابوبکر کی جان نثارانہ اور فداکارانہ جذبہ کی ایک بہت بڑی مثال ان کا وہ کارنامہ ہے جس کے متعلق قرآن میں مذکور ہے :-

" ثانی اثنین اذھما فی الغار یقول لصاحبہ لاتحزن ان اللہ معنا"

یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر کج بحثی کے ساتھ تاویل بعید کو کام میں نہ لایا جائے تو اس کے معنی میں کوئی اشکال نہیں۔ یہی وجہ ہے، کہ "خدابخش لائبریری پٹنہ" میں قرآن کا ایک قلمی نسخہ ہے جس پر گو کاتب کا نام درج نہیں ہے لیکن کسی شیعہ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس میں دو سورتیں زیادہ ہیں جن میں سے ایک کا نام "نورین" ہے اور دوسری کا نام "ولایت" نیز ۳۳ آیات بھی حسب ضرورت بڑھادی گئی ہیں۔ ان سورتوں اور آیات کو قرآن میں بڑھا دینے کے بعد "مصنف" نے شیعیت کے تمام مشتبہ مسائل کو قرآن میں داخل کر دیا ہے اور اس اضافہ کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ چونکہ قرآن کے یہ حصے اہل تشیع کی صریح حمایت میں تھے اس لیے اہل سنّت نے ان کو اصل قرآن سے نکال دیا (نعوذ باللہ) بہرحال اس قرآن میں مذکورہ بالا آیت کے مفہوم کو حضرت ابوبکر کی مذمت میں تبدیل کرنے کی خاطر اس طرح لکھا گیا ہے :-

" یقول لصاحبہ ویحک لاتحزن ان اللہ معنا"

ڈوبتا آدمی تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات حضرت علیؓ کی امامت کو ثابت کرنے کے لیے اُن کے سابق الاسلام ہونے کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اوّل تو یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ تاہم اگر مختلف مستند اقوال کو یکجا جمع کرنے سے کوئی یقینی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ نوجوانوں میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔ بہرحال اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ آپ سب سے پہلے ہی اسلام لائے

تب بھی یہ امر اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ محض اس کی وجہ سے آپ کو دیگر تمام صحابہ سے افضل قرار دے دیا جائے۔ اس لیے کہ گو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام لانے کے وقت آپ کی عمر کیا تھی لیکن جس روایت میں سب سے زیادہ عمر بتائی گئی ہے وہ سولہ برس ہے اگر اسی روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ عمر وہ ہے جب انسان میں عقل و شعور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عمر میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے۔ اور بہت جلد نئی باتوں پر یقین کر لیتا ہے۔ اور اس لیے اگرچہ حضرت علیؓ کی مذہبی رفعت شان اور جلالت و مرتبت میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا لیکن مقابلتاً ان کے اسلام کو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ جیسے پختہ کار شرفائے قریش کے اسلام کے مقابلہ میں زیادہ قابل اہمیت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ دوسرا سبب جس کی بنا پر ان کی یہ مسابقت فی الاسلام مقابلتاً اتنی اہم نہیں رہتی جتنی بیان کی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ رسول کریمؐ کے چچیرے بھائی تھے اور اس لیے ظاہر ہے کہ ان کی اس "مسابقت ایمانی" میں قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے "وصول الی الحق" کا وہ بے لوث جذبہ کارفرما نہیں ہو سکتا جو ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے غیر متعلق اشخاص میں پایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں رسولؐ کے بھائی ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر رسولؐ کا پیغام سب سے پہلے آپ کے کانوں تک پہنچا ہوگا۔ پھر اس کو حسن اتفاق کی مثال کہیں تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ فخر البتہ یہ ہے کہ رسولؐ کا پیغام سنتے ہی فوراً "آمنا" کہہ دیا جائے۔ حقیقتاً حضرت علیؓ کو یہ فخر پہنچتا ہے لیکن اس میں حضرت ابوبکرؓ بھی برابر کے شریک ہیں۔

ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریمؐ نے اپنے اعزا کے سامنے اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علیؓ کے متعلق کہا تھا:-

اِنَّ ھٰذا اخی ووصیّی وخلیفتی فیکم۔

لیکن اس سے خلافتِ علیؓ پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا۔

اس وقت رسولِ کریمؐ کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار "لیڈر" سے زیادہ نہ تھی اور اس لیے ان جملوں سے اس موقعہ کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جا سکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت علیؓ کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو اس حالت میں نبیؐ کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے۔

پھر جو طبقہ حضرت علیؓ کی الوہی امامت کا قائل ہے وہ اسی طرح حضرت حسنؓ کی الوہی امامت کو بھی مانتا ہے اگر اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ امام حسنؓ کے اس "انتقام" کو سامنے رکھتے ہوئے جو آپ نے حضرت علیؓ کے قاتل ابن ملجم سے لیا، ان کی اخلاقی فضیلت کا کیا معیار قائم کیا جائے گا[1]۔

میں اس سلسلہ میں زیادہ تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا، لیکن اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ "شیعیت" کی جانب سے حضرت علیؓ کی الہامی امامت کو ثابت کرنے کے لیے جتنے دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ وہ حقیقتاً اسلام کے بنیادی اصول سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے۔ اس جھگڑے کا آغاز محض بعض مقامی پیچیدگیوں سے ہوا تھا جن کو اس وقت کامیاب بنانے کی خاطر مذہبی رنگ دیا گیا اور جن کو اب غلطی سے مستقل مذہبی عقائد میں داخل کر لیا گیا ہے۔

عربوں کی فطری خاندانی عصبیت کے ماتحت نبی کریمؐ کی وفات کے بعد بنو ہاشم کے ہر فرد نے اپنے موروثی جذبہ کے ماتحت اپنے خاندان کے ایک ممتاز فرد کو خلافت کا مستحق سمجھا اور اس کے لیے انھوں نے حضرت علیؓ کا نام پیش کیا۔ اس میں ان کو ناکامی ہوئی پھر خلافتِ راشدہ کے ختم ہوتے ہی بدقسمتی سے حضرت معاویہ نے جس سلطنت کی بنیادیں دمشق میں استوار کیں وہ خالص "بدوانہ" ذہنیت رکھتی تھی۔

ایران ہمیشہ سے ایک بلند اور مہذب حکومت رہی ہے جنھوں نے ہمیشہ عربوں کو

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الکامل للمبرد جلد ۳ طبع مصر صفحہ ۱۱۶

اپنے سے فروتر سمجھا ہے۔ لیکن جب اسلامی فتوحات نے ایران کو دمشق کے پایۂ تخت سے متعلق کر دیا، تو اہلِ ایران کی غیرت قومی اور حمیتِ ملی کے لیے یہ چیز سخت ناقابلِ برداشت تھی کہ وہ عربوں کے جور و استبداد کے سامنے اپنی گردنوں کو خم ہوتا دیکھیں[1] گو وہ زمانہ کی ناسازگاری کے ہاتھوں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس نہیں لے سکتے تھے لیکن اپنے جذبات کے ماتحت عربوں سے انتقام لینے کے معمولی سے معمولی موقعہ کے منتظر تھے۔ اسلام نے خلافت کے مسئلہ میں جس بلند معیار کو قائم کر دیا تھا وہ اگر چالیسویں ہجری میں حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد معاویہ کے بے رحم ہاتھوں سے تباہ نہ ہو چکا ہوتا۔ تو وہ وقت کی ضروریات کے ماتحت مختلف ارتقائی دوروں سے گزرنے کے بعد آج دنیا کی اعلےٰ سے اعلیٰ جمہوریت کے لیے بھی قابلِ رشک ہوتا، لیکن خلافت کے مسئلہ میں اس "انتخابی نظام" سے دنیا قریب قریب ناواقف تھی۔ ایران میں "وراثت" کا قانون نافذ تھا۔ انھوں نے عربوں سے بدلہ لینے کا بہت اچھا موقعہ دیکھا، کہ حضرت علیؑ کی خلافتِ الٰہیہ کی آڑ میں خاندان امویہ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیں۔ چنانچہ بالآخر ۹ جون ۷۴۷ء کی صبح کو خراسان کے ایک گوشہ سے ابو مسلم نے عباسیوں کا سیاہ جھنڈا بلند کر دیا اور گو عباسیوں کے دورِ حکومت میں ایران پوری طرح مطمئن نہ ہو سکا۔ لیکن جب چنگیز خاں کے حملہ کے بعد ایران میں ایک مستقل خودمختار حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تو ایرانیوں کو دل کے پھپھولے پھوڑنے کا کافی موقعہ ملا۔ چنانچہ خاندانِ صفویہ اٹھا اور اس نے صحیح معنوں میں عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ سارے

---

[1] اس سلسلہ میں فردوسی کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے، جو بتلاتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود جب قومی اور ملی جذبہ کے ماتحت وہ ایرانیوں کے مقابلہ میں عربوں کا ذکر کرتا ہے تو کتنا "پُر شور" نظر آتا ہے:۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

ملک کو نوکِ شمشیر شیعیت کے رنگ میں رنگ دیا۔

یہی حال عبد اللہ ابن میمون القداح کی اس عظیم الشان تاریخی سازش کا ہے جس کے بعد مصر میں تقریباً دو سو برس تک بنو فاطمہ کے جھنڈوں کے نیچے شیعیت پرورش پاتی رہی۔[1]

المختصر ان واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت محتاجِ تشریح نہیں رہتی کہ خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخورِ اعتنا کہا جا سکے۔ اور نہ "شیعیت" اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ۔ فقط۔

سیّد ابو سعید بزمی بھوپالی

ایم۔ اے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسلم تھیالوجی مصنفہ میکڈانلڈ۔

مسئلۂ خلافت

سرنام

مسئلہ خلافت

مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ میرے اُس خالص سلجھے ہوئے مضمون کے جواب میں جو "خلافت و امامت" کے عنوان سے "نگار" میں شائع ہوا تھا، مضمون نگار اصحاب میری "شخصیت" کے متعلق بھی زورِ قلم ضرور صرف کریں گے۔

کوئی کچھ سمجھے، مجھے واقعی ہندو سمجھے اور یہ باور کرے کہ مجھے صرف بعض شیعہ احباب کی صحبت اور مطالعۂ کتب سے شیعی مذہب کے متعلق معلومات حاصل ہوئے۔ اور میں نے محض ذوقِ تحقیق کی بنا پر کتابوں میں اس کے بارے میں چھان بین کی اور غیر جانبدارانہ تصفیہ کی کوشش کی یا یہی خیال کرلے کہ میں شیعہ ہوں۔ اس کا اصل حقیقت مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بے شک یہ اندازہ کرکے مجھے افسوس ہوا کہ مسلمانوں میں اب ذوقِ تحقیق اتنا کم ہوگیا ہے اور نظریں سطحی پہلوؤں کو دیکھنے کی اتنی عادی ہوگئی ہیں کہ باوجود ملک کے اخباروں اور رسالوں میں میرے مضمون کے متعلق غلغلہ بلند ہو جانے کے کوئی ایک مضمون بھی ایسا شائع نہیں ہوا جس میں میرے مضمون کے تمام جزئیات پر نظر ڈال کر تحقیقی حیثیت سے ان کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہوتی۔

"نگار" مارچ ۳۵ء میں میرا مضمون شائع ہوا۔ اس کے پورے چار مہینے کے بعد جولائی کے پرچہ میں میرے نادیدہ کرمفرما سیّد ابوسعید بزمی صاحب بھوپالی ایم اے

کا مضمون شائع ہوا جس کے ذیل میں حضرت مدیر "نگار" کا یہ نوٹ قابلِ لحاظ تھا کہ "ہر نام کے مضمون کا جواب متعدد حضرات نے بھیجا ہے، ان موصولہ مضامین میں سے ہم سب سے پہلے بزمی ایم۔ اے کا مضمون شائع کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اور مضامین بھی شائع کریں گے۔

اس کے بعد قدرتاً مجھے انتظار پیدا ہونا چاہیئے تھا، اور یقیناً جواب الجواب کے لیے مجھے اس وقت تک قلم اٹھانے کا حق نہیں تھا۔ جب تک میرے مخالف مضامین کا سلسلہ ختم نہ ہو۔

لیکن افسوس ہے کہ اس کے بعد نگار کے دو پرچے نکلے اور وہ بالکل اس بحث سے خالی ہیں۔ جناب نیاز کی وسیع الخیالی سے یہ یقین ہوتا ہے۔ کہ اگر دوسرے مضامین ان کے معیارِ ذوق کے مطابق ہوتے تو وہ ضرور شائع کرتے بہرحال اب میرا محورِ نظر صرف جناب بزمی کا مضمون ہے اس لیے کہ نگار کے بساطِ بحث پر سوائے اس کے کوئی نہیں آیا ہے۔

پہلی بات جسے محلِ بحث قرار دیا گیا ہے۔ اسلام میں "تعلیم اخلاق" اور سیاستِ ملکی" کا باہمی تعلق ہے۔ نہ جانے میرے کس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ میں پیغمبر اسلامؐ کی زندگی سے "سیاست ملک" کو بالکل علیحدہ کر دینا چاہتا ہوں یا میں اسلام کو صرف ریاضت کرنے اور گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے کا ایک نظام قرار دینا چاہتا ہوں۔"

میرے الفاظ غور سے دیکھے نہیں گئے کہ "اگر رسولؐ کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلمِ روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی۔ تو ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی۔

اس "صرف" اور "بھی" کے نظر انداز کر دینے سے نقاد کے قلم کو دو صفحے نذرِ تحریر

کرنا پڑے۔ یورپ کے مستشرقین خانۂ شہادت میں الگ بلا لیے گئے۔ جزیہ، ذمی، حربی، جہاد حدِ زنا وغیرہ کے ہدایات قرآنی کی دستاویزیں الگ پیش کر دی گئیں۔ اور اخلاق و سیاست کے باہمی ارتباط کی عقلی بحث الگ چھیڑ دی گئی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شیعہ اصحاب بھی ان دونوں کو الگ الگ نہیں سمجھتے ہیں یعنی امامت کے حقوق کو صرف تعلیمِ اخلاق اور روحانی تربیت میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ سلطنت کو اس کا لازمی جزو سمجھتے ہیں اور نہ انھیں خلفائے بنی امیہ و بنی عباس وغیرہ سے یہ شکایت کیوں پیدا ہوتی کہ اُنھوں نے صاحبانِ حقوق کے حق پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ کیونکہ وہ چیز جس پر قبضہ کیا گیا سلطنت تھی۔ رہ گئی تعلیمِ روحانی اور ہدایتِ باطنی وہ کسی کے غصب کرنے کی چیز نہیں اور نہ اس پر کوئی ناجائز قبضہ کر سکتا ہے۔

⁂

لیکن اس کے ساتھ پھر بھی جہاں تک میں نے تاریخ اسلامی اور فلسفۂ احکامِ اسلام کا مطالعہ کیا ہے میں اپنے ان الفاظ کا اعادہ کروں گا کہ آنحضرتؐ کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی نہ تھی۔ آپ کا نصب العین کسی سلطنت کی بنیاد رکھنا نہیں تھا۔ بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو۔ بظاہر یہی الفاظ شش و پنج میں ڈالنے والے ہیں تو سنیئے۔

"دنیاوی بادشاہت" میں اسے سمجھتا ہوں کہ جس کا مقصد اصلی صرف مادی اقتدار کا بڑھانا آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کرنا اور حدودِ مملکت کا وسیع کرنا، کمزور اقوام کو مغلوب کرنا اور اپنی طاقت کا سکہ بٹھانا، مال و دولت سے سرکاری خزانہ کو بھرنا اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔

اس بادشاہت کی پوری کامیابی کا معیار صرف سطوت و اقتدار کی زیادتی توسیع حدودِ سلطنت اور جاہ و حشمت کی فراوانی میں منحصر ہوتا ہے۔ جہاں نہ حق اور نہ ناحق کا سوال ہے نہ عدل و انصاف کی شرط ہے نہ اخلاق و آداب کی کوئی مراعات ہے۔

اس کا معیارِ تفوق صرف جہانگیری و جہانبانی ہے اور کچھ نہیں۔

⁂

اس کے برخلاف "روحانی حکومت" جس کے نظام و قانون کو میں "سیاستِ الٰہی" کا مصداق سمجھتا ہوں وہ ہے جس میں ضروریاتِ اجتماعی، لوازمِ تمدنی، انتظاماتِ ملّی سب بلندیٔ اخلاق اور صحیح انسانیت کے سایہ میں انجام پائیں۔ وہاں اصل مقصد توسیعِ حدودِ مملکت کا نہ ہو بلکہ قوم بنائی جا رہی ہو۔ انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ بے شک قوم کی تشکیل بغیر "قوانینِ اجتماعی" کے ہوتی ہی نہیں اور انھیں قوانینِ اجتماعی کا نام "نظامِ سیاسی" ہے لیکن "یہ سیاست" اس سیاست سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو سلاطینِ دنیا کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔

یہ سیاست وہ ہے جو کسی طرح تربیتِ اخلاقی سے علیحدہ جا ہی نہیں سکتی اور بالکل لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

⁂

یہ شیعہ اصحاب کی تنگ نظری سمجھیے یا بارگاہِ رسالت میں حد سے زیادہ خوش اعتقادی یا جو کچھ کہ ان کے خیال میں حضرت پیغمبرؐ جس طرح اپنے زمانہ کے خود بہترین مصلحِ انفرادی و اجتماعی تھے اپنے مخصوصین میں وہی یہ سمجھ سکتے تھے کہ اس روحِ اسلامی کی حفاظت کے ساتھ جو اس کا اصلی طرۂ امتیاز ہے تمدنی و اجتماعی انتظامات کو کون درست کر سکتا ہے۔

انھیں دنیا کے اس عام اصول میں کچھ تردد نہیں ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ دنیا نے اس عہدہ کے سمجھنے میں غلطی کی اس لیے انجام دینے نہ دینے کی حقیقت میں بھی دھوکا ہوا۔

ان کا مستقل خیال یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے بعد جتنی بھی حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں توسیعِ ملک، فتوحات، جاہ و حشمت کی فراوانی اور خزانہ و سرمایہ ملکی میں ترقی جتنی بھی ہوئی ہو لیکن اسلامی تعلیمات کی روح فنا ہو گئی اور وہ باقی نہیں رہی۔

یعنی پیغمبری کی سنت کے بجائے کسروی و قیصری سُنتیں قائم ہوگئیں اور اس لیے وہ ہرگز ہرگز ان حکومتوں کے دور کو کامیاب ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

⁂

حضرت علیؓ کے مختصر دورِ حکومت کے ظاہری حیثیت سے ناکامیاب رہنے کا پورا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ آپ بالکل اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ جو آنحضرتؐ کی تعلیمات سے بالکل متحد تھا۔ اور اس لیے آپ اجتماعات ملکی و تمدنی میں کلیتہً اسی نظام کو بروئے کار لانا چاہتے تھے جو حضرت پیغمبرؐ کا اصلی منشا تھا مگر امتِ اسلامیہ کے عام افراد کی پچیس برس کی طولانی مدت میں بالکل عادتیں اور خصلتیں تبدیل ہوچکی تھیں۔ آپ کے دور کی پوری کامیابی اسی وقت کھل سکتی تھی جب آپ کی حکومت حضرت رسول اکرمؐ کے بعد بلا فاصلہ تسلیم کر لی جاتی اور آپ برسرِ اقتدار ہو جاتے۔

پھر بھی اس حیثیت سے آپ کا دور انتہائی کامیاب ہے کہ اتنی مختصر مدت میں بھی آپ نے دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیا کہ دنیاوی سلطنت والے بادشاہوں اور روحانی حکومت کے تاجداروں میں کیا فرق ہے اور "سیاست ملوکیہ" و "سیاستِ نبویہ" میں کتنا تفرقہ ہے۔

⁂

یہ کہنا کہ "حضرت علیؓ ایک متقی، زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ نبی کریمؐ کے چچیرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپ کے رفیق و معاون رہے۔ بعد میں داماد بھی ہو چکے تھے اس لیے ظاہر ہے کہ نبی کریمؐ نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر آپ کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔"

اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو چند صفتیں حضرت علیؓ کی شمار کرائی گئی ہیں اُن میں سے "متقی" اور "زاہد" اور "فداکار" اور "صحابی" اور "رفیق و معاون" کی صفتوں میں تو

جمہورِ اسلام دوسرے صحابہ کو حضرت علیؑ کا ہم پلہ یا آپ سے چند قدم آگے قرار دیئے ہوئے ہے۔ پھر اب رد کیا جاتا ہے۔ چچیرا بھائی اور داماد ہونا، چچیرے بھائی ہونے کی صفت میں بھی عقیل اور جعفر شریک تھے اور داماد ہونے میں بقول مورخین اہل سنت حضرت عثمان حصّہ دار تھے۔ پھر آخر مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر حضرت علیؑ ہی کے متعلق آنحضرتؐ نے ان اوصاف کا کیوں تذکرہ کیا۔ دوسرے صحابہ کے متعلق اس طرح کے اوصاف کیوں ذکر نہیں فرماتے۔

اس کے علاوہ کیا پیغمبرِ اسلامؐ صرف جذباتی انسان تھے کہ فقط اپنے چچیرے بھائی اور داماد ہونے کی وجہ سے وہ تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔ حالانکہ دوسرے صحابہ ان اوصاف میں اُن سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہوں۔

اگر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتۂ قرابت و عزیزداری کے صرف اس لیے رسولؐ پر جان دیتے تھے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا رہنما ہے اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسولؐ کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان لختِ جگر صاحبزادیوں کو اس کے حبالۂ ازدواج میں دے دیتے ہیں۔ (بقول بزمی صاحب) اس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اس کے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لٹا دیتے ہیں۔ غرضیکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی جب موقعہ پڑتا ہے تو رسولؐ علیؑ کے اوصاف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور ان حضرات کے لیے ویسے اوصاف اور اتنی کثرت سے کبھی بیان نہیں کرتے۔ صرف اس لیے کہ ان کے مقابلہ میں رسولؐ کا بھائی اور داماد ہے تو پھر اس کا نام "متعصبانہ اعزہ پرستی" نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بیرحمانہ جانبداری" اور "غیر منصفانہ پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟ لیکن تاریخ اسلامی کا ہر سٹوڈنٹ جانتا ہے کہ نبی کریمؐ کی ذاتِ گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں

سے بہت بلند ہے۔

میری جانب سے اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نبی کریمؐ قدم قدم پر اشارۃً اور تصریحاً حضرت علیؑ کو اپنا قائم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کو اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ اتنا بھی حسن ظن نہ رکھنا چاہیئے کہ آپؐ کا یہ فعل کسی عزیز داری کے لحاظ اور بے جا پاسداری پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً اس ذات میں کمالات وخصوصیات ایسے موجود ہیں جو پیغمبر اسلام کو آپ کی تعریف و توصیف پر آمادہ کرتے ہیں اور آپ کو اپنا قائم مقام بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔

اگر ایمان بالنبیؐ جو اسلام کا جزو اعظم ہے مسلمان ضروری سمجھیں تو اس کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ایسا سمجھنا ضروری ہے۔

یہ سوال کم از کم میرے سامنے عجیب وغریب ہے کہ اگر فی الواقع نبی کریمؐ حضرت علیؑ کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے تھے تو پھر آپ نے علی رؤس الاشہاد، اس کا اعلان کیوں نہیں کیا؟

اس صورت میں یہ سوال کرنے کے آخر معنی کیا ہیں؟

* * *

یہ اسلام کا اتنا اہم داخلی مسئلہ، اس کے حل کے لیے مستشرقین یورپ کے دامن سے تمسک، میری سمجھ میں تو نہیں آتا، کیا مستشرقین یورپ تعلیمات اسلام کی روح کو سمجھ گئے ہیں؟ تو پھر کیا حضرت پیغمبرؐ کی ذات پر جو بہت اعتراضات ان کی طرف سے وارد ہوتے رہتے ہیں انھیں صحیح تسلیم کیا جائے!

میرے تمام مضمون کو چھوڑ کر جس میں احادیث بالکل پیش ہی نہیں کیے گئے بلکہ صرف تاریخی واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے جناب ترمی صاحب نے موئدین امامت کی ایک دلیل پیش فرمائی ہے۔ انا مدینۃ العلم وعلیؑ بابھا اس کے مقابلہ میں آپ نے

چند حدیثیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے فضائل میں ذکر کی ہیں۔ مجھے میرے سنی احباب معاف فرمائیں گے۔ آپ حضرات کی بحث کا یہی انداز ایک غیر جانبدار کو آپ کی استدلالی قوت سے بدگمان بنا دیتا ہے۔ ہم ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شیعہ اپنے مطلب کی جتنی باتیں پیش کرتا ہے نام لے لے کر صفحہ سطر کا حوالہ دے دے کر آپ کی کتابوں سے، آپ اس کے جواب میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری بس ایک صحیح بخاری ہے اور کچھ نہیں (دیکھو وہ مضمون جو ہمارے جواب میں رسالہ "فاران" بجنور میں نکلا ہے) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صحیح بخاری کے علاوہ جتنی تفسیر، حدیث، علم رجال و سیر کی کتابیں ہیں وہ سب دریا بُرد کر دینے کے قابل ہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری میں بھی شیعوں کے مطلب کی روایتیں مل ہی جاتی ہیں

لیکن آپ جب شیعوں کے مقابلہ میں حدیثیں پیش کرنے پر آتے ہیں تو وہی اپنی کتابوں سے یعنی صحیح بخاری اور دوسرے صحاح سے۔ اب بتائیے شیعہ ان حدیثوں کو کیوں تسلیم کریں گے اور ایک غیر جانبدار پر ان روایتوں کا کیا اثر پڑے گا؟

* * *

خدا بخش لائبریری کے قرآن کو جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ پھر اُس کے تذکرہ سے نتیجہ کیا؟ "ثانی اثنین اذ ہما فی الغار" کی آیت کے متعلق ہمارے مضمون میں کافی تبصرہ موجود ہے۔ اب آپ بغیر اس پر کچھ نقد و تبصرہ فرمائے ہوئے یہ کہہ دیں کہ "یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے" تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح وقعت دی جائے؟

* * *

"سبقت اسلام" کے متعلق حضرت علیؑ کی فضیلت کو سبک کرنے کے لیے جو خامہ فرسائی فرمائی گئی ہے وہاں "کاوش فکری" کے ساتھ "ژولیدگی خیال" کا اثر نمایاں ہے۔

* * *

"نوجوانی میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے" مگر انسان میں ذوقِ تحقیق ہوتا ہے اور
قوتِ خیال وساوس واوہام زیادہ پیدا کرتی ہے اس لیے ان تمام شکوک واوہام کے مقابلہ
میں کسی حقیقت پر سرِ تسلیم خم کر دینا کچھ "قابلِ قدر نہیں ہے" "چچیرے بھائی" اور قریب کے
عزیز دوسرے بھی موجود تھے لیکن انھیں وہ سبقت کا شرف حاصل نہیں ہوا بہرحال سبقت
ایک شرف ہے جو "اسابقون اسابقون اولٰئك المقرّبون" میں معیارِ تقرب
قرار دیا گیا ہے۔ اس میں عزیز اور غیر عزیز، نوعمر اور پختہ کار کی کوئی تفریق نہیں کی ہے لیکن ہمارا
مضمون دیکھ لیا جائے ہم نے اس کو کوئی مستقل دلیل خلافت نہیں قرار دیا ہے۔ آخر ہمارے
مضمون کے سلسلۂ دلائل کو مرتب صورت سے سامنے رکھ کر اس پر تبصرہ کیوں نہیں کیا گیا۔
کہا جاتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریمؐ نے اپنے اعزا کے سامنے اسلام کو
پیش کرتے ہوئے حضرت علیؑ کے متعلق کہا تھا۔ "ان ھذا اخی ووصی وخلیفتی
فیکم" لیکن اس سے خلافت علیؑ پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا
اس وقت رسولِ کریمؐ کی پوزیشن ایک "بے یار و مددگار لیڈر" سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس لیے
ان جملوں سے اس موقع کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جا سکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے۔
کہ حضرت علیؑ کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو اس حالت میں نبی کریمؐ کا واحد معتمد علیہ قرار
دیا گیا ہے۔"

یہ الفاظ جنھیں پورا نقل کر دیا گیا ہے، مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک مسلمان کے قلم
سے دیکھ رہا ہوں۔ کیا نبی کریمؐ مسلمانوں کی نگاہ میں مکار لوگوں کی طرح دنیا دار، حیلہ باز، خود غرض
اور ابن الوقت تھے؟ انھوں نے بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر حضرت علیؑ کی
حوصلہ افزائی کے لیے کہہ دیا کہ میرے وصی ہیں۔ یہ میرے خلیفہ و جانشین ہیں۔ اس طرح کام
نکال لیا اور ان جملوں کے معنی کچھ بھی نہیں سمجھے؟
میں تو سمجھ سکتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفٰے کی سچائی، امانت و دیانت اور بے لوث

اخلاق قولی و عملی کو جاننے والا کوئی غیر مسلم بھی آپ کی نسبت اس خیال کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

⁂

اس جگہ حضرت علیؑ کی امامت و خلافت کے تذکرہ میں بالکل بے جوڑ طریقہ سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ جو شخص حضرت علیؑ کو صحیح تسلیم کرے گا تو حضرت حسنؑ کو بھی ماننے گا لیکن آپ نے حضرت علیؑ کے قاتل ابن ملجم سے جس طرح انتقام لیا ہے اس کو دیکھ کر اس کی اخلاقی فضیلت کا معیار کیا قائم رہتا ہے۔

اس کے جواب میں پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ ایک غیر جانبدار شخص کے سامنے حضرت علیؑ کی خلافت کی بحث میں امام حسنؑ کی امامت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بہت ممکن ہے وہ تحقیق کی بنا پر حضرت علیؑ کی امامت کو تسلیم کرے اور حضرت حسنؑ کو تسلیم نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو واقعہ حضرت حسنؑ کی نسبت پیش کیا جا رہا ہے اس کو شیعہ فریق فرقۂ خوارج کی اختراع قرار دیتا ہے، لہٰذا قابل تسلیم نہیں ہے۔ پھر اس کے مقابلہ میں وہ متفقہ تاریخ کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے فجا سلمیٰ کو زندہ آگ میں ڈال کر جلوا دیا۔ اس کے متعلق سوال پیدا ہوگا کہ اخلاقی معیار فضیلت کی بنا پر یہ فعل صحیح سمجھا جائے گا یا نہیں۔

⁂

مجھے بھی اب زیادہ تفصیلی بحث نہیں کرنا ہے۔ میرا گذشتہ مضمون درحقیقت ابھی تک بالکل کورا ہے اور اس وقت تک دست نقد و اعتراض نہیں پہنچا ہے۔

شیعیت [illegible] ایرانی [illegible] یہ تربیت میں ایجاد ہونے کے فرضی افسانے بنانے سے حقیقت [illegible] بل بحث [illegible] ی، اصل مسئلہ پر گفتگو ان چیزوں سے بالکل علیحدہ ہے۔

⁂

سب سے آخر میں مجھے اس فقرہ پر ریمارک کرنا ہے کہ "خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخورِ اعتنا کہا جا سکے اور نہ "شیعیت" اسلام کا کوئی "مذہبی فرقہ"۔ خلافت کو اہمیت ہے یا نہیں، اس کو تو مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس بحث کی اہمیت مسلمانوں کی عملی اخلاقی و تعلیمی زندگی کے اعتبار سے سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیماتِ مذہبی میں کن پیشوایانِ دین کو اپنا رہنما قرار دیں اور ان کے تعلیمات پر عمل کریں اسی طرح یہ فقرہ کہ "نہ شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ"۔

اس کا جواب شیعہ ہی دے سکتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں افتراق اسی قسم کی تعبیری بے اعتدالیوں کی وجہ سے ہے۔ آپ کہیے گا "شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ نہیں" شیعہ کہیں گے "سنّیت اسلام کا مذہبی فرقہ نہیں" نتیجہ اس کا انتشار ہے اور کچھ نہیں یہ کبھی ہو جائے کہ سنّی سب شیعہ بن جائیں یا شیعہ سب سنّی بن جائیں غیر ممکن لیکن اتحاد و اتفاق کی صورت یہ ہے کہ آپ ان کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کیجیے اور ان کا احترام کیجیے، وہ آپ کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کریں اور احترام کریں۔ چلیے اس طرح یہ شیرازہ مجتمع رہے گا اور ملتِ اسلامیہ کا نظام درہم برہم نہ ہوگا۔ خدا جانتا ہے کہ مسلمانوں کا خیرخواہ ہوں۔ اس لیے اتنا لکھ بھی دیا نہیں تو مجھ سے کیا مطلب۔ فقط

ہرنام

مسئلۂ خلافت و امامت

نیاز فتحپوری
مدیر "نگار"

مسئلۂ خلافت و امامت

(میرے نقطۂ نظر سے)

نگار میں اس مسئلہ کی ابتدا ایک صاحب ہزنام کے مضمون سے ہوئی جنھوں نے شیعی نقطۂ نگاہ اور استنادات اہلِ تسنن سے وصایت و ولایت جناب امیرؑ کو ثابت کیا تھا۔ اس کے جواب میں جو مضامین اہلِ تسنن کی طرف سے موصول ہوئے ان میں اکثر تشنہ و ناکمل تھے۔ صرف جناب ابو سعید بزمی، ایم۔ اے کا ایک مقالہ ایسا تھا جو اشاعت کے قابل سمجھا گیا۔ درانحالیکہ وہ بھی کوئی قطعی جواب ہزنام کے مضمون کا نہ تھا۔ اس کے بعد ہزنام صاحب کا پھر دوسرا مقالہ نومبر کے نگار میں جناب بزمی کے جواب میں شائع ہوا اور اسی کے ساتھ میں نے وعدہ کیا کہ اب بغیر کسی مزید انتظار کے اپنی رائے اس مسئلہ میں پیش کروں گا۔ دسمبر میں مجھے اس مسئلہ پر کچھ لکھنے کا موقعہ نہ ملا۔ جنوری میں اس بحث کی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے اب فروری کی اشاعت میں اپنے اس وعدہ کا ایفا کرتا ہوں:-

ہزنام کا استدلال دو باتوں پر مشتمل تھا۔ ایک یہ کہ جناب امیرؑ اپنے خصائل و عادات کے لحاظ سے مرجح حقِ خلافت کا رکھتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ خود رسول اللہؐ نے بھی غدیرِ خم میں اور اس کے قبل و بعد متعدد بار اپنے بعد ولایت و وصایت علیؑ کی صراحت فرمائی تھی۔ اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار نے تمام روایات و اسناد وہی پیش کیے تھے جو اہلِ تسنن کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس لیے سنیوں کی طرف سے جواب کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ وہ سرے سے ان روایات کے وجود ہی سے انکار کریں یا یہ کہ وہ ان روایتوں کا کوئی مفہوم اور بتائیں۔ ظاہر ہے کہ اول صورت جواب کی اختیار نہیں کی جاسکتی کیونکہ

وہ روایات تو کتابوں سے نکالی نہیں جاسکتیں۔ اس لیے عموماً دوسری صورت اختیار کی جاتی ہے یعنی بعض تو ان روایتوں کو ضعیف قرار دے کر ناقابلِ اعتنا خیال کرتے ہیں اور بعض الزامی جواب کے انداز میں ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جو فضائل جناب شیخینؓ میں ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ درآنحالیکہ ان دونوں میں سے کوئی طریقہ جواب کا مفید یقین نہیں ہوسکتا کیونکہ جن روایتوں کو آج ضعیف کہہ کر ناقابلِ استناد قرار دیا جاتا ہے وہ قدماء کے نزدیک حد درجہ قابلِ وثوق سمجھی جاتی تھیں اور فضائل شیخینؓ کو جناب امیرؑ کے حق ولایت وخلافت سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ ایک کی فضیلت نہ دوسرے کی فضیلت سے انکار کا منافات ہوا کرتی ہے اور نہ اس سے کسی دوسرے کا حق محو ہوسکتا ہے۔

غالباً مناسب ہوگا کہ پہلے ایک اجمالی تبصرہ اس وقت تک کے مضامین پر کردیا جائے تا کہ جس حد تک روائتی استنادات کا تعلق ہے یہ بحث ابتداء ہی میں ختم ہوجائے۔

سب سے پہلی خصوصیت جناب امیرؑ کی ہمنام صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ آپ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ ہرچند سابقیت اسلام کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو خلافت وامامت پر مؤثر ہوسکے لیکن چونکہ رسالۂ فاران میں کسی صاحب (مولوی فاروق) نے ہمنام کے مضمون کا جواب لکھتے ہوئے اس کی بھی تردید کی تھی اس لیے نامناسب نہ ہوگا اگر اس مسئلہ پر بھی محاکمہ کیا جائے۔

مولوی فاروق صاحب نے بروایت بخاری ثابت کیا ہے کہ حضرت علیؑ کا نمبر اسلام لانے والوں میں چوتھا یا نواں تھا لیکن بخاری کی جن دو روایتوں سے استناد کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے ایک راوی اسمٰعیل بن مجاہد ہیں۔ جو نسائی کے نزدیک ضعیف اور حاکم کی رائے میں ناقابلِ اعتبار ہیں۔ دارقطنی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اسمٰعیل کے ضعف پر اجماع ہے۔ الغرض بخاری کی ایک ایسی روایت پر جو درجہ احاد سے آگے نہیں بڑھتی اور مجروح بھی ہے۔ تمام جمہور محدثین کے اس فیصلہ کو کیونکر رد کیا جاسکتا ہے۔ کہ حضرت خدیجہؑ کے بعد سب سے پہلے جناب امیرؑ ہی نے اسلام قبول کیا۔ بلکہ بعض روایتوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت علیؑ

ہی ایمان لائے۔ چنانچہ دارقطنی نے ابوسعید خدری سے، امام احمد نے حضرت عمرؓ سے، حاکم نے معاذ سے، عقیلی نے حضرت عائشہ سے جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود رسول اللہؐ نے اپنی زبان سے فرمایا کہ "مجھ پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے علیؑ ہیں"

الغرض ان تمام روایات کے ہوتے ہوئے امام بخاری کی ایک مجروح روایت کو استدلال میں پیش کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

دوسرا استدلال جناب امیرؑ کی وصایت و امامت کے ثبوت میں ہمنام صاحب نے پیش کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہؐ کو "انذر عشیرتک الاقربین" کی ہدایت ہوئی تو آپ نے اپنے اعزہ و اولادِ عبدالمطلب و ہاشم کو جمع کر کے ایک تقریر کی اور اس میں جناب امیرؑ کو "اخی و وصی وخلیفتی فیکم" (اپنا بھائی اور اپنا ولی عہد و جانشین) ظاہر کیا۔ اس کا جواب بھی سنیوں کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ بخاری میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ درآنحالیکہ مسند احمد بن حنبل، خصائص نسائی، سیرۃ ابن اسحاق، تفسیر ابن حاتم، دلائل بیہقی و ابونعیم میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ اور مستند طریقہ سے مروی ہے محض بخاری میں نہ پایا جانا کوئی معقول وجہ انکار کی نہیں ہو سکتی۔ رہا جناب ابوسعید بزمی کا یہ کہنا کہ رسول اللہؐ کا ایسا فرمانا صرف حضرت علیؑ کی حوصلہ افزائی کے لیے تھا۔ ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر نہ کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ جسے رسول اللہؐ سے منسوب کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

تیسری خصوصیت جناب امیرؑ کی ہمنام صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ جب رسول اللہؐ نے پوشیدہ طور پر مکہ سے ہجرت کا ارادہ کیا تو اپنے بستر پر جناب امیرؑ کو لٹا کر تشریف لے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت علیؑ کا رسول اللہؐ کے بستر پر لیٹ جانا انتہائی خطرہ کی بات تھی۔ اور آپ کا اس خطرہ کو گوارا کر لینا جان نثاری کا ایسا زبردست ثبوت ہے۔ کہ اس سے زیادہ قوی ثبوت کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس واقعہ سے بھی بعض علماء اہل تسنن صرف اس لیے انکار کرتے ہیں کہ بخاری میں کوئی ایسی روایت نہیں پائی جاتی۔ لیکن یہ کوئی قابلِ اعتبار استدلال نہیں ہے۔ کیونکہ علاوہ بخاری کے تمام کتب احادیث و تفسیر و تاریخ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ مسند احمد بن حنبل، سنن امام نسائی، سنن ابن ماجہ، خصائص نسائی، سیرۃ ابن ہشام، سیرۃ ابن اسحاق، تفسیر ثعلبی، تفسیر ابو حاتم رازی، تاریخ کبیر اور اسد الغابہ وغیرہ تمام کتابوں میں ہر شخص اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

چوتھی خصوصیت مواخاۃ کی ہرنام صاحب نے ظاہر کی ہے۔ یعنی جب رسول اللہؐ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد مہاجرین و انصار میں بھائی چارے کی رسم قائم کی تو جناب امیرؑ کی مواخاۃ خود اپنی ذات سے کی اور ارشاد فرمایا۔ "انت اخی فی الدنیا والاخرۃ" "اے علیؑ تو دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے"۔ اس واقعہ سے بھی اہلِ تسنن صرف اس لیے انکار کرتے ہیں کہ جناب امام بخاری اس مسئلہ میں خاموش ہیں۔ درانحالیکہ دیگر کتب احادیث میں بارہ صحابہ کی روایت سے اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

پانچویں خصوصیت ہرنام صاحب نے یہ ظاہر کی ہے کہ مسجد نبوی کے چاروں طرف جتنے صحابہ کے گھر تھے ان سب کے دروازے رسول اللہؐ نے بند کرا دیے لیکن حضرت علیؑ کے گھر کا دروازہ صحن مسجد کی طرف کا بند نہیں کرایا۔ یہ واقعہ بھی اہل تسنن کی کتب احادیث و تاریخ میں صراحتاً موجود ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام نسائی، حاکم، طبرانی، ترمذی، بیہقی اور ابن عساکر وغیرہ سب بالاتفاق اس واقعہ کی صحت کے شاہد ہیں۔

چھٹی خصوصیت جناب امیرؑ کی ہرنام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ آپ رسول اللہؐ کے داماد یعنی اس محبوب بیٹی کے شوہر تھے جس کو جناب رسالتمآبؐ "سیدۃ نساء العالمین" "سیدۃ نساء المومنین" "سیدۃ نساء اھل الجنۃ" کے الفاظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ واقعہ ایسا ہے جس سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔

ساتویں خصوصیت ہرنام صاحب نے حضرت علیؑ کی یہ ظاہر کی ہے کہ جنگِ بدر، جنگِ اُحد اور جنگِ خیبر وغیرہ میں جو کارہائے نمایاں آپ نے کیے وہ دوسروں سے ظاہر نہ ہو سکے بلکہ بعض موقعوں پر تو تمام اکابر صحابہ رسول اللہؐ کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے اور صرف حضرت علیؑ رہ گئے چنانچہ آپ کی انھیں خصوصیات جرأت و وفاداری کی بناء پر رسول اللہؐ نے خیبر کی مہم پر روانہ کرتے وقت آپ کو "کرار غیر فرار" کے الفاظ سے یاد فرمایا۔

ان تمام جنگوں میں جناب امیرؑ نے جس غیر معمولی شجاعت و ثابت قدمی سے کام لیا۔ اس کے اعتراف پر اہلِ تسنن بھی مجبور ہیں لیکن خیبر کی مہم روانہ کرتے وقت رسول اللہؐ کا جناب امیرؑ کو "کرار غیر فرار" کہنا اور جنگِ اُحد و جنگِ حنین میں تمام اکابر صحابہ یہاں تک کہ جناب ابوبکر اور جناب عمر کا بھی رسول اللہؐ کو تنہا چھوڑ کر چلا جانا ایسی باتیں ہیں جو سنیوں کے لیے ناقابلِ قبول ہیں۔ لیکن رسول اللہؐ کا جناب امیرؑ کو "غیر فرار" کے لفظ سے خطاب کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ اس سے قبل جو صحابہ (یعنی جناب ابوبکر و جناب عمر) پرچم اسلام لے کر خیبر فتح کرنے گئے تھے۔ اور ناکام واپس آئے وہ بھاگ آنے والوں میں تھے، اور جنگِ حنین و جنگِ اُحد میں تو خیر کھلم کھلا ان حضرات پر رسول اللہؐ کا ساتھ چھوڑ دینے کا الزام قائم کیا جاتا ہے۔

اہلِ تسنن بر بنائے امام بخاری الفاظ "کرار غیر فرار" کی صحت سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ابنِ اسحاق، نسائی، احمد، ابن ابی شیبہ، ابن جریر، طبرانی، بیہقی نے اور دارقطنی خطیب اور ابن عساکر نے تو خود حضرت عمر سے انھیں الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے علاوہ اس کے جناب ہرنام کا یہ استدلال کہ اگر "کرار غیر فرار" کے الفاظ نکال دیے جائیں تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی اور زیادہ توہین متصور ہے کیونکہ اس صورت میں حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت علیؑ سے قبل جو حضرات پرچم اسلام لے گئے تھے وہ خدا و رسول کے دوست بھی نہ تھے۔

رہ گیا جنگِ اُحد و جنگِ حنین میں تمام اکابر صحابہ کا فرار ہو جانا، سو اگر باوجود متعدد احادیث اہلِ تسنن کی موجودگی کے اس سے انکار بھی کر دیا جائے تو حضرت علیؑ کی عدیم النظیر خدمات کو ایک مخصوص امتیاز دینا لازم ہے کیونکہ ان کے پیٹھ موڑ کر چلے جانے یا رسول اللہؐ کا ساتھ چھوڑ دینے کی ایک روایت بھی کسی جگہ نہیں پائی جاتی۔

ساتویں خصوصیت برنام صاحب نے حدیث منزلت سے ثابت کی ہے یعنی جب غزوۂ تبوک میں رسول اللہؐ نے اپنے ساتھ تمام صحابہ کو چلنے کا حکم دیا تو حضرت علیؑ کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ مدینہ ہی میں قیام کریں جس سے آپ کبیدہ خاطر ہوئے۔ رسول اللہؐ نے آپ سے فرمایا "کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے حاصل تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے۔"

چونکہ یہ حدیث بخاری میں بھی موجود ہے اس لیے اہلِ تسنن اس واقعہ سے انکار تو نہیں کر سکتے لیکن وہ اس کو کوئی ایسا زیادہ اہم بھی نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے کہ اس حدیث سے استخلاف جنابِ امیرؑ ثابت نہ ہو سکے لیکن ان کی فضیلت تمام دیگر صحابہ پر ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ امام نودی نے شرح مسلم میں بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔

آٹھویں خصوصیت برنام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ جب سورۂ برات نازل ہوئی، تو رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکر کو مامور کیا کہ جا کر اہلِ مکہ کو اس کی تبلیغ کریں جب وہ چلے گئے تو وحی نازل ہوئی کہ اس کی تبلیغ خود رسول اللہؐ کو کرنا چاہیئے یا اپنے کسی عزیز قریب کے ذریعہ سے۔ چنانچہ آپؐ نے جنابِ امیرؑ کو روانہ فرمایا کہ وہ حضرت ابوبکر سے سورۂ برأت لے کر اہلِ مکہ کو جا کر سنائیں اور جنابِ امیرؑ کو یہ خدمت تفویض کرتے وقت فرمایا کہ:۔

"علی منی وانا منہ ولایودی عنی الا انا وعلی" (علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں اور اپنی ترجمانی یا میں خود کر سکتا ہوں یا علیؑ)

یہ واقعہ بھی اہلِ تسنن کی تمام کتب معتبرہ احادیث و تفاسیر میں موجود ہے اور

اس سے انکار ممکن نہیں۔ بعض اہلِ تسنّن اس کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے، درآنحالیکہ اس سے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ جو خدمت خود ذاتِ نبویؐ سے متعلق ہوسکتی تھی۔ اس کو صرف حضرت علیؑ ہی انجام دے سکتے تھے۔

نویں خصوصیت کا اظہار جناب مرزا صاحب نے اس واقعہ کے سلسلہ میں کیا ہے جب جناب امیرؑ تبلیغ اہلِ یمن کے لیے مامور کیے گئے تھے اور آپ کے خلاف چند لوگوں کی شکایت سن کر فرمایا تھا کہ "مجھ سے علیؑ کی برائی نہ کرو" فانہ منی وانا منہ وھو ولیکم بعدی" (علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں اور وہ میرے بعد تمھارا حاکم ہے) بعض احادیث میں الفاظ "وھو ولیکم بعدی" کے نہیں پائے جاتے۔ اور بعض میں "وھو مولی کل مومن ومومنۃ" پائے جاتے ہیں۔ شکایت یہ تھی کہ جناب امیرؑ نے خمس میں سے ایک لونڈی اپنے لیے منتخب کرلی۔ امام بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکایت سن کر رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "فان لہ فی الخمس اکثر من ذالک" (علیؑ کا حصہ خمس میں اس سے بھی زیادہ ہے) یہ حدیث بھی اہلِ تسنّن کی تمام معتبر کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اور اس سے جو منزلت جناب امیرؑ کی ظاہر ہوتی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔

دسویں خصوصیت وہ ہے جو خطبہ حجۃ الوداع اور غدیرِ خم سے متعلق ہے اور اس میں کلام نہیں کہ حضرات شیعہ کے پاس ولایت جناب امیرؑ کی یہ سب سے بڑی شہادت ہے یہ واقعہ مختصراً یوں ہے کہ جب حج سے فارغ ہونے کے بعد قافلۂ نبویؐ غدیرِ خم پر پہنچا تو رسول اللہؐ نے سب کو روک کر ایک تقریر فرمائی اور اس میں اپنے وصال کی خبر دیتے ہوئے کہا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" میں جس کا مولیٰ ہوں علیؑ بھی اس کا مولیٰ ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ :-

> "میں اپنے بعد دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسری میری عترت، میرے اہلبیتؑ اور انھیں دونوں کی پیروی کرنا چاہیئے۔"

بعض علماء اہل تسنن اس واقعہ سے بھی صحت اس لیے انکار کرتے ہیں کہ امام بخاری نے اس کی روایت نہیں کی ہے۔ اور ابن تیمیہ نے اس کو بے اصل بتایا ہے۔ حالانکہ حضرت بخاری کا روایت نہ کرنا یا ابن تیمیہ کا انکار ان متعدد و متواتر تصدیقوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جو اس باب میں پائی جاتی ہیں۔

امام المحدثین حافظ ابن عقدہ نے ایک سو صحابہ سے اس حدیث کی روایت کی ہے امام جزری شافعی نے اسی صحابیوں سے، امام احمد بن حنبل نے تیس صحابیوں سے اور طبری نے پچھتر صحابیوں سے۔ علاوہ اس کے تمام اکابر اسلام مثلاً ذہبی، صنعانی اور علی القاری وغیرہ اس حدیث کو مشہور و متواتر مانتے ہیں۔

اخیر میں ہزنام صاحب نے واقعۂ قرطاس کو بھی پیش کیا ہے لیکن اس کا تعلق اوّل تو وصایت جناب امیرؑ سے ہے بھی نہیں (کیونکہ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہؐ کاغذ و قلم منگوا کر کیا لکھوانا چاہتے تھے) اور دوسرے یہ کہ یہ حدیث اہل تسنن کے نزدیک قابلِ لحاظ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے خاص راویوں میں سے ایک یحییٰ بن سلیمان ہیں۔ جو غیر ثقہ قرار دیے گئے ہیں، دوسرے راوی قبیصہ ہیں جو بہت غلط گو سمجھے جاتے ہیں۔ تیسرے یونس بن یزید ہیں جن کا حافظہ بھی ضعیف تھا اور جو غلط گو بھی تھے۔ چوتھے راوی علی بن عبداللہ ہیں جن کا شمار ضعفاء میں ہے۔ رہ گئے ایک اور راوی حضرت ابن عباس سو ان کا اسوقت وہاں موجود ہونا ثابت نہیں۔

دسویں خصوصیت جناب ہزنام نے یہ ظاہر کی ہے کہ رسول اللہؐ نے وقتِ آخر میں فرمایا کہ "بلاؤ میرے حبیب کو۔ چنانچہ پہلے حضرت ابوبکر آئے لیکن آپ نے توجہ نہیں کی اس کے بعد حضرت عمر تشریف لائے لیکن دیکھ کر پھر تکیہ پر سر رکھ لیا۔ تیسری مرتبہ جب حضرت علیؑ آئے تو آپ نے انھیں چادر میں لے لیا۔ اور برابر لیے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔"

گرچہ مسئلۂ خلافت و ولایت سے براہِ راست اس واقعہ کا تعلق نہیں ہے لیکن فضیلت جناب امیرؑ ثابت کرنے کے لیے یقیناً یہ نہایت زبردست دلیل ہے ۔

بعض علمائے اہل تسنن اس حدیث کی صحت سے بھی منکر ہیں اور میرے نزدیک ان کا یہ انکار بھی درست نہیں۔ کیونکہ اس حدیث کو امام نسائی، امام احمد بن حنبل، دارقطنی، امام ترمذی اور حاکم سب نے روایت کیا ہے ۔

یہاں تک تو میں نے ہرنام صاحب کے تمام روایتی مستندات کا خلاصہ پیش کر کے ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی اور اس میں شک نہیں کہ ان روایات و واقعات سے نہ صرف یہ کہ جناب امیرؑ کی غیر معمولی فضیلت ثابت ہوتی ہے بلکہ بڑی حد تک یہ بھی کہ رسول اللہؐ اپنے بعد آپ ہی کو جانشین بنانا چاہتے تھے ۔ اہل تسنن جواب کے دو طریقے اختیار کرتے ہیں، ایک یہ کہ وہ ان میں سے بعض روایات کو صرف اس لیے غلط قرار دیتے ہیں کہ امام بخاری نے ان کو درج نہیں کیا۔ حالانکہ یہ ایسا بچکانہ طریقۂ ردِ اعتراض کا ہے کہ اس کی کمزوری ہر شخص محسوس کر سکتا ہے ۔ دوسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے ۔ یعنی یہ کہ حضرت علیؑ کے فضائل کے جواب میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے فضائل کی احادیث پیش کرنے لگتے ہیں ۔ اوّل تو جواب کی یہ صورت اس لیے بھی بیکار ہے کہ جن احادیث کو یہ پیش کرتے ہیں وہ حضرات شیعہ کی کتابوں میں نہیں پائی جاتیں (برخلاف اہل شیعہ کے کہ وہ فضائل حضرت علیؑ کی روایات اہل تسنن کی کتابوں سے پیش کرتے ہیں) دوسرے یہ کہ اگر فضائل شیخین کی احادیث کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے اصل مسئلہ خلافت و امامت جناب امیرؑ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے ۔ جبکہ حضرت علیؑ کے مرتبہ و فضیلت سے اہل تسنن کو بھی انکار نہیں ۔

الغرض جس حد تک روایات کا تعلق ہے میرے نزدیک حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں ۔ کہ رسول اللہؐ کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت علیؑ آپ

کے بعد جانشین قرار دیے جائیں۔ لیکن گفتگو اس میں ہو سکتی ہے کہ رسول اللہؐ کی اس خواہش کا حالات کے اقتضا کے لحاظ سے پورا ہونا ممکن و مناسب تھا یا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اگر حضرت علیؑ رسول اللہؐ کے بعد خلیفہ قرار نہیں دیے گئے۔ تو یہ کوئی مسئلہ ایسا اہم تھا جو تفریق مذاہب کا باعث ہو سکے؟

جہاں تک میں نے غور کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خلافت کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے اور اگر کوئی جماعت اس کی قائل ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے نہ اسلام کی تعلیمات پر غور کیا ہے نہ اس کے صحیح مقصد کو اس نے سمجھا ہے۔ اور نہ منصب نبوت کے حقیقی مفہوم سے اُسے آگاہی حاصل ہے۔

⁂

اس سے غالباً شیعہ و سنی کسی کا انکار نہیں کہ تعلیمات اسلام مذہب و سیاست دونوں پر حاوی ہیں۔ یعنی اگر رسول اللہؐ کو ایک طرف مبلّغ احکام خداوندی کی حیثیت حاصل تھی تو دوسری طرف آپ ایک سیاست دان فرمانروا کا منصب بھی رکھتے تھے لیکن ان دو مختلف حیثیتوں کا آپ کے منصبِ نبوّت سے کیا تعلق تھا؟ اس کو سب نے نظر انداز کر دیا ہے اور یہی اصل سبب تمام نزاعات کا ہے۔ اس لیے آئیے سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کریں۔

نبی یا رسول کا لغوی مفہوم جو کچھ بھی رہا ہو لیکن اس کا اصطلاحی مفہوم ہمیشہ یہی قرار دیا گیا کہ نبی وہ غیر معمولی انسان ہے جو خدا کی طرف سے کوئی پیغام لایا ہو۔ جو معجزوں کا حامل ہو پیشین گوئیاں کرتا ہو۔ غیب کی باتیں جانتا ہو۔ بات بات میں خدا فرشتے بھیج کر اس کی مدد کرتا ہو۔ محالات کو ممکن بنا دینے پر قادر ہو، بالکل معصوم ہو۔ لغزش و غلطی سے مبرّا ہو جس کا ہر قول و فعل ہر وقت الہام خداوندی کے ماتحت ظہور پذیر ہوتا ہو۔ یعنی مختصر یہ کہ اس میں عام خصوصیات انسانی بالکل نہ پائی جائیں اور وہ ایک "غیر انسانی" انسان ہو۔

آپ تمام مذاہبِ عالم کی تاریخ کا مطالعہ کر جائیں، بہ ادنیٰ تغیرِ الفاظ نبی یا رسول کا مفہوم آپ کو یہی نظر آئے گا، لیکن یہ خصوصیت صرف اسلام کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی نے نبی کے اس عجیب و غریب مفہوم کی تردید کی اور تمام مذاہب میں وہی ایک مذہب ایسا ہے جس نے نبوت کے اس طلسم زار کو توڑ کر اس کے حقیقی خط و خال دنیا کے سامنے پیش کیے۔

انسان کو دیگر مخلوقات کے لحاظ سے اشرف المخلوقات صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کو عقل و فراست عطا ہوئی ہے اور وہ اپنے جذباتِ حیوانی سے مغلوب نہیں ہو سکتا اگر وہ چاہے۔ بالکل اسی طرح ایک نبی، دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں صرف یہ شرف رکھتا ہے کہ اس میں وہ تمام قوتیں جو ایک انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہیں، زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور وہ باوجود تمام جذباتِ حیوانی رکھنے کے ان کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہے۔

ہم ایک ایسے شخص کو جانتے ہیں جو حد درجہ مسکین و غریب ہے۔ جو کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا۔ جو ہر شخص کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے اور ہم اس کی صلاحیتِ نفس کی تعریف کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ غیر معمولی ضبط سے کام لے کر اپنے جذباتِ حیوانی پر قابو رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ قدرتاً وہ حد درجہ بے حس واقع ہوا ہے تو ہم بجائے تعریف کرنے کے اس کو بزدل و بے غیرت کہیں گے۔

ایک شخص حد درجہ عفت مآب و پاکباز ہے۔ اور ہم اس کے ضبطِ نفس کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ جان جائیں کہ اس میں قدرت کی طرف سے یہ مادہ ہی نہیں پایا جاتا اور وہ فطرتاً ناکارہ پیدا ہوا ہے۔ تو پھر ہم بجائے تعریف کے اس کی حقارت کرنے لگتے ہیں۔

الغرض ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس

سے باز آئے۔ وہ جھوٹ بول سکتا ہو لیکن نہ بولے، وہ غصہ کر سکتا ہو لیکن نہ کرے۔ ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو، لیکن نہ ہو، اسی پر ایک نبی کے خصوصیات کا زیادہ وسیع پیمانہ پر قیاس کر لیجیے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ نبی فطرتاً معصوم پیدا ہوا ہے تو اس کی عصمت کوئی قابلِ تعریف بات نہیں۔ اگر وہ غیب کی باتیں جان لیتا ہے تو اس کی فراست و پیش بینی بے معنی ہے اگر فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں تو اس کی کامیابیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اگر اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی تو اس کی سلامت روی ہیچ ہے۔ ایک نبی کو دوسرے انسانوں کے مقابلے میں امتیاز اگر حاصل ہے تو صرف یہ کہ وہ باوجود ان تمام جذبات رکھنے کے جو تمام لوگوں میں پائے جاتے ہیں ان کے ضبط پر دوسرے انسانوں سے زیادہ قادر ہے، وہ دوسرے انسانوں کی طرح سوچتا ہے لیکن بہت غائر نگاہ سے، وہ مخالف و مقابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن بہت کم، وہ کسی غایت تک پہنچنے کے لیے انھیں اسباب و دلائل کو سامنے رکھتا ہے جو دوسروں کے سامنے ہیں اور اکثر صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ الغرض وہ ہماری طرح ایک انسان ہے، لیکن بلند ترین سطح کا اور انسانی فراست سے جو غلطی یا لغزش اس دنیا میں ہو سکتی ہے وہ اس سے بھی ممکن ہے، لیکن بہت کم۔ وہ اپنی نیت کے لحاظ سے، اپنے مقاصد کے نقطۂ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان ہے۔ لیکن اپنی تدابیر اپنی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کاروبارِ عالم میں وہ کبھی کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے اور یہی وہ مفہوم نبوت کا تھا جسے سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا اور جس کو سامنے رکھ کر ہم رسول اللہؐ کی غیر معمولی عظمت تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ممکن ہے مسلمانوں کی جماعت نبوت کے اس مفہوم کو سن کر متعجب ہو علی الخصوص حضرات شیعہ جو نہ صرف رسول اللہؐ بلکہ اہل بیت کے تمام افراد کو معصوم جانتے ہیں لیکن کیا کروں کلامِ پاک سے نبوت کا مفہوم میری سمجھ میں یہی آتا ہے اور اس سے ہٹ کر "پیدائشی معصومیت" سے نبی کو متصف کرنا میرے نزدیک منصبِ نبوت کی توہین کرنا ہے۔

نبی آخر الزماں سے قبل نبوت کا جو مفہوم لوگوں کے ذہن نشین تھا۔ وہ یہ تھا کہ "رسول" نوعِ انسانی سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ اور اس کا تعلق فرشتوں سے ہے[1]۔ اس کی تردید رسول اللہؐ کی زبان سے یوں کی گئی:۔

"قل لو کان فی الارض ملائکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولا" (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۹۵) یعنی اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتوں کی آبادی ہوتی تو ہم کسی فرشتہ ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔

اسی طرح سورۂ کہف (آیت ۱۱۰) میں رسول اللہؐ کی انسانی حیثیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

"قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی انما الٰھکم الٰہ واحد" (یعنی اے رسولؐ کہہ دے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ خدا مجھے تمھیں وحدانیت کی تعلیم دینے کی ہدایت کرتا ہے۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۹۳ میں "ھل کنت الا بشرا رسولا" کہہ کر اس کی اور زیادہ وضاحت کردی جاتی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل میں نے عرض کیا، ایک نبی کی خصوصیات میں اس کا غیب داں ہونا بھی لازمی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن اسلام نے اس کی بھی نہایت پُرزور الفاظ میں تردید کی ہے۔ رسول اللہؐ سے ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ تم سے اس قسم کا مطالبہ کرتے ہیں ان سے کہہ دو کہ "و للہ غیب السموات والارض والیہ یرجع الامر کلہ" (یعنی آسمان و زمین کی پوشیدہ باتوں کا جاننے والا صرف خدا اور وہی سب کا مرجع حقیقی ہے۔ (آیت ۱۲۳ سورۂ ہود)

---

[1] وما منع الناس ان یومنوا اذ جاءھم الھدیٰ الا ان قالوا البعث اللہ بشرا رسولا (ایمان لانے سے جس چیز نے ان لوگوں کو باز رکھا وہ یہ تھی کہ وہ کہا کرتے تھے کیا خدا نے کسی انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے)
(سورۂ بنی اسرائیل آیت ۹۴)

سورۂ نمل کی آیت ۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے :-

"قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ"

سورۂ انعام کی آیت ۱۵ میں اس کی صراحت اور زیادہ پُر زور الفاظ میں اس طرح کی جاتی ہے کہ :-

"قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ و لا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک"

(اے رسول کہ دیجیے کہ میں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں یا میں غیب کا جاننے والا ہوں یا یہ کہ میں فرشتہ ہوں)

پھر سورۂ اعراف میں اس کی وضاحت دوسرے طریقہ سے یوں کی گئی ہے :-

"قل لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً الا ما شاء اللہ ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء" (آیت ۱۸۸)

(یعنی مجھے اپنے نفع و نقصان پر بھی اختیار نہیں ہے اور اگر مجھے آئندہ کا حال معلوم ہوتا تو اپنے لیے سب بھلائیاں ہی بھلائیاں جمع کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا)

یہ ہیں وہ آیاتِ قرآنی جن سے رسول اللہؐ کی حیثیت انسانی کو ظاہر کیا گیا ہے اور کھلے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ آپ بھی دوسرے انسانوں ہی کی طرح ایک انسان تھے، نہ آپ کو آئندہ کا حال معلوم تھا، نہ آپ کے پاس خزائن غیب کی کنجیاں تھیں، یہاں تک کہ جن دنیاوی اسباب کے ماتحت انسان کو نفع و ضرر پہنچا کرتا ہے، ان سے بھی آپ مستثنیٰ نہ تھے۔

ایک نبی کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ حامل معجزات ہو۔ اور رسول اللہؐ سے قبل عام طور پر خوارق عادات کا ظہور اثبات نبوت کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا، لیکن کلام مجید نے اس مسئلہ کو بھی ہمیشہ کے لیے صاف کر دیا۔

جس وقت کفار نے رسول اللہ ؐ سے کہا کہ ہم تجھ پر اُس وقت ایمان لائیں گے جب تو زمین سے ہمارے لیے چشمہ جاری کر دے یا یہ کہ تیرے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور اس میں بہتی ہوئی نہریں نکال دے یا یہ کہ تو آسمان کے ٹکڑے کر دے یا یہ کہ خدا اور فرشتوں کو اپنے ساتھ لے آئے وغیرہ تو اس کا جواب رسول اللہ ؐ نے صرف یہ دیا کہ "سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا" (ملاحظہ ہو سورۃ بنی اسرائیل آیات ۹۲-۹۵)

اگر رسول اللہ ؐ حامل معجزہ ہوتے یا منصب نبوت میں معجزوں کا دکھانا بھی شامل ہوتا تو اس سے زیادہ موزوں و مناسب وقت کوئی ہو ہی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ کفار اس پر اصرار کر رہے تھے اور ایسے وقت میں معجزہ کا اظہار ازبس مفید و کارآمد ہوتا۔ لیکن آپ نے نہ صرف معجزہ دکھانے سے انکار کر دیا بلکہ ان کو منصبِ نبوت کا صحیح مفہوم بھی سمجھا دیا کہ نبی یا رسول کو انسانی ہستی سے بالاتر ہستی سمجھنا غلطی ہے۔

نبی کے متعلق یہ بھی عام اعتقاد پایا جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ یا یہ کہ وہ خطا و نسیان سے مبرا ہے۔ لیکن کلام مجید سے اس کی بھی تردید ہوتی ہے۔

سورۂ سبا کی آیت ۹۴ میں رسول اللہ ؐ سے ارشاد ہوتا ہے:-

"قل ان ضللت فانما اضل علی نفسی وان اھتدیت فبما یوحی الی ربی انہ سمیع قریب"

(یعنی کہہ دو کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوتی ہے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں اور اگر سیدھی راہ اختیار کرتا ہوں تو وہ خدا کی ہدایت ہے)

سورۂ مومن آیت ۵۵ میں ایک جگہ رسول اللہ ؐ سے خطاب کیا گیا ہے۔ کہ:-

"استغفر لذنبک وسبح بحمد ربک" (اپنی غلطی سے توبہ کر اور خدا کی حمد بیان کر)

سورۂ محمد آیت ۱۹ میں پھر "واستغفر لذنبک وللمومنین والمومنات"

کے الفاظ ارشاد ہوتے ہیں۔

سورۂ فتح آیت ۱-۲ میں ارشاد ہوتا ہے :-

"انّا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک"

یہاں بھی وہی لفظ ذنب موجود ہے۔

ایک بار رسول اللہ نے کسی اندھے کی بات نہ سنی اور اس سے منہ پھیر لیا۔ اس پر آپ کو اس طرح تنبیہہ کی گئی :-

"عبس و تولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ" (سورۂ عبس آیت ۱-۲-۳)

سورۂ برأۃ (آیت ۴۳) میں رسول اللہ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ :-

"عفا اللہ عنک لم اذنت لھم حتی یتبین لک الذین صدقوا وتعلم الکاذبین"

کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے بعض جنگوں میں رسول اللہ کا ساتھ نہ دیا تھا۔ لیکن رسول اللہ نے ان کو بغیر شمولِ جنگ کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ سے کہا گیا کہ جب تک سچے جھوٹوں کی تفریق و تصدیق نہ ہوئی تھی، کیوں انھیں اجازت دی گئی۔

سورۂ انعام کی آیت ۶۸ سے یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سے وہ نسیان بھی سرزد ہو سکتا تھا جسے عام طور پر شیطان سے منسوب کیا جاتا ہے[1]

آیات مذکورہ بالا کے مطالعہ سے دو باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ کی ذات لغزش، غلطی، نسیان یا بھول چوک سے مستثنیٰ نہ تھی اور دوسرے یہ کہ آپ کو آئندہ کا کوئی حال معلوم نہ تھا۔ ممکن ہے بعض حضرات اسے نبوت کی توہین سمجھیں

---

[1] واذا رأیت الذین یخوضون فی ایاتنا فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ۔ واما ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظالمین۔

لیکن حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ کی حقیقی عظمت وجلالت صرف اسی طرح ثابت ہوسکتی ہے پہلے ان کو ایک انسان اور پھر نبی سمجھا جائے۔

میں کبھی اس کا قائل نہیں ہوسکتا کہ رسول اللہ کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابیٔ ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت وارادہ کا تعلق ہے ایک رسولؐ کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوسکتا، لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے۔ یہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ رسولؐ اللہ کی ذات مرکز تھی، روحانی و مذہبی تعلیم کی بھی اور سیاسی رہنمائی کی۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھیے۔ کہ جس حد تک مذہب کا تعلق تھا، آپ کی ہر تعلیم وحی والہام کے ماتحت ہوتی تھی اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا۔ لیکن آپ کی سیاسی زندگی میں اس کا امکان تھا۔ کہ آپ سے کبھی کوئی فروگذاشت ہوجائے یا کوئی فیصلہ آپ ایسا کریں جو مناسب نہ ہو۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیات سے خود سیرۃ نبوی کے بعض واقعات سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ پھر جب خود ذاتِ نبویؐ کے متعلق غلطی یا لغزش کا امکان تھا تو خلفاء وائمہ یا اہل بیت کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ ان سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہ ہوسکتی تھی، کیونکر درست ہوسکتا ہے اتنی بحث کے بعد جواب کا ایک یہ پہلو واضح ہوجاتا ہے کہ اگر منجانب رسول اللہ وصایت جناب امیرؑ کو صحیح تسلیم کرلیا جائے۔ تو بھی اس کا امکان رہ جاتا ہے کہ رسول اللہ کا یہ انتخاب موزوں نہ رہا ہو یا یہ کہ صحابہ سے آپ کو خلیفہ نہ بنانے میں غلطی ہوئی ہو، مگر اس غلطی سے یہ نتیجہ تو نہیں نکل سکتا۔ کہ انھوں نے قصداً ازراہ عناد والنفاق آپ کے حقوق کو پامال کیا ہو تاہم میں جواب کے اس پہلو کو ترک کرکے ایک اور پہلو اختیار کرتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ امر تصفیہ طلب ہے کہ آیا خلافت کا مسئلہ مذہبِ اسلام سے تعلق رکھتا تھا یا سیاساتِ اسلام سے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق مذہب سے ہونا چاہیے، کیونکہ رسول اللہؐ کے بعد ان کی جانشینی کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور نہ اصولاً ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کا تعلق صرف سیاسیات سے تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کلام مجید اس مسئلہ میں ساکت ہے۔ یعنی رسول اللہؐ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا۔ اب اسی کے ساتھ واقعات و حالات پر بھی ایک نگاہ ڈالیے کہ ان سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہؐ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب امیرؑ خلیفہ قرار دیے جائیں۔ جیسا کہ آپ نے بارہا اشارتاً وکنایتاً کیا۔ بلکہ ایک حد تک صراحتاً اس کو ظاہر بھی کیا لیکن اسی کے ساتھ چونکہ اسلام جمہوری حکومت کا حامی تھا اور وہ مسئلۂ نیابت کی بنیاد خاندانی یا ذاتی وجاہت پر قائم کرنا نہ چاہتا تھا، اس لیے رسول اللہؐ کا اپنے بعد کسی کو نامزد کر جانا (علی الخصوص اس وقت جبکہ خدا کی طرف سے بھی کوئی ہدایت نہ پہنچی تھی) کوئی معنے نہ رکھتا تھا۔ اور اس نامزدگی کی حیثیت صرف ایک ذاتی رائے کی سی تھی جس کو وحی سے کوئی تعلق نہ تھا، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یوں تو بارہا رسول اللہؐ نے جناب امیرؑ کو ولی، مولیٰ، وصی وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا لیکن جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں خاموشی اختیار کر لی۔ اس وقت کا سب سے زیادہ اہم واقعہ جس سے حضرات شیعہ خلافت جناب امیرؑ پر استدلال کرتے ہیں، واقعۂ قرطاس ہے۔ اول تو اس کے وقوع میں اشتباہ ہے لیکن اگر اس کو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی اب یہ کیونکر یقین کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہؐ نے خلافت و نیابت ہی کا فیصلہ کرنے کے لیے کاغذ و قلم طلب فرمایا تھا۔ بلکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ مقصد کچھ اور تھا یا اگر یہی تھا تو آپ نے دوبارہ غور فرمانے کے بعد اس کو ملتوی کر دیا۔

واقعۂ قرطاس کے بعد فوراً رسول اللہؐ کا وصال نہیں ہوا۔ بلکہ ہوش و حواس کے عالم میں اتنا وقت آپ کو ملا کہ اگر آپ اس مسئلہ کا بحق جناب امیرؑ فیصلہ کرنا چاہتے تو عملاً کر سکتے تھے اور تمام اکابر صحابہ کو بلا کر اپنے سامنے حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت لے سکتے تھے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اگر رسول اللہؐ کی یہ خواہش کسی وحی الٰہی کا نتیجہ ہوتی تو آپ بلا پس و پیش نہایت صاف الفاظ میں اس کا اظہار کر جاتے اور وہ الفاظ کلامِ مجید میں بھی ہوتے۔ لیکن چونکہ اس مسئلہ کا تعلق مذہب سے نہ تھا۔ بلکہ مصالحِ سیاست سے تھا۔ اس لیے کلامِ مجید میں تو اس کا ذکر ہو ہی نہ سکتا تھا اور سیاسی حیثیت سے اس کا قطعی تصفیہ رسول اللہؐ نے اس لیے نہ کیا کہ اول تو یہ اسلام کی روح دستوریت کے خلاف ہوتا اور دوسرے یہ کہ آپ اچھی طرح واقف تھے کہ جناب امیرؑ کا خلیفہ بن جانا آسان نہیں ہے۔ اور ان کے اتنے مخالف موجود ہیں کہ اس پر اصرار کرنا سخت فتنہ و فساد کا باعث ہوگا۔

شیعی روایات کے لحاظ سے رسول اللہؐ کے وصال کے بعد حضرت علیؑ کے طرفداروں میں صرف تین شخص تھے (سلمان انصاری، ابوذر، المقداد بن الاسود الکندی) اگر واقعی تمام مہاجرین و انصار و اکابرِ عرب میں سے صرف تین اشخاص (بعض شیعی روایات کے مطابق دو چار اور) جناب امیرؑ کے طرفدار تھے، اور باقی سب مخالف، تو یقیناً آپ خلافت کے لیے نامزد ہو ہی نہ سکتے تھے اور اگر اس کی کوشش کی جاتی تو بھی کامیابی کی کوئی توقع نہ تھی۔ ممکن ہے کہ رسول اللہؐ نے انھیں حالات کو دیکھ کر آخر وقت میں سکوت فرمایا ہو۔ اور اس کا فیصلہ مستقبل پر چھوڑ دیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنی خواہش کا اظہار تو اپنی زندگی میں کر دیا تھا، لیکن یہ آپ کی ایک رائے تھی، حکم نہ تھا، آپ کی ذاتی خواہش تھی۔ فرمانِ خداوندی نہ تھا، گویا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ رسول اللہؐ کا حضرت علیؑ کو ولی و وصی وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرنا صرف یہ معنی رکھتا

تھا کہ اگر ان کے بعد خلافت کے لیے انتخاب عمل میں آئے تو ان کی رائے حضرت علیؓ کے حق میں شمار کی جائے۔ پھر یہ بھی آپ کی انتہائی فراست تھی کہ وصال کے وقت آپ نے اپنی جانشینی کا مسئلہ طے نہیں فرمایا۔ ورنہ ممکن ہے وہ فتنہ و فساد جو حضرت عثمان کے بعد شروع ہوا آپ کے وصال کے بعد ہی برپا ہو جاتا اور اسلام کی عمر اور زیادہ ناپائدار ثابت ہوتی۔

اب ایک صورت اور اس مسئلہ پر غور کرنے کی ہے یعنی یہ کہ خود حضرت علیؓ کے طرز عمل سے ہم کو کیا بات ظاہر ہوتی ہے۔ حضرات شیعہ کا اعتقاد ہے کہ ولایت و وصایت جناب امیرؑ کا اعلان رسول اللہؐ نے حسب فرمانِ خداوندی کیا تھا۔ یعنی نص قطعی سے آپ کی ولایت ثابت ہوتی ہے۔ درانحالیکہ کلام مجید میں کوئی آیت اس کی تائید میں نہیں ملتی۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہؐ کا یہ ارشاد ہی نصِ قطعی یا وحیِ متلو کی حیثیت رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے تمام اقوال کو وحیِ متلو نہ سمجھا جائے۔ اور حدیث و قرآن کے امتیاز کو اٹھا دیا جائے۔ حالانکہ حضرات شیعہ بھی قرآن و حدیث میں یہی وجہ امتیاز قائم کرتے ہیں۔ کہ ایک وحی متلو ہے اور دوسری وحی غیر متلو۔ یعنی ایک کا تعلق فرمانِ خداوندی سے ہے اور دوسرے کا رسول اللہؐ کی ذاتی رائے سے۔ ہم اس سے قبل ظاہر کر چکے ہیں کہ اس مسئلہ کا تعلق چونکہ نفسِ مذہب سے نہ تھا بلکہ سیاسیات سے تھا اسی لیے کوئی وحی متلو (قرآن مجید کے اندر) اس باب میں نہیں پائی جاتی۔ اور اگر حضرات شیعہ کے قول کو صحیح باور کیا جائے تو ہم کو حسب ذیل باتیں معارض نظر آتی ہیں۔

۱ ۔ اگر خلافت جناب امیرؑ کے متعلق کوئی نص قطعی موجود ہوتی تو اسے کلام مجید میں ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ نہیں ہے۔

۲ ۔ اگر واقعی فرمانِ خداوندی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ حضرات شیعہ سمجھتے ہیں تو علاوہ اس کے دیگر احکام کی طرح نہایت صاف و واضح الفاظ میں اس کا ذکر کلام مجید میں ہوتا

رسول اللہؐ خود اپنے سامنے ہی حضرت علیؑ کی باقاعدہ خلافت سب لوگوں سے تسلیم کرا کے رخصت ہوتے، حالانکہ یہ بھی تاریخ سے ثابت نہیں۔

۳۔ اگر کوئی خالص مذہبی مسئلہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ ضرور اس سے واقف ہوتے اور چونکہ وہ احکامِ مذہبی کے نہایت سخت پابند تھے اس لیے باوجود تمام مخالفتوں کے اپنی خلافت کی ضرور کوشش کرتے۔ لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کر لی تو آپ خاموش ہو رہے ہم تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کیے لیتے ہیں کہ آپ نے خود حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، لیکن آپ کا اس بیعت کو گوارا کر لینا اسی سے ظاہر ہے کہ آپ صحابہ کے تمام مشوروں میں شریک ہوتے تھے اور اکثر آپ کی رائے پر عمل بھی کیا جاتا۔ اگر حضرت علیؑ حضرت ابوبکر کو غاصب خلیفہ سمجھتے یا ان کی خلافت آپ کے نزدیک خلافِ منشاءِ خداوندی ہوتی تو کم ازکم آپ یہ ضرور کرتے کہ ان سے ہمیشہ کے لیے کٹ کر علیحدہ ہو جاتے اور مراسم موالات ترک کر دیتے۔ اگر جنگ کرنا مناسب نہ تھا، ممکن ہے کہ آپ نے مصلحتاً اس کو اس خیال کی بناء پر گوارا کر لیا ہو کہ حضرت ابوبکر ضعیف ہیں اور جب چند دن بعد ان کا انتقال ہو جائے گا تو پھر خلافت ان کو ملے ہی گی۔ لیکن حضرت ابوبکر کے بعد بھی ان کو اس کا موقعہ نہیں دیا جاتا اور وہ حضرت عمر کے دورِ خلافت میں بھی اسی رواداری و موالات سے کام لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان کا زمانہ آتا ہے اور حضرت علیؑ بدستور نہ صرف خاموش رہتے ہیں بلکہ ان کی بھی مدد کرتے ہیں۔ اگر یہ تمام زمانہ واقعی غاصبانہ دورِ خلافت کا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایسا مبغوض عہد تھا جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا تھا نہ اس کا رسولؐ۔ لیکن حیرت ہے کہ جناب امیرؑ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں

بسر کر دیا اور انھوں نے نہ کبھی کوئی صدائے احتجاج بلند کی اور نہ منشار خدا و رسولؐ کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

حضرت علیؑ اپنے اخلاق کی مضبوطی، اپنی غیر معمولی شجاعت و بہادری، اپنی اسلامی محبت، اپنی جذبۂ فدویت و قربانی کے لحاظ سے اتنے غیر معمولی انسان تھے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے متعلق یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ محض کسی دنیاوی مصلحت کی بنار پر دینی احکام کی پابندی میں انھوں نے کبھی تسامح سے کام لیا ہو۔ اس لیے حضرت علیؑ کا خلفار ثلاثہ کے زمانہ میں حد درجہ امن پسندانہ زندگی بسر کرنا اور سب کے ساتھ صلاح و مشورہ میں شریک ہونا سوائے اس کے اور کسی سبب کی بنا پر نہیں ہو سکتا۔ کہ آپ مسئلۂ خلافت کو خالص مذہبی مسئلہ نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو سیاسی معاملہ جان کر واقعات و حالات کے لحاظ سے اپنی خلافت پر زور دینا یا اس کے لیے کوشش کرنا مناسب خیال نہ فرماتے تھے۔

اس سے قبل ہم خود شیعی روایات کی بنا پر یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صرف انگلیوں پر گنے جانے والے چند نفوس حضرت علیؑ کے طرفداروں میں پائے جاتے تھے۔ اور چونکہ آپ خود بھی اس کو جانتے تھے کہ لوگ ان کی خلافت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ اس لیے سیاسی مصالح کے لحاظ سے آپ نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی اور رائے عامہ کے خلاف کبھی کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جو فتنہ وفساد کا باعث ہوتا۔ حضرات شیعہ جناب امیرؑ کے اس سکوت کو جس چیز سے چاہیں تعبیر کریں۔ لیکن میں اس کا سبب صرف یہ قرار دیتا ہوں کہ آپ صحیح معنے میں تعلیماتِ اسلام کے مقصد سے واقف تھے اور روح دستوریت یا رائے عامہ کے منافی کوئی کام کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ خلفار ثلاثہ کی خلافت کا مسئلہ رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد طے نہیں کیا گیا۔ خیر خلیفۂ اول کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت نازک تھا اور اگر رائے عامہ

حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس تعویق سے خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ لیکن حضرت عمر اور حضرت عثمان کی خلافت کے وقت یہ سبب بھی پیدا نہیں تھا اور یقیناً انکی خلافت نامزدگی کی صورت سے ہوئی جو تعلیمات اسلامی کے منافی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک عربوں میں اتنی صلاحیت پیدا نہ ہوئی تھی کہ وہ انتخابِ حکمران کے مسئلہ میں صحیح معنی میں دستوری حکومت کے نقطۂ نظر کو سمجھ سکتے۔ علاوہ اس کے جن ذاتی اثرات کے ماتحت یہ حضرات خلیفہ تسلیم کیے گئے وہ غالباً ایسے تھے کہ اگر رائے عامہ حاصل کی جاتی تو بھی شائد نتیجہ یہی نکلتا لیکن اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ نتیجہ کچھ اور پیدا ہوتا تو اب اس سے بحث فضول ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق مذہب سے تھا ہی نہیں اور جو کچھ ہوا وہ سب سیاسی مصالح یا سیاسی اختلافات سے متعلق تھا۔ جب غیر مذہبی معاملات میں لغزش و غلطی کا امکان رسول اللہؐ سے بھی تھا تو خلفاء کا کیا ذکر ہے ؟

اس سلسلہ میں ایک امر اور قابل غور رہ جاتا ہے وہ یہ کہ حضرت علیؑ کے طرفدار اتنے کم کیوں تھے ؟ اور ان کی خلافت کی راہ میں کون سے اسباب حائل تھے ؟

رسول اللہؐ کو جو تعلق جناب امیرؑ کی ذات سے تھا وہ کسی سے مخفی نہیں ۔ اور جو خدمات آپ نے انجام دیں وہ بھی سب پر عیاں ہیں۔ رسول اللہؐ کو آپ سے عشق تھا اور آپ بھی رسول اللہؐ کے ایسے فدائی تھے کہ کوئی دوسرا اس باب میں ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا پھر یہ فطرتِ انسانی ہے کہ جب ایک محبوب کے متعدد چاہنے والے ہوتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اپنا ہی درخور حاصل کرنا چاہتا ہے اور اگر اسے کسی خاص شخص سے زیادہ تعلق ہو جاتا ہے تو دوسروں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ رسالتمآبؐ جس خصوصیت کا اظہار جناب امیرؑ سے کیا کرتے تھے۔ اسے فطرتاً تمام صحابہ کے لیے باعث رشک ہونا چاہیے تھا۔ اور غالباً حقیقت سے انکار ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جو عزت جناب امیرؑ کی رسول اللہؐ کے دل میں تھی بالکل وہی دوسروں کی نگاہ میں تھی۔

اس کے علاوہ حضرت علیؓ کی طرف سے ایک عام جذبۂ ناپسندیدگی کا سبب یہ بھی تھا کہ غزوات میں سب سے زیادہ آپ ہی نے دشمنوں کو قتل کیا تھا اور شاید ہی کوئی خاندان یا قبیلہ ایسا ہو جو متاثر نہ ہوا ہو۔ ہر چند یہ جو کچھ ہوا سب اسلامی نقطۂ نظر سے تھا اور اس میں ذاتی اغراض و مقاصد کا مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن اہلِ عرب اپنی کینہ پرور طبیعت کی وجہ سے مجبور تھے اور یہ کانٹا ان کے دل سے کسی طرح نہ نکلتا تھا۔ آپ رسول اللہؐ کے بھائی تھے، داماد تھے، لیکن عربوں کی نگاہ میں بیٹی داماد کا رشتہ کوئی ایسا رشتہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ رسول اللہؐ کے بعد اس کا کوئی اثر پڑ سکتا۔ بہ نسبت ایامِ جاہلیت کے عہدِ اسلام میں عورت کی معاشرتی سطح کافی بلند ہو گئی تھی۔ لیکن نہ اتنی کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے بغیر کسی عذرِ صحیح کے دوسری شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا یا یہ کہ طلاق دینے میں کچھ پس و پیش کیا جاتا۔ شادی کرنا اور بیوی کو چھوڑ دینا ان کا روز کا مشغلہ تھا۔ اور وہ تعلقات جو نکاح کے سلسلہ میں قائم ہوا کرتے تھے صرف وقتی اہمیت رکھتے تھے اور ان کا کوئی پائدار اثر نہ ہوا کرتا تھا۔ اس لیے حضرت علیؓ کا داماد ہونا اہلِ عرب کے نزدیک کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا کوئی وزن ہوتا۔ رہ گیا رسول اللہؐ کا اپنی زندگی میں بارہا جناب امیرؑ کی خدمات کو غیر معمولی طور پر سراہنا اور ان کو مولیٰ، وصی یا ولی کے الفاظ سے یاد کرنا، سو اس کو کوئی مذہبی اہمیت تو دی نہیں گئی اور نہ دینا چاہیے تھی۔ اس سے الٹا نقصان اور یہ ہوا کہ لوگ آپ سے زیادہ جلنے لگے اور رسول اللہؐ کے وصال کے بعد آپ کے مخالفین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ حضرات شیعہ کے قول کے مطابق سوائے دو چار آدمیوں کے اور کوئی طرفدار آپ کا نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخِ اسلام کا یہ حد درجہ دردناک واقعہ ہے کہ رسول اللہؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی آپس میں اختلافات شروع ہو گئے۔ لیکن ایسا ہونا لازم تھا کیونکہ جس وقت تک رسول اللہؐ زندہ رہے اس وقت تک تو خیر کسی کو چون و چرا کا موقعہ ہی نہ تھا۔ مذہب و سیاست دونوں کی باگ آپ کے ہاتھ میں تھی لیکن آپ کے بعد ان دونوں میں

تفریق ہو جانا اور مختلف سیاسی اداروں کا قیام بالکل قدرتی امر تھا کیونکہ وحی کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو باہمی اختلافات کی صورت میں کسی خدائی فیصلہ کا اعلان کر کے سب کو خاموش کر سکتا۔

اس لیے رسول اللہؐ کے بعد مسئلہ خلافت میں تین جماعتیں تین مختلف رائیں رکھنے والی پیدا ہو گئیں۔ ایک شیعی جماعت جو اس بات کی قائل ہے کہ خلافت کے اولین حقدار جناب امیرؑ تھے اور اہلبیت ہی میں اس سلسلہ کو قائم رہنا چاہیئے۔ یعنی سوائے آلِ رسولؐ کے کوئی اور مستحق امامت و خلافت نہیں ہے۔ دوسری جماعت خارجیوں کی جو اس مسئلہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور ان کے نزدیک ایک حبشی غلام بھی خلیفہ ہو سکتا ہے اگر وہ اس کا اہل ہے۔ تیسری جماعت سنّیوں کی ہے جنھوں نے بین بین راستہ اختیار کیا۔ لیکن حقیقتاً وہ کچھ نہ تھا، یوں تو وہ اس امر کے قائل ہیں کہ خلافت خاندان قریش کے لیے مخصوص ہے لیکن عملاً انھوں نے ترک فرمانرواؤں کو بھی خلیفہ تسلیم کیا جن میں قریش کیا عرب کے کسی خاندان سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

حضرات شیعہ اس باب میں جن احادیث سے استناد کرتے ہیں ان سے اہلبیت کے مرتبہ کی بلندی ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن میں یہ کبھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا کہ اسلام جس نے جمہوریت کی بنیاد دنیا میں قائم کی وہ اس قدر تنگ نظر ہو سکتا ہے کہ سیادت و قیادت ابدالآباد تک صرف رسولؐ کے خاندان کے لیے مخصوص کر دے۔ مذہبِ اسلام کی خصوصیت اس کا جذبۂ مساوات ہے۔ یعنی وہ رنگ و نسل کا امتیاز مٹا کر تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانا چاہتا ہے اور وہ سطح صرف بلندئ اخلاق کی ہے۔ اس لیے امامت و خلافت کو آلِ رسولؐ کے لیے مخصوص کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ رسول اللہؐ نے بجائے جذبۂ جمہوریت کے شخصی و استبدادی حکومت کی حمایت کی۔ جو قطعاً روحِ اسلام کے منافی ہے۔ سنّیوں کا طرزِ عمل اس باب میں قطعاً غیر فیصلہ کُن ہے۔ وہ ایک طرف شیعوں کے بھی ہمنوا ہیں اور دوسری طرف خارجیوں کے بھی۔

یہاں غالباً اس بحث کا نہ موقع ہے نہ ضرورت کہ ان تینوں میں کس جماعت کی رائے جمہوریتِ اسلام کے مفہوم کے لحاظ سے زیادہ قابلِ قبول ہے۔ لیکن ان تینوں جماعتوں کی تاریخ پر نگاہ ڈال کر یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کس کو کب مذہبی حیثیت دی گئی، اور اتحادِ اسلامی کو سب سے زیادہ نقصان کس جماعت سے پہنچا۔

جس حد تک مذہب و اتحادِ اسلامی کا تعلق ہے اہلِ سنّت قطع نظر اس سے کہ وہ تعیینِ خلافت کے مسئلہ میں حق پر ہیں یا نہیں بڑی حد تک محفوظ ہیں، کیونکہ خلافت کے مسئلہ کو سب سے پہلے اجتماعی و مذہبی حیثیت سے دیکھنے والی وہی جماعت ہے۔ رسول اللہؐ کا انتقال ہوتا ہے۔ ایک جماعت حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرتی ہے جس کے اتباع میں سب لوگ (سوائے چند افراد کے) ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح اس سیاسی فیصلہ کو مذہبی حیثیت دے کر اتحاد و اجتماع کی ایک معقول صورت دے دیتے ہیں۔ ممکن ہے حضرت علیؑ نے اس کو پسند نہ کیا ہو لیکن انھوں نے بھی اس اجتماعی فیصلہ کا کافی احترام کیا اور اپنے حقِ خلافت کو نظر انداز کر دیا۔ اس وقت ایک مختصر سی جماعت چند افراد کی ضرور ایسی تھی جو اس فیصلہ سے خوش نہ تھی لیکن اس کو کوئی جداگانہ مذہبی حیثیت حاصل نہ تھی۔ بلکہ اسے ایک مختصر سا سیاسی ادارہ کہنا چاہیئے۔ جس کو ممکن ہے حضرت علیؓ کی دلی حمایت حاصل رہی ہو لیکن عملی حیثیت سے آپ نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔

ہو سکتا ہے کہ اس جماعت نے یہ خیال کیا ہو کہ حضرت ابوبکر کے بعد تو سوائے حضرت علیؑ کے کوئی دوسرا خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے چند دن اور انتظار کر لیا جائے۔ لیکن اتفاق کہیے یا فریقِ ثانی کا حسنِ تدبیر کہ حضرت علیؓ کو پھر بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی ظاہر ہے کہ اس دوبارہ ناکامی سے طرفدارانِ علیؓ کو زیادہ صدمہ پہنچنا چاہیے تھا اور پہنچا لیکن حضرت علیؓ نے پھر بھی اتحادِ اسلامی کے مقصد کو سامنے رکھ کر اس جماعت کو ابھرنے کا موقعہ نہ

دیا تیسری بار حضرت عثمان کی نامزدگی خلافت کے وقت پھر اسی ناکامی سے سامنا ہوا اور حضرت علیؓ نے پھر اسی صبر و سکون سے کام لیا۔ الغرض تینوں خلفاء کے دور میں طرفداران علیؓ کی جماعت کو صرف ایک سیاسی فریق کی حیثیت حاصل تھی اور اس نے کوئی مذہب کی صورت اختیار نہ کی تھی۔ جب حضرت علیؓ کا دورِ خلافت آیا اور آپ کے ہاتھ پر جمہور نے بیعت کی تو پھر طرفداران و غیر طرفداران علیؓ کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا تھا کہ اس کی بناء پر کوئی مذہبی تفریق قائم ہو سکتی۔ لیکن جس زمانہ میں آپ نے منصب خلافت قبول کیا وہ ایسا نازک و پُر آشوب زمانہ تھا کہ مذہبی تفریق سے زیادہ خطرناک سیاسی تفریق پیدا ہو گئی تھی۔ اور حضرت عثمان کی وجہ سے جو غیر معمولی اقتدار بنو امیہ کو حاصل ہو گیا تھا اس نے بجائے مذہب اسلام کے حکومت اسلام کی بنیاد ڈال کر اتحاد اسلامی کے شیرازہ کو منتشر کر دیا تھا۔ لیکن جہاں تک امکان میں تھا جناب امیر نے اسلام کی مذہبی روح کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور شاید وہ پوری طرح اس میں کامیاب ہو جاتے اگر جنگ صفین میں فریق ثانی کی سیاسی چال کامیاب نہ ہو جاتی۔

امیر معاویہ بظاہر بیعت سے انکار تو نہ کرتے تھے لیکن حقیقتاً وہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے بہانہ یہ ڈھونڈھا کہ پہلے قاتلانِ عثمان ان کے حوالہ کر دیے جائیں، اس کے بعد وہ بیعت کریں گے۔ حضرت علیؓ اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکتے تھے کیونکہ قاتلانِ عثمان کی تعیین اور ان کے خلاف شرعی ثبوت کی فراہمی ممکن نہ تھی۔ آخر کار اسی بات پر حضرت علیؓ اور امیر معاویہ میں جنگ ہوئی جو جنگ صفین کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کا سلسلہ کئی مہینہ تک قائم رہا اور اس میں شک نہیں کہ حضرت علیؓ کی کامیابی کے امکانات بہت قوی تھے۔ لیکن عمرو بن العاص کے مشورہ سے امیر معاویہ نے نیزوں پر کلام مجید بلند کر کے مصالحت کی گفتگو شروع کر دی اور جن لوگوں پر فیصلہ کا انحصار رکھا گیا تھا انھوں نے کھلم کھلا امیر معاویہ کا ساتھ دیکر دفعتہً

تاریخ اسلام کے رُخ کو پلٹ دیا۔ اس کا ایک خراب نتیجہ تو یہ ہُوا کہ حضرت علیؓ کی فوج میں سے ایک جماعت اس گفتگوئے مصالحت سے برہم ہو کر علیحدہ ہو گئی (جسے خوارج کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) اور اس نے اپنی بغاوتوں سے اتحادِ اسلامی کو جس قدر نقصان پہنچایا وہ اہلِ تاریخ سے مخفی نہیں۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ کی شہادت بھی اسی جماعت کے ایک فرد کے ہاتھ سے ہوئی۔ دوسرا نقصان یہ ہُوا کہ امارت و حکومت خاندانِ بنی امیہ میں منتقل ہو گئی اور اسلام میں ملوکیت کی بنیاد پڑ گئی جو قطعاً تعلیمات اسلام کے منافی تھی لیکن ابھی تک طرفدارانِ علیؓ نے ابھی تک کوئی علیحدہ مذہبی حیثیت قائم نہیں کی اور یہ تمام اختلافات بدستور سیاسی حیثیت اختیار کیے رہے۔ اس کے بعد جب امام حسنؓ کا انتقال ہُوا جس کو شہادت کہا جاتا ہے تو علویین کے جذبات اور زیادہ مشتعل ہوئے اور آخر کار جب امام حسینؓ کا مشہور واقعۂ قتل کربلا میں پیش آیا تو صورت ناقابلِ برداشت ہو گئی، اور اس وقت کی تمام ناکامیوں کا احساس اتنا شدید ہو گیا کہ طرفدارانِ علیؓ کی سیاسی تحریک نے مذہبی صورت اختیار کر لی اور وہ مطالبات جو پہلے صرف سیاسی حیثیت رکھتے تھے انھوں نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا، اور مسئلہ امامت اس حد تک جزوِ ایمان قرار پا گیا کہ جب تک کوئی اسے تسلیم نہ کرے نجاتِ اخروی ناممکن ہے۔ اس سے ایک نقصان تو ان کو یہ پہنچا کہ سیاسی مرکزیت ختم ہو گئی اور دوسرا یہ کہ مذہبی حیثیت سے "امام و امامت" کی تعبیریں اتنی مختلف کی گئیں کہ مذہبی یکجہتی بھی قائم نہ رہ سکی اور شیعہ جماعت اپنے عقائد کے لحاظ سے پارہ پارہ ہو گئی۔

ان کا ایک گروہ جو زیدی کہلاتا ہے وہ امام کو اس دنیا کا ایک انسان سمجھ کر اس کی رہنمائی کا قائل ہُوا۔

دوسرا گروہ امامی دبی زبان سے حلول کو بھی تسلیم کرنے لگا اور تیسرا گروہ جو غلاۃ کے نام سے موسوم ہے، کھلم کھلا امام کو خدا کا ایک جزو بلکہ عین خدا کہنے لگا۔ پھر اس کے

بعد جو اختلافات ان میں پیدا ہوئے ان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ طبرستان دوئم میں جو ریاستیں زیدیوں کی قائم ہوئیں وہ یمن کی زیدی ریاست سے بوجہ بُعد متحد الخیال نہ ہوسکیں اور عراق کے زیدی چونکہ دارالحکومتہ سے قریب تر تھے اس لیے انھوں نے تقیہ یا کتمان کو بھی اپنے عقائد میں شامل کرلیا۔

غلاۃ میں بہ لحاظ عقائد جو تفریق پیدا ہوئی وہ اس سے ظاہر ہے کہ قرامطہ، اسماعیلی نصیری، علی اللہی سب اس اجماع کے مختلف گروہوں کے نام ہیں اور پھر ان میں سے بعض جماعتیں ایسی رونما ہوئیں جنھوں نے امامت کے لیے اہل بیت ہونا بھی ضروری قرار نہیں دیا۔ مثلاً کیسانی جو محمد بن الحنفیہ کی امامت کے قائل ہیں یا حروفی جو فضل اللہ استرآبادی کو امام مانتے ہیں۔ شیعیانِ علیؓ میں سب سے زیادہ اہم جماعت وہ ہے جو امامیہ کے نام سے مشہور ہے، لیکن اس میں بھی وہی اختلافِ خیال نظر آتا ہے۔

ابتداءِ عہدِ اسلام یا خلفاء اربعہ کے وقت میں منصبِ امامت کے لیے جو قاعدہ مقرر تھا (خواہ اس کی پابندی کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو) یہ تھا کہ اس کا انتخاب جمہور کی رائے سے کیا جائے (بعد کو خوارج نے بھی یہی اصول اختیار کیا) رائے دہندگان کے لیے تین شرطیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ ثقہ ہو، دوسرے یہ کہ شریعت سے آگاہ ہو، اور تیسرے یہ کہ اس کی قوتِ فیصلہ و انتخاب صحیح ہو۔

امیدوارِ امامت کے لیے حسب ذیل صفات ضروری خیال کی گئیں :۔

(۱) ثقہ ہو (۲) شریعت کا اجتہادی علم رکھتا ہو۔ (۳) فصیح و بلیغ ہو (۴) سماعت و بینائی اور اعضاءِ جسمانی میں کوئی نقص نہ ہو (۵) معاملات کے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو (۶) جہاد کی ہمت و جرأت اس میں پائی جائے (۷) قریش میں سے ہو۔ حضرات شیعہ کے یہاں سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ وہ اہل بیت یعنی حضرت علیؓ اور جناب فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہو۔

حضرت علیؑ کی امامت کو وہ "نص قطعی" کے ماتحت قرار دیتے ہیں۔ اور آپ کے بعد امام حسنؑ کی امامت کے قایل ہیں کیونکہ حضرت علیؑ کے بڑے بیٹے وہی تھے اور ان کے خیال کے مطابق جناب امیرؑ کے نامزد کیے ہوئے بھی تھے اگر جناب فاطمہؑ کے صرف ایک ہی بیٹا ہوتا تو راستہ صاف تھا لیکن چونکہ آپ کے دو صاحبزادے تھے اس لیے امام حسنؑ کے بعد اختلاف پیدا ہونا قدرتی امر تھا کیونکہ اہل بیت ہونے کی حیثیت سے جس طرح امام حسینؑ کی اولاد مدعیٔ امامت ہوسکتی تھی بالکل اسی طرح امام حسنؑ کی اولاد بھی لیکن ایک بڑی جماعت نے امام حسنؑ کے بعد ان کی اولاد کو اس منصب کا مستحق نہیں جانا اور امام حسینؑ کے خاندان میں اس کو منتقل کر دیا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ امام حسنؑ نے بحق امیر معاویہ دعویٔ خلافت سے دستبردار ہو کر شیعیان علیؑ یا مخالفین بنی امیہ کی بڑی جماعت کو برہم کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ امام حسینؑ رسول اللہؐ سے قریب تر رشتہ رکھنے کی وجہ سے زیادہ اہلِ امامت کے تھے اور تیسرے یہ کہ (بروایت اہلِ شیعہ) امام حسنؑ ان کو نامزد بھی کر گئے تھے۔ علاوہ اس کے امام حسینؑ کی زندگی میں واقعۂ کربلا ایک ایسا اہم واقعہ رونما ہوا کہ اگر امام حسنؑ کی اولاد میں کوئی دعویدارِ خلافت و امامت ہوتا بھی تو امام حسینؑ کی اولاد کے مقابلہ میں انھیں کون پوچھتا۔ علی الخصوص ایسی حالت میں کہ ان کے بیٹے امام زین العابدینؑ یزدگرد (شاہِ ایران) کی بیٹی کے بطن سے تھے اور امام حسن کی کوئی بیوی اس مرتبہ کی نہ تھی۔

الغرض امامیہ جماعت کی مہتم بالشان شاخ وہی ہے جو سلسلۂ امام حسینؑ کی اولاد میں سلسلۂ امامت کی قائل ہے۔ اور اثنا عشری کہلاتی ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد ان کے بارہ اماموں کے نام سلسلہ وار یہ ہیں:-

(۱) حضرت علی مرتضیٰؑ (۲) امام حسنؑ المجتبیٰ (۳) امام حسینؑ الشہید (۴) امام

زین العابدین السجادؒ (۵) امام محمد باقرؒ (۶) امام جعفر صادقؒ (۷) امام موسی الکاظمؒ (۸) امام علی الرضاؒ (۹) امام محمد التقیؒ (۱۰) امام علی النقیؒ (۱۱) امام حسن العسکریؒ (۱۲) امام محمد المہدیؒ۔

لیکن اہل بیت میں سلسلۂ امامت کی قائل جماعت بھی کسی ایک خیال پر قائم نہ رہ سکی اور متعدد مختلف الخیال گروہ اس میں قائم ہو گئے۔ بعض اختلافات ذیل میں درج ہیں:۔

۱۔ امام حسن العسکریؒ کا انتقال نہیں ہوا، بلکہ آپ غائب ہو گئے ہیں اور پھر ظاہر ہوں گے۔

۲۔ امام حسنؒ بغیر اولاد چھوڑے ہوئے وفات پا گئے۔ لیکن آپ پھر زندہ ہو کر ظہور کریں گے۔

۳۔ امام حسنؒ نے اپنے بعد اپنے بھائی جعفرؒ کو خلافت کے لیے نامزد کیا تھا۔

۴۔ جعفرؒ نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

۵۔ حضرت علیؓ کے بعد ان کے بیٹے محمد الحنفیہ امام تھے۔

۶۔ امام حسنؒ کے ایک لڑکا آپ کی وفات سے دو سال قبل ہوا تھا جس کا نام محمد تھا۔

۷۔ امام حسنؒ کے ایک لڑکا ضرور تھا، لیکن وہ آپ کی وفات کے ۵ ماہ بعد پیدا ہوا۔

۸۔ امام حسنؒ چونکہ لاولد تھے اس لیے دنیا امام سے خالی ہو گئی۔

۹۔ امام حسنؒ کے ایک بیٹا تھا، لیکن اس کا حال معلوم نہیں۔

۱۰۔ امام کا پایا جانا ضروری ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ اولاد امام حسنؒ میں سے ہے یا نہیں؟

۱۱۔ سلسلۂ امامت امام علی الرضاؑ پر ختم ہو گیا اور آخری امام کا ہنوز انتظار ہے۔

۱۲۔ سلسلۂ امامت امام موسیٰ کاظمؑ پر ختم ہو گیا۔

۱۳۔ امام موسیٰ کاظمؑ کے بعد امامت آپ کے بڑے بیٹے احمد کی طرف منتقل ہوئی نہ کہ امام علی الرضاؑ کی طرف۔

۱۴۔ امام علی الرضاؑ کے بعد ان کے بیٹے محمد بہت چھوٹے تھے۔ اس لیے امامت کی تعلیم وہ اپنے باپ سے حاصل نہیں کر سکے۔

۱۵۔ امام محمد النقیؑ کے بعد بجائے علی النقیؑ کے موسیٰ مستحق خلافت تھے۔

۱۶۔ امام علی النقیؑ کے بعد بجائے حسن العسکریؑ کے دوسرے بیٹے جعفرؑ کو امام ہونا چاہیے۔

۱۷۔ امام حسن العسکریؑ نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی اس لیے امامت کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

۱۸۔ امام حسن العسکریؑ کا ایک لڑکا جعفر نامی کسی کنیز سے تھا، اس لیے آپ کے بعد اسے امام ہونا چاہیے۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اختلافات تھے۔ جن کی بنا پر کوئی جماعت سبعیہ کے نام سے موسوم ہوئی اور کوئی قطعیہ کے نام سے، کوئی واقفیہ کہلائی اور کوئی حماریہ، کسی نے جعفریہ کا لقب اختیار کیا اور کسی نے اسماعیلیہ۔ الغرض جب تک شیعہ جماعت صرف ایک سیاسی ادارہ کی حیثیت اختیار کیے رہی، اس میں ایک نوع کا اتحاد بھی پایا جاتا تھا، لیکن جب حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اس کو مذہبی رنگ پیش کیا گیا تو وہ یک جہتی بھی مفقود ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کبھی کوئی خالص شیعی حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ مغرب میں فاطمی حکومت کو بھی ہم شیعی حکومت اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ملک کے تمام افراد سنّی تھے۔

بحث کے اس حصہ سے میرا مقصود یہ دکھانا تھا کہ شیعی تحریک ابتدا میں نہ کوئی مذہبی تحریک تھی اور نہ اصولاً اسے مذہب اسلام سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بعد کو اسے مذہب کے رنگ میں پیش کر کے محض سیاسی اغراض کی بنا پر اسلام کے دو ٹکڑے کر دیے گئے۔

اسلام نام ہے صرف اعتراف وحدانیت و اقرار نبوت کا۔ اس میں نہ خلافت و امامت شامل ہے نہ کوئی اور چیز۔ اگر اہل سنت خلفاء کی موجودہ ترتیب کو درست و صحیح مانتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ حضرت علیؑ کے غیر معمولی فضائل اور ان کی وصایت سے منکر ہوں اور اگر حضرات اہل شیعہ خلافت کا اولین مستحق حضرت علیؑ کو قرار دیتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دیگر صحابہ کو کافر و منافق قرار دیں۔

اگر سنی، اسلام کی ضروری شرط یہ قرار دیتے ہیں کہ اعتراف توحید و رسالت کے ساتھ ہی ساتھ ترتیب خلافت کا بھی اقرار ضروری ہو تو میرے نزدیک وہ بھی اسلام سے ہٹے ہوتے ہیں۔ اور اگر شیعہ وصایت جناب امیرؑ اور معصومیت امام کی تصدیق جزوِ مذہب سمجھتے ہیں تو وہ بھی نا مسلم ہیں۔

* * *

اس تمام گفتگو کے بعد حسب ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:-

۱۔ جس حد تک روایات کا تعلق ہے، اخلاق و فضائل کے لحاظ سے حضرت علیؑ کا مرتبہ بہت بلند نظر آتا ہے۔ اور رسول اللہؐ کی روحانی خلافت کے لیے ان سے زیادہ موزوں کوئی اور نہ تھا۔ لیکن چونکہ رسول اللہؐ کے بعد بلافصل خود مختارانہ طور پر سیاسی خدمات انجام دینے کا موقعہ انھیں نہیں ملا۔ اس لیے اس امر کا فیصلہ کہ رسول اللہؐ کے بعد سیاسی جانشین ہونے کی حیثیت سے بھی آپ مرجح کا حق رکھتے تھے اب ممکن نہیں۔

۲۔ رسول اللہؐ یقیناً اپنے بعد حضرت علیؑ کی خلافت کے متمنی تھے۔ اور آپ نے

اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا۔ لیکن آپ کی اس خواہش کا تعلق وحی یا فرمانِ خداوندی سے نہ تھا بلکہ صرف آپ کی ذاتی رائے سے تھا اور اس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر حضرت علیؑ کی خلافت کا امکان ہو یا اُن کی خلافت کا مسئلہ بحث میں آئے، تو آپ کی رائے ان کے حق میں شمار کی جائے۔

۳۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حالات حضرت علیؑ کی خلافت کے مساعد نہ تھے اور اگر آپ خلافت کے دعویدار ہوتے تو کامیاب نہ ہوتے۔ اس حقیقت سے رسول اللہؐ بھی واقف تھے اور اسی لیے آپ نے باضابطہ طور پر کھلم کھلا اپنی وفات کے وقت حضرت علیؑ کے ہاتھ پر لوگوں کی بیعت نہیں کی۔ اور خود حضرت علیؑ بھی جانتے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے بھی نہایت خاموشی سے جمہور کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا اور کوئی مخالفانہ اقدام نہیں کیا۔

۴۔ اسلام کا مدعا چونکہ ملوکیت و تقدم شخصی کو مٹا کر جمہوریت کی روح پیدا کرنا تھا۔ اس لیے رسول اللہؐ یوں بھی اپنے بعد کسی کو قطعی طور پر خلیفہ نامزد نہیں کر سکتے تھے۔ چہ جائیکہ اپنے خاندان میں ہمیشہ کے لیے خلافت و امامت کو منحصر کر دینا کہ یہ کھلی ہوئی ملوکیت کی طرفداری تھی۔ اگر رسول اللہؐ ایسا کرتے تو ان میں اور دنیاوی فرمانرواؤں میں کوئی فرق نہ رہتا اور دنیا یہی کہتی کہ نبوت و رسالت کا یہ سارا ڈھونگ اسی لیے تھا کہ اپنے خاندان کے لیے سلطنت کی بنیاد قائم کر جائیں۔

۵۔ چونکہ رسول اللہؐ عالم الغیب نہ تھے اور مستقبل کا علم آپ کو حاصل نہیں تھا اس لیے آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اہل بیتؑ میں کون کس اہلیت کا پیدا ہوگا۔ اور وہ مستحق امامت و خلافت ہوگا یا نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ آلِ رسولؐ کا اصلح و مکمل انسان ہونا حقائقِ ثابتہ میں سے متصف ہونا چاہیے، حالانکہ یہ بالکل خلافِ واقعہ ہے۔

۶۔ چونکہ رسول اللہؐ سے (باوجود معصوم ہونے کے) امورِ غیر الہامی میں اجتہادی غلطی

کا امکان تھا۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ رسول اللہؐ کا انتخاب حالات مابعد کے لحاظ سے مناسب نہ رہا ہو یا اگر مناسب بھی رہا ہو تو خلفا ر نے اس کے سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ اور یہ غلطی ایسی نہیں جس کا تعلق مذہب سے ہو۔

۷ ۔ حضرت علیؓ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ آپ کی امامت "نصِ قطعی" سے ثابت ہے کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ کلام مجید اس باب میں بالکل ساکت ہے، اور "نصِ قطعی" نام ہے صرف قرآنِ پاک کا۔ احادیث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۸ ۔ شیعہ جماعت اوّل اوّل صرف ایک سیاسی جماعت تھی جس کا مدعا خلافت کو اپنے ذاتی مصالح یا خواہش نبوی کی بنا پر اہل بیتؑ میں منتقل کرنا تھا، اور امام حسینؓ کی شہادت تک اس کی حیثیت صرف ایک ادارۂ سیاسی کی سی رہی، لیکن واقعۂ شہادت کے بعد اس جماعت نے اپنے سیاسیات کو مذہبی رنگ دینے کے لیے بعض مخصوص عقائد متعین کر لیے جن کو تعلیمات مذہبِ اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔

۹ ۔ جمعیت اسلامیہ میں سب سے پہلے انتشار مذہبِ شیعہ نے پیدا کیا۔ اور پھر اس میں بھی باہمدگر اتنے اختلافات پیدا ہوگئے کہ وہ اپنا کوئی متحدہ سیاسی محاذ بھی نہ قائم رکھ سکا۔

۱۰ ۔ اہلِ تسنّن کو تسلیم کرنا چاہیے کہ رسول اللہؐ بے شک حضرت علیؓ کی خلافت کے متمنی تھے اور اہلِ تشیع کو ماننا چاہیے کہ رسول اللہؐ کی یہ خواہش بعض ناگزیر حالات و اسباب کے ماتحت پوری نہ ہوسکی۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ

۱۱ ۔ امامت و خلافت کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے حقیقتاً شیعہ سنی کی تفریق بالکل بے معنی ہے۔ اور ان دونوں کا اختلاف

صرف تاریخ و سیاست کا اختلاف ہے جو ایک علمی اختلافِ تحقیق سے آگے نہیں بڑھتا۔

نیاز فتحپوری

خلافت و امامت

نیاز فتحپوری
مدیر "نگار"

خلافت و امامت

اس مسئلہ پر پچھلے مہینے کے نگار میں جو محاکمہ میرا شائع ہوا ہے اسے خلافِ توقع سنی و شیعہ دونوں جماعتوں کے آزاد خیال افراد نے بہت پسند کیا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ متقشف حضرات مطمئن نہ ہوں گے اور نہ شاید کبھی ہو سکتے ہیں۔

میں نے جن نتائج کو اپنے مضمون میں پیش کیا ہے ان میں سے بعض جو حضرات شیعہ کے لیے قابلِ قبول ہیں اہلِ سنت کے نزدیک غلط ہیں اور جو سنیوں کے موافق ہیں وہ شیعوں کے نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اسی سلسلہ میں ان تمام مسائل کو بھی لے لیا جائے جو میرے مضمون کو پڑھنے کے بعد معرضِ بحث میں آ سکتے ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے۔ گناہ و خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش و نسیان یا اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و آئمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں؟

۲۔ انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں؟

۳۔ کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے؟ اگر تھے تو اس کا کیا ثبوت ہے؟

۴۔ قیامِ امامت کی ضرورت کیا ہے؟ اور صرف اہلبیتؑ میں اس سلسلہ کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے؟

۵۔ وصایتِ جنابِ امیرؑ ثابت کرنے کے لیے حضرات شیعہ کیا نصوصِ قطعیہ پیش کرتے ہیں؟

۶۔ امامت کا بارھویں امام پر ختم ہو جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟

۷۔ جو سلسلۂ امامت دوسرے شیعی فرقوں کے نزدیک صحیح ہے اس کو غلط قرار دینے کے لیے اثنا عشری جماعت کیا دلائل اپنے پاس رکھتی ہے؟

۸۔ امام مستور یا مہدی موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ۔

۹۔ ہر دو فریق کی روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں۔ اگر پڑا تو کیا؟

۱۰۔ مسئلہ خلافت کو اصل مذہبِ اسلام سے کیا تعلق ہے؟

۱۱۔ اسلام نے ہیئت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی خاندان کے لیے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں؟

چنانچہ میں ہر دو **مذاہب** کے علماء و اہلِ نظر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ نہایت سنجیدگی سے ان تمام مسائل پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور جہاں تک ممکن ہو ان روایات سے استدلال نہ کریں جن کا تعلق صرف خوش عقیدگی سے ہے اور درایتاً قابلِ قبول نہیں ہیں۔

میں اس بحث کے لیے زیادہ سے زیادہ اپریل سے دسمبر تک نو مہینے کی مہلت دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے حق حاصل ہوگا کہ تمام شائع شدہ مضامین کے مباحث و دلائل کو سامنے رکھ کر خود اپنی رائے پیش کروں اور بالکل ممکن ہے کہ آئندہ جنوری کا پرچہ صرف اسی موضوع کے لیے وقف ہو۔ (اگر ناظرینِ نگار نے اس کو پسند کیا)

میں اس دوران میں ایک استفسار بھی ہر دو مذاہب کے علماء سے کروں گا۔ اور جو جوابات مجھے موصول ہوں گے ان سے میں اپنے محاکمہ کے وقت کام لوں گا۔

خلافت و امامت

ہزنام

خلافت و امامت

اور

محترم مدیر ”نگار“ کا محاکمہ

مارچ ہی مارچ سال بھر اور اب جولائی تک چار مہینے اتنا عرصہ ہوا جب اس مسئلہ پر میرا سب سے پہلا مضمون شائع ہوا تھا۔

جو اصحاب یہ خیال رکھتے ہوں کہ میں نے نگار میں مضمون اس توقع پر لکھا تھا۔ کہ مدیر نگار میری رائے سے حرف بحرف موافقت ہی کر لیں گے وہ بالکل غلطی پر ہیں۔

میں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے شیعہ و سنی کسی جماعت سے کوئی جانبدارانہ تعلق نہیں ہے۔ اگر کسی جماعت کو میری آزادانہ تحقیق شیعی مذہب کے موافق نظر آئی ہو تو اس سے یہ سمجھ لینا کبھی صحیح نہیں تھا کہ میں شیعہ ہی ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ”سطحیت“ بہت زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ اور ان کی نگاہیں کسی مطلب کی گہرائی میں جانے سے انکار کرنے لگی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سنیوں میں میرے مضمون پر شور برپا ہوا اور اخباروں کی دنیا میں غلغلہ ہو گیا لیکن مدیر نگار کے محاکمہ پر ”اطمینانی سکون“ چھا گیا۔ گویا وہ سمجھے کہ ڈگری بالکل ہمارے موافق ملی۔

اس کے برخلاف شیعی جماعت اس وقت تک صبر و سکون کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کرتی رہی، جب تک کہ مسئلہ زیر بحث تھا۔ لیکن ادھر مدیر نگار کا محاکمہ شائع ہوا اور شیعی جماعت میں اضطراب پیدا ہو گیا، گویا تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کوئی مجھ غریب کو

کوسنے دے رہا ہے کہ اس نے نگار میں اس بحث کو شائع ہی کیوں کیا؟ کوئی نگار کے محاکمہ کا سخت سے سخت اور مناظرانہ جواب دینے کو آمادہ ہے۔

مگر مجھے اس سب پر مسرت ہے کہ میں نے تحقیقاتی بحث کا ایک دروازہ کھول کر علمی دنیا میں چہل پہل پیدا کر دی اور موجودہ صورتِ حال پر ہنسی آتی ہے کہ یہ نتیجہ الٹا کیونکر ہو گیا۔

میرے خیال میں مدیر نگار نے جہاں تک میرے زاویۂ بحث کا تعلق ہے، فیصلہ بالکل میرے موافق کیا ہے اور اگر میرے مضمون سے شیعی احباب متفق تھے تو اُنھیں فیصلہ کے اس جزو سے بالکل مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ اور جہاں سے مدیر نگار کا فیصلہ مخالف نظر آتا ہے وہ ایسا جزو ہے کہ اس پر سنیوں کو بھی اسی حد تک برافروختہ ہونا چاہیے تھا جس حد تک شیعوں کو۔

میرے مضمون کی حیثیت وہ ہرگز نہیں ہوسکتی تھی جو کسی شیعہ عالم کے قلم سے نکلے ہوئے مضمون کی جس میں مسئلۂ امامت پر خالص اعتقادی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ اسی لیے میرے مضمون میں کلامی دلائل اور عقلی براہین کا پتہ بھی نہیں ہے۔ میں نے تو صرف تاریخی حیثیت سے واقعات کی بنا پر یہ دکھلایا تھا کہ حضرت پیغمبرؐ کا منشا یہی تھا کہ حضرت علیؑ ان کے خلیفہ اور جانشین ہوں۔

اس صورت میں میرے خلاف فیصلہ ہونے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ ان واقعات کو صحیح نہ تسلیم کیا جاتا جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان واقعات کا نتیجہ وہ تسلیم نہ کیا جاتا جو میں نے قرار دیا ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ مدیر نگار کا فیصلہ ان دونوں جزوں میں میرے بالکل موافق ہے انھوں نے میرے پیش کردہ تمام روایاتِ تاریخی کو تسلیم کیا ہے۔ صرف ایک روایت واقعۂ قرطاس کے متعلق شبہ کیا ہے کہ "اس کا تعلق اول تو وصایت جناب

امیدؔ سے ہے بھی نہیں (کیونکہ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہؐ کاغذ و قلم منگوا کر کیا لکھوانا چاہتے تھے) اور دوسرے یہ کہ یہ حدیث اہلِ تسنن کے نزدیک قابلِ لحاظ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے خاص راویوں میں ایک یحییٰ بن سلیمان ہیں جو غیر ثقہ قرار دیے گئے ہیں دوسرے راوی قبیصہ ہیں جو بہت غلط گو سمجھے جاتے ہیں۔ تیسرے یونس بن زید ہیں جن کا حافظہ بھی ضعیف تھا اور جو غلط گو بھی تھے، چوتھے راوی علی بن عبداللہ ہیں جن کا شمار ضعفاء میں ہے۔ رہ گئے ایک اور راوی حضرت ابن عباسؓ۔ سو ان کا اس وقت وہاں موجود ہونا ثابت نہیں۔"

مجھے بہرحال مدیر نگار کی آزادرائے کا احترام ہے۔ لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ انھوں نے جو کچھ اس روایت میں تشکک ظاہر کیے ہیں وہ عام اہلِ سنّت کی جانب سے پیش نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ ان کے قواعد کی بنا پر روایت کا صحیح بخاری کے اندر متعدد طریق سے ہونا ہی اس کی صحت و وثاقت کے لیے کافی ہے۔ جس کے بعد راویوں کی جانچ پڑتال کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر اگر ہر ایک سند میں کوئی ایک راوی مجروح مان لیا جائے تو آخر تین چار الگ الگ راویوں کے طریق سے روایت کا وارد ہونا بھی تو ایک قابلِ لحاظ چیز ہے اور پھر جبکہ اس روایت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو غلط طور سے بیان کرنے کی کوئی مخصوص غرض ہو سکے جبکہ اس کے راویوں میں کوئی ضعیف ہو، غیر ثقہ ہو، غلط گو ہو مگر "رافضی" کوئی ایک بھی نہیں ہے۔ تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ صرف حضرت عمرؓ پر رسولؐ کی بارگاہ میں بے ادبی کا الزام لگانے کے لیے یہ روایت ایجاد کی گئی ہے۔ رہ گیا یہ امر کہ رسولؐ آخر لکھنا کیا چاہتے تھے؟ اس کو صراحت کے ساتھ تو میں بیشک نہیں دکھلا سکتا جبکہ وہ لکھا ہی نہیں گیا لیکن میں نے جس ترتیب کے ساتھ اس واقعہ کو اپنے مضمون میں درج کیا ہے اس سے حقیقت کا انکشاف ضرور ہوتا ہے۔ پھر جبکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ پیغمبرؐ اپنی تقریر میں "من کنت مولاہ فعلی

مولاہ" کہہ کر یہ فقرہ کہہ چکے تھے کہ:- انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی"۔

اور اس کے بعد دوات قلم مانگتے وقت آپ فرماتے ہیں:- "اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ" اس سے ضرور پتہ چلتا ہے کہ تحریر بھی اسی کے متعلق ہونیوالی تھی جس کے متعلق تقریر تھی۔ نیز حضرت عمر کا انکار کہ" ہمارے لیے کتاب خدا کافی ہے اور کوئی ضرورت نہیں" جبکہ مدیر نگار اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ رسولؐ کا منشا یہی تھا کہ حضرت علیؑ خلیفہ ہوں اور نیز یہ کہ دوسرے صحابہ کو یہ منظور نہیں تھا اور یہ بھی کہ دوسرے صحابہ حضرت علیؑ سے رشک کرتے تھے۔

بہرحال اس روایت سے قطع نظر کرتے ہوئے دوسری تمام روایات کو مدیر نگار نے تسلیم کیا ہے۔ اور آخر میں یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ:-

"جس حدتک روایات کا تعلق ہے میرے نزدیک حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہؐ کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت علیؑ آپ کے بعد جانشین قرار دیے جائیں۔"

بس، میں تو سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میرے مضمون کا تعلق تھا بحث یہاں پر ختم ہو گئی۔ حضرت رسولؐ کی دلی خواہش یہی تھی اور حضرت نے صحابہ کے لیے اس خواہش کو پورے طور پر ظاہر بھی کیا یقیناً" اور اگر ظاہر نہیں کیا تو ہم کو اور محترم مدیر نگار کو اس کی خبر کیوں کر ہوئی؟

اب یہ کہ آپ کی خواہش صحیح تھی یا غلط اور یہ کہ آپ کی خواہش کا پورا ہونا ممکن تھا یا نہیں؟

یہ تنقیحیں ہیں جواب قائم کی گئی ہیں اور نیز یہ کہ اگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تو کیا یہ کوئی مسئلہ ایسا اہم تھا جو تفریق مذاہب کا باعث ہو سکے؟

یہ چیزیں میری بحث سے خارج ہیں اور یقیناً اب یہ اعتقادی چیزیں ہیں جن پر ایک غیر مسلم شخص کو بحث کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں مسلمانوں کا عقیدہ رسولؐ کی نسبت یہ رہا ہے کہ آپ کا کوئی حکم اور کوئی امر حکم خدا کے خلاف نہیں ہوتا تھا اور یہ کہ آپ کی ہستی غلطی سے بالکل بلند ہے۔

اب اگر "مدیر نگار" اس مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں تو یہ ویسے بہت سے مسائل میں داخل ہے۔ جو عام مسلمانوں میں متفقہ حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن مدیر نگار کو اپنی "حریت رائے" کی بنا پر ان سے اختلاف ہے جیسے بہشت و دوزخ، ملائکہ، معجزات انبیاء وغیرہ وغیرہ۔

غالباً شیعی اصحاب کا بھی یہ خیال ہے کہ مسئلۂ امامت اور نبوت کا چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی اگر نبوت میں وہی معیاری حیثیت مسلّم رہی جس پر شیعوں کا عقیدہ ہے اور جو ایک حد تک دوسرے مسلمانوں میں بھی متفقہ ہے تو امامت کے مسئلہ کا شیعوں کے حسب دلخواہ طے ہونا ضروری ہے۔ بے شک اگر اصطلاحی نبوت ہی کے معنی میں تبدیلی ہو جائے اور عقیدۂ رسالت ہی اس شان پر باقی نہ رہے تو امامت بھی ختم ہے۔ اور شاید شیعوں کی جانب سے امامت کو "اصول دین" میں داخل کرنے کا بھی یہی منشا ہے۔ یعنی وہ اس کو نبوت کا ایک جزو لاینفک سمجھتے ہیں اور "ایمان بالنبیؐ" کے تحت میں اس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

⁂

یہ امر کہ مسئلۂ امامت کا تعلق مذہب سے ہونا چاہیے یا نہیں؟ میرے طے کرنے کا نہیں ہے لیکن جہاں تک میری سمجھ میں آتا ہے جبکہ محترم مدیر نگار حضرت پیغمبرؐ کی دو حیثیتیں تسلیم کرتے ہیں ایک معلّم مذہب ہونے کی اور دوسرے

حاکم و منتظم ہونے کی تو اس مسئلہ کا تعلق مذہب کے ساتھ اسی وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جانشینی کو صرف دوسرے جزو کے ساتھ مخصوص قرار دیا جائے جس کے بعد خلیفہ کی حیثیت سوائے بادشاہ کے کچھ نہیں ہو سکتی اور اس کے بعد ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر فرماں روا جس سے انتظام ملک ہو جائے وہ خلیفۂ رسولؐ سمجھا جانا چاہیے۔ یہاں تک کہ اعلیٰحضرت ملک معظم تاجدار برطانیہ اس وقت سب سے بڑے "خلیفۃ المسلمین" ہیں۔ اس واسطے کہ عالم اسلامی کا زیادہ حصہ ان کے زیر سلطنت و حمایت ہے اور امن و امان سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن اگر خلافت کا تعلق پہلے جُز سے بھی ہے۔ جیسا کہ اب تک مسلمانوں کا خیال رہا ہے۔ چنانچہ "خلافت" کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ: ۔ "النیابۃ عن النبی فی امور الدین والدنیا" تو اب مذہب کے ساتھ اس کا کھلا کھلا تعلق ہو جاتا ہے۔

اگر اس میں یہ مذہبی پیشوائی کی حیثیت قائم نہ رکھی جائے اور حضرات خلفاء کی حیثیت وہی رہ جائے جو اس وقت بادشاہ عراق یا ایران یا حجاز وغیرہ کی ہے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ شیعی اور سنی کا اختلاف باقی نہیں رہ سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرات اہل سنت اس کو گوارا نہیں کریں گے۔ وہ حضرات خلفاء کو مذہبی پیشوا بھی تسلیم کرانا چاہتے ہیں اور یہیں سے شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

یہ استدلال کہ "رسول اللہؐ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا"، ممکن ہے کہ درست ہو مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ اصحاب وحی کی ہدایت کو اس باب میں قرآن مجید سے بہت شد و مد کے ساتھ ثابت کرتے ہیں اور علمائے اہل سنت ہی کے روایات سے اس کی تفسیر بھی پیش کرتے ہیں۔

کاش اس مسئلہ پر اب کسی شیعہ عالم کی طرف سے بھی اظہارِ خیال کیا جائے جسے میرے خیال میں مدیر نگار بخوشی شائع کریں گے تاکہ بحث کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔

* * *

مجھے بے شک صرف اپنی اتنی ہی ریسرچ کی بنا پر جسے میں نے اپنے گذشتہ مضمون میں پیش کر دیا ہے۔ اور جس پر مجھے خوشی ہے کہ محترم مدیر نگار نے مہرِ تصدیق بھی ثبت کر دی ہے۔ تھوڑا سا اختلاف محترم مدیر کے اس فیصلہ سے ہے کہ رسول اللہؐ چاہتے ضرور تھے کہ جناب امیرؑ خلیفہ قرار پائیں مگر آپ نے اس کا اعلان نہیں کیا اور اس کی ذمہ داری خود اپنے اوپر نہیں لی۔

جبکہ ہمارے سامنے ہے یہ واقعہ کہ بعیت عشیرہ میں رسولؐ نے اعلان کیا۔ "فایکم یوازرنی علیٰ ھٰذا الامر علیٰ ان یکون اخی ووصیی وخلیفتی فیکم" "کون تم میں سے میرا ساتھ دیتا ہے اس شرط پر کہ وہی میرا بھائی میرا ولی عہد اور میرا جانشین قرار پائے۔" علیؑ اٹھے اور کہا کہ میں آمادہ ہوں۔ حضرتؐ نے یہ سن کر فرمایا کہ: "دیکھو یہ ہے میرا بھائی، میرا وصی اور جانشین۔"

اب بتلائیے کہ اگر روحِ جمہوریت اسی کی مقتضی تھی کہ رسولؐ اس معاملہ کو اپنے ذمہ نہ رکھیں اور عام مسلمانوں پر چھوڑ دیں تو آپ کو خواہ مخواہ یہ سبز باغ دکھا کر اپنی نصرت کا وعدہ لینے کی کیا ضرورت تھی اور یہ معاہدہ کرنے کا حق کونسا تھا؟

اب سوائے اس کے کہ "نیرنگی صاحب" کی طرح اس کو صرف "حوصلہ افزائی" پر مبنی قرار دیا جائے اور کیا چارہ کار رہے؟ مگر اس معاملہ میں مدیر نگار فرما چکے ہیں۔ کہ "یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر نہ کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ جسے رسول اللہؐ سے منسوب [illegible] ہوتا ہے۔"

یہ ابتدائے رسالت کا قصہ تھا اور انتہائے رسالت میں خطبۂ حجۃ الوداع (جس میں محترم مدیر نگار کے الفاظ میں) رسول اللہؐ نے اپنے وصال کی خبر دیتے ہوئے کہا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" "میں جس کا مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولیٰ ہے" اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسرے میری عترت، میرے اہل بیتؑ اور انھیں دونوں کی پیروی کرنا چاہیئے"۔

اب آپ ملاحظہ کیجئے کہ یہ اعلان نہیں تو اور کیا ہے یہ آخری تقریر ہے، جو رسول اللہؐ نے اتنے بڑے مجمع میں کی۔ اس کے بعد آپ دو مہینہ سے زیادہ زمانہ نہیں رہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کہاں تک حق بجانب ہے کہ "رسول اللہؐ نے جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو اس باب میں خاموشی اختیار کر لی" لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد اور زیادہ قریب زمانہ میں بھی رسولؐ نے سکوت نہیں کیا۔ اسوقت جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ جبکہ آپ کے وصال میں صرف چند روز باقی تھے، اس موقع پر بھی آپ نے تقریر کی اور فرمایا:۔ "اے لوگو بہت قریب ہے وہ وقت کہ میں دنیا سے اٹھ جاؤں اور تم سے رخصت ہوں میں نے اس سے قبل تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے اور حجت تمام کر دی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمھارے درمیان خدا کی کتاب اور اپنی عترت اہل بیتؑ کو چھوڑے جاتا ہوں" یہ کہہ کر حضرت نے جناب امیرؑ کا ہاتھ پکڑا اور اسے بلند کر کے فرمایا:۔

> "علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ، یہ دونوں جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں۔ میں ان سے دریافت کروں گا کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا"۔

(صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۵)

دیکھے جائیں یہ الفاظ کہ:۔ قد قدمت الیکم القول معذرۃ الیکم"

"میں تم سے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔ اور حجت تمام کر دی ہے"

اس کے بعد پھر بھی کہا جاتا ہے کہ رسولؐ نے اعلان کیوں نہ کر دیا۔ بے شک اس کے بعد صرف ایک ہی چیز باقی تھی اور وہ تحریر۔ اس کا رسولؐ نے بندوبست کرنا چاہا جس کا صحیح بخاری میں واقعۂ قرطاس کی صورت میں تذکرہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کیا معلوم حضرت کیا لکھنے والے تھے؟ بیشک کیا معلوم لیکن اگر لکھنے دیا گیا ہوتا آپ کو جو کچھ لکھنا چاہتے تھے تو کیوں کسی کو یہ کہنے کا موقع ملتا۔ کہ آپ خلافت ہی کے لیے لکھنا چاہتے تھے۔

حضرت رسول اکرمؐ کے بار بار وہ الفاظ کہ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں جن سے تمسک کی صورت میں تم گمراہ نہ ہوگے۔ اور پھر آپ کا یہ کہنا کہ "ایسا نوشتہ لکھ دوں جس پر عمل کرنے سے تم گمراہ نہ ہو" اور پھر حضرت عمر کا یہ فقرہ کہ "ہم کو بس کتابِ خدا کافی ہے اور کسی بات کی ضرورت نہیں" کیا اس کے یہی معنی پیدا نہیں ہوتے کہ حضرت عمر کو اپنی فراست کی بناء پر یہ یقین ہو گیا تھا کہ آپ وہی لکھنے والے ہیں جو آپ بہت دفعہ کہہ چکے ہیں۔ جس میں آپ نے کتابِ خدا کے ساتھ اپنی عترت اور اہل بیتؑ کو ضم کیا ہے۔ اور ان دونوں کی پیروی کو ذریعۂ نجات قرار دیا ہے۔ اور اس کی بنا پر آپ نے یہ کہا کہ ہمارے لیے تو بس کتابِ خدا کافی ہے۔ یعنی کسی دوسرے جُز کی ہم کو ضرورت نہیں ہے۔

یقیناً ایک غیر متعلق اور بے غرض انسان مذکورہ صورتِ حال اور حضرت عمر کے اس فقرہ پر غور کرنے سے سوائے اس نتیجہ کے کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔

بے شک واقعۂ قرطاس کے بعد فوراً رسول اللہؐ کا وصال نہیں تھا بلکہ ہوش و حواس کے عالم میں اتنا وقت ملا کہ آپ اس کی تکمیل کر سکتے تھے لیکن حضرت عمر نے جن مدبرانہ الفاظ کے ساتھ اختلاف فرمایا تھا۔ (جن کا صحیح بخاری میں تذکرہ موجود ہے)

ان کے بعد کوئی محل آپ کو اپنی خواہش کے پورا کرنے کا باقی نہ رہا تھا۔

وہ یہ کہ آپ نے فرمایا تھا کہ رسولؐ پر مرض کا غلبہ ہے جس سے آپ کے ہوش و حواس جا چکے ہیں۔"

بعض روایات میں یہ فقرہ ہے کہ "ان الرجل لیہجر" "آپ پر ہذیان کی کیفیت ہے۔" آپ کے اس فقرہ کا حاضرین پر بھی یہ اثر پڑ گیا تھا کہ بعض لوگ کہتے تھے کہ رسولؐ جو کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ قلم دوات حاضر کر دو اور بعض لوگ کہتے تھے کہ نہیں بات وہی ہے جو حضرت عمر نے ارشاد کی یعنی واقعی رسولؐ کے ہوش و حواس درست نہیں رہے۔ اب آپ فرمائیے کہ اس کے بعد رسولؐ کو کب موقع تھا کہ کچھ تحریر کراتے اور اگر کچھ لکھواتے بھی تو وہ مستند کب سمجھا جاتا جب کہ بخیال حضرات "بحالتِ صحت نفس و ثبات عقل" کی شرط ہی مفقود تھی۔

میں اپنے مسلمان اصحاب اور خصوصیت کے ساتھ سنّی احباب سے معذرت چاہتا ہوں۔ میں تو تاریخی واقعات سے دیکھ رہا ہوں کہ غدیر خم کے واقعہ کے بعد ایک مکمل سازش ہو گئی تھی کہ رسولؐ کا مقصد کامیاب نہ ہونے دیا جائے اور اس سازش کے ارکان اتنے اندرونی تھے کہ رسولؐ اپنے بستر بیماری پر بھی ان کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ اور خود حضرت کو بھی اس سازش کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی سازش کے توڑنے کے لیے آپ نے لشکرِ اسامہ کے بھیجنے کا بندوبست کیا تھا اور نام بنام تمام مضر عناصر سے چاہا تھا کہ فضا کو صاف کر دیں۔ اور اس کے لیے اتنے تاکیدی احکام نافذ کیے تھے کہ "خدا کی لعنت ہے اس پر جو لشکرِ اسامہ میں نہ جائے۔" مگر آپ کی حکم عدولی کی گئی جس کے بعد آپ کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

محترم مدیر نگار نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ بیشتر صحابہ کو حضرت علیؑ سے رشک و رقابت اور عداوت تھی اور مختلف وجوہ کی بنا پر آپ کے خلاف متفق تھے۔

اس صورتِ حال میں وہ فرماتے ہیں کہ علیؑ کا خلیفہ قرار پانا غیر ممکن تھا۔ بیشک غیر ممکن تھا لیکن اس سے تمام اصحاب الزام سے بری تو نہیں ہو جاتے۔

فرض کیا جائے کہ ایک بادشاہ، رئیس، امیر کبیر کے تمام ملازمین اس کے فرزند کے قتل کرنے پر متفق ہو جائیں۔ یقیناً اس کا قتل ہو جانا اس صورت میں ناگزیر ہے لیکن کیا اس بناء پر قاتل بالکل بری قرار پائیں گے؟

اس صورت میں کیا جماعت مسلمین عقیدت مندان رسولؐ کو آزادانہ طور پر واقعات کی جانچ کرنے کے بعد اس کا اقرار نہیں کرنا چاہیے تھا کہ جو کچھ ہوا وہ رسولؐ کی مرضی کے خلاف ایک متفقہ بندوبست کا نتیجہ تھا۔ جو قابلِ افسوس ہے۔ نہ یہ کہ اس کے برخلاف "الصحابۃ کلھم عدول" صحابہ سب کے سب عادل ہیں کے کلیے بنا لیے جائیں اور غزوۂ بدر، بیعتِ شجرہ وغیرہ کے پیغاموں کو بلا استثنا، سب کے رستگار و نیکوکار ہونے کی قطعی سند قرار دے لیا جائے اور "اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم" کی سی روایتوں کو رسولؐ کی زبانی بیان کرکے ہر ایک کی پیروی کو ذریعۂ نجات سمجھ لیا جائے۔

محترم مدیر نگار کو یہ تسلیم ہے کہ خلفائے ثلثہ کی خلافت کا مسئلہ رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد طے نہیں کیا گیا۔ لیکن جن ذاتی اثرات کے ماتحت یہ حضرات خلیفہ تسلیم کیے گئے وہ غالباً ایسے تھے کہ اگر رائے عامہ حاصل کی جاتی تو بھی شاید نتیجہ یہی نکلتا۔"

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ "ذاتی اثرات" رسولؐ کے منشاء کی موافقت میں کام نہیں آ سکتے تھے۔ اور جب ایسا نہیں ہوا تو مخالفتِ رسولؐ کی ذمہ داری کیا اب انہی "ذاتی اثرات" والی ہستیوں پر عاید نہیں رہ جاتی؟ اور کیا اس صورت میں ان لوگوں سے اظہارِ اختلاف صرف رسولؐ کے ساتھ بجا (یا بیجا) عقیدت کا نتیجہ قرار نہیں پاتا لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاملہ بالکل برعکس ہو گیا یعنی حضرات اہلِ سنت محبت رسول اللہؐ کے تنہا دعوے دار بن گئے اور شیعہ جماعت کے متعلق یہ خیال قرار دے دیا گیا کہ ان

کو رسول اللہؐ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

پھر جب کہ پیغمبرؐ نے اپنے اُنہی اظہارات میں (جنھیں محترم مدیر نگار بھی اعلان نہیں لیکن اظہار رائے کی حد تک صحیح سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کا منشا یہ تھا کہ اگر انتخاب کی نوبت آئے تو رسولؐ کا ووٹ علیؑ کے حق میں سمجھا جائے) اس مسئلہ کو کسی خالص دنیاوی پہلو کے اعتبار سے نہیں پیش کیا بلکہ اسے گمراہی سے بچنے کا وسیلہ اور نجات کا ذریعہ بتایا تھا جیسا کہ (لن تضلوا) کے الفاظ بتا رہے ہیں۔ نیز یہ کہ "میں روزِ قیامت دریافت کروں گا کہ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟"

تو اب بتائیے کہ اس چیز کو مذہب سے الگ اور اخروی جزا و سزا سے غیر متعلق کیونکر قرار دیا جائے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے اپنے دوسرے مضمون میں تحریر کیا ہے اس وقت مسلمانوں کے لیے مسئلہ خلافت کا عملی پہلو صرف اس قدر ہے۔ کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایانِ دین کو اپنا رہنما قرار دیں اور ان کے تعلیمات پر عمل کریں۔

اگر یہ مسئلہ اس وقت بھی طے پا جائے اور تمام اہلِ اسلام متفقہ حیثیت سے عترتِ رسولؐ کی مذہبی پیشوائی کو قبول کر لیں۔ اور احکام و تعلیماتِ مذہبی میں انھی کے تعلیمات کو مستند سمجھنے لگیں تو پھر کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لیے کہ خلافت بمعنی بادشاہت تو ایک وقتی چیز ہے۔ جس کے احکام انتظامی حیثیت رکھتے ہیں جن کا کوئی تعلق آئندہ نسلوں کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر حضرات خلفاء کی حکومت کو اس حیثیت سے ان کے زمانہ میں تسلیم بھی کیا جائے۔ تو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ اس کا کوئی عملی یا اعتقادی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور اس لیے موجودہ زمانہ میں شیعہ اور سنی تفریق کا کوئی سبب باقی نہیں رہتا۔ خدا کرے مدیر نگار کی کوشش کامیاب ہو اور مسلمانوں کی یہ باہمی تفریق دور ہو کر ایک مذہب قرار پائے جس کو کہا جا سکے "حقیقی اسلام"

بس مجھے اب اس سلسلہ میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ مدیر نگار نے جو تنقیحات قائم کیے ہیں ان پر اہل سنّت اور شیعہ مذہب کے علماء کو بحث کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ زاویۂ بحث اب ایسے نقطہ پر پہنچ گیا ہے۔ جو ایک "ہندو" کے دسترس سے باہر ہے۔

"ہرنام"

(**نگار**) گزشتہ فروری کے نگار میں مسئلہ خلافت و امامت پر میرے محاکمہ کی اشاعت کے بعد اس وقت تک متعدد مضامین شیعہ و سنی حضرات کے موصول ہوئے لیکن ان کو شائع نہیں کیا گیا کیونکہ جو طریق استدلال ان میں اختیار کیا گیا ہے وہ یا تو یکسر مجادلانہ ہے یا پھر اس انداز کا جو اس سے قبل بارہا استعمال ہو چکا ہے اور ناکام ثابت ہوا ہے۔

جس حد تک روایات کا تعلق ہے یقیناً حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہؐ جناب امیرؑ کی خلافت چاہتے تھے اور اپنی اس خواہش کا آپ نے اظہار بھی فرما دیا تھا۔ اہل سنّت دیگر خلفاء کے صرف فضائل بیان کر کے اس حقیقت کے مٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ سوال خلافت کا ہے نہ کہ محض فضیلت کا۔ اسی کے ساتھ اہل سنّت کا مناظرانہ پہلو اس لیے اور بھی زیادہ کمزور ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے شیعہ روایات سے ثابت نہیں کر سکتے اور شیعی حضرات خود اہل سنت کی روایات سے حضرت علیؑ کی وصایت و خلافت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔ اس لیے اب اس مسئلہ پر بحث کرنا کہ رسول اللہؐ حضرت علیؑ کو اپنا جانشین و خلیفہ بنانا چاہتے تھے یا نہیں، بیکار ہے

ضرورت اس امر کی ہے کہ (اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد) نفسِ مسئلۂ امامت پر گفتگو کی جائے یعنی یہ کہ اس کی اہمیت مذہبِ اسلام میں کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ کہ کیا جناب امیرؑ کی امامت واقعی منصوص تھی یا نہیں۔

اسی لیے میں نے ماہ مارچ ۳۶ء کے نگار میں چند مباحث متعین کر دیے تھے اور چاہتا تھا کہ شیعی علماء اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک کسی نے توجہ نہیں کی۔

اب جناب ہرنام کا (جو اس تحریک کے بانی ہیں) یہ دوسرا مقالہ شائع کیا جا رہا ہے، وہ بھی میرا محاکمہ دیکھنے کے بعد اب اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ میں پہلے شیعی علماء سے درخواست کروں گا کہ وہ ان تمام مباحث کو سامنے رکھ کر جو ماہ مارچ ۳۶ء کے نگار میں درج کیے گئے ہیں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور اس کے بعد سنّی علماء کو متوجہ کروں گا کہ وہ جواب دیں۔ لیکن دونوں فریق سے میری التجا یہی ہے کہ جو کچھ وہ لکھیں اس میں کوئی مجادلانہ پہلو نہ ہونا چاہیئے۔ نیز یہ کہ روایتی استدلال میں وہ صرف فریقِ مخالف کی کتابوں کو سامنے رکھیں۔ ورنہ یوں تو اپنی اپنی روایات کو سامنے رکھ کر ہمیشہ سبھی نے بحث کی ہے اور اسی لیے معقول نتیجہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔

خلافت و امامت

مولانا فاروق کانپوری

علیؑ تمام صحابہ سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے" اس حقیقت کو بے لوث تحقیقی نگاہ سے جانچنے کے لیے ایک بہترین طریقہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مستشرقین یورپ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم یہاں صرف نکلسن کے الفاظ کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو تقریباً تمام ذی رتبہ مستشرقین کی آراء کی طرف سے نمائندگی کرسکتے ہیں:۔

"حضرت علیؑ میں ایک حکمران ہونے کے علاوہ اور تمام صفات موجود تھیں"[1]

اس کے بعد ہمارے سامنے جو چیز ابوبکر و عمر کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کے شرف و فضیلت کا صحیح معیار پیش کرسکتی ہے وہ ان دونوں کے عہدِ خلافت کا مقابلہ ہے۔

خلفاء کی زندگی کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جواب ہونا چاہیئے تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقابلہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے۔ اس لیے "مویدین امامت" نے اس میدان میں اپنی شکست کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنی رزمگاہ کے دو اور میدان تلاش کیے ہیں۔ یعنی ایک تو یہی کہ آیا خلافت کے مفہوم میں سیاست داخل ہے یا نہیں اور دوسرے یہ کہ نبی کریمؐ کے اقوال سے حضرت علیؑ کی بے انتہا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ پہلے مسئلہ پر ایک اجمالی تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس لیے اب ہمارے سامنے صرف دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے یعنی یہ کہ خود نبی کریم کے اقوال سے حضرت عمر و ابوبکر کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کی کیا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں "مویدین امامت" انا مدینۃ العلم وعلیؑ بابہا کی حدیث کو نہایت شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عمر کے متعلق صحیح بخاری کی ان احادیث کو ملاحظہ فرمایا جائے:۔

> رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں میرے سامنے کچھ لوگ پیش کیے گئے جو کرتے پہنے ہوئے تھے ان میں سے کسی کا کرتہ سینہ تک تھا کسی کا اس کے نیچے۔ پھر عمر میرے سامنے لائے گئے

---

[1] لٹریری ہسٹری آف عرب مصنفہ نکلسن صفحہ ۱۹۱

مسئلۂ خلافت و امامت[۱]

مکرمی ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

معزز رسالہ نگار لکھنؤ میں کسی ہرنام صاحب نے جن کے نام کی ہیئت ترکیبی ہرنام کو اپنے اندر پناہ دے رہی ہے بحیثیت ایک غیر مسلم کے مسئلۂ خلافت پر روشنی ڈالی ہے اور اخیر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ خلافت کا مسئلہ تو رسول اللہ کے زمانہ سے طے تھا، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ابتدا ہی سے ولی عہد تھے، پھر مسلمانوں کو اس میں اس قدر لڑنے اور باہمی بحث و مباحثہ کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ صاحب مضمون کے چہرہ پر اگر "تقیہ" کا کوئی حجاب نہیں ہے تو یقیناً مجھ کو ان سے ہمدردی ہے کہ خالص ہندو ہو کر ایک مخینث اسلامی مسئلہ کے حل پر وہ کس طرح تیار ہو گئے اور پھر کتنی محنت اور وقت سے ان حوالوں کو یکجا کیا، جو مختلف ضخیم ماخذوں میں جابجا پھیلے پڑے ہیں۔ اس علم دوستی اور ذوق تحقیق کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

ہرنام صاحب نے مضمون لکھنے کو تو لکھا اور بڑی محنت سے لکھا لیکن وہ جستجو اور تلاش کے سلسلہ میں "اسلامی فن روایت" اور اس کے اصول و فروع کو بالکل نظر انداز کر گئے، جس کی وجہ سے ان کو اپنے ہر دعوے میں جگہ جگہ ٹھوکریں کھانا پڑی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے تقریب التہذیب، استیعاب، اسد الغابہ، تاریخ کبیر، تاریخ کامل، تاریخ ابو الفداء، لباب التاویل، معالم التنزیل، مواہب لدنیہ، تاریخ خمیس

---

[۱] رسالہ فاران بجنور، اپریل ۱۹۲۵ء

صواعق محرقہ، خصائص، ریاض النضرہ، طبقات کبریٰ، تاریخ الخلفاء، مدارج النبوۃ جامع البیان، تفسیر کبیر، موطا، سیرۃ ابن ہشام، روض الانف وغیرہ سے استناد کیا ہے۔ جو رجال، سیر، تاریخ اور تفسیر کی مشہور کتابیں ہیں اور مشہور علماء اسلام کی لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ بھی تو ایک واقعہ ہے کہ ان کتابوں میں ہزاروں موضوع اور ضعیف روایتیں موجود ہیں، جن پر اہم مسائل کے فیصلہ میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ ان میں سے ہر کتاب میں ایک ایک مسئلہ کے متعلق مختلف اقوال درج ہیں اور ایک لکھنے والے کو اس کا موقع میسر ہے کہ ان میں سے جو قول چاہے لے لے اور جس کو چاہے چھوڑ دے۔ مثلاً یہی مسئلہ کہ سب سے پہلے آنحضرتؐ پر کون ایمان لایا ان کتابوں سے طے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے متعلق مختلف روایات ہیں بعض روایتوں میں حضرت ابوبکرؓ کا نام ہے بعض میں حضرت خدیجہؓ کا، بعض میں حضرت علیؓ کا، اور بعض میں حضرت زید بن حارثہؓ کا، یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا وہ اس مسئلہ کو آج تک طے نہ کر سکے اس کے برخلاف اگر تحقیق سے کام لیا جاتا اور روایات جانچ لی جاتیں تو یہ مسئلہ نہایت آسانی سے طے ہو سکتا تھا۔

معاف کیجیے گا، ہمارے علماء کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ان کتابوں کے مصنفین کے ناموں سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور تحقیق کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ اسی لیے سیکڑوں مسائل آج تک غیر منفصل ہیں۔ اور اگر یہی ذہنیت رہی تو ہمیشہ غیر منفصل رہیں گے، حالانکہ محدثین کرام نے فن رجال کی کتابیں اسی لیے مدوّن کی تھیں کہ روایات کا یہ بے پایاں اور لغو ذخیرہ چھانٹ دیا جائے۔ جس کی وجہ سے صدہا اختلافات مسلمانوں کے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ اکابر محدثین نے تو احادیث کے جانچنے میں کم و بیش فن رجال کے اصول سے کام لیا لیکن تاریخ وغیرہ میں ان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور آج تک ہمارے علماء ان کی طرف سے بے نیاز نظر آ رہے ہیں۔

مسلمانوں کو فنِ رجال کی بدولت اپنی صحیح تاریخ مرتب کرنے کے جو مواقع میسر ہیں اور محدثین نے اس کے اصول سے کام لے کر روایات کا جس قدر صحیح ذخیرہ مرتب کر دیا ہے دنیا کی دوسری قومیں اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتیں کیونکہ مسلمانوں کے علاوہ ساری دنیا ایسے وسائل و ذرائع سے محروم ہے۔ لیکن بھلا ہو قدیم پرستی کا جس نے ہر محقق کی زبان اور قلم کو بے کار کر رکھا ہے۔ اور علماء صرف اس ذہنیت کے باقی رہ گئے ہیں کہ جو کچھ رطب و یابس واقعات قدماء کی کتابوں میں پائے جائیں ان پر بلا نقد و جرح آمنّا بول اٹھیں، اور جو ایسا نہ کرے وہ ملحد، زندیق، کافر، بے ادب اور خدا جانے کیا کیا ہے؟

بہرحال آپ مجھے "خارجی" سمجھیں یا بالکل دائرہ شریعت ہی سے نکال دیں لیکن میں بالاعلان یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق جو روایات ہرنام صاحب نے لکھی ہیں ان کا اکثر حصہ غلط ہے۔ اور ان ہی کے مقابل روایات بالکل اسی قسم کی ان ہی محولہ کتابوں میں دوسرے صحابہ کے متعلق موجود ہیں، جن کو خدا معلوم کیوں قلم انداز کیا گیا ہے؟ اور جب کہ وہی فضائل جو حضرت علیؓ کے متعلق مذکور ہیں ان ہی حوالوں سے دوسرے بزرگوں کے لیے بھی ثابت ہیں۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فیصلہ کیونکر کر لیا گیا۔ کہ فضائل علیؓ تو صحیح ہیں اور دوسروں کے فضائل غلط! کیا یہ یک طرفہ فیصلہ نہیں ہے؟

اس قسم کے مباحث کے طے ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ صحیح روایات لے کر غیر صحیح روایات یک قلم ترک کر دی جائیں۔ اسی سے مسلمانوں کی موجودہ بے راہ روی دور ہو سکتی ہے اور اسی سے دوسری قوموں کی پریشاں خیالی کو ہم دور کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہرنام صاحب نے اپنے مضمون میں جن کتابوں کے نام لکھے ہیں وہ سب علماء اہلِ سنّت کی ہیں، لیکن وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اہلسنت کے نزدیک ان میں سے ہر کتاب درجہ میں برابر نہیں ہے۔ بلکہ بعض کتابیں معتبر ہیں بعض

غیرمعتبر۔ اور یہ تفریق مراتب صرف روایات کی نوعیت کی بناء پر پیدا ہوئی ہے' تاریخ وغیرہ کو چھوڑ کر خود احادیث کی کتابوں کو لے لیجیے تو وہاں بھی یہ فرقِ مراتب کام کرتا نظر آئے گا۔ صحاح ستہ حدیث کی دوسری کتابوں سے کیوں افضل ہیں؟ محض روایات کے لحاظ سے صحاح ستہ میں نسائیؔ اور ابن ماجہ کیوں کم رتبہ ہیں؟ اس لیے کہ ان کی روایات بقیہ چار کتب کے مقابلہ میں کمزور ہیں یا یہ کہ ان میں نسبتاً ضعیف احادیث کا زیادہ ذخیرہ ہے' صحیح مسلم' ترمذی اور ابوداؤد پر کیوں ترجیح رکھتی ہے؟ اس لیے کہ اس میں روایات اور سند پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ صحیح بخاری' صحیح مسلم سے کیوں بہتر ہے؟ اس لیے کہ اس میں روایات اور راویوں کی جانچ پڑتال پر جو توجہ کی گئی ہے وہ صحیح مسلم میں نظر نہیں آتی اور نہ دنیا کی کسی کتاب میں تصحیح کا وہ معیار آج تک پیش کیا گیا ہے!

پس جب خدا کے فضل سے اہل سنت کے پاس روایات کا ایسا معتبر ذخیرہ موجود ہے جس کی نظیر سے ساری دنیا خالی ہے تو پھر آئیے ہم اسی کو اپنا ماخذ کیوں نہ قرار دیں۔ اور ہر اختلافی مسئلہ کی نسبت اسی کی طرف کیوں نہ رجوع کریں۔ میں بڑے ادب کے ساتھ ہرنام صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ جہاں اتنی زحمت اپنے اس مضمون کے لیے اٹھا چکے ہیں وہاں میری خاطر سے تھوڑی سی تکلیف اور برداشت کرکے روایات کے سب سے مستند ذخیرہ پر ایک غائر نظر ڈال جائیں اور دیکھیں کہ انھوں نے فضائل علیؓ کے متعلق جو واقعات درج کیے ہیں ان کا سراغ صحیح بخاری سے بھی لگتا ہے یا نہیں؟ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ یہ تمام مزخرفات ان کو صحیح بخاری میں نظر نہیں آئیں گے۔ اور یہیں سے حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے گا۔ کیونکہ جب سب سے زیادہ صحیح کتاب ان روایات کے ذکر سے خاموش ہے تو پھر ان پر استدلال کی بنیاد کیونکر رکھی جا سکتی ہے؟ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان کو صحیح کیونکر سمجھا جاتا ہے؟

اب آئیے کس مضبوط ماخذ کی رہنمائی میں ہم ہرنام صاحب کے دعوؤں

پر توجہ کریں۔

مضمون نگار کا خیال ہے کہ سب سے پہلے حضرت علیؓ نے اسلام قبول کیا۔ لیکن صحیح بخاری سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص کے اسمائے مبارک قبولِ اسلام کے سلسلہ میں سب سے مقدم معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ایک اور روایت کی رو سے پانچ غلام (حضرت خدیجہؓ کو ملاکر) دو عورتیں اور حضرت ابوبکرؓ سابقین اسلام میں ہیں۔ حضرت علیؓ کا اب تک کہیں پتہ نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ سعد بن ابی وقاص کے بعد ان کو چوتھا نمبر دیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ صحیح بخاری کی کوئی روایت اشارتاً یا تصریحاً اس کی تائید کرے۔ ورنہ دوسری روایت کو پیش نظر رکھ کر نواں نمبر بھی شاید ہو سکے۔

اس سلسلہ میں ابن حجر وغیرہ کے جو اقوال ہیں ان صحیح روایات کے مقابلہ میں لغو ہوں گے۔

انذر عشیرتک الاقربین کا واقعہ نہایت معمولی کتابوں میں ہے اور بخاری میں قطعاً نہیں ہے۔ اس لیے حضرت علیؓ کی ولیعہدی کی بنیاد یہیں سے کٹ جاتی ہے اور مضمون نگار کا سب سے بڑا حربہ اسی جگہ سے بے کار ہو جاتا ہے۔

ہجرت کا واقعہ خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ اور لفظ "صاحب" کی تشریح میں متعدد صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کا نام لیا ہے۔ اور یہ سب روایتیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ لیکن حضرت علیؓ کا بستر پر سونا، بخاری میں نہیں ہے۔ اس لیے ہجرت کے سلسلہ میں اس کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ صحیح نہیں ہے۔ اس موقع پر ہر نام صاحب نے قصداً حضرت ابوبکرؓ کی تنقیص کا پہلو اختیار کیا ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہؐ کے قتل کا اشتہار تھا اور متعدد اشخاص آپ کی تلاش میں گھوم رہے تھے، جو مکہ سے مدینہ تک تعاقب کرتے ہوئے گئے۔ ایسی حالت میں اس

شخص کی خدمت زیادہ وزن دار ہوگی جو اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر رسول اللہ ؐ کے ساتھ ساتھ گھوم رہا تھا۔ یا وہ قابلِ ستائش ہوگا جو رات بھر گھر کے احاطہ کے اندر رسول اللہ صلعم کے حرم میں بہ آرام سوتا رہا۔ کیونکہ حضرت سودہؓ حرمِ نبوت کی موجودگی کی وجہ سے یہ اطمینان تھا کہ مشرکین مکان کے اندر نہیں آسکتے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو رسول اللہ ؐ کی موجودگی ہی میں گھر کے اندر دروازہ توڑ کر یا دیواروں پر چڑھ کر آسکتے تھے ساری رات باہر کیوں کھڑے رہتے؟

یہ کون دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر پر اطمینان نازل ہوا؟ اطمینان رسول اللہ ؐ پر نازل ہوا اور آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر کی تسلی کی، لیکن بایں ہمہ حضرت ابوبکر کے انتشارِ خیال کو کمزوری پر محمول نہیں کیا جا سکتا، وہ انسان کی ایک فطرت ہے حضرت ابوبکر غار کے دہانہ پر کفار کو دیکھ رہے تھے اس لیے اگر رسول اللہ ؐ سے انھوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ لوگ اگر اپنے قدموں پر نظر کریں تو ہم کو دیکھ لیں گے تو اس میں کمزوری کی کیا بات ہوئی؟ حضرت ابوبکر اگر سرفروشی کے لیے تیار نہ تھے تو ہجرت کی رفاقت کیونکر گوارا کی؟ یہ سب واقعات کمزوری پر دلالت کرتے ہیں؟ البتہ کمزوری یہ تھی کہ حضرت علیؑ آرام سے ساری رات گھر کے اندر بستر پر سوتے رہے اور رسول اللہ صلعم کو خدا کے سپرد کر دیا کہ جہاں مزاج چاہے تشریف لے جائیں اگر زندگی باقی ہے تو آئندہ ملاقات ہوجائے گی! کیا یہ اطمینان حضرت ابوبکر نے بھی ظاہر کیا؟ مجھے حیرت ہے کہ ہرنام صاحب کے قلم میں رعشہ کیوں نہ پیدا ہوا؟ ان کو حق و صداقت کے چھپاتے وقت خدا کا خوف کیوں نہ معلوم ہوا؟ کیا رسول اللہ ؐ کے سب سے بڑے جان نثار کے حق میں ایسے جملے لکھنا سچائی کے گلے پر چھری پھیرنا نہیں ہے؟ کیا حضرت علیؑ نے کبھی اس طرح آنحضرت ؐ کو کفار کے حملہ سے بچایا ہے؟ صرف ایک ہی واقعہ صحیح بخاری

سے پیش کر دیا جائے! کیا کسی صحابی نے اس زمانہ میں جبکہ رسول اللہؐ کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، فدائیت اور جان نثاری کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں؟ کیا رسول اللہؐ کا حضرت ابوبکر سے زیادہ دامے، درمے، قدمے، سخنے کسی نے ساتھ دیا ہے؟ اور کیا اُن کے برابر کوئی رسول اللہؐ کے واقعات میں بھی شریک بھی رہا ہے؟ اور ان سے زیادہ رسول اللہؐ کے کوئی کام بھی آیا ہے؟ ہجرت سے پہلے جب عقبہ نے آپ کی گردن مبارک میں لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچا تھا، اس وقت آپ کے بچانے کے لیے حضرت علیؓ گئے تھے؟ بدر، اُحد، اور تمام معرکوں میں رسول اللہؐ کی حفاظت کیا حضرت علیؓ نے کی تھی؟

مواخاۃ کے واقعہ میں صحیح بخاری بالکل خاموش ہے۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت علیؓ کی کن بزرگوں سے مواخات ہوئی تھی۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کو دوبار آنحضرتؐ نے اپنا اسلامی بھائی فرمایا ہے۔ ایک تو حضرت عائشہؓ سے نسبت کے وقت اور دوسرے آخری خطبہ میں جو وفات سے قبل ارشاد فرمایا۔ تعجب ہے کہ ابوالفداء، سیرت حلبیہ، صواعق اور خمیس کا حوالہ اس سلسلہ میں پیش کیا جاتا ہے اور صحیح کی روایات سے آنکھ بند کر لی گئی ہے۔

مسجد نبوی کے اندر صرف حضرت ابوبکر کے مکان کا دروازہ باقی رکھا گیا تھا اور تمام دوسرے دروازے آنحضرتؐ نے بند کرا دیے تھے۔ اس کا ذکر بھی آپؐ کے آخری خطبہ میں ہے۔ جو بخاری میں موجود ہے۔ حیرت ہے کہ لوگوں نے ان روایات کو سامنے رکھ کر حضرت علیؓ کے متعلق بالکل اسی قسم کی روایات وضع کیں، اور مضمون نگار نے صحیح روایت کو چھوڑ کر غلط روایتوں کو قبول کر لیا، کیا یہی انصاف و صداقت ہے؟

بدر کے واقعہ میں حضرت ابوبکر کا کارنامہ سب سے بڑا ہے کہ وہ رسول اللہؐ کی حفاظت کے لیے خود اُن کے پاس موجود تھے، کیونکہ ان کی حیثیت سب سے بڑے

رفیق کی تھی، اور ظاہر ہے کہ جو شخص ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے وقت رسول اللہؐ کی معیت سے مشرف رہا تھا اس سے بڑھ کر قابلِ اطمینان آدمی کون ہو سکتا تھا؛ رہے حضرت عثمان تو وہ رسول اللہؐ کی صاحبزادی کی علالت کی وجہ سے غزوہ میں شریک نہ ہو سکے، لیکن رسول اللہؐ نے ان کو شریک سمجھا، اور ان کا مالِ غنیمت میں حصہ لگایا۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ کی خدمات سے کس کو انکار رہے؟ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ بزرگوار سپاہی تھے، اور حضرت ابوبکرؓ وزیر اور ظاہر ہے کہ وزیر اور سپاہی کی ذمہ داریوں اور کاموں میں بڑا فرق ہوتا ہے!

حضرت فاطمہؓ کی شادی کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر و عمر کے پیغامات صحیح بخاری سے دکھانے چاہئیں، پھر مضمون نگار کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس اضافی خوبی سے اُن بزرگوں کے مدارج میں کیا ترقی ہو سکتی تھی جن کی صاحبزادیاں جنابِ رسالت پناہ کی زوجیت سے مشرف ہو کر تمام مسلمانوں اور خود حضرت علیؓ کی بھی مائیں بن چکی تھیں؛ رسول اللہ صلعم کی دامادی دوسرے درجہ کی چیز تھی، اس لیے دوسرے درجہ کے لوگ اس سے مشرف ہو سکتے تھے، حضرت عثمان، حضرت علیؓ اور حضرت ابوالعاص کے لیے البتہ یہ قابلِ فخر چیز ہو سکتی تھی۔

غزوۂ اُحد کے ذکر میں مضمون نگار کا دل تھرّایا ہے۔ اور قلم لرز گیا ہے، لیکن اس نے صحیح کی وہ روایت نظر انداز کر دی، جس میں حضرت ابوبکرؓ اور متعدد صحابہ کی موجودگی اور ثابت قدمی درج ہے۔ حضرت عمرؓ کا فرار بھی مضمون نگار ثابت نہ کر سکے، شاید ان کو اس جواب و سوال کی خبر نہیں جو ابوسفیان اور حضرت عمرؓ میں ہوا تھا۔ اور رسول اللہؐ کے ارشاد کے مطابق حضرت عمرؓ ابوسفیان کو جواب دے رہے تھے۔ یہ واقعات بخاری میں موجود ہیں۔ رہے حضرت عثمان اور دیگر صحابہ کرام جنہوں نے فرار اختیار کیا تھا تو جب قرآن مجید نے ان کی یہ لغزش قابلِ مواخذہ نہیں سمجھی تو آج

کسی کو کیا حق ہے کہ ان پر اعتراض کرے۔ موطا۔ کی جو روایت اس سلسلہ میں نقل کی گئی ہے اس کا صحیح میں کہیں پتہ نہیں۔

جنگِ خندق کا کارنامہ ایک سپاہیانہ کارنامہ ہے اس لیے اس کو حضرت علیؓ نے انجام دیا۔ رہے وزرا، وہ آنحضرتؐ کے پاس رہے اس میں منقصت کی کیا بات ہے؟

صلح حدیبیہ میں معاہدہ کے کاتب بلاشبہ حضرت علیؓ تھے۔ اس لیے بحیثیت کاتب کے جو فرض ان پر عائد تھا انھوں نے ادا کیا۔ یعنی رسول اللہ صلعم نے جو الفاظ ارشاد فرمائے ان کو بجنسہٖ حضرت علیؓ نے لکھ دیا۔ اور یہی کام ایک امین کاتب کا ہو سکتا ہے۔ لیکن حضرت عمر اور حضرت علیؓ کی حیثیت میں فرق تھا، نہ رسول اللہؐ کے وزیر تھے، اس لیے ان کو معاہدہ کی بعض شرطوں میں کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور اسی لیے وہ آپ کی خدمت اقدس میں بڑی کدوکاوش کے ساتھ اپنی درخواست پیش کر رہے تھے۔ حضرت علیؓ کا یہ منصب نہ تھا اور نہ تعلقات کے لحاظ سے اتنی جرأت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہؐ سے دو بدو سیاست کے متعلق ایسی گفتگو کر سکیں۔ رہا کفارہ اور روزہ کا قصہ تو اس کا سبب نعوذ باللہ یہ نہ تھا کہ حضرت عمر اس گفتگو میں اپنے کو سرکش یا رسول اللہ صلعم کا مدِمقابل سمجھ رہے تھے، بلکہ یہ سبب تھا کہ شاید سوالات کی تلخی رسول اللہؐ کے لیے باعثِ تکلیف ہوئی ہو۔ یہ تو حضرت عمر کی اسلام پرستی اور حبِ رسولؐ کی بڑی شاندار اور ناقابل تردید دلیل ہے کہ ایسے نازک پہلوؤں کو بھی انھوں نے فراموش نہیں فرمایا۔

اس واقعہ میں صحابہ کے قربانی میں تامل کرنے کو مضمون نگار نے "خفگی" سے تعبیر کیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کی شرائط کی نرمی اور کمزوری کی وجہ سے ایسا صدمہ تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ پر ٹھٹھک کر رہ گیا تھا۔ "خفگی" کا لفظ لکھنا انسانی سائیکالوجی سے کس قدر بےخبری ظاہر کر رہا ہے! حضرت عثمان کا بال نہ منڈوانا اولاً تو بخاری سے ثابت کیجیے، پھر جب یہ بھی جائز تھا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟

غزوۂ خیبر میں جو الفاظ حضرت علیؓ کے متعلق صحیح بخاری کی روایت سے ثابت ہیں، بلاشبہ صحیح ہیں۔ ان سے حضرت علیؓ کی مدح نکلتی ہے۔ اگر بخاری میں کرار غیر فرار کا ٹکڑا نہیں ہے تو یہ مضمون نگار کو کیوں کھٹکتا ہے؟ جب مستند راویوں سے کوئی جملہ مروی نہ ہو تو کیا یہ بھی کسی محدث کا کام ہے کہ وہ قیاسات کی بناء پر اپنی طرف سے جملے بڑھا دے! اس غزوہ میں حضرت ابوبکر و عمر کا فوجیں لے کر جانا اور ناکام واپس آنا صحیح سے ثابت کیجیے، اور اگر بفرض محال ایسا ہو بھی تو اس میں سبکی کی کیا بات ہے؟ کیا حضرت علیؓ کو جنگِ صفین میں شکست نہیں ہوئی؟ رہی حضرت علیؓ کی کراری اور غیر فراری تو اس کا یہ کتنا نمایاں ثبوت ہے کہ آنحضرتؐ نے کبھی ان کو پوری فوج کا سپہ سالار نہیں بنایا۔ بلکہ ہمیشہ ایک سپاہی یا معمولی حیثیت کے افسر کے طور پر رکھا۔ بخلاف اس کے حضرت ابوبکر اور حضرت زید بن حارثہؓ اکثر سرایا کے امیر رہے۔

فتح مکہ کی دوش نشینی صحیح بخاری سے ثابت کیجیے۔

حنین کے مفرورین میں حضرت ابوبکر کا نام کہیں نہیں ہے! حضرت عمر کی میدانِ جنگ میں موجودگی بخاری سے ثابت ہے۔ لیکن حضرت علیؓ کا بھی تو صحیح روایت میں پتہ نہیں چلتا، البتہ حضرت عباس اور ابوسفیان بن حارث کی پامردی ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے۔

محاصرۂ طائف کے زمانہ میں آنحضرتؐ اور حضرت علیؓ کی ایک پُراسرار گفتگو کا مضمون نگار ذکر فرماتے ہیں، لیکن کس کے حوالہ سے؟ الریاض النضرہ!

تبوک میں جو حدیث ارشاد فرمائی ہے وہ بخاری میں مذکور ہے۔ اور لے دے کے یہی ایک حدیث صحیح حضرت علیؓ کے فضائل میں سب سے نمایاں ہے۔ لیکن لا نبی بعدی کے بعد اس میں کیا خصوصیت رہ جاتی ہے؟ صرف اہل و عیال کی نگرانی! جو ظاہر ہے کہ کوئی شرف نہیں، اس سے بڑا شرف تو ان بزرگ کو ملا جو مدینہ منورہ پر

خلیفہ بنائے گئے تھے۔ مضمون نگار کا یہ لکھنا بھی غلط اور محض قیاس آرائی ہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو حضرت علیؓ نبی ہوتے، اس مضمون کی حدیث حضرت عمرؓ کے متعلق ہے۔

سورۂ برأت کے اعلان کے سلسلہ میں مضمون نگار سے لغزش ہوئی ہے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر اور حضرت علیؓ کی پوزیشن میں فرق نہیں سمجھا۔ حضرت ابوبکر امیر الحج تھے اور اس لیے خود رسول اللہ کے قائم مقام تھے۔ حضرت علیؓ اور منادی کرنے والوں کی طرح احکام کی منادی کر رہے تھے۔ جن کے نام صحیح کی روایات میں آئے ہیں۔

یمن کی امارت کے واقعہ میں کوئی خاص پہلو نہیں۔ حضرت علیؓ کی طرح بہت سے صحابہ مختلف صوبوں میں گورنر بنا کر بھیجے گئے تھے، لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ صحیح روایات کے مطابق لوگوں کو ان سے شکایت پیدا ہوئی، جس کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا اور یہ حضرت علیؓ کی انتظامی قابلیت میں کمی ظاہر ہونے کا پہلا واقعہ تھا۔ جو عہدِ نبوت میں منظرِ عام پر آیا! اس سلسلہ میں جو حدیث لکھی ہے اس کا بخاری میں سرے سے ذکر ہی نہیں اور اس لیے وہ غلط ہے۔

حجۃ الوداع کے ذکر میں پہلی حدیث بے اصل اور غدیر خم والی حدیث اس سے زیادہ بے اصل ہے، حالت یہ ہے کہ جس قدر ضعیف روایات ہیں، سب میں حضرت علیؓ کی فضیلت کے الفاظ پڑھے جاتے ہیں، صحیح مسلم میں حضرت علیؓ کے متعلق ایک فقرہ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ غدیرِ خم کا نام اور اہل بیتؓ کی فضیلت مختصر لفظوں میں ملتی ہے۔ اور صحیح بخاری میں غدیرِ خم اور اس کے واقعہ کا نشان تک نہیں ہے! خدا ان جھوٹے راویوں سے سمجھے جنھوں نے اپنی طبیعت سے ایک مستقل اور عظیم واقعہ بنا کر کھڑا کر لیا۔

یہاں پہنچ کر مضمون نگار نے خطیب کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ہم خاموشی سے ان کی گفتگو سن کر صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ما محمدؐ الا رسول کیا غزوۂ اُحد میں نازل ہوئی تھی؟ اس کو شانِ نزول کی کسی کتاب کے بجائے جامع صحیح سے

تحریر فرمائیے۔ تاکہ صحابۂ کرام پر جو آپ نے عموماً ساتھ چھوڑنے کا الزام رکھ دیا ہے وہ صحیح روایت سے ثابت ہوجائے۔ بخاری کی پیشین گوئی کا اگر وہ مطلب لیا جائے جو مضمون نگار سمجھ رہے ہیں تو میرے خیال میں حضرت ابو بکر و عمر و عثمان سے زیادہ قابلِ الزام حضرت علیؓ قرار پائیں گے، کیونکہ اول تو تین بزرگوں نے تو رسول اللہؐ کے بعد اسلام کو ترقی دی اور آپ کے مشن کو پورا کیا اور حضرت علیؓ تو سوائے مسلمانوں کے کشت و خون کے اور کچھ نہ کر سکے۔ اس لیے "گل کھلانے" کا لفظ سچ سچ کہیے کس پر چسپاں ہوتا ہے؟

اس کے بعد مضمون نگار نے فضائل علیؓ کی حدیثیں شروع کی ہیں۔ ان میں مدینۃ العلم کی حدیث غلط، قضا والی حدیث صحیح، علیؓ منّی غلط اور من کنت مولاہ سب سے لغو۔

مدینہ کی واپسی پر جو خطبہ حضورؐ کا نقل کیا ہے، محدثانہ تنقید کے اعتبار سے بالکل لغو ہے۔

جیشِ اسامہ میں اگر حضرت ابوبکر و عمر فوجیوں میں نامزد تھے تو حضرت علیؓ کب مدینہ میں روکے گئے تھے؟ اس کے لیے صحیح سے کوئی روایت پیش کیجیے! مدارج النبوۃ قابلِ سند نہیں۔ تعجب ہے کہ کوئی عربی کی پرانی کتاب آپ کو حوالہ کے لیے یہاں پر نہ مل سکی۔ بے شک اگر رسول اللہؐ اپنی وفات کے وقت حضرت ابوبکر و عمر کو مدینہ سے باہر کر دینا چاہتے تھے تو ان بے چاروں کو شام چلے جانے میں کیا عذر ہو سکتا تھا؛ لیکن حیرت ہے کہ رسول اللہؐ نے بادلِ ناخواستہ ان لوگوں کی موجودگی گوارا فرمائی اور نعوذ باللہ ان کے خوف کی وجہ سے حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ نہ بنا سکے۔ کیا اس اخلاقی کمزوری کے اندر "تقیہ" تو مضمر نہ تھا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ قربان جائیے اس اندھی حمایت کے کہ حضرت علیؓ کے پیچھے خود رسول اللہؐ پر الزام لگا رہے ہیں۔

قلم دوات کے واقعہ سے خلافت علیؓ کیسے معلوم ہوسکتی ہے؟ کیا معلوم کہ آپ کیا لکھواتے؟ حضرت عمر کا قلم دوات لانے سے روکنا صحیح بخاری میں نہیں ہے۔ پھر اگر بخار کی شدّت کا حال دیکھ کر کسی نے منع کیا ہو تو کیا بے جا کیا؟ اگر کوئی چیز باقی رہ گئی تھی تو آیندہ بھی آنحضرتؐ لکھوا سکتے تھے، کیونکہ قلم دوات مانگنے کا واقعہ جمعرات کا ہے! اور آپ کا انتقال دوشنبہ کے دن ہوا جس میں بسا اوقات آپ بالکل تندرست معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ خود دوشنبہ کے دن بھی صبح کے وقت صحیح و بشاش تھے جس سے خود حضرت علیؓ کا خیال تھا کہ آپ کو افاقہ ہو جائے گا، کیا پانچ دن کے اندر کسی چیز کے لکھوانے کا موقع نہیں ملا۔ قوموا عنّی کا فقرہ اظہار ناراضگی پر دلالت نہیں کرتا؟ بلکہ جس طرح عام طور پر مریض کو زیادہ بات چیت ناگوار ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح آنحضرت نے بھی مرض کی زیادتی کی وجہ سے صحابہ کی باہم گفتگو کو ناپسند فرمایا۔

انتقال کے وقت حضرت علیؓ کی موجودگی اور دستِ مبارک کا ان کے اوپر ہونا ریاض النضرہ کی جھوٹی روایت ہے۔ جو حضرت عائشہ کے پُرفخر صحیح واقعہ کے جوڑ پر تراشی گئی ہے، صحیح روایات سے اس وقت حضرت علیؓ کا کاشانۂ نبوی میں ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا۔

ناظرین! آپ نے دیکھا کہ کس طرح غلط اور موضوع روایات لکھ کر مضمون نگار نے حضرت علیؓ کے فضائل بیان کیے ہیں۔ اور کس طرح حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بلکہ اکثر صحابۂ کرام کو موردِ الزامات قرار دیا ہے۔ لیکن الحق یعلو ولا یعلیٰ! مضمون نگار اگر میرے بیان کردہ واقعات کو جامع صحیح میں تلاش کریں گے تو امید ہے کہ ان پر تحقیق کا نیا دروازہ کھلے گا۔ اور ان کو خلافت کا صحیح حل معلوم ہوگا۔ اس معیار پر واقعات کو دیکھنے کے بعد میں تو یہاں تک کہنے کے لیے مجبور ہوں کہ حضرت علیؓ کو اسلام میں جو چوتھا درجہ دیا جاتا ہے یہ بھی محض ان کے خلیفہ منتخب ہو جانے کی وجہ سے ہے ورنہ

جامع صحیح کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رسول اللہ صلعم کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر کو سمجھتے تھے۔ پھر حضرت عمر کو، پھر حضرت عثمان کو اور ان کے بعد پھر سب کو برابر سمجھتے تھے۔ اور یہ خیال عہدِ نبوت سے لے کر حضرت عمر کی وفات کے وقت تک قائم رہا۔ چنانچہ حضرت عثمان سے جو بیعت ہوئی اس کا سبب بھی تھا کہ مدینہ کی اکثریت ان ہی کی طرف تھی۔ اور اس کو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے برملا منبر پر حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے کہہ دیا تھا یہ دونوں روایتیں بھی صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ ان واقعات کی موجودگی میں کیا یہ کہنا انکارِ حقیقت نہیں ہے کہ حضرت علیؓ پر زیادتی کی گئی اور ان کا حق خلافت غصب کیا گیا؟ حضرت علیؓ کی حمایت میں دانستہ یا غلطی سے روایات اور فضائل کا جو بے پایاں ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے اس کی موجودگی میں جو کچھ چاہیے کہیے لیکن اگر تلاشِ حقیقت مقصود ہو تو بارگاہِ حق سے وہی فیصلہ ہوگا جو رسول اللہ صلعم کی زندگی اور آپ کی وفات کے بعد ہو چکا، اور اب اس کو کوئی بڑے سے بڑا ذخیرۂ روایات بھی متزلزل نہیں کر سکتا۔

مولانا! میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ آپ مجھے جوشِ غضب میں آ کر "خارجی" نہ کہہ دیں۔ لیکن اگر حقیقت کوئی چیز ہے اور یہ حق کسی اچھے خلق کا نام ہے۔ تو میں اپنے ضمیر کے اس بے باکانہ اقدام پر نہایت مسرور ہوں کہ میں نے بلا لومۃ لائم اظہارِ حق کیا ہے؟ آخر میں عرض ہے کہ آپ ان چند سطور کو شائع فرما دیں۔ تاکہ دنیا مضمون نگار کی حق طلبی کا آخری نظارہ بھی دیکھے۔

فاروق کانپوری

فاران:-

آپ کے خیالات میں بجنسہٖ شائع کیے دیتا ہوں۔ ان پر وہ صاحب غور کریں گے جن کو آپ نے مخاطب فرمایا ہے۔ لیکن اتنا میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اسلام کے تمام لٹریچر میں قرآن مجید کے بعد صحیح بخاری سے زیادہ کیا معنے اس کے برابر کی بھی کوئی کتاب موجود نہیں ہے اور نہ آئندہ ہوسکتی ہے۔ لیکن آخر روایت کی یہ تمام کتابیں بھی تو بے کار نہیں ہیں اور ان سے بھی تو علمائے اسلام نے اجتہاد و استنباط مسائل میں کام لیا ہے۔ کیا یہ اتنا بڑا ذخیرہ بالکل لغو اور لاطائل ہے؟ البتہ اگر آپ کا یہ منشا ہے کہ اختلافی مسائل میں سے وہ چیزیں جن کا تعلق فضائل صحابہ یا مشاجرات قرنِ اول سے ہے۔ ان میں صحیح بخاری کو حکم مان کر کم درجہ کی روایات ترک کردی جائیں اور ان کو بحث میں نہ لایا جائے تاکہ فرقی اختلافات دور ہوجائیں، تو آپ کی "خوش نیتی" میں مجھے بھی کلام نہیں۔ بشرطیکہ تمام فرق اسلامیہ اس پر تیار ہوں۔ اور آپ کے ماخذ کو وہ بھی اتنا ہی مستند تسلیم کریں۔ جتنا آپ تسلیم کررہے ہیں۔ اور اگر یہ شکل نہ ہو تو یہ ساری بحثیں بے کار ہیں۔ کیونکہ ان کا حاصل نہ اب تک کچھ نکلا ہے نہ آیندہ نکلنے کی امید ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ "گرفتاران ابوبکرؓ و علیؓ" کی یہ خانہ جنگیاں کب ختم

ہوں گی۔ اور کب اصلی اور بنیادی کام مسلمانوں کے سامنے آئیں گے! آپ نے کئی جگہ مجھ کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ آپ کو کہیں "خارجی" نہ کہہ دوں۔ اہلِ قبلہ کی تکفیر میرا مسلک نہیں ہے اور میں ایسے فتووں سے اپنے کو علیحدہ رکھتا ہوں۔ آپ کم از کم میرے فتوے سے مطمئن رہیں۔

بحث
خلافت و امامت
پر ایک نظر

علامہ عینی شاہ نظامی
حیدر آبادی
خلیفہ
حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مرحوم

بحث "خلافت و امامت" پر ایک نظر[1]

موقر رسالہ فاران میں لعنوان خلافت و امامت بجواب پنڈت ہرنام جی صاحب مولانا فاروق صاحب کی جوابی تحریر دیکھی اور انھیں کی زبانی ہرنام جی کی داستان بھی سُنی۔ یہ بحثا بحثی فضول اور اس کا نتیجہ بے حصول ہے۔ رہیں طنزیہ تحریریں۔ اس سے نہ حضرت ابوبکر تولہ بھر گھٹ سکتے ہیں اور نہ جناب امیرؑ رتی بھر کم ہوتے ہیں۔ نہ موطا، حضرت ابوبکر کی تنقیص کرسکتی ہے اور نہ بخاری جناب امیرؑ کی عظمت کو کم کرسکتی ہے۔ ہمارے عندیہ میں پنڈت جی کی وسعتِ تحقیق مسلّم اور مولانا کا امام بخاری سے بے حد خلوص بے کیف و کم۔

بخاری کا اصح کتب ہونا امام ابوبکر بن خزیمہ تلمیذ امام بخاری کا عقیدتمندانہ نظریہ ہے۔ جو ایک حلقہ میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا امام شافعی کے عقیدہ اصح الکتب تحت ادیم السماء بعد کتاب اللہ الموطاء سے شروع ہوئی اور بو علی نیشاپوری کے جذبہ ماتحت ادیم السماء اصح من کتاب مسلم القرآن پر ختم ہوئی۔ یہ اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ اس پر دوسرے کا بس نہیں۔ اس کو عقیدہ کی حد تک رکھا جائے تو مناسب ہے۔

قرآن وحدیث ہم مسلمان قرآن مجید کے لفظ لفظ اور آیت آیت کو وحیٔ ربانی اور کلامِ حقانی مانتے ہیں۔ اور از ازل

---

[1] اخبار منادی دہلی ۵ ر و ۱۲ ر جولائی ۱۹۳۵ء

تا ابد اس کو واجب التعمیل اور قابلِ احترام جانتے ہیں۔ رہی حدیث، یہ بھی اگر باللفظ اور بالتواتر مروی ہے تو بعد کلام باری سر آنکھوں پر اور یہ ہی ہے مسلک امام ابو حنیفہ۔

ما جاء عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعلی الراس والعین

سلف اور خلف اس پر متفق ہیں کہ ہماری ساری مرویات بالمعنیٰ ہیں۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا اور کہا اس کا خلاصہ صحابہ نے اپنے لفظوں میں تابعین کو اور تابعین نے جو سنا اس کا مفہوم اپنے لفظوں میں تبع تابعین کو سنایا اور انھوں نے ان لفظوں کو مطالب کے ساتھ محفوظ کر لیا اور روایت کی ۹۵ھ سے ابو حنیفہؒ نے روایت بالمعنیٰ کی روک تھام کرتے ہوئے روایت باللفظ پر زور دیا اور علی الاعلان فرمایا۔ لا حجۃ الا فیما رواہ الراوی من حفظہ وتذکرہ (ابن الصلاح) مگر سنے کون؟ کثرتِ روایت کا اس درجہ شوق تھا کہ ہزاروں حدیثیں بالمعنیٰ مروی ہوگئیں۔ جس کا خمیازہ آج امت اٹھا رہی ہے علامہ ابن البر کتاب الکنیٰ میں لکھتے ہیں کہ ابو حنیفہ کی نہ سن کر اربابِ روایت نے بڑی غلطی کی۔ جیتے دم تک امام صاحب اس کے پابند رہے۔ مگر ہزاروں بالمعنیٰ روایات کو روک نہ سکے۔ مگر پھر بھی ان پر چند قیود عائد فرما گئے (۱) راوی میں ثقاہت، عدالت اور صداقت کے علاوہ فقاہت بھی رہے (۲) کوئی بھی حدیث شواہد کے بغیر قبول نہ ہو، (۳) کوئی حدیث خلافِ قرآن، منافی وقارِ نبوت، معارض واقعۂ مشہورہ یا مخالف اصول مجمع علیہا مروی نہ ہونے پائے۔ مگر اربابِ روایت نے اس پر شور وغل مچایا اور امام صاحب کو اہل الرائے قرار دیا۔

احادیث بخاری کی ہوں کہ طبری کی، مسلم کی ہوں کہ طبرانی کی، سب کی سب بالمعنیٰ مروی از قسم احاد اور مفید ظن ہیں۔ یہ قطعی الثبوت والدلالۃ نہیں۔ ہمارے محدثین نے جمع احادیث میں بڑی بڑی کڑیاں جھیلیں اور ہمارے لیے ایک بڑا ذخیرہ

رکھ چھوڑا۔ مگر سب کا دار و مدار راوی کے معتمد اور غیر معتمد سمجھنے پر رہا۔ جس کو معتبر جانا اس سے حدیث لی۔ جس کو معتبر نہ جانا اس کی روایت چھوڑ دی۔ یہاں پر دیکھنا یہ ہے کہ احمد ہوں یا بخاری، ان بزرگوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک تین چار واسطے ضرور ہیں۔

ان لوگوں نے اپنے استاد کے سوا اوپر کے کسی راوی کو دیکھا نہ سنا، ہمارا یہ کلیہ کہ چونکہ یہ بڑے ائمہ ہیں ان کے کل راوی ثقہ و صدوق ہوں گے محض حسن ظن ہے۔ جب حسن ظن پر بات ٹھہری یہ مخصوص بالبخاری کیوں؟ دوسرے اس سے محروم کیوں؟ اور اگر چھان بین کی ٹھہری تو بخاری اس سے مستثنیٰ کیوں؟

کہتے ہیں کہ کتب رجال اوپر کے راویوں کے حالات کا آئینہ ہیں۔ یہ ایمان بالغیب ہے اور مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ کتب رجال بھی کتب انسانی ہیں۔ ایک کتاب میں ایک کو ثقہ اور دوسری میں غیر ثقہ لکھا ہے۔ بلکہ ایک ہی میں ایک ہی کو ثقہ و غیر ثقہ لکھا ہے۔ بعض جگہ ایک امام فن نے ایک کو ثقہ اور دوسرے نے غیر ثقہ لکھا ہے اور نیز ایک ہی امام نے ایک ہی کو ثقہ اور متروک بھی فرمایا ہے۔ بعض جگہ ایک راوی کو ایک جماعت کذّاب متروک ناقابلِ روایت سارقِ حدیث وضّاع و دجال کہتی ہے مگر صرف ایک امام فن اس کو ثقہ تسلیم کرتا اور اس سے حدیث روایت کرتا ہے۔ کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ رشید بن زید الجمال سے) جس کو ایک جماعت نے متروک کر دیا امام فن بخاریؒ اس سے اپنی صحیح میں روایت کرتے ہیں۔ بعض وقت ایک جماعت ایک شخص کو ثقہ و صدوق حجت اور امام کہتی ہے۔ مگر ایک امامِ وقت اس راوی کو ناقابلِ حجت کہتا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ امام جعفر صادقؒ جن کو تمام محدثین مانتے ہیں بخاری انھیں ناقابلِ روایت سمجھتے ہیں۔

مولانا کی طرح جامع بخاری کو ہی مضبوط ماخذ روایات ماننے پر نہ ہم آمادہ ہیں اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ بخاری کے سوا ہماری اور ساری تفسیر و حدیث کی کتابیں جو عبد الرزاق ابن ابی شیبہ، ابو حنیفہ، شافعی، احمد ابن راہویہ، ابو یعلی، عبد بن حمید، ابن منصور، نسائی، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی، دارمی، بیہقی، ابن عاصم ابو حاتم، ابن خزیمہ، طحاوی، ابن حبان، حاکم، ضیا، مقدسی، طبرانی، طبری، ابن اسحٰق ابن ہشام، حلبی، ابن عبد البر، ابن سعد، ابن عساکر، خطیب، ابن مردویہ، ابن مغازلی، دیلمی، عاصمی، ابو الحسن الملا، ثعلبی، واحدی، ابن ابی حاتم، امام رازی اور بغوی سے منسوب ہیں۔ تو وہ خرافات اور مجموعۂ موضوعات و ضعاف ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے سلف صالحین اور علمائے عاملین مثل علامہ عینی، نووی، ابن حجر، سبکی، ذہبی، قسطلانی، زرقانی، شوکانی، قاری، متقی، سیوطی، ابن حجر مکی، شیخ دہلوی اور شاہ ولی اللہ نے ان ہی کتب سے ان گنت روایتیں اپنی تصنیفوں میں لی ہیں اور ان کتب کو مستند اور قابلِ استناد تسلیم کیا ہے۔

امام بخاری فنِ حدیث کے بڑے امام اپنی آپ نظیر اور خاص شان کے محدث ہیں مگر معصوم اور محفوظ عن الخطا نہیں۔ ان سے پہلے بھی اور ان سے بعد بھی صدہا جلیل القدر آئمۂ فن گزرے ہیں اور اپنی صدہا تصنیفیں ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ ہم اور ہمارے سلف ان سب کو مانتے ہیں اور سب کی روایتیں لیا کرتے ہیں۔ خود بخاری و مسلم بھی تو عبد الرزاق، ابن ابی شیبہ و امام احمد کی کتابوں سے برسوں متمتع ہوئے ہیں۔ سو دو سو کتب حدیث میں ایک بخاری کی صحیح بھی ہے۔ ہر کتاب قابلِ احتجاج اور ہر کتاب مستند ہے۔ ہر کتاب میں صحیح، حسن، ضعیف و سقیم روایتیں ہیں۔ کہیں کم کہیں زیادہ۔ نہ ہم اس کے

قائل کہ بخاری میں جو بھی ہے وہ سب صحیح ہے۔ اور نہ ہم اس کے معتقد کہ اس سے باہر جو ہے وہ غیر مستند، ناقابلِ حجت یا ہمہ سوختنی ہے۔ یہی ہمارا مسلک ہے اور یہی ہمارے ائمہ حنفیہ کا طرز ہے۔

چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی جو حنفیہ کے مستند عالم اور محدث ہیں۔ شرح سفر السعادت میں رقمطراز ہیں:-

(۱) صحیح در مسلم و بخاری منحصر نیست از غیر اینہا ہم حدیث صحیح را اخذ تواں کردہ۔

(۲) احادیث صحیحہ منحصر نیست در صحیحین بخاری و مسلم و ایشاں استیعاب نہ کردہ اند، جمیع صحاح را کہ نزد ایشاں بود بر شرط ایشاں چہ جائے مطلق صحیح (۳) کتب ستہ کہ مشہور اند در اسلام گفتہ اند کہ درانجا اقسام حدیث از صحیح و حسان و ضعاف ہمہ موجودست (۴) بہ تحقیق روایت کردہ است امام مسلم در کتاب خود از بسیارے از رواۃ کہ سالم نیستند از غوائل جرح و ہمچنیں در کتاب خود بخاری از جماعتے روایت کردہ کہ تکلم کردہ شدہ است در ایشاں (۵) در کتب نسائی و ابن ماجہ و ابو داؤد و احمد و طیالسی و عبداللہ بن احمد و عبدالرزاق و ابن منصور و ابن ابی شیبہ و ابو یعلی و حاکم و طبرانی و دارقطنی و ابو نعیم و بیہقی صحیح و حسن و ضعیف ہمہ اقسام حدیث نمایاں اماں ہر چہ در مسند امام احمد است ہمہ مقبول است و ضعیف وے نیز قریب حسن است۔

امام ابن حجر عسقلانی قول مسدد میں اور علامہ ابن ہمام بھی فتح القدیر میں قریب قریب یہی فرما رہے ہیں۔

عقیدت اور بات ہے، واقعہ اور چیز ہے، عقیدت سے واقعہ کا کوئی تعلق نہیں عقیدت منوائی نہیں جاتی، واقعہ اپنے آپ کو منوا کر رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بخاری میں بھی صحاح و حسان، ضعاف و منکر مرفوعات اور تعلیقات ہیں شامل

کنیتوں اور ناموں کا اختلاط آج بھی لاینحل ہے، غزوات خطبات اور بعض واقعات کی ناقابل بیان قطع وبرید بوجہ اختصار پسندی ہو گئی ہے جو بخاری سے باہر باسناد جیّد تفصیل سے ملتے ہیں۔ تعلیقات کی بھرمار نے آپ کے ہمعصر امام ابو حفص کبیر کو آپ کا مخالفت کر دیا۔ اور بعد والوں میں ابن حزم جیسی ہستیوں کو اس کتاب پر جرح کا کافی موقع دیا۔ ان کے علاوہ فرقہ ہائے اباضیہ، خارجیہ، ناصبیہ، رافضیہ، جہمیہ مرجیہ وقدریہ کی ان گنتی روایتیں اس میں موجود ہیں۔ چنانچہ ابن حجر جیسا بخاری پرست محدث بھی نخبہ میں لکھتا ہے: ۔

ان الرجال الذین تکلم فیھم من رجال مسلم اکثر عددًا من رجال البخاری۔

اور علی القاری شرح نخبہ میں فرماتے ہیں: ۔

فان الذین انفرد بھم البخاری اربعمائۃ وخمس وثلاثون رجلاً والمتکلم فیھم بالضعف نحو من ثمانین والذین انفرد بھم مسلم نحو ستمائۃ وعشرون والمتکلم فیھم بالضعف مائۃ وستون کما ذکرہ السخاوی فی شرحہ علی لفیۃ المالک

مختصر یہ کہ بخاری میں چار سو پینتیس حدیثیں منفرد ہیں جن میں اسّی ضعیف ہیں اور مسلم میں چھ سو بیس حدیثیں منفرد ہیں جن میں ایک سو ساٹھ ضعیف ہیں۔

بخاری کے چند ضعیف راویوں کے نام

۱۔ سید بن زید الجمال ابو محمد کوفی، کذّاب ومتروک۔ ابن معین نے کہا کذّاب ہے نسائی واحمد نے کہا متروک ہے، ابن حجر نے کہا کہ کسی کے نزدیک بھی یہ ثقہ نہیں۔

۲ - عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار۔ ابن معین نے کہا ضعیف ہے، ابوحاتم نے کہا ناقابلِ روایت ہے، مہدی سے نے کہا ناقابلِ حجت ہے، دارقطنی نے کہا اس سے روایت کرنا بخاری کے لیے عیب ہے۔

۳ - اسحٰق بن محمد بن اسماعیل الفروی۔ مرۃ نے کہا مضطرب ہے، عقیلی نے کہا واہی ہے، نسائی نے کہا ثقہ نہیں، دارقطنی نے کہا ضعیف ہے۔ ابوداؤد نے کہا راوی منکرات ہے۔

۴ - اسماعیل بن ادریس۔ نسائی نے کہا ضعیف ہے۔ ابن معین نے کہا چور ہے، دارقطنی نے کہا کذاب ہے، ابن عدی نے کہا سارقِ حدیث ہے۔

۵ - ذکریا بن یحییٰ طائی۔ دارقطنی نے کہا ضعیف ہے۔ یحییٰ نے کہا راوی منکرات ہے۔ حاکم نے کہا کثیر الاغلاط ہے اور ابوداؤد نے منکر الحدیث ہے

۶ - عبدالعزیز دراوردی۔ احمد نے کہا وہمی اور کثیر الاغلاط ہے۔ ابوذرعہ نے کہا سیئ الحفظ ہے۔ نسائی نے کہا منکر الحدیث ہے۔ ابوحاتم نے کہا ناقابلِ احتجاج ہے۔

۷ - محمد بن طلحہ بن مصرف کوفی۔ ابن سعد نے کہا راوی منکرات ہے، عفان نے کہا کذاب ہے، ابوداؤد نے کہا کثیر الخطا ہے۔ نسائی نے کہا ضعیف ہے۔ ابوکامل نے کہا لا یحل [illegible]۔

۸ - محمد بن یزید کوفی۔ ابوحاتم نے کہا شیطٰی ہے۔ ابوذرعہ نے کہا چور ہے اور خود بخاری نے کہا ضعیف ہے۔

۹ - معلیٰ بن منصور رازی۔ احمد نے کہا کثیر الخطا ہے، ابوحاتم نے کہا کذاب ہے۔ یحییٰ نے کہا ثقہ نہیں۔

۱۰ - یحییٰ بن ذکریا غسانی۔ ابوداؤد نے کہا ضعیف ہے۔ ابن معین نے

کہا مجہول ہے۔ ابن حبان نے کہا لا یجوز اعنہ الروایۃ یحییٰ نے کہا کذاب ہے، دجال ہے، حدیثیں بنایا کرتا ہے۔

۱۱۔ عتاب بن بشیر جزری۔ احمد نے کہا ضعیف ہے۔ نسائیؒ نے کہا قوی نہیں، ابن مہدی نے کہا متروک ہے۔

۱۲۔ فلیح بن سلیمان۔ یحییٰ و ابوحاتم و ابوداؤد نے کہا ناقابل احتجاج ہے۔ ابن معین و نسائیؒ و ابوحاتم نے کہا قوی نہیں، ثقہ نہیں، ابوداؤد نے کہا کچھ بھی نہیں، نسائیؒ نے کہا بے انتہا ضعیف ہے۔ سعید بن منصور نے کہا کثیر الخطا ہے، ابن عدی نے کہا راوئ غرائب ہے۔

۱۳۔ عکرمہ مولی ابن عباس۔ یحییٰ بن سعید نے کہا جھوٹا ہے۔ مالک نے کہا ناقابلِ اعتبار ہے۔ علی بن عبداللہ بن عباس نے کہا کذاب ہے خبیث ہے میرے باپ کے نام سے جھوٹی روایتیں کرتا ہے۔ سعید بن مسیب نے کہا کذّاب ہے۔ عطا بن ابی رباح نے کہا جھوٹا ہے۔ ابن سیرین نے کہا کذاب ہے۔ ابن ابی ذئب نے کہا ثقہ نہیں۔ یحییٰ بن معین نے کہا دروغ باف ابن سعد نے کہا اس کی روایتیں ناقابلِ اعتبار ہیں۔

۱۴۔ مروان بن حکم بن عاص۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لعنت کردہ ملعون بن ملعون۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم بن العاص ومروان فی صلبہ۔ جھوٹا فاسق، قاتل طلحہ، دشمن آل نبیؐ۔ اس کی بھی روایتیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔

صحیح بخاری ہو کہ صحیح مسلم، آخر انسانی کتابیں ہیں۔ ان میں غلطیوں کا رہ جانا کوئی بات نہیں۔ امام صاحبوں نے اپنے امکان تک جانچ پڑتال کی اور لاکھ دو لاکھ

کے ذخیرہ سے جو کُل کے کُل آپ دونوں کے عندیہ میں صحیح تھے کاٹ چھانٹ کر یہ دو کتابیں ہمارے لیے چھوڑیں۔ اتنی یا اتنی سے بڑھ کر ضعیف حدیثوں کا اس میں پایا جانا کوئی بات نہیں۔ مگر ان میں اوروں کی بہ نظر صحیح کی مقدار زیادہ ہے۔ رہا یہ عقیدہ کہ جو کچھ بخاری میں ہے وہ سب صحیح ہے۔ یا بخاری میں جو بات نہیں وہ غلط ہے محض عقیدت ہے۔ اور واقعہ اس کے برعکس ہے۔ بخاری نے ایک لاکھ صحیح حدیثیں جو اپنی شرط پر تھیں حفظ کیں اور ان میں سے صرف چار ہزار اس کتاب میں درج کیں اور بقیہ ۹۶ ہزار صحیح حدیثوں کو بخوفِ طوالتِ کتاب ترک کر دیا۔ پھر ایسی کتاب ساری صحیح حدیثوں کا کیونکر مجموعہ ہو سکتی ہے۔

سابقیتِ اسلام

مولانا کا یہ تخیل کہ جناب امیرؑ کا نمبر اسلام میں چوتھا بلکہ نواں تھا اور جو آپ کے مضبوط ماخذ سے ماخوذ ہے، نہ نقلاً درست ہے اور نہ عقلاً صحیح ہے۔ آپ کے مضبوط ماخذ یعنی بخاری کی ہر دو روایتیں معلول اور سقیم ہیں۔ ہر دو میں ایک مشترک راوی اسمٰعیل بن مجالد ہے جو ضعیف ناقابلِ اعتبار اور بے انتہا سقیم ہے۔ نسائی کہتے ہیں بے انتہا ضعیف ہے۔ حاکم کہتے ہیں ناقابلِ اعتبار ہے، دارقطنی کہتے ہیں بالاجماع ضعیف ہے۔ سعدی کہتے ہیں نامحمود شخص ہے۔ ابو ذرعہ کہتے ہیں نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے۔

اس ناقابلِ قبول روایت کو لیے ہوئے جمہور کے برخلاف جو جناب امیرؑ کو بعد حضرت خدیجہؓ سابق الاسلام مانتے ہیں، بخاری کھڑے ہوئے ہیں روایت بھی وہ جس میں پانچ گمنام غلاموں کا اسلام میں سابق ہونا ذکر کیا گیا ہے۔ جناب امیرؑ کا بعد حضرت خدیجہؓ کے سابق الاسلام ہونا خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تسلیم فرمالیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں مجھ پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے علیؑ ہیں اس کی روایت امام احمد نے سیّدنا عمر سے، طبرانی نے حضرت سلمان سے

بزار نے حضرت ابوذرؓ سے، عقیلی نے براء بن عازب سے، امام احمد و طبرانی نے معقل بن یسار سے، دارقطنی نے ابوسعید خدری سے، دیلمی نے حضرت سعد ابوسعید و ام سلمہ و جابر و اسماء بنت عمیس سے، حاکم نے معاذ سے، عقیلی نے حضرت عائشہ سے، حاکم ابن عدی، خطیب اور ابن اسامہ نے سلمان سے بزار نے حضرت علیؑ سے، حاکم نے ابو یعلیٰ سے، ابونعیم نے حضرت معاذ اور ابوسعید رضی اللہ عنہم سے کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بعد کسی اور کی شہادت ناقابلِ قبول ہے۔ مگر مزید قوتِ روایت کے لیے صحابہ کی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ امام احمد نسائی و ترمذی و حاکم و طبرانی نے حضرت زیدؓ[1] بن ارقم سے، ترمذی و بغوی نے حضرت انسؓ[2] سے، طبرانی و احمد نے حضرت جابرؓ[3] و ابورافعؓ[4] سے، طبرانی و حاکم نے حضرت انسؓ[5] سے، ترمذی، طبرانی و حاکم و ابن جریر نے ابن عباسؓ[6] سے، طبرانی نے حضرت جابرؓ[7] سے، ابن عبدالبر نے حضرات ابن عباسؓ[8]، سلمانؓ[9]، ابوذرؓ[10]، خبابؓ[11]، مقدادؓ[12]، زید بن ارقمؓ[13]، جابرؓ[14]، ابوسعید خدریؓ[15] حضرت عباسؓ[16] اور ابن مسعودؓ[17] سے، حاکم نے ابوموسیٰؓ[18] و زید بن ارقمؓ[19] سے، امام شافعی، طیالسی، ابن ابی شیبہ امام احمد و ترمذی، حاکم و بیہقی و ابن عبدالبر و ابن ابی خثیمہ نے زید بن ارقمؓ[20] سے، طبرانی و ابن عبدالبر و عبدالرزاق و حاکم و ابن سعد نے ابن عباسؓ[21] سے، امام ابوحنیفہ احمد و نسائی و حاکم و بزار و ابویعلیٰ نے حضرت علیؓ[22] سے روایت کی ہے کہ بعد حضرت خدیجہؓ کے علیؑ ابن ابی طالب سابق الاسلام ہیں۔ محمد ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں اور ابن عبدالبر نے استیعاب میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ جناب امیرؑ کے سابق الاسلام بعد خدیجہؓ ہونے پر صحابہ کا اجماع ہے۔

ان روایات کو ترمذی و حاکم و ابن عبدالبر اور ابوجعفر طبری اور ضیاء مقدسی

اور ابن حجر نے صحیح مانا ہے۔ اور عفیف کندی والی روایت کہ نئے دین پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم و خدیجہؓ و جناب امیرؑ کے سوا کوئی چوتھا روئے زمین پر نہ تھا، اسی دن میں نے اسلام قبول کر لیا ہوتا تو میرا نمبر چوتھا ہوتا، اس کی روایت خود بخاری نے تاریخ میں، ابن اسحٰق و امام احمد و طبرانی و ابویعلیٰ و حاکم و بغوی و ابن عبدالبر اور نسائی نے اپنی تصنیفوں میں کی ہے اور یہ حدیث ترمذی، ابن عبدالبر ابوجعفر طبری، ابن حجر و سیوطی کے عندیہ میں درجۂ صحیح کی ہے۔ اتنی زبردست شہادتوں کے مواجہ میں تنہا بخاری کی روایت وہ بھی معلول اور سقیم کس کام کی؟

ہجرت کا واقعہ

جیسے حضرت ابوبکر کا واقعہ قرآن میں وثانی اثنین اذھما فی الغار سے مفہوم ہے، ایسے ہی حضرت علیؑ کا بستر رسولؐ پر آپ کی چادر اوڑھے سونا آیت ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد سے مترشح ہے جیسے "صاحب" کی تشریح میں متعدد صحابہ نے حضرت ابوبکر کا نام لیا ہے اسی طرح تفسیر من یشری نفسہ میں کئی صحابہ نے جناب امیرؑ کا نام لیا ہے اگر اس کو امام بخاری نے بقول علامہ ابن رحیہ اندلسی بدأ ٰنا بما اوردہ مسلم لانہ اوردہ بکمالہ وقطعہ البخاری واسقط فیہ علی عادتہ کما نری وھو مما عیب علیہ فی تصنیفہ علی ماجری ولا سیما اسقاطہ لذکر علی ابن ابی طالب۔ محض نام علیؑ آنے کی وجہ سے ساقط فرما دیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ واقعہ ہوا ہی نہیں۔ جب کہ ۹۶ ہزار صحیح حدیثیں اس کتاب سے غائب ہیں وہاں ایک کا کیا ذکر۔ مگر امام ابن اسحٰق کی سیرت میں، سیرت ابن ہشام میں، تاریخ طبری میں، صحیح حاکم میں مسند طیالسی میں، مسند احمد و سنن ابوعوانہ و سنن نسائی و خصائص میں، تفسیر ابوحاتم و تفسیر

ثعلبی و واحدی و اسد الغابہ وغیرہم جیسی مستند کتب میں یہ واقعہ بتمامہ موجود ہے۔ اور شاہ ولی اللہ ہمارے شیخ الشیوخ بھی ازالۃ الخفاء میں اس کو لکھتے ہیں اور ذہبی جیسے مشدد اس کو حدیث صحیح فرماتے ہیں (مستدرک ص۱۳۳ ج) اور حاکم جیسے امام فن بخاری کو اس کے ترک کا طعنہ دیتے ہیں اور مولانا شبلی جیسے بخاری پرست نے سیرت جلد اول ص۱۹۱ میں لکھا ہے۔ یہ سخت خطرہ کا موقع تھا جناب امیر کو معلوم تھا کہ قریش آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر قتل گاہ کی زمین ہے لیکن فاتح خیبر کے لیے قتل گاہ فرش گل تھا، پنڈت ہرنام صاحب کے اور مولانا فاروق صاحب کے معرکۂ توہین صحابہ سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا تو یہ مقولہ ہے، کہ جناب امیرؑ نے جانبازی کی انتہا کردی اور جناب ابوبکر نے جان نثاری کی حد کردی رضی اللہ عنہما۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھائی علیؑ

مواخات نبیؐ و علیؑ کا تذکرہ بخاری میں نہیں نہ سہی۔ مگر واقعہ سچا اور مستند شہادتوں سے ثابت ہے۔ ترمذی، حاکم، بغوی نے حضرت ابن عمر سے امام احمد نے زید بن ابی اوفی یعلی بن مرہ، عمرو بن العاص ابن عباس اور حذیفہ رضی اللہ عنہم سے۔ ابن مردویہ نے حضرت زید بن ارقم سے، عبداللہ بن احمد نے ابن عمر سے، طبرانی نے ابو رافع و ابن عباس سے، ابن عساکر نے ابوامامہ سے، نسائی نے حضرت ابن عباس اور زید بن ارقم سے، ابن عبدالبر نے ابوالطفیل سے، ابن مردویہ نے حذیفہ بن یمان سے ابوالحسن ابن المغازلی نے حضرت انس سے روایت کی کہ مہاجرین اور انصار کے مابین مواخات قائم کرنے کے بعد حضرت علیؑ سے فرمایا کہ تم دنیا میں بھی ہمارے بھائی ہو اور آخرت میں بھی ہمارے بھائی ہو۔ سولہ محدثین عظام اور بارہ صحابۂ کرام کی زبردست شہادت سے

یہ واقعہ ثابت ہے۔ اس کا انکار ممکن نہیں۔

سدِّ ابواب کا تذکرہ

حدیث سدّوا هٰذه الابواب الا باب علی کی روایت نہ صرف ثابت اور صحیح ہے بلکہ کبار محدثین کے پاس متواترات سے ہے۔ سولہ صحابیوں سے تیرہ محدثین نے باسناد جید من وعن روایتیں کی ہیں۔ امام احمد نے مسند اور مناقب میں حضرت زید بن ارقم و براء بن عازب و سیّدنا عمر و ابوہریرہ و ابن عمر و سعد رضی اللہ عنہم سے، امام نسائی نے حضرت ابن عباس و ابن عمر و حرب بن مالک و زید بن ارقم و سعد بن مالک و براء بن عازب سے، حاکم نے مستدرک میں حضرت زید بن ارقم و براء سے طبرانی نے سعد و ابن عباس و جابر بن سمرہ و ناصح بن عبداللہ اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے، ترمذی نے حضرت ابن عباس سے، ابن سمان نے حضرت ابوہریرہ سے ابن المغازلی نے حضرت سعد سے، بیہقی نے حضرت ام سلمہ سے، ابوبکر بزار نے عمرو بن سہیل سے، ابن مردویہ نے حضرت علی سے، ابن عساکر نے عثمان بن عبداللہ سے اور ابوسعد نے شرف النبوۃ میں حضرات سعد و جابر بن عبداللہ سے اس سد ابواب والی حدیث کی روایت کی ہے۔

تنقیدِ حدیث

علامہ ابن حجر فتح الباری شرح بخاری میں الاباب علی کی نسبت لکھتے ہیں کہ امام احمد و نسائی کی حدیث سعد کے سارے طرق قوی اور ثابت ہیں۔ طبرانی نے بھی اس کی ثقہ راویوں سے روایت کی ہے۔ دوسری حدیث زید بن ارقم مرویہ احمد و نسائی کا ہر طریقہ قوی اور ان کے سارے رجال ثقہ و صدوق ہیں۔ تیسری حدیث جابر بن ثمرہ مرویہ طبرانی اور چوتھی حدیث ابن عمر مرویۂ امام احمد کے کل راوی درجۂ حسن کے ہیں۔ پانچویں حدیث ابن عمر مرویۂ نسائی میں علاء بن عزار کے علاوہ (جو ابن معین اور

احمد کے نزدیک ثقہ مگر اوروں کے نزدیک ثقہ نہیں، باقی سارے راوی ثقہ وصدوق ہیں جو امام احمد کے پاس حدیث صحیح ہے ترک بھی کر دیا جائے تو احادیث سعد و زید بن ارقم مرویۂ احمد و نسائی سب کے پاس صحیح ہیں اور احادیث جابر بن سمرہ مرویۂ طبرانی اور حدیث ابن عمر مرویۂ امام احمد حدیث حسن ہے اور ثبوت کے لیے یہ بہت ہیں۔

مطابقت روایات

حافظ احمد بن عمر عبد الخالق صاحب مسند و تلمیذ خاص امام بخاری نے اپنی مسند میں اور امام طحاوی حنفی نے مشکل الآثار میں ان دونوں روایتوں کی یوں تطبیق کی ہے کہ باب علیؓ کے سوا سارے دروازے بند ہونے کا حکم ہوا تو سب دروازے بند کیے گئے سوائے دروازۂ علیؓ کے۔ مگر ان صحابہ نے جن کے مکان مسجد کے ارد گرد تھے نماز کے اوقات کی آگہی کے لیے جانب مسجد کھڑکیاں رکھ لیں۔ جس پر دوبارہ ان کے بند کرنے کا حکم ہوا اور حضرت ابوبکر کی کھڑکی کھلی رکھی گئی۔

محاکمہ ابن حجر نسبت حدیث خوخہ حضرت ابوبکر

خوخہ والی روایت بخاری کی ہے۔ باب علیؓ والی حدیث سعد و زید بن ارقم مرویۂ احمد و نسائی اور روایت جابر مرویۂ طبرانی و روایت ابن عمر مرویۂ احمد عند الجمہور صحیح و ثابت ہیں۔ امام بخاری کی روایت میں اضطراب ہے۔ کہیں خوخہ کا لفظ ہے اور کہیں باب کا اور دونوں کے معنی جدا جدا ہیں۔ اس کے راوی فلیح بن سلیمان بن ابی مغیرہ جو حضرت ابوسعید سے تیسرے ہیں مجروح اور ضعیف ہیں۔ ابوحاتم نے بروایت معاویہ بن صالح نقادِ فن یحییٰ بن معین سے فلیح کا غیر ثقہ ہونا نقل کیا ہے۔ ابوداؤد نے تو ان کو لیس لشیء لا یجوز عنہ الروایۃ لکھا ہے۔ نسائی کہتے ہیں کہ یہ وہمی اور بے انتہا ضعیف ہیں۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ یہ راوی غرائب و مناکیر ہیں اور سعید بن منصور کا

قول ہے کہ یہ کثیر الخطا ہیں۔ (و تہذیب التہذیب ابن حجر جلد ۸ ص ۳۰۴) دوسری روایت ابن عباس مرویہ بخاری خود ان صحیح روایات ابن عباس مرویہ احمد و ترمذی و نسائی متعلقہ باب علیؑ کے مخالف ہے۔ چنانچہ یہ بھی ائمہ محدثین کے نزدیک صحت کے معیار سے گری ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کا راوی عکرمہ غلام ابن عباس ہے جو سخت خارجی اور ناصبی ہونے کے علاوہ کذاب اور حدیث وضع کرنے والا ہے۔ یحییٰ ابن سعید کا قول ہے، عکرمہ کذّاب ہے۔ امام مالک کا بیان ہے کہ وہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ حضرت ابن عباس کے فرزند علی کا کہنا ہے کہ عکرمہ کذّاب ہے، خبیث ہے اور دجال ہے، میرے باپ کے نام سے حدیثیں بنا بنا کر روایت کرتا ہے۔ قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق کہتے ہیں، کہ عکرمہ جھوٹا ہے۔ سعید بن مسیب خیر التابعین کا قول ہے کہ عکرمہ کذاب ہے۔ عطا بن رباح اجل تابعی کا قول ہے کہ عکرمہ کذاب ہے اور ابن عباس کی طرف سے حدیثیں بنا بنا کر روایت کرتا ہے۔ علامہ ابن سیرین کا بیان ہے کہ عکرمہ کذّاب ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں عکرمہ کذّاب ہے۔ ابن ابی ذئب نے کہا ثقہ نہیں ہے۔ ابن سعد نے کہا لا یجوز عنہ الروایۃ۔ علی المدینی عطا بن ابی رباح تابعی جلیل، خیر التابعین سعید بن المسیب، یحییٰ بن کبیر اور مصعب بن زبیر کہتے ہیں کہ عکرمہ سخت خارجی ہے لوگوں نے اس کے جنازہ کی نماز تک نہ پڑھی۔ غور کا مقام ہے کہ یہ روایت جس میں عکرمہ ہو کس حیثیت کی ہو سکتی ہے۔

یہ کہے بغیر رہا نہیں جاتا کہ جامع بخاری عکرمہ جیسے جھوٹے اور واضع احادیث کی روایتوں سے اور مروان لعین بن لعین جیسی شخصیت کی روایتوں سے تو مالامال ہے مگر سید التابعین اویس قرنی اور امام الصادقین امام جعفر علیہ السلام کی

روایتوں سے معریٰ ہے، مروان اور عکرمہ تو بخاری کے نزدیک مقبول مگر اویس قرنی اور جعفر صادق نامقبول۔ اے سبحان اللہ۔

علامہ ابن جریر طبری اور عینی شارح بخاری کا کہنا یہ ہے کہ مسجد نبوی سے ملحق سیدنا ابوبکر کا کوئی مکان نہ تھا۔ ہجرت پر آپ بنی عبد عوف میں مقیم رہے اور اسی مکان میں حضرت عائشہ کا زفاف بھی ہوا (بخاری) اور یہیں عبداللہ بن زبیر آپ کے نواسے پیدا ہوئے۔ یہاں سے مسجد تک تقریباً میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ تھا، (عمدۃ القاری شرح بخاری جلد ہفتم ص۶۰) ایام علالت نبوی میں آپ مقام سنح میں جو حوالی مدینہ سے ہے رہتے تھے۔ بوقت رحلت رسالتمآبؐ اور کئی دن بعدِ رحلت بھی یہیں مقیم تھے۔ امام بخاری نے کتاب الصلوٰۃ کتاب المناقب اور کتاب الجنائز میں بھی لکھا ہے۔ اقبل ابوبکر علی فرسہ من مسکنہ بالسنح۔ خود حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر خلیفہ ہونے کے چھ مہینے بعد تک بھی اپنے مکان مقام سنح میں رہتے تھے۔ وہاں سے علی الصبح مدینۂ منورہ کبھی پیدل کبھی گھوڑے پر آیا کرتے تھے، عشاء کی نماز پڑھ کر پھر واپس جاتے تھے۔ آپ کبھی نہ آتے تھے تو آپ کی جگہ عمر بن الخطاب نماز پڑھا دیا کرتے تھے (تاریخ طبری ص۲۱۴۲)

مولانا فاروق کا یہ ذم آمیز کلام، کہ یہ بزرگوار سپاہی تھے اور حضرت ابوبکر وزیر اور ظاہر ہے کہ وزیر اور سپاہی کی ذمہ داریوں اور کاموں میں بڑا فرق ہوتا ہے، یقیناً قابلِ استحسان نہیں۔ تحقیق تو یہ ہے کہ حضرت حمزہ بنی ہاشم فرزند عبدالمطلب، عم رسول اللہؐ اور شیر خدا اور شیر رسولؐ خدا تھے۔ حضرت عبیدہ رسول اللہؐ کے چچا زاد بھائی اور حضورؐ کے فدائی تھے، رہے حضرت علیؑ آپ آنحضرتؐ کے دین و دنیا میں بھائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے اور خدا کے محبوب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جان نثار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر اور شیخین کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر اور خلیفہ تھے (بخاری و مسلم، ترمذی و نسائی) حدیث یا علی انت اخی و صاحبی و وزیری مرویہ احمد و طبرانی و ابن ابی شیبہ از سلمانؓ و ابوذرؓ اور حدیث انت منی بمنزلۃ ھارون من موسےٰ اس پر دو ثقہ شاہد ہیں۔ جناب ابوبکر ہوں کہ جناب عمر، جناب علیؑ ہوں کہ جناب حمزہ، ہر فرد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یار، جان نثار، حقیقی مشیر، وزیر باتدبیر اور فدائی تھا اسی جنگ میں حضور نے مع احد کما جبرئیل و مع الاخر میکائیل مرویہ احمد و نسائی و ابن ابی شیبہ حضرات علیؑ و ابوبکر کی نسبت فرمایا۔ اور اسد اللہ و اسد رسولہ حضرت حمزہ کے متعلق فرمایا تھا۔ جس کے ذمہ جو کام سپرد ہوا اس کو اس نے جان نثاری سے انجام دیا۔ جناب امیرؑ آپ کی نگاہوں میں ایک معمولی سپاہی نظر آئیں تو کوئی حرج نہیں۔ مگر نگاہِ رسالت مآب میں علیؑ فاتح بدر و حنین اور خیبر و احد کے ہیرو تھے۔ چنانچہ علامہ شبلی سیرت النبی جلد اول ص۲۵ میں فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے راوی غزوۂ بدر کے ہیرو اسد اللہ الغالب علیؑ بن ابی طالب ہیں۔

شرف زوجیت فاطمۃ الزہراؑ

یہ وہ مہتم بالشان افتخار اور سرافرازِ وقار تھا کہ آپ کے بقول ان دونوں بزرگواروں نے بھی جن کی صاحبزادیاں مسلمانوں کی مائیں بن چکی تھیں اس اعزازِ خصوصی کے حصول میں سعی کی تھی، ملاحظہ ہوں۔ احادیث مرویہ احمد و ابوحاتم و نسائی و عبد الرزاق وغیرہم و مرویات ابن حجر فی الاصابہ و ابن سعد فی الطبقات و ابن اثیر فی اسد الغابہ و ابن جریر فی تہذیب الآثار و مواہب عسقلانی چونکہ

تزویج فاطمہؑ بروحی آسمانی تھی ، ارشاد ہوا مجھے وحی کا انتظار ہے (امام احمد، ابوحاتم ، ابن ابی شیبہ وحاکمی) اتنے میں وحی نازل ہوتی ہے ۔ ارشاد فرماتے ہیں ۔ خدا نے فاطمہؑ کا عقد علیؑ سے کر دینے کا امر فرمایا ہے ۔ احمد و ابوجعفر و طبری وطبرانی و ابن شاذان و ابن السمان و بیہقی و خطیب و ابن عساکر وحاکم از حضرات انس وجابر و ابن عباس ۔

مولانا کے اس جملہ کا (بلکہ خود حضرت علیؑ کی مائیں بن چکی تھیں) حضرت ابوبکر اور عمر کی مائیں بھی تو ہو چکی تھیں ، کافی جواب ہے ۔ آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں کہ دامادی دوسرے درجہ کی چیز تھی ، اس لیے دوسرے درجہ کے لوگ اس سے مشرف ہو سکتے تھے ، یہ کلمہ صداقت وادب سے گرا ہوا ہے ۔ دامادئ رسولؐ تو ایک مختص شرف ہے ۔ مگر زوجیت فاطمۃ الزہراؑ اس مختص شرف میں بھی اعلیٰ ہے ۔ یہ وہ شرف ہے جس کی تمنا کا اظہار وہ بزرگ بھی فرمایا کرتے تھے جن کی صاحبزادیاں مسلمانوں کی مائیں بن چکی تھیں ۔ امام احمد ابن ابی شیبہ ، ابن مندہ ، ابویعلیٰ حاکم و ابن نجار سے مروی ہے کہ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ جناب امیرؑ کے تین شرف سے ایک بھی مجھے حاصل ہوتا تو مجھے حُمر نعم سے بھی محبوب تر ہوتا ، ایک تو فاطمہؑ جیسی بی بی کا علیؑ کو ملنا ، مسجد میں صرف ان کا دروازہ کھُلا رہنا اور یوم خیبر کو رایت کا ملنا ، یہ وہ شرف وافتخار ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں ۔ یا علی اوتیت ثلاثا لم یوت احد ولا انا اوتیت صهرًا مثلی ولم اوت انا مثلی واوتیت صدیقةً مثل بنتی ولم اوت مثلها واوتیت الحسن والحسین من صلبك ولم اوت من صلبی مثلهما ولکنکم منی وانا منکم (اس کی روایت دیلمی نے ابن حجر عسقلانی نے ابوسعد نے شرف نبوت میں اور امام

علی الرضاؑ نے اپنی مسند میں اور ابوالحسن ملا نے سیرت میں کی ہے) یعنی اے علیؑ تم کو تین باتیں ایسی حاصل ہیں جو مجھے بھی حاصل نہیں اور نہ کسی کو حاصل ہیں۔ تم کو مجھ جیسا خسر ملا، مجھ کو تجھ جیسا خسر نہ ملا۔ تم کو میری بیٹی جیسی صدیقہ ملی، مجھ کو ایسی نہ ملی۔ تم کو حسنینؑ جیسے بچے ملے مجھ کو ان جیسے بچے نہ ملے۔ مگر تم سب میرے اور میں تمھارا ہوں۔ یہ وہ شرف ہے جس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرماتے ہیں:۔ لولم یخلق علی ما کان لفاطمۃ کفوٌ۔ جامی نے اس کا ترجمہ خوب فرمایا ؎

گر علیؑ خود نمی شدے مخلوق
ہم نمی داشت فاطمہؑ ہم سر

حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ فاطمۃ بنت محمد سیدۃ نساء العالمین سیدۃ نساء المومنین سیدۃ نساء اھل الجنۃ (امام احمد از حضرت عائشہ) اور فرمایا، یا فاطمۃ الا ترضین ان تکونی سیدۃ نساء العالمین وسیدۃ نساء المومنین وسیدۃ نساء ھٰذہ الامۃ (از حضرت عائشہ ذہبی نے تلخیص میں کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے مستدرک جلد ۳ صفحہ ۱۵۶) سیدۂ نساء العالمین وسیدۂ نساء امت و سیدۂ نساء اہل جنت کے شوہر بننے کا شرف اسی کا حصہ تھا۔ جو زبانِ رسالتؐ سے امیر المومنین سید المسلمین (حاکم، بزار، ابن مردویہ، ابونعیم) سیدِ دارین (احمد و حاکم) نبیوں اور رسولوں کے سوا باقی ساری اولادِ آدمؑ کا سردار (ابن مردویہ و خوارزمی) امام البررہ (حاکم) نفس رسول اللہؐ (خوارزمی ابن نجار و ابویعلیٰ) نظیر رسول اللہؐ (طبرانی، ابوجعفر، طبری دیلمی و ابن عساکر) خدا و رسولؐ کے محبوب ترین (نسائی، حاکم، امام احمد) ہونے کا شرف یاب تھا۔

مولانا کے عندیہ میں جناب علیؑ درجۂ دوم کے شخص ہوں گے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک آپ اعلیٰ درجہ کے انسان تھے۔ محبوب خدا و رسولؐ تھے۔ (بخاری و مسلم، حاکم و ترمذی نسائی) بہترین خلق تھے (علی خیر البشر من ابی فقد کفر۔ رواہ ابن مردویہ عن حذیفہ والحاکم عن ابن مسعود و احمد والخطیب عن جابر و ابو یعلی والشاذان عن علی) اول مومن اعلم باللہ اور اعظم عند اللہ تھے۔ (احمد و دیلمی عن عمر بن الخطاب والحاکم عن ابی ہریرہ) اہل بیت نبیؐ تھے۔ نحن اھل البیت لا یقاس بنا احد رواہ ابو نعیم فی الحلیۃ و ابن نجار و ابو یعلی والخطیب فی المتفق والمفترق)

انذار عشیرۃ الاقربین

جناب امیرؑ فرماتے ہیں کہ بعثت کے چوتھے سال وانذر عشیرتک الاقربین نازل ہوئی اور اپنے قریبی رشتہ داروں کے انذار کا آپ کو حکم ہُوا۔ تو آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ دعوت کا سامان یعنی گوشت روٹی اور دودھ مہیا کروں اور بنو عبد المطلب کو دعوت دے آؤں۔ تقریباً چالیس بنی عبد المطلب جن میں آپ کے چار چچا ابو طالب ابو لہب، حمزہ اور عباس بھی تھے دعوت پر آئے۔ بعد طعام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مخاطب فرمایا، کہ خدا نے کُل بنی آدم پر اور خصوصاً تم پر مجھے اپنا رسولؐ بنا کر بھیجا ہے۔ کون تم میں سے میرا شریک کار اور حامی ہو سکتا ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں میرا بھائی، میرا وزیر اور میرا خلیفہ ہُوا چاہتا ہے تین مرتبہ کے بعد بھی کسی نے جواب نہ دیا تو میں نے کہا، میں سب میں کمسن، کمزور اور ناتواں ہوں، مگر میں تا زیست آپ کا ساتھ دوں گا اور آپ کا ممد و معاون رہوں گا، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری پیٹھ ٹھونکی اور قوم سے فرمایا۔ (ھٰذا اخی و وصی و وزیری و خلیفتی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوا)

"یہ میرا بھائی ہے، میرا وصی، میرا وزیر اور تم میں میرا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس کی سنو اور اطاعت کرو۔" ہماری برادری نے اس کا مضحکہ اڑایا اور میرے باپ ابوطالبؑ سے کہا، لو اب اپنے بیٹے کی اطاعت کرتے رہو۔

تقریباً انہی لفظوں میں یا کم وبیش یہ واقعہ مسند امام احمد و مناقب امام احمدؒ مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ و خصائص نسائی و سیرت ابن اسحاق و تاریخ طبری و تہذیب آثار طبری و دلائل بیہقی و ابونعیم و تاریخ ابوالفدا و تاریخ خمیس و تفاسیر ابن مردویہ و واحدی و ابن ابی حاتم و معالم بغوی میں موجود ہے (ملاحظہ ہوں خصائص نسائی ص۱۳ مسند احمد ص۱۱۱ جلد سوم کنز العمال جلد ۶ ص۳۹۷ تفسیر معالم بغوی ص۶۶۳ مطبوعہ بمبئی، تاریخ ابوجعفر طبری جرمن ص۱۱۷۳۔ مگر مصر کی مطبوعہ تاریخ طبری جلد ۹ ص۶۸ میں وصی وخلیفتی کے بجائے کذا وکذا درج ہیں جو موجودہ ذہنیت کا اظہار کر رہے ہیں۔

امام بخاری نے تو غضب ہی کر دیا۔ سرے سے اس واقعہ کا ذکر نہ مذکور بلکہ باب نزول وانذر عشیرتک الاقربین کے تحت آپ نے بخلاف جمہور جو قصہ درج فرمایا ہے وہ کوئی اور ہی ہے۔ نہ اس میں کوئی دعوت کا تذکرہ ہے نہ جناب امیرؑ کا ذکر مذکور ہے، اور نہ وزیر و خلیفہ کا کوئی اشارہ یا کنایہ ہے بخاری میں اس کی تین روایتیں ہیں اور تینوں میں بجائے انذر عشیرتک الاقربین کے خلاف آیاتِ قرآنی انذارِ قریش و قبائل بنی فہر، بنی لوئی و بنی عدی وغیرہم مذکور ہے۔

ان دو روایتوں کے راوی اول حضرت عبداللہ بن عباس ہیں جو باتفاق ارباب سیر و تاریخ ہجرت سے تین سال پہلے مکہ میں متولد ہوئے، اور یہ واقعہ انذار عشیرت بعثت کے تین سال بعد ہوا۔ گویا حضرت عبداللہ عالم وجود

یں آنے کے سات سال پہلے سے ہی اس واقعہ کے شاہد عینی رہے تھے۔

۲۔ ابن عباس والی روایت کی ابتداء لما نزلت وانذر عشیرتك الاقربین ورھطك منھم المخلصین سے بخاری نے کی ہے چونکہ بخاری بعضوں کے نزدیک اصح الکتب ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ورھطك منھم المخلصین بھی آیتِ قرآنی و کلامِ ربانی ہے جو انذر عشیرتك الاقربین کا ایک ٹکڑا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل تو ہوئی مگر بعضوں نے اس کو قرآن سے خارج کر دیا (نعوذ باللہ) بخاری کو مانیں کیوں اور ان تاویلات میں پڑیں کیوں؟

۳۔ تیسری کے راویٔ اول حضرت ابوہریرہ ہیں جو بہ اتفاق ۷ھ میں بہ مقام خیبر یا دورانِ سفرِ خیبر مسلمان ہوتے۔ اس وقت آپ کی مسیں بھیگنے لگی تھیں اور آپ کا سنِ وفات ۵۷ھ یا ۵۹ھ ہے۔ گویا آپ بھی اس انذار عشیرت کے وقت دو تین سال کے ماشاء اللہ ہوں گے۔ اور اس عمر میں بقول بخاری آپ نے اس قصہ کا معائنہ فرمایا تھا۔

۴۔ روایت ابوہریرہ میں حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی مخاطب الفاظ "اے فاطمہؑ اپنی آپ دیکھ لو، محمدؐ تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتے" (نعوذ باللہ) ہوئی ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ بقولے سہ سالہ و بقولے چار سالہ یا پنج سالہ لڑکی نہ اس کی مخاطب بن سکتی ہے اور نہ ان الفاظ کی وہ مستحق ہو سکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ حضرت فاطمہ یومِ گویائی ہی سے کلمہ گو رہی ہیں اور یہ مخاطبت محض کفار سے تھی۔ ابن حجر جیسے سرپرست بخاری بھی فرماتے ہیں وفی نداء فاطمة یومئذٍ ایضًا ما یقتضی اخر القصة لانها کانت حینئذٍ صغیرة (فتح الباری ج ۳ ص ۳۱۱)

۵ ۔ امام بخاری نے انذارِ عشیرت والے قصہ سے گریز فرمایا اور آیت انذر عشیرتک الاقربین کے تحت نزول تبت یدا والے قصۂ کوہِ صفا کو اس لیے یہاں درج فرمایا کہ جناب امیرؑ کا کوئی ذکر مذکور نہ ہونے پائے حالانکہ نزول آیت وانذر عشیرتک الاقربین کے تین سال بعد کوہ صفا والا معاملہ ہوا اور سورۂ تبت نازل ہوئی۔

۶ ۔ تمام مفسّرین اور مورخین اہل سیر اور محدثین کا اتفاق ہے کہ نزول تبت یدا ابی لہب بعد محاصرۂ شعب ابی طالب ہوا محاصرہ یکم محرم سنہ بعثت کو شروع ہوا اور تین سال رہنے کے بعد سنہ ۱۰ نبوی کو ختم ہوا اور انذارِ عشیرت سن چار نبوی میں ہوا۔ نہ معلوم بخاری نے کس مصلحت کی بناء پر واقعہ انذارِ عشیرت کو حذف کرکے اس جگہ ایک چار سال بعد والے واقعہ کوہِ صفا کو آیت انذارِ عشیرت کے تحت درج فرمایا۔

۷ ۔ معاہدۂ قریش کی رو سے بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب جب محصور ہو گئے تو ابو لہب بنی عبد المطلب سے جدا ہوا اور قریش سے جا ملا۔ فلما فعلت ذالک قریش اجتاذت بنو ہاشم و بنو عبد المطلب الی ابی طالب فدخلوا معہ فی شعبہ واجتمعوا الیہ وقد خرج من بنی ہاشم ابو لہب الی قریش (سیرۃ ابن ہشام جلد اوّل ص۱۲۳ وتاریخ طبری جزمن)

۸ ۔ یہ محاصرہ سنہ نبوی سے شروع ہوا اور سنہ ۱۰ نبوی کے پہلے دن ختم ہوا وفی التاریخ الخمس ص۳۳۵ وفی السنۃ السابعۃ من النبوۃ اوالثامن منہا علی ما فی المتقی تقاسمت قریش وتعاہدوا علی معاداۃ بنی ہاشم و بنی عبد مطلب گویا نزول تبت

یہ ۱۰ اور واقعہ صفا بعد ارتفاع محاصرہ یعنی سنہ ۱ نبوی میں واقع ہوا۔

امام بخاری کی مصلحتوں کو وہی جانیں مگر آپ کے حذف واقعہ انذار عشیرت اقربین اور اندراج واقعہ کوہ صفا و نزول تبت یدا اور باب انذر عشیرتک الاقربین سے آپ کے ہواخواہ ابن خزیمہ و اسمٰعیل بھی چکرا گئے اور آخر انھیں کہنا پڑا کہ انذار عشیرت والا معاملہ صدر اسلام کا ہے جب کہ نہ ابن عباس پیدا ہوئے تھے اور نہ ابوہریرہ سے کوئی واقف تھا۔

بخاری کی روایت انذارِ عشیرت کی اب کیا حیثیت رہ جاتی ہے جب کہ اس کے ایک راوی ابن عباس اس وقت پیدا ہی نہ ہوئے تھے اور دوسرے راوی ابوہریرہ بہ مشکل ڈھائی تین برس کے ہوں تو ہوں۔ انذارِ عشیرت والی حقیقی روایت کو ترک کر کے کوہِ صفا والی روایت کو آیت وانذر عشیرتک الاقربین کے تحت میں درج کرنا اور شاہدِ عینی جناب علیؑ سے روایت نہ لے کر ایسی ہستی سے اس کو مروی کرنا جو عالمِ وجود ہی میں نہ آئی ہو اور واقعہ کے وقت اس کے پیدا ہونے ہی میں سات برس اور باقی ہوں یقیناً اصح الکتب کے شایانِ شان ہے۔

بخاری کے چھپائے نہ چھپنے والے واقعہ انذار عشیرت کا تذکرہ تفسیر خازن، تفسیر سراج منیر، تفسیر ثعلبی، تفسیر واحدی، تفسیر ابن مردویہ، تفسیر ابن ابی حاتم، تفسیر معالم التنزیل امام بغوی، کنز العمال، دلائل بیہقی، دلائل ابونعیم، حلیۃ الاولیاء، ذخیرۃ المآل عجلی، مختارۃ ضیا مقدسی، تہذیب الآثار طبری، اکتفاء عاصمی، کامل ابن اثیر، تاریخ ابوالفداء، تاریخ روضۃ الصفا، تاریخ حبیب السیر، معارج النبوۃ، مدارج النبوۃ، ازالۃ الخفاء شاہ ولی اللہ صاحب میں موجود ہے اس کا انکار اور اخفاء ممکن نہیں۔

علاوہ بریں مصنفین یورپ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ :-

۱۔ جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب اپالوجی میں لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دو مرتبہ اپنے مخالفین کی دعوت کی اور اپنی تقریر اس پر ختم کی کہ کون میرا ساتھ دے گا اور میرا وزیر اور میرا خلیفہ بنے گا۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ نوجوان بہادر علیؑ نے للکار کر کہا۔ "میں آپ کا ساتھ دوں گا" اس پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا۔ "تو میرا بھائی میرا وزیر اور خلیفہ ہے۔"

۲۔ کارلائل اپنی کتاب ہیروز میں لکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ مجمع جس میں علیؑ کے والد ابوطالب بھی تھے، کھلم کھلا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ابھی تک مخالف نہ تھا مگر سب کو اس کا اچنبھا تھا کہ ایک ادھیڑ آدمی اور پندرہ سالہ لڑکا دنیا کو اپنا رام کریں گے مضحکہ خیز تھا، مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ دعویٰ درست تھا۔

۳۔ ارون اپنی کتاب خلفائے محمدؐ میں لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوبارہ بنی ہاشم کو اپنے گھر بلایا، اور انکی ضیافت کی، اور پھر کھڑے ہو کر خدا کے الہامی حکم سے انھیں نئے دین پر بلایا اور کہا "کون میرے اس امر میں میرا وزیر اور میرا جانشین ہوگا" سب تو چپ رہے مگر نوجوان علیؑ نے کہا "میں حاضر ہوں"، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی باہیں علیؑ کی گردن میں ڈال دیں اور سینہ سے لگایا اور بہ آوازِ بلند کہا۔ "تم سب لوگ میرے بھائی میرے وزیر اور میرے جانشین کو دیکھ لو اور اس کی فرماں برداری کرو" اس پر لوگوں نے ایک قہقہہ لگایا اور اس کم سن خلیفہ کے باپ ابوطالبؑ سے کہا۔ اب بیٹے کے سامنے جھکے رہیے۔

۴۔ گبن اپنی تاریخ میں اس واقعہ کو تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ اس مجمع میں ایک علیؑ ہی نے آپ کا ساتھ دیا، اور آپ کے وزیر اور جانشین بنے۔

بزعم فاروق صاحب اگر پنڈت جی نے تذکرۂ اُحد میں حضرات شیخین کی توہین کی ہے تو واقعات مشہور کے خلاف اور منافیٔ ادب ہے۔ اس کا جواب آپ کو توہینِ امیرؑ سے دینا نہ چاہیے تھا۔ بخاری و مسلم امام احمد و ابوحاتم ابن ابی شیبہ و ابن اسحٰق تو یک زبان ہوکر کہیں کہ اُحد کے دن مہاجرین میں حضرات علیؑ و ابوبکر و ابن عوف و سعد و طلحہ و زبیر و ابوعبیدہ حضورؐ کے ساتھ ساتھ تھے اور انصار میں حضرات ابودجانہ، سہل ابن حنیف، اسد بن خضیر، خباب بن منذر، سعد بن معاذ اور عاصم جمے کے جمے رہے۔ اس کے خلاف کوئی اگر ہزار کہے تو ملنے کون؟ رہا صحابہ کا انتشار خصوصاً بعد خبرِ شہادت سیدِ ابرارؐ ایک فطری امر تھا، جب سر ہی نہ رہا تو دستار کہاں: انھیں تو خداوندِ تعالیٰ ولقد عفا اللہ عنھم کی تحریری معافی دے اور دوسری طرف ہم انھیں خاطی و مجرم بنائیں۔

مولانا کا بار بار یہ کہنا کہ حضرت علیؑ ایک معمولی سپاہی تھے اور شیخین وزراء تھے یقیناً ہجو ملیح ہے۔ توہینِ خلفاء اگر عادت ثانیہ تھی تو قلم ہی نہ اٹھاتے۔ یارانِ رسولؐ کی ہجو ہی اگر مضمون نگاری ہے تو ایسی مضمون نگاری کو ہمارا دور سے سلام۔

جناب امیرؑ نہ صرف معمولی سپاہی تھے بلکہ امت بھر کی طرف سے آپ مجاہد تھے۔ اور (کفی اللہ المومنین القتال بعلی) کے مصداق تھے۔ حضرت ابن مسعود نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ ساری امت کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے جناب امیرؑ کا جہاد قبول فرمایا۔ (ابن ابی حاتم ثعلبی، واحدی، حافظ ابن عساکر خطیب، دُرِّ منثور سیوطی مہبط وحی لافتیٰ تھے۔ ابن اسحٰق امام احمد اور ابوالحسن بن عرفہ عن ابی رافع و ابن عباس، بریدہ و جابر رضی اللہ عنھم و مردویہ قسطلانی و زرقانی و طبری و سبط ابن جوزی و خوارزمی و شیخ دہلوی و صاحب روضۃ الاحباب۔

بشارت باب لم یرجع حتی یفتح اللہ علیہ تھے (ابن اثیر از بریدہ و

وابن ابی شیبہ واحمد وبزار وحاکم ونسائیؒ وطبری از ابوہریرہ، وابن ابی شیبہ وحاکم وبزار واحمد از امام حسنؓ (۴) مخاطب کرار وغیر فرار تھے۔ (نسائی واحمد از ابن ابی لیلیٰ وابن اسحٰق از حضرت ام سلمہ وامام احمد وابن جریر طبری وابن ابی شیبہ از حضرت علیؑ ودارقطنی وخطیب وابن عساکر از حضرت عمر) (۵) ہم رکاب جبرئیل ومیکائیل تھے۔ (احمد وابن ابی شیبہ وطبری وخطیب وابن عساکر از حضرات عمر وعلی) (۶) علم بردار نبی تھے (وھو الذی کان لواءہٗ معہ فی کل زحف) ترمذی ونسائیؒ وابن عبدالبر وبزار از ابن عباس (۷) حامل لواء حمد بروز حشر یہی ہیں (ابن حبان از جابر بن سمرہ خوارزمی از علی دیلمی از انس۔ شاذان از علیؑ واحمد از ابن عباس وابن اثیر از ثعلبہ راوی ہیں کہ حضور نے فرمایا بروز قیامت علیؑ ہی حامل لواء حمد ہوگا (۸) جنگ بدر کے ہیرو تھے۔ سیرت ابن اسحٰق طبری۔ مسند احمد۔ صحیح حاکم ابن اثیر اور سیرت النبی جلد اول ص۲۵۷ (۹) اُحد کے سورما تھے۔ ابن اسحٰق، حاکم، احمد اور مدارج، شیخ دہلوی فرماتے ہیں۔ "وے رضی اللہ عنہ حق مبارزت ومحاربت وجلادت وشجاعت بجائے آورد ولہ فوق آں تصور نہ تواں کرد۔ می گویند چوں علی مرتضیٰ ایں مردانگی کرد و نصرت واو جبرائیل بہ آنحضرتؐ گفت کہ ایں کمال مواسات وجواں مردی است کہ علی با تو می برد۔ آنحضرتؐ فرمود انہ منی وانا منہ۔ آں گاہ جبرائیل فرمود انا منکما بعد ازاں آوازِ غیب شنیدند "لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار۔ اس ندائے آسمانی کی تصدیق سیرت ابن اسحٰق میں ابن عباس سے اور مسند احمد میں بریدہ سے کامل ابن عدی میں ابورافع سے اور ابو جعفر کی تاریخ میں ابن عباس سے ص۱۴۰۲ پر ہوتی ہے۔ امام سیوطی نے حضرت علیؓ سے، قسطلانی نے مواہب میں ابن عباس سے، محب طبری نے ریاض میں۔ خوارزمی نے مناقب میں سبط ابن جوزی نے تذکرہ میں جمال الدین

محدث نے روضۃ الاحباب میں اور فضل اللہ روزبہان نے کشف الغمہ میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ (۱۰) "فاتح جنگِ احزاب تھے"۔ شیخ دہلوی مدارج میں فرماتے ہیں۔ "القصہ محاربہ ومقاتلہ میان دو لشکر واقع شد۔ خصوصاً از علی مرتضیٰ دریں غزوہ مبارزت ہا ومقاتلہ ہا واقع شد، از حد قیاس وعقل بیرون چنانچہ در اخبار وارد شدہ است لمبارزۃ علی یوم الخندق افضل من اعمال امتی الی یوم القیامۃ یوم خندق والی علیؑ کی لڑائی میری امت کے اعمال تا قیامت سے افضل ہے۔ اس کی روایت حاکم نے صحیح میں دیلمی نے فردوس میں خوارزمی نے مناقب میں فخر رازی نے ارلعین میں شیرازی نے القاب میں اور جمال محدث نے روضۃ الاحباب ص۳۲۷ میں کی ہے۔ (۱۱) "قاطع باب خیبری تھے"۔ جس کی روایت ابن ابی شیبہ وبیہقی وابونعیم وحاکم وجابر بن سمرہ سے اور محمد بن اسحٰق نے ابورافع سے کی اور جس کی تخریج قسطلانی نے مواہب میں۔ ابن حجر نے صواعق میں اور ابو جعفر طبری نے تاریخ کبیر میں کی ہے۔ (۱۲) "وزیر رسول اللہؐ تھے۔" حدیث متواتر منزلت اور حدیث انت اخی وصاحبی ووزیری مرویۂ امام احمد ونسائی وطبرانی وحاکم وابن مردویہ، اس کے دو شاھد عادل ہیں (۱۳) "مشکل کشائے غزوۂ حنین تھے" ابن اسحٰق نے سیرت میں ابن ہشام نے اپنی سیرت میں حاکم نے اپنی صحیح میں امام احمد نے اپنے مسند میں حضرات جابر و ابو رافع سے اس کی روایت کی ہے۔ ابن قتیبہ نے معارف اور کتاب امامت و سیاست میں ابن عساکر نے تاریخ میں اور ابن مندہ نے حضرت انس سے اور ابوبکر بن ابی شیبہ نے بھی حضرت انس سے اس کی روایت کی کہ حضرت علیؑ کی حیداری اور بہادری سے مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا اور چالیس پہلوانوں کو آپ نے اس دن قتل کیا۔

تذکرۂ حدیبیہ میں فاروق صاحب کا یہ فقرہ "لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت علیؑ کی حیثیت میں فرق تھا" دل جلا فقرہ ہے۔ جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ آیت نہیں، حدیث نہیں جس کو مانئے۔ وزیر کی حیثیت سے ہو یا مشیر کی، صحابی کی حیثیت سے ہو یا خلیفہ کی، دونوں ہم پلّہ اور مساوی تھے۔ بلکہ جناب امیرؑ میں اہل بیت رسولؐ، نفس رسولؐ اور خونِ رسولؐ ہونے کی وجہ سے ایک خصوصی بات اور بھی تھی جس پر مرفوع شہادتیں بکثرت ہیں۔ "میرا اور علیؑ کا خون ایک ہے" مرویہ ابونعیم و ابن عساکر از ابن مسعود، دیلمی و عقیلی از ابن عباس، خوارزمی و طبرانی از حضرت علیؑ، ابویعلی از ام سلمہ۔ "علیؑ میرا نفس ہے" (مرویہ ابن نجار از عمرو بن العاص و نسائی و دارقطنی از حضرت علیؑ و ابویعلی از عبداللہ بن عمرو بن العاص و امام نطنزی از حضرت عائشہ و حاکم از جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم)

"میری جان کو میرے جسد سے جو نسبت ہے وہی نسبت علیؑ کو مجھ سے ہے۔"

اس کی روایت ابن نجار نے اور دمشقی نے حضرت ابن مسعود سے کی ہے۔ علاوہ بریں خود جناب امیرؑ فرماتے تھے۔ کانت لی منزلۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن لاحد من الخلائق (مرویہ احمد و نسائیؒ و حاکم از حضرت علیؑ و حدیث ام سلمہؓ کان لعلی منزلۃ الخ مرویۂ حاکم۔ یہ حیثیت اور منزلت فاروق صاحب سے غالباً پوشیدہ نہ ہوگی۔

حدیث خیبر میں امام بخاری نے کرار غیر فرار کا ٹکڑا اگر ترک کر دیا تو کیا ہوا۔ بخاری کے سارے ہمسروں بلکہ بخاری کے اساتذہ کی روایتوں میں یہ ٹکڑا جیسے کا تیسا موجود ہے۔ چنانچہ ابن اسحاق ابن ہشام اور حلبی نے سیرتوں میں حضرت ام سلمہؓ سے نسائی و احمد نے ابویعلی سے مناقب میں۔ ابن ابی شیبہ و احمد و ابن جریر طبری نے حضرت علیؑ سے، دارقطنی و خطیب و ابن عساکر نے

حضرت عمر سے طبرانی و بیہقی نے حضرت جابر سے، بزار نے ابو یعلیٰ سے۔ امام احمد نے بریدہ اسلمی سے، طبرانی نے ابن عمر سے اور بزار نے ابن عباس سے اسی حدیث خیبر کو "کرار غیر فرار" کے ٹکڑے کے ساتھ روایت کیا ہے۔ رہی خلفاء کرام کی توہین وہ بھی دونوں صاحبوں کا حصہ ہے۔

حضرت ابوبکر و عمر کا جنگِ خیبر سے بے فتح کیے لوٹ آنا ان کی توہین کا باعث نہیں۔ جیت ہار تو خدا کے ہاتھ ہے۔ جنگِ احد کی مثال موجود ہے اور جنگِ حنین کا دن یاد ہے۔ مگر مولانا نے حالتِ غضب میں یہ غضب کر دیا کہ صفین میں جنابِ امیرؑ کی شکست بتائی۔ لم یرجع حتی یفتح اللہ علیٰ یدیہ جس کی شان ہو اس نے کہیں نہیں، کہیں نہیں صرف صفین میں شکست اٹھائی! شکست تو امیر معاویہ نے اٹھائی اور قرآن نیزوں پر اٹھایا، تاکہ جنابِ امیرؑ کا فاتح لشکر بد دل ہو۔ مگر آپ کی کمال عقیدت نے اس کو جنابِ امیرؑ کی طرف پھیر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

اس پر یہ اور اضافہ :- "رہی علیؑ کی کراری غیر فراری" تو اس کا کتنا نمایاں ثبوت ہے کہ آنحضرتؐ نے ان کو کبھی پوری فوج کا سپہ سالار نہ بنایا، بلکہ ہمیشہ ایک سپاہی یا معمولی حیثیت کے افسر کے طور پر رکھا" جلے دل کا پھپھولا ہے۔ دعویٰ تو یہ ہے کہ علیؑ کی کراری غیر فراری غلط۔ اور اس کی دلیل یہ کہ کبھی انھیں فوج کا سپہ سالار نہ بنایا۔ دعویٰ کیا؟ اور دلیل کون سی؟ سبحان اللہ۔ بتایا تو یہ ہوتا کہ علیؑ فلاں فلاں لڑائیوں سے بھاگ نکلے تھے لہٰذا ان کی کراری غیر فراری غلط ہے۔ بخاری کی نہ سہی کسی ضعیف سی روایت ہی سے یا ضعیف بھی نہ ملتی ہو تو جھوٹی اور موضوع روایت ہی سے ثابت کیا ہوتا کہ علی مرتضیٰؑ لڑائی سے بھاگے تھے۔ مولانا آپ تو کیا ساری امت بھی اس کو بتا نہیں سکتی کہ علیؑ فراری تھے۔ بات اتنی ہے کہ علیؑ

کی کراری غیر فراری کو جو نقلاً و عقلاً روایتاً و درایتاً علماً و عملاً ثابت ہے اور جو خارجی کشمکش ہے۔ غلط ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی گئی ہے آخر علیؑ کرار غیر فرار ہی ثابت رہے۔ صدق اللہ و رسولہ

رہی علیؑ کی سپہ سالاری۔ حضورؐ نے تو اپنے عہد مبارک میں کسی کو بھی پوری فوج کا سپہ سالار نہ بنایا۔ اس کی نہ کوئی مرفوع شہادت ہے نہ موقوف۔ بڑی جنگوں میں تو خود بدولت سپہ سالار رہے۔ سریوں میں البتہ اپنے صحابیوں کے زیر کمان تین سو چار سو سپاہیوں کو مختلف مقامات پر بھیجا۔ جس میں حضرت علیؑ بھی گئے اور حضرت عمر بھی اور حضرت ابوبکر بھی اور حضرت ابوعبیدہ بھی (مواہب زرقانی ابن ہشام۔ تاریخ طبری و ابن اسحاق)

فتح مکہ کی دوش نشینی کا تذکرہ صحیح بخاری میں نہ ہونا، نفی واقعہ کا انوکھا استدلال ہے۔ جس واقعہ کی روایت امام احمد و ابوبکر ابن ابی شیبہ اور ابوجعفر طبری و حاکم و نسائی و حاکمی و امام قسطلانی و زرقانی جلد دوم ص ۳۸۷ شرح مواہب میں کرتے ہیں۔ اس کو نسیاً منسیاً کر دینا آپ ہی کی جرأت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی تو ازالہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

حنین میں بروایات ابن قتیبہ و حارث بن اسامہ و ابویعلیٰ و ابن عساکر و خطیبؒ و ابن اسحاق، جناب امیرؑ و حضرت عباسؓ و ابوسفیان بن حارث و زبیر بن اسامہ بن زیدؓ عقیل و عبداللہ بن زبیر بن عبدالمطلب کا آنحضرتؐ کے ساتھ ساتھ رہنا ثابت خصوصاً جناب امیرؑ کی پامردی و جانبازی بروایت ابویعلیٰ و طبرانی و ابن ابی شیبہ و زرقانی از انسؓ و جابر مسلّم اور جناب امیرؑ کا چالیس پہلوانوں کو قتل کرنا بروایت ابن ابی شیبہ حضرت انسؓ سے منقول اور علامہ ابن عبدالبر کی روایت سے صرف علیؑ، عباسؓ، سفیان اور عمرؓ کا ثبات مروی۔ مگر ابن اسحاق کی روایت سے علیؑ، عباسؓ و فضل بن عباس

ابوسفیان وجعفر بن ابوسفیان و ربیعہ بن حارث اور اسامہ بن زید کا ثابت قدم رہنا مسطور (استیعاب جلد ۲ صـ ۲۹۸) ابوجعفر طبری نے تاریخ کے صـ ۱۶۶۱ پر لکھا ہے کہ آنحضرتؐ کے ہمراہ حنین میں مہاجرین سے ابوبکر و عمر اور اہل بیت سے علیؑ، عباس، فضل بن عباسؓ ابوسفیان بن حارث ربیعہ بن حارث وایمن بن عبید و اسامہ بن زید ثابت قدم تھے اور ابن ہشام نے بھی یہی نام بتائے ہیں۔ مگر بخاری نے حضرت عمر کا نام مفرورین میں لکھا ہے۔ نعوذ باللہ۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ علیؑ و عباسؓ و ابوسفیان و عقیل و عبداللہ بن زبیر و زبیر بن العوام اور اسامہ آنحضرتؐ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ مگر بعد کے محقق علامہ قسطلانی نے اس کا جو ریویو کیا ہے وہ صحیح معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں ولم یثبت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یومئذٍ الا العباس وعلی والفضل وابوبکر وعمر واسامۃ بن زید فی اناسٍ من اھل بیتہ واصحابہ (مواہب) جو مطابقت روایات اولین ابوسفیان وربیعہ بن عقیل وعبداللہ بن زبیر بن عبدالمطلب و زبیر بن العوام وعبداللہ بن مسعود پر مشتمل ہے۔

سرگوشی طائف

بزعم مولانا سرگوشی پر صرف ریاض نضرہ کی تنہا روایت نہیں بلکہ ترمذی، نسائی وطبرانی کی حدیث جابر اور ابویعلی اور ابن ابی شیبہ وابن حبان والی روایت ابن عباس ہی موجود ہے ما انا انتجیتہ ولکن اللہ انتجاہ۔ میں نے نہیں بلکہ میرے خدا نے علیؑ سے راز میں گفتگو کی تھی، دنیا کو دکھا رہی ہے کہ علیؑ مخاطب حق سبحانہٗ ہیں۔

حدیث منزلت

یہی ایک حدیث وہ بھی مرویۂ بخاری ہونے کی وجہ سے مولانا کے نزدیک صحیح اتری تھی۔ مگر پھر بھی مولانا سے رہا نہ گیا فرماتے ہیں۔ "لا نبی بعدی کے بعد اس کی خصوصیت ہی کیا؟ صرف اہل وعیال کی نگرانی جو ظاہر ہے کہ کوئی شرف نہیں۔" اے سبحان اللہ! مولانا!! اس حدیث

کی خصوصیت لا نبی بعدی کے بعد بھی لو کان نبی بعدی لکان عمر کے ہم پلّہ ہے۔ "اگر نبوّت باقی رہتی تو یہ دونوں نبی ہوتے۔ کوئی معمولی شرف نہیں؛ منزلت ہارونی اور اس میں آپ کی یہ آنا کانی۔ یہ حدیث کسی کو بھلی لگے یا بُری مگر واقعہ یہی ہے کہ علیؑ کی منزلت رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نزدیک بالکل وہی ہے۔ جو ہارونؑ کی موسیٰ کے نزدیک تھی کس کی مجال جو جناب امیرؑ کے یا جناب صدیق کے فضائل کا اندازہ کر سکے یا ان میں آنا کانی کرے۔ صرف ایک فضیلت جناب امیرؑ سے اتنا سٹ پٹا گئے سُنیے ائمہ حدیث آپ کی نسبت کیا کہہ رہے ہیں۔

ماجاء لاحد من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الفضائل بالاسانید الحسان ماجاء لعلی بن ابی طالبؑ (صحیح حاکم جلد ۳ ص۱۰۷ واستیعاب جلد دوم ص۴۷۹) یہ قول .... احمد بن حنبل کا ہے، یہ قول امام نسائی کا ہے۔ یہ قول ابو علی نیشاپوری کا ہے یہ قول قاضی اسماعیل مالکی کا ہے۔ یہ قول علامہ ابن عبدالبر کا ہے۔ یہ قول امام المحدثین ابو عبداللہ حاکم کا ہے۔

ابن عبدالبر استیعاب جلد دوم ص۴۷۹ میں فرماتے ہیں کہ جتنی حدیثیں باسانید جید جناب امیرؑ کی شان میں وارد ہوئی ہیں اتنی کسی بھی صحابی کی شان میں نہیں آئیں۔ اور حاکم صحیح کی جلد سوم ص۱۰۷ میں لکھتے ہیں کہ احمد ابو یعلیٰ اور نسائی کی یہ تحقیق ہے کہ جتنی حدیثیں باسانید جید جناب امیرؑ کی شان میں آئی ہیں اتنی کسی اور صحابی کی شان میں نہیں آئیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی امام نودی، عراقی، ابن حجر مکی، علی القاری علی متقی صاحب روضۃ الاحباب اور حضرت شاہ ولی اللہ بھی یہی فرما رہے ہیں۔ مولانا خود ہی اس کا تصفیہ فرمائیں کہ ان کی کون سُنے گا؛

راویانِ حدیثِ منزلت

صحابہ سے اس کی روایت حضرات عمر بن خطاب

علی بن ابی طالب، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ عباس جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، جابر بن سمرہ، مالک بن حویرث، براء بن عازب زید بن ارقم، ابورافع، عبداللہ بن ابی ادفیٰ، حذیفہ، انس بن مالک، بریدہ، ابوموسیٰ اشعری ابوایوب انصاری، عقیل، حبشی بن جنادہ، معاویہ بن ابوسفیان، حضرت ام سلمہ حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت اسماء بنت عمیس وغیرہم نے کی۔ اور ائمہ محدثین سے امام احمد بن حنبل، بخاری، مسلم، ابن ابی شیبہ، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان ابن خزیمہ، ابن ابی خثیمہ، بزار، ابویعلی، طبری، ابن عقدہ، ابوعوانہ، ابوالشیخ، طبرانی، حاکم بیہقی، ابونعیم، ابن عبدالبر، ابن مردویہ، ابن سمان، ابوسعد بغوی۔ ابوالحسن ملا، دیلمی و خوارزمی نے اس کو روایت کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر، امام جزری، ابن عبدالبر، جمال مزی، ابن حجر، حاکم، نسائی، طبرانی، ابن تیمیہ، سیوطی، ذہبی اور شاہ ولی اللہ نے اس کو حدیث صحیح و متواتر مانا ہے۔

امام احمد نے سند و مناقب میں اس کے ذیل میں اسماء بنت عمیس سے باسناد جید روایت کی کہ حضور نے یہ دعا بھی فرمائی۔ اللھم انی اقول کما قال اخی موسیٰ اللھم اجعل لی وزیراً من اھلی اخی علی بن ابی طالب اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری کی نسبحک کثیراً ونذکرک کثیراً انک کنت بنا بصیراً۔ خدایا میرے بھائی موسیٰ کی طرح میں بھی ملتجی ہوں کہ میرے عزیزوں میں سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر بنا اور اس سے میری کمر کو مضبوط فرما۔ اور اس کو میرا رفیق کار بنا۔ تاکہ ہم تیری تسبیح اور تیری یاد بکثرت کریں۔ اور تو ہم کو دیکھ رہا ہے (اس کی روایت طبری نے تہذیب الآثار میں ثعلبی نے تفسیر میں، علامہ زرندو ابن الصباغ مالکی نے مناقب میں اور فخر الدین رازی نے تفسیر میں حضرت ابوذر اور ابن عباس سے خطیب و ابن عساکر و ابن مردویہ نے اسماء بنت عمیس سے کی ہے)

جامی از قافلہ سالارِ رہِ عشق ترا ! !
کہ بہ پرسند کہ آں کیست علیؑ گوئی علیؑ

مولانا اس کی خصوصیت اور اہمیت ہم کیا جانیں۔ امام نودی جیسا شخص ہی جان سکتا ہے۔ شرح مسلم جلد دوم ص۲۷ امام نودی فرماتے ہیں:۔

فیہ اثبات فضیلۃ لعلی لا تعرض فیہ لکونہ افضل من غیرہ اومثلہ ولیس فیہ الدلالۃ لاستخلافہ۔ یعنی اس حدیث سے حضرت علیؓ کی اس فضیلت کا ثبوت ملتا ہے جو آپ کو اپنے ماسوا اور برابر والوں یعنی دیگر صحابہؓ پر بلا تعرض حاصل ہے مگر اس میں آپ کے استخلاف کی کوئی دلیل نہیں۔

سورۂ برأت مسلم کی تبلیغ

تبلیغ برأۃ کے سلسلہ میں مولانا کا یہ ارشاد کہ حضرت ابوبکر اور علیؓ کی پوزیشن میں فرق تھا۔ حضرت ابوبکر امیرِ حج تھے اور اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام تھے اور منادی کرنے والوں میں علیؓ بھی ایک تھے۔" اعراض عن الحق اور اعتراض علی الحق ہے امیرِ حج تو کئی بزرگ ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے۔ مگر برأۃ کی رسالت ایک ہی کو ملی۔ اور قیامت تک دوسرے کو مل نہیں سکتی۔ امام احمد و ابو یعلےٰ نے حضرت ابوبکر سے نسائی اور عبداللہ بن احمد نے حضرت علیؓ سے ابوبکر بن ابی شیبہ، احمد، ترمذی، ابوداؤد و نسائی، طحاوی، ابوالشیخ و ابن مردویہ نے حضرت انس سے، نسائی و ابن مردویہ نے حضرت ابوسعید سے، احمد و ترمذی، نسائی و طبرانی، حاکم اور طحاوی نے حضرت ابن عباس سے اس واقعہ کی یوں صراحت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کے ہمراہ سورۂ برأت کو اہلِ مکہ کی تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا۔ وحی آئی کہ یا تو آپ بہ نفسِ نفیس اس کی تبلیغ فرمائیں یا کسی اپنے عزیز سے کروائیں۔ آپ نے سیدنا علیؓ کو اس حکم

کے ساتھ متعاقب روانہ فرمایا کہ تم ابوبکر سے سورۂ برأت لے لو اور خود اہلِ مکہ کو سناؤ کیونکہ یہی حکمِ خدا ہے کہ اس کی تبلیغ میں کروں یا تم۔ لا یؤدی الا انا او علیؑ ہماری نگاہوں میں تو دونوں حضرات دو مختلف جہات سے نائبانِ رسالت مآبؐ تھے۔

امارتِ یمن

اس سلسلہ میں مولانا سے کچھ اور نہ بن پڑا تو جناب امیرؑ کی انتظامی ناقابلیت کا شکوہ کر دیا۔ طرفہ یہ ہے کہ امام یوسفؒ جیسا امام فن فقہ اپنی کتاب الخراج میں جنابِ امیرؑ کی سیاستِ مدن اور انتظام کی تعریفیں کرے اور آپ کی تحسین کے پُل باندھے اور نقادِ حدیث و تاریخ طبری آپ کی اس خصوصی خداداد قابلیت کی ثنا گوئی کرے اور دوسری طرف مولانا فاروق اس کی مذمت کریں۔

سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، شرح زرقانی، فتح الباری عمدۃ القاری و ترمذی و ابن ابی شیبہ میں ہم نے بھی امارت یمن کا قصہ پڑھا ہے کسی جگہ جناب امیرؑ کی انتظامی ناقابلیت کا کوئی ریمارک ہمیں نظر نہ پڑا۔ البتہ نسائی نے اتنا لکھا ہے کہ بنی زبیدہ پر جب مسلمان فتح یاب ہوئے تو سبایا سے جناب امیرؑ نے ایک لونڈی اپنے لیے خاص کر لی۔ جس پر حضرت خالد نے بذریعہ بریدۂ اسلمی بارگاہِ نبوت میں شکایت پیش کی۔ شاکیوں پر عتاب ہوا اور فرمایا ما تریدون عن علی وھو مولیٰ کل مومن و مومنۃ اور صراحت فرما دی کہ خمس میں اس سے بڑھ کر علیؑ کا حق ہے۔ فان لہ فی الخمس اکثر من ذالک (بخاری) اور جناب امیرؑ کون ہیں دکھا دیا۔ ما تری فی رجل یحبہ اللہ و رسولہ (ترمذی و نسائی عن البراء) مولانا کو نہ معلوم آپ کی ناقابلیت کا سراغ لگا کہاں سے؟

حجۃ الوداع کا واقعہ

اس تذکرہ میں مولانا فرماتے ہیں، پہلی حدیث بے اصل اور حدیث غدیرِ خم اس سے زیادہ بے اصل! سے

میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ بخاری بھی ہوتے تو ذرا جھجکتے۔ آپ کی طرح اس قدر بیساختہ نہ کہتے۔ حدیث کیا ہوئی گھر کی کھیتی ہو گئی۔

مولانا جس پہلی حدیث کو آپ نے بے اصل کہا ہے وہ حدیث ثقلین ہے۔ جس کو بڑے بڑے ائمہ حدیث اور ثقافتِ فن مثل امام زہری، ابن اسحٰق، ابن سعد، احمد، ابن ابی شیبہ، ابو خثیمہ، ابن جریر طبری، عبد بن حمید، دارمی، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابو یعلیٰ، دولابی، ابن خزیمہ، ابن عبدالبر، ابن عقدہ، طبرانی، ابو نعیم، حاکم، خطیب، حمیدی، دیلمی، خوارزمی اور شاہ ولی اللہ نے روایت کیا ہے۔ اور جس کی ابن حجر، نودی، عینی، سبکی، مکی، زرقانی، شوکانی، سیوطی، متقی، دہلوی اور شاہ ولی اللہ نے تخریج کی۔ اور معتمد کہا، بھلا آپ کے یا کسی اور کے بے اصل کہہ دینے سے بے اصل ہو سکتی ہے؟

رہی دوسری حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ جو صحیح اور مشہور و متواتر ہے۔ یہ اگر آپ کے نزدیک لا اصل لہ متصور ہو تو امام بخاری کی ۵۳۴ روایات منفردہ وضعیفہ کا کیا حشر ہوگا اور صحیح کی کیا وقعت ہوگی۔ غالباً حدیث من کنت مولاہ آپ کے نزدیک اس لیے بے اصل ٹھہری ہے کہ اس میں علیؑ کا نام ہے کسی اور کا نام ہوتا تو اس کا ارتقاء آپ کے نزدیک آیتِ قرآنی تک پہنچ جاتا۔

یہ حدیث متواتر ہے

علامہ محمد بن اسمٰعیل صنعانی روضۂ ندیہ میں حافظ العصر ابن عقدہ موالات میں سیوطی جمع الجوامع میں، مناوی تیسیر میں، فیروزی اربعین میں، ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں، جزری اسنی المطالب میں، علی القاری مرقات

میں صاحب نزل الابرار اپنی اس تصنیف، شیخ دہلوی اشعۃ اللمعات میں اس کو حدیث صحیح مشہور متواتر بلنتے ہیں۔ شیخ دہلوی تو لکھتے ہیں کہ ایک جماعت نے اس کی روایت کی اور اس کے ان گنت طریق بتلائے ہیں۔ بقولے سولہ صحابہ نے اور بقول امام احمد تیس صحابیوں نے اس کی روایت کی ہے۔

کثرت روایات

حافظ بن عقدہ متوفی ۳۳۲ھ نے کتاب موالاۃ میں یکصد و یک صحابہ سے، امام جزری شافعی نے اسی صحابیوں سے، امام ابو جعفر طبری نے ۵۷ صحابیوں سے، امام احمد بن حنبل نے تیس صحابیوں سے اور حافظ ابوالعلا، العطار کوئی دو سو طریقوں سے اس کی روایت کرتے ہیں۔ یہ حدیث نہ صرف صحیح و ثابت بلکہ مشہور و متواتر بھی ہے۔

حدیث انا مدینۃ العلم

ذرا اور آگے چل کر فاروق صاحب ایک سانس میں حدیث "انا مدینۃ العلم غلط۔ حدیث قضا صحیح۔ حدیث علی منی غلط اور حدیث مولاہ لغو فرماتے ہیں۔ اور دوسری سانس میں سارے فضائل علیؑ موضوع اور ان کے راویوں کو دروغ باف فرماتے ہیں۔"

غالباً ہمارے مولانا کو اب چین آیا ہوگا۔ آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوگا چلو چھٹی ہوگئی۔ نہ علیؑ رہیں اور نہ علیؑ کا نام و نشان رہے۔ مگر افسوس ہے کہ تمنا تو تمنا ہی کی حد تک رہی جب تک ساری حدیث کی سیر کی تاریخ کی کتابیں دریا برد نہ کی جائیں علیؑ کی تعریفیں مناقب اور فضائل کل باقی رہیں گے۔ صرف یہ غلط، وہ لغو، یہ موضوع اور وہ فضول کہنے سے کام نہ چلے گا۔ ساری کتابیں جلا دینی چاہئیں۔

امام زہری متوفی ۱۲۵ھ سے چودھویں صدی تک نہ کوئی محدث نہ کوئی راوی مناقب جناب امیرؑ چھوٹا اور نہ کوئی حدیث فضیلت باقی رہی جس کو مولانا نے دروغ گو اور روایت موضوعہ نہ فرمایا ہو۔ ابن جوزی جیسے مشدد بھی آج ہوتے تو مولانا

کے آگے کان پکڑ لیتے۔

حدیث انا مدینۃ العلم جس کو ہمارے مولانا غلط فرماتے ہیں بعضوں کے نزدیک درجہ صحیح اور بعضوں کے عندیہ میں حدیث درجۂ حسن ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو جناب امیر امام حسنؓ، امام حسینؓ، حضرت ابن عباس، جابر، ابن عمر، ابن مسعود، حذیفہ اور انس رضی اللہ عنہم نے سنا اور روایت کیا ہے۔

جناب امیر سے امام احمد، ترمذی، شاذان، حاکم، ابن مردویہ، ابویعلیٰ، ابونعیم ابن مغازلی، ابن اثیر، ابن نجار، ابن حجر، سیوطی وغیرہم نے اور امام حسنؓ سے سلیمان بلخی نے، امام حسینؓ سے ابن مردویہ و ابن نجار نے حضرت ابن عباس سے امام ابن معین طبری، ابوالشیخ، حاکم، ابن مردویہ، بیہقی، ابن عبدالبر، ابن اثیر، خطیب، امام سیوطی، ابن حجر، علی متقی، شیخ دہلوی اور شاہ ولی اللہ نے حضرت ابن عمر سے طبرانی و حاکم نے حضرت ابن مسعود سے طبرانی و ابویعلیٰ نے حضرت حذیفہ سے ابن مغازلی نے اور حضرت انس سے جزری و سلیمان بلخی نے اپنی مسندوں میں مجموں، مناقبوں میں باسانید معتمد اس کی روایتیں کی ہیں۔

صحت حدیث قائلین صحت حدیث یحییٰ بن معین، ابوجعفر طبری، حاکم، محمد بن طلحہ قرشی، صلاح علائیؒ، امام جزری اور سیوطی وغیرہم ہیں اور اس کے درجۂ حسن ہونے کے معترف، ترمذی، عسقلانی، نجادی، زرقانی، شوکانی، مناوی، ابن حجر، علی القاری اور متقی ہیں۔

رہا یہ امر کہ بخاری نے اس کو ترک کر دیا۔ جہاں ۹۶ ہزار صحیح حدیثیں غائب وہاں یہ بھی ایک سہی۔ مگر آپ کے اساتذہ اور شیوخ میں عبدالرزاق نے دو طریقوں سے (مستدرک ۳ جلد ص ۱۲۷) یحییٰ بن معین نے دو طریقوں سے (کنز جلد ۶ ص ۴۰۱ اور تاریخ خطیب جلد ۱۱ ص ۴۹) اور امام احمد نے ۸ طریقوں سے اس کی

روایت کی ہے۔ اور امام ابوعبد اللہ حاکم نے اس کو کئی طریقوں سے جو لشرط شیخین ہیں ثابت کیا ہے۔ اور امام ذہبی نے میزان جلد اوّل صہ ۳۱۲ میں بہ ترجمہ سوید بن سعید اس کی روایت بہ سند متصل مسلم کے شیخ سوید بن سعید کی ہے۔ اور اس سند کو عوالی الاسناد لکھا ہے۔ اس کو غلط کہہ دینا غلطی ہے۔

حدیث علیؑ منی ہم اہل سنّت کے اجل ائمہ اور اکابر علماء مثل ترمذی، نسائی، حاکم، ابن ماجہ، امام احمد، طیالسی، حضرت عمران بن حصین سے اور امام احمد و ابن ابی شیبہ و ابن ماجہ حبشی بن جنادہ سے اس کی مرفوع روایت کرتے ہیں اور اس کو حدیث ثابت بدرجہ حسن تسلیم کرتے ہیں۔ اس کو غلط کہہ دینا غلط تحقیق پر مبنی ہوگا۔

حدیثِ قرطاس مرویہ بخاری ہے بھی بڑی مضطرب اور مضطر۔ اس کے راوی تقریباً معلول و منکر، اسی کے برتے توہین علی اور ذم عمر۔ اس کے سات طریقے ہیں۔ ہر طریقہ ضعیف اور منکر، ہر متن مضطرب و مضطر، کہیں غلب علیہ الوجع، کہیں ھجر، کہیں یھجر، کہیں یہ ھجر ھجر، کہیں اھجر اور کہیں اھجر اھجر۔ پانچ روایتوں میں ان بے ہودہ الفاظ کی نسبت نامعلوم صحابہ پر اور دو میں بہ نزلہ حضرت عمر کے سر۔ خلفاء کی توہین ہلاہے۔ مگر ثابت رہے بخاری کا اثر۔ ان ساتوں کے راوی حضرت ابن عباس چودہ سالہ عمر، جمعرات کا دن زانوئے جناب امیرؑ پر سر پیغمبرؐ، سرہانے حضرت عباس، مواجہ میں حضرت ابوبکر اور چوکھٹ پر حضرت عمر۔ باقی تین چار سو صحابہ محاذی حجرۂ پیغمبرؐ۔ حضور فرماتے ہیں کہ کوئی کاغذ لا دو تاکہ تمھارے لیے وہ بات لکھ دوں کہ جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو۔ اس پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ فرمایا اٹھو، اب رخصت۔ اسی پر طرفداران علی و عمر ہیں چودہ صدی سے جنگِ متواتر کبھی اِدھر سے کافر کبھی اُدھر سے کافر۔

مناقب جیسے جس کے مروی ہیں۔ وہ بے کم وکاست سب قابلِ قبول اور ان پر جرح واعتراض طرفدارانہ فضول اور ان میں ہماری کمی بیشی نہایت نامعقول اور ہماری ردوقدح بالکل لغو وفضول۔ ہاں اگر خلفائے پیغمبرؐ کی توہین کہیں مروی ہو تو وہ بلا استثنا، ناقابلِ قبول اور قطعاً مہمل وفضول ہے۔ اس پر ردوقدح ہر ممکن طور سے مقبول۔ یہی ہے مذہبِ حنفیہ کا اور عموماً اہلِ سنت کا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے علماء نے باوجود کٹر سنی ہونے کے دوسری صدی سے لے کر صدہا مستقل کتابیں مناقب علیؑ میں لکھیں اور آج بھی لکھتے جارہے ہیں۔

حدیث قرطاس کا نہ تو حضرت علیؓ نے نہ حضرت عباس نے نہ حضرت ابوبکر نے نہ حضرت عمر نے اور نہ کسی ام المومنین نے کبھی تذکرہ کیا اور نہ ہی ان بیش والانی میں چاروں صحابیوں نے اس کا کوئی اشارہ کیا۔ لے دے کے بس ایک ابن عباس ہیں جن کو ہمارے محدثین اس اہم واقعہ کا مفرد راوی قرار دیتے ہیں۔ جو اس وقت بہ شہادت معتبرہ نہ تو حجرۂ مبارکہ کے اندر تھے اور نہ باہر دالان مسجد میں تھے۔ حافظ ابن حجر شارح بخاری نے فتح الباری باب کتاب العلم میں ابن عباس کی عدم موجودگی کا اثبات شواہد اور قرائن سے درایت وروایت سے کر دیا ہے۔ اب اس روایت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے ظاہر ہے۔

علاوہ بریں اس فرضی حکایت کے راویوں میں یحییٰ بن سلیمان ہیں۔ جن کو ابن معین و نسائی وابوحاتم غیر ثقہ اور راوی منکرات کہتے ہیں۔ دوسرے راوی قبیصہ ہیں۔ جو امام احمد کے نزدیک کثیر الاغلاط ہیں۔ یحییٰ کے نزدیک ضعیف اور ابن قطان کے عندیہ میں وہمی اور کثیر الاغلاط ہیں۔ تیسرے راوی یونس بن یزید ہیں۔ جو وکیع کے نزدیک سیئی الحفظ اور کثیر الاغلاط، ابن سعد کے نزدیک ناقابلِ روایت اور اور امام احمد کے نزدیک مردود ہیں۔ چوتھے علی بن عبد اللہ ہیں جو عقیلی کے نزدیک ضعفاء میں داخل

اور عقیدتاً بدعقیدہ۔ مسلم کے نزدیک ناقابل احتجاج اور ابوذرعہ کے نزدیک ناقابل روایت اور ابوحاتم کے نزدیک راوی منکرات ہیں۔ دو چار کا یہ حال، باقیوں کا کتب رجال میں نہ معلوم کیا ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس پر صدیوں سے ہم مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں میں جنگ و جدل ہے۔

مولانا فاروق فرماتے ہیں" انتقال کے وقت حضرت علیؓ کی موجودگی اور دست مبارک کا ان کے اوپر ہونا۔ ریاض النضرہ کی جھوٹی روایت ہے جو حضرت عائشہ کے پُر فخر صحیح واقعہ کے جوڑ پر تراشی گئی ہے۔ صحیح روایات سے حضرت علیؓ کا کاشانۂ نبوی میں موجود ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا۔"

جناب من حضرت علیؓ کا کاشانۂ نبوی میں رہنا بھی اس لیے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علیؓ کا حجرہ متصل حجرۂ حضرتِ عائشہ تھا (بخاری) ریاض نضرہ طبری ناقل روایت ہے۔ اس کے اصل راوی جنھیں آپ جھوٹا کہہ رہے ہیں وہ امام احمد بن حنبل، امام نسائی، دارقطنی و حاکم ہیں۔ آپ ان بزرگوں کو جو چاہیں کہیں۔ بخاری جو آپ کے عندیہ میں مضبوط ماخذ ہے اس سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ ایک دیوار کی آڑ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حجرہ سے متصل رہتے تھے اور آپ کا حجرہ وسط بیوت ازواج مطہرات تھا۔ بیٹیؓ تو باپ کے سرہانے رات دن رہے اور داماد بلکہ بھائی اپنے بھائی کے آخری وقت قرب و جوار میں بھی نہ رہے۔ یہ آپ کے جذبات ہیں۔ کوئی وحی یا واقعہ نہیں۔ یہ تو تجاہلِ عارفانہ ہے۔ کیوں مولانا سچ سچ کہنا۔ آخر وہی علیؓ تھے نا جنھوں نے پیغمبرؐ کو نہلایا دُھلایا، کفنایا اور دفنایا تھا، کیا یہاں پر بھی علیؓ کا وجود آپ کے نزدیک موجود نہ تھا؟

آپ مانیں نہ مانیں۔ حضورؐ کے آخر وقت علیؓ ہی پاس تھے حضورؐ کی

چادر میں علیؓ ہی تھے۔ دستِ مبارک علیؓ ہی کی گردن میں حمائل تھا۔ اور علیؓ کے سینہ پر ہی پیغمبرؐ کا سر وقتِ آخر تھا۔ حضرت ام سلمہؓ یہی کہتی ہیں اور حضرت عائشہؓ یہی فرماتی ہیں۔ امام احمد نے اس کو حضرت ام سلمہؓ سے بطریق متعددہ روایت کیا ہے اور نسائی و حاکم حضرت ام سلمہؓ سے یہی روایات ہیں۔ دارقطنی حضرت عائشہؓ سے یہی نقل کرتے ہیں اور ابن عاری، ابن عمر سے یہی روایت کرتے ہیں۔ ابن سعد کئی طریقوں سے طبقات میں اور فخر رازی اربعین میں اسکا اثبات کرتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں آپ کی ہائے وائے فضول ہے۔ اگر یہ ترشی ہوئی بات ہوتی تو امام زرقانی اور شیخ دہلوی میں جمع بین الروائتین کی زحمت اور تکلیف نہ ہوتی (زرقانی وفات النبی اور مدارج جلد۲ صـ۸۸۲) ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ سعادت بی بی کو بھی نصیب ہوئی اور بھائی کو بھی۔ رہی آپ کی اور پنڈت جی کی منقصت خلفاء راشدین۔ نہ ہمیں اس سے کوئی غرض نہ کوئی مطلب۔ کسی کے بھی قلم سے نکلے بری بات بری ہی ہے۔

وفقنا اللہ وایاکم

خلافت اور جانشینِ رسولؐ

نوشتہ

مولانا سیّد جَلیلُ الرحمٰن صاحب اعظمی

خلافت اور جانشین رسولؐ

کچھ روز سے رسالہ نگار میں مسئلۂ خلافت پر بہت ہی دلچسپ بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں ہرنام صاحب اور خود جناب نیاز صاحب کے نہایت بلند پایہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

مجھے نیاز صاحب کی رائے سے تقریباً اتفاق ہے مگر میرے خیال میں اب تک تاریخ و سیر، حدیث و تفسیر، عقائد و کلام کی اوراق گردانی میں تصویر کے ایک ہی رُخ پر سارا زورِ قلم صرف ہوا ہے۔ دوسرا رُخ سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں کے متعلق ہم سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان کے بارے میں منشاء نبوت کیا تھا؟

درحقیقت صحابۂ کرام میں حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی دو ایسی بااقتدار ہستیاں گزری ہیں جن کی دینی اور مذہبی جاں نثاریاں دیکھ کر نہ صرف مسلمانوں بلکہ بسا اوقات خود آنحضرت صلعم کو بھی تردد ہوتا تھا کہ وہ اپنا جانشین کس کو بنائیں۔ بلکہ اس ابتدائے اسلام سے لے کر وفاتِ رسولؐ تک کے واقعات پر تفصیلی نظر ڈال جائیے اور غور کیجیے کہ یہ مسئلہ خود آنحضرت صلعم کے لیے بھی کس قدر دشوار تھا۔

جہاں تک روایات کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اخلاق و اعمال، فضائل و مراتب کے اعتبار سے ان دونوں بزرگوں کا مرتبہ تمام صحابہ سے بہت بلند ہے مگر خود ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک گونہ اشکال سے خالی نہیں

بہتر ہوگا کہ خلافت کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے ہم ان دونوں بزرگوں کی صحیح پوزیشن سمجھ لیں اور دیکھیں کہ اسلام کے آڑے وقتوں میں انھوں نے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ یہ طویل بحث مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت آسکتی ہے :۔

"قبولِ اسلام" "اعانتِ اسلام" "مسئلہ امارت و خلافت"۔

میں انہی عنوانات کے تحت اس وقت بحث کروں گا۔

قبولِ اسلام

یہ مسئلہ کہ سب سے پہلے مشرف بہ اسلام کون ہوا؟ نہ کوئی اہمیت رکھتا ہے نہ مسئلہ خلافت پر اس کا کوئی خاص اثر پڑتا ہے حضرت علیؑ سب سے پہلے ایمان لائے ہوں خواہ حضرت ابوبکر۔ اس حقیقت سے تو شاید کسی کو انکار نہیں کہ صحابہ میں سے کوئی اور شخص ان سے پہلے ایمان نہیں لایا، امام ابوحنیفہ نے اس اوّلیت کے جھگڑے کو نہایت عاقلانہ طریقہ پر ختم کیا ہے اور وہی جمہور علماء کا مسلک ہے یعنی یہ کہ :۔

> "ابوبکر مردوں میں سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے اور علیؓ نے بچوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا، اور خدیجہؓ عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لائیں" (تاریخ الخلفاء فصل فی اسلام ابی بکر)

اعانتِ اسلام

اس عنوان کے ماتحت مجھ سے پہلے حضرت علیؓ کے مناقب پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس لیے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ تاہم میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ حضرت علیؓ نے ابتدائے اسلام سے آخر وقت تک جو اسلام کی اعانت فرمائی ہے اس کی نظیر صحابہ کی تاریخ میں ملنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ خندق، غزوۂ خیبر اور غزوۂ حنین

کوئی ایسا معرکہ نہ تھا جس میں حضرت علیؓ کو نمایاں اور امتیازی خصوصیت حاصل نہ ہوئی ہو۔ ہجرت کے موقع پر بھی جو جان نثاری حضرت علیؓ نے دکھائی کسی دوسرے شخص سے مشکل تھی ایسے خطرہ کی حالت میں بستر رسولؐ پر لیٹ رہنا معمولی جان بازی کا کام نہ تھا لیکن اس سلسلہ میں بڑی ناانصافی ہو گی اگر حضرت ابوبکرؓ کے خدمات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ نوجوان تھے، بہادر اور شیر دل تھے، اس لیے میدانِ کارزار ہمیشہ ان کے ہاتھ رہا۔ حضرت ابوبکرؓ بوڑھے اور کمزور تھے۔ اس لیے گو انھیں معرکہ ہائے جنگ میں کوئی طرۂ امتیاز حاصل نہ تھا تاہم جو دینی اعانت ان کی طرف سے کی گئی اس کی تین بڑی یادگاریں اسلامی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔ عمائدِ قریش کو مسلمان بنانے کی کوشش کرنا۔ اسلام کی ترقی میں روپیہ صرف کرنا۔ نو مسلم غلاموں کو آزاد کرنا۔

حضرت ابوبکرؓ نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد دوسرے شرفاء قریش کو بھی مسلمان بنانے کی کوشش کی اور ترقیٔ اسلام کو اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد بنا لیا۔ چنانچہ عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبداللہ وغیرہ حضرت ابوبکرؓ کے ذریعہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

(سیرۃ ابن ہشام باب ابتداء افتراض اللہ علی النبی من الصلوٰۃ)

اسی طرح ترقیٔ اسلام پر حضرت ابوبکرؓ نے روپیہ بھی سب سے زیادہ صرف کیا۔ جس کی تصدیق رسولِ خدا صلعم کے اس قول سے ہوتی ہے جو آپ نے اپنے آخر دورِ حیات میں حضرت ابوبکرؓ کے متعلق فرمایا تھا۔ یعنی:۔

مانفعنی مال احد ما نفعنی مال ابی بکر" ابوبکرؓ کے مال سے جتنا فائدہ مجھے ہوا کسی دوسرے کے مال سے نہیں ہوا۔ (ترمذی باب مناقب ابی بکرؓ)

اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ مسلمانوں کا کوئی اقتدار نہ تھا اس لیے کفار قریش انھیں طرح طرح سے ستایا کرتے تھے، خاص کر ان غریب غلاموں کو جو

ایمان لا چکے تھے، مکہ کی سنگلاخ زمین پر لٹا کر ان کے سینوں پر پتھر کی جلتی ہوئی چٹان رکھ دیتے تھے۔ بھوکا اور پیاسا رکھ کر ان کے برہنہ جسم پر کوڑے لگاتے تھے۔ آہنی سلاخیں گرم کر کے انھیں داغتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ یا تو محمدؐ کے دین سے پھر جاؤ یا پھر اسی حالت میں مر جاؤ۔

اسلام کی اس غربت اور کفار کے اس تشدد کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ نے سات غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جن کی تفصیل اصابہ میں درج ہے ظاہر ہے کہ اس سے انسان ترسی اور رضا جوئی الٰہی کے علاوہ اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ کفارِ قریش کے ہاتھوں بارہا حضرت ابوبکرؓ بھی بہت بری طرح زدوکوب کیے گئے مگر آپ اسلام اور بانیٔ اسلام کی حمایت میں ہمیشہ سینہ سپر رہے۔

حضرت اسماءؓ کا بیان کہ ایک مرتبہ مشرکینِ مکہ مسجد میں بیٹھے ہوئے رسولِ خدا صلعم کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں آنحضرت صلعم مسجد میں تشریف لائے۔ آپ کا دستور تھا کہ لوگ جو کچھ آپ سے دریافت کرتے تھے آپ ان سے صحیح صحیح بتا دیا کرتے تھے۔ کفارِ قریش نے آپ سے پوچھنا شروع کیا کہ تم ہمارے معبودوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہتے ہو؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں میں ضرور کہتا ہوں۔ یہ سنتے ہی سب کے سب آپ کے لپٹ گئے۔ ایک شخص نے آ کر حضرت ابوبکرؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ فوراً ہی موقع پر پہنچ گئے اور کفار کو ڈانٹ کر فرمایا۔ ”افسوس ہے تم پر! کیا تم ایک شخص کو محض اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار ”خدا“ ہے۔ حالانکہ وہ تمھارے پاس معجزات بھی لایا ہے۔“ یہ سنتے ہی کفار نے رسولِ خدا صلعم کو تو چھوڑ دیا اور حضرت ابوبکرؓ پر پل پڑے اور ان کو اس قدر مارا کہ جب وہ گھر واپس تشریف لائے تو سر پر جہاں بھی وہ ہاتھ رکھتے تھے بال ہاتھ کے ساتھ ہی ساتھ چلے آتے تھے۔ مگر وہ فرماتے

جاتے تھے کہ خداوندا تو بزرگ اور برتر ہے ۔ (دیکھو استیعاب ذکر عبداللہ بن ابی قحافہ)

ہجرت کے موقعہ پر جب تمام صحابہ مدینہ چلے گئے تو آنحضرت صلعم نے اپنے خاص جان نثار اور معتمد حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکر کو روک لیا، ان دونوں بزرگوں کے علاوہ آپ کی نقل و حرکت کی کسی کو خبر نہ تھی ۔ ان دونوں بزرگوں سے خدا اور اس کے رسولؐ کو اہم ترین خدمات لینا تھیں ۔ اس لیے یہ مکہ میں اس وقت تک رکے رہے جب تک کہ آنحضرتؐ کو خدا کی طرف سے ہجرت کی اجازت نہ ملی ۔ ابن اسحاق کی روایت ہے :-

"جہاں تک مجھے علم ہے رسول خدا صلعم کی روانگی کا کسی کو علم نہ تھا کہ آپ کب روانہ ہوئے، سوائے حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکر کے اور ان کی اولاد کے۔"

(سیرۃ ابن ہشام باب ہجرۃ النبی صلعم)

ہجرت کی اجازت ملنے پر آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو مکہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا اور ان کے سپرد وہ امانتیں کیں جو لوگوں کی آپ کے پاس رکھی تھیں اور حضرت ابوبکر کے ساتھ مدینہ روانہ ہوئے ۔ راستہ میں تین دن تک غار ثور میں چھپے رہے جہاں کھانے پینے اور خبر رسانی کا انتظام پہلے سے حضرت ابوبکر نے کر رکھا تھا ۔ تین دن کے بعد جب خطرہ کچھ کم ہوا تو حضرت ابوبکر اور آنحضرتؐ دونوں ایک ہی اونٹنی پر آگے پیچھے بیٹھ کر روانہ ہوئے ۔ امام بخاری نے اس مبارک سفر کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے "ابوبکر شیخ یعرف نبی اللہ شاب لا یعرف فیلقی الرجل ابابکر فیقول یا ابابکر من هذا الرجل بین یدیک فیقول هذا الرجل یهدینی الطریق فیحسب الحاسب انه انما یعنی بالطریق وانما یعنی سبیل الخیر" (حضرت ابوبکر بوڑھے تھے جنھیں لوگ عموماً جانتے تھے آنحضرتؐ جوان تھے جنھیں لوگ عام طور سے نہیں چاہتے تھے ۔ جو راستہ میں ملتا تھا وہ پوچھتا تھا کہ ابوبکر یہ تمھارے آگے

کون ہے ؟ حضرت ابوبکرؓ اس سے کہہ دیتے تھے۔ یہ شخص مجھے راستہ کی ہدایت کرتا ہے سننے والا یہ خیال کرتا تھا کہ وہ اس سے "رہبر" مراد لیتے ہیں۔ لیکن وہ دراصل اس سے "ہادی اور مرشد" مراد لیتے تھے (بخاری باب الہجرۃ)

امارت وخلافت

اس سے پہلے کہ خلیفۂ رسولؐ سب سے پہلے کس کو ہونا چاہیے تھا اور کیوں ؟ میں چاہتا ہوں کہ خلافت اور خلیفہ کے معنے کی تشریح کر دی جائے تاکہ آئندہ اصل مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

خلافت کے معنی جانشینی کے ہیں۔ خلیفہ ایک مذہبی عہدہ ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ دینی احکام کی تعلیم و تعمیل کی کوشش کرے اور مسلمانوں کی مذہبی اور اقتصادی حالات کی اصلاح کرے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ سب سے پہلے خلیفہ کس کو ہونا چاہیے تھا اور کیوں ؟ اس پر غور کرنے سے پہلے یہ طے کرنے کی ضرورت ہے کہ دراصل اس مسئلہ کا تعلق خدا سے ہے یا بندوں سے ؟ عقل سے ہے یا نقل سے ؟ اس کا فیصلہ ہونے کے بعد مسئلہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ علامہ قوشجی نے شرح تجرید میں اس مسئلہ پر کافی تفصیل سے بحث کی ہے جو درج ذیل ہے :۔

> "لوگوں کا اس امر میں اختلاف ہے کہ زمانہ نبوت ختم ہونے کے بعد کسی خلیفہ کا مقرر کرنا واجب ہے یا نہیں ؟ اگر واجب ہے تو خدا پر ہے یا ہم پر ؟ پھر یہ وجوب عقلاً ہے یا نقلاً۔ اہل سنت کا خیال ہے کہ خلیفہ کا تقرر ہم پر نقلاً واجب ہے۔ معتزلہ اور زیدیہ کی رائے ہے کہ یہ ہم پر عقلاً فرض ہے۔ فرقہ امامیہ کا خیال ہے کہ یہ خدا پر عقلاً فرض ہے اور خوارج کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ کسی پر بھی فرض نہیں۔"

مذہب اہل سنت کا یہ عقیدہ چند دلائل پر مبنی ہے جن میں سے پہلی اور سب سے

بہتر دلیل اجماع صحابہ ہے ۔ صحابۂ کرام نے اس مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے حتیٰ کہ رسولِ خدا کی تجہیز و تکفین کو بھی اس مسئلہ میں مشغولیت کی وجہ سے انھوں نے پس پشت ڈال دیا ۔ اور اسی طرح ہر خلیفہ کے انتقال کے بعد ہوتا رہا ۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ شریعت نے حدود، سرحدوں کی ناکہ بندی اور جہاد کے لیے لشکروں کی تیاری اور بہت سی ایسی چیزوں کا حکم دیا ہے جس کا تعلق نظام دین کی حفاظت اور مذہب اسلام کی حفاظت ہی ہے جو بغیر کسی خلیفہ کے عمل میں نہیں آسکتیں اور جس چیز کے بغیر واجبات ادا نہ ہوں وہ جیسا گزر چکا واجب ہے ۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ خلیفہ کے تقرر میں اس قدر فوائد ہیں جو شمار نہیں کیے جا سکتے اور اتنے نقصانات سے حفاظت ہو جاتی ہے جو پوشیدہ نہیں اور جس چیز کی یہ حالت ہو وہ یقینی واجب ہے ۔

(شرح التجرید المقصد الخامس فی الامامہ)

مذکورہ بالا بیان سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ مسئلہ محض تاریخی اور سیاسی نہیں ہے بلکہ خالص مذہبی ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خلیفہ کا تقرر مذہب کے اہم ترین واجبات میں سے ہے ۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ رسولِ خدا کے انتقال کے بعد کیا حالات پیش آئے اور حضرت ابوبکر صدیق کا انتخاب کیونکر عمل میں آیا اور یہ صحیح بھی تھا یا نہیں ؟

رسول خدا صلعم کے انتقال کے وقت اسلامی سوسائٹی تین گروہوں پر منقسم تھی جن میں سب سے زیادہ زبردست گروہ انصار کا تھا ۔ مدینہ خاص انھیں کا گھر تھا ، وہی وہاں کے رہنے والے تھے اور انھیں کی قوت و جانبازی سے معرکہ ہائے جنگ میں اسلام کو شاندار کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں ، دوسرا گروہ ان مہاجرین کا تھا جن میں آنحضرت صلعم کے داماد حضرت علی اور چچا حضرت عباس اور پھوپھی زاد بھائی حضرت طلحہ بن عبداللہ اور بنی امیہ کے سرگروہ ابوسفیان شامل تھے ، یہ سب لوگ حضرت علیؓ کے مکان میں موجود تھے اور اس بات پر متفق تھے کہ حضرت علیؓ کو جانشین رسولؐ ہونا چاہیے ۔ اس لیے کہ وہ ہم میں

سب سے افضل اور رسولِ خدا کے ابنِ عم اور داماد بھی ہیں۔ دوسرے مہاجرین اس فکر میں تھے کہ خلافت کوئی موروثی چیز نہیں جس کو مسلمان بالاتفاق اپنا خلیفہ تسلیم کریں بس وہی جانشین رسول سمجھا جانا چاہیے۔ اس گروہ کے روحِ رواں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر جیسی بااقتدار ہستیاں تھیں۔

سب سے پہلے خلافت کا خیال انصار کو آیا۔ اور یہ حضرات کسی ایک انصاری کو خلیفہ بنانے کے لیے سقیفہ بنی ساعدہ میں جو اُن کا مشہور کونسل چیمبر تھا۔ جمع ہوئے مسئلہ انتخاب پیش ہوا۔ اس کی خبر رفتہ رفتہ مہاجرین کو بھی ہو گئی۔ موقع کی نزاکت کا خیال کر کے وہ بھی فوراً پہنچ گئے۔ انصار کا خیال تھا کہ مدینہ منورہ میں سوائے انصار کے کوئی دوسرا فرماں روا نہیں ہو سکتا۔ مہاجرین کی رائے تھی کہ اس وقت کسی خاص شہر یا قبیلہ کی حکمرانی کا نہیں بلکہ سارے ملک عرب کی فرماں روائی کا مسئلہ درپیش ہے اور یہ بوجھ انصار کے بس کا نہیں۔ اس لیے کہ مدینہ کے باہر ان کا کوئی اثر و اقتدار نہیں۔ انصار نے کہا اچھا "منا امیر و منکم امیر"، لیکن مہاجرین اسلامی شیرازہ کو منتشر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے انصار کو سمجھایا کہ تم کو اس مسئلہ میں ہم سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ ہماری مدد کرنا چاہیے۔ گو اس وقت فریقین میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر انصار کی صلح پسندی کی یہ شان اس وقت بھی نمایاں تھی کہ حضرت زید بن ثابت نے جو انصار ہی میں سے تھے نہایت ایثار کے ساتھ فرمایا کہ "رسول خدا صلعم مہاجر تھے۔ لہٰذا خلیفہ بھی مہاجر ہی ہونا چاہیے۔ ہم جس طرح آنحضرت صلعم کے جاں نثار تھے ان کے خلیفہ کے بھی جاں نثار رہیں گے۔" آخر انصار کو تسلیم کرنا پڑا۔ اور مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر صدیق خلافت کے لیے منتخب ہوئے۔

اس مجلس انتخاب میں گو انصاری نمائندگی پورے طور پر ہوئی تھی لیکن بعض سربرآوردہ مہاجرین جن پر نظرِ انتخاب بالکل بجا طور پر پڑ سکتی تھی موجود نہ تھے۔ اس لیے حضرت ابوبکر کا یہ انتخاب گویا ایک فوری انتظام تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے اس انتخاب کے کچھ روز

بعد فرمایا بھی تھا کہ "میں وقتی انتظام کے طور پر خلافت کے لیے منتخب کیا گیا تھا، اب اطمینان کی حالت ہے مسلمان جسے پسند کریں اپنا خلیفہ بنالیں اگر عام طور سے مسلمانوں کی نظروں میں سیاست و تدبر کے علاوہ بعض مصالح کی بنا پر حضرت ابوبکر سے زیادہ خلافت کے لیے کوئی دوسرا موزوں نہیں تھا، اس لیے انھوں نے کسی جدید انتخاب کی ضرورت نہیں سمجھی۔

حقیقت یہ ہے کہ قبائل عرب سے حضرت علیؓ کے تعلقات بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے کچھ تو اس وجہ سے کہ بہت سے سرداران قبائل جنگوں میں حضرت علیؓ ہی کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ عام طور پر مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر حضرت علیؓ خلیفہ ہو گئے تو پھر خلافت ایک موروثی چیز ہو کر رہ جائے گی اور یہ اسلام جیسے آزاد خیال اور مساوات پسند مذہب کی پیشانی پر ایسا کلنک کا ٹیکہ ہوگا جو کبھی مٹائے نہ مٹے گا۔ یہ وہ بات ہے جو حضرت عمرؓ نے بھی ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس سے ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ خلافت اور نبوت دونوں تمھارے ہی خاندان میں رہیں۔ (طبری ص ۲۷۶۸)

آنحضرت صلعم بڑے زمانہ شناس تھے، موقعہ کی نزاکت کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لیے آپ نے آخر وقت تک اس بارے میں کوئی حکم نہیں دیا۔ آپ نتیجہ سے واقف تھے۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے اس بیان میں کہ آنحضرتؐ نے کسی کو اپنا جانشین کیوں نہیں بنایا۔ حضرت حذیفہ کی وہ حدیث نقل کی ہے جو مسند بزار میں پائی جاتی ہے وھو ھذا:-

"قالوا یا رسول اللّٰہ لم لا تستخلف علینا قال انی ان استخلفت علیکم نتعصون خلیفتی ینزل علیکم العذاب"

"لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپ ہم پر کسی شخص کو خلیفہ کیوں نہیں بناتے؟

آپؐ نے فرمایا اگر میں کسی کو خلیفہ بنالوں اور پھر تم اس کو نہ مانو تو تم پر خدا کا عذاب نازل ہوگا۔" (تاریخ الخلفاء بیان کونہ صلعم لم یستخلف)

آنحضرت صلعم نے گو اپنا منشاء حدیث[1] منزلہ، واقعۂ خم غدیر[2] اور مسئلہ تبلیغ آیات[3] کے سلسلہ میں پوری طرح ظاہر کر دیا تھا جسے ہر سنجیدہ شخص جو تعصب کی عینک نہ لگائے ہو بآسانی سمجھ سکتا ہے تاہم آپ ان پیچیدگیوں کو بھی اچھی طرح محسوس کر رہے تھے، جو حضرت علیؓ کے خلاف پائی جاتی تھیں۔ واقعۂ قرطاس اور جیشِ اسامہ کا باوجود آنحضرتؐ کے اصرار کے روانہ نہ ہونا اسی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ نماز کی امامت پر حضرت ابوبکر کا مامور فرمانا اسی یاس کی ایک خفیف لہر کا نتیجہ تھا جو آپ کو حضرت علیؓ کے متعلق پیدا ہو چکی تھی۔

میں اس خیال سے بالکل مختلف ہوں کہ آنحضرتؐ کا دلی منشاء یہ تھا کہ ان کے بعد حضرت علیؓ ہی ان کے خلیفہ ہوں مگر ساتھ ہی میرا یہ بھی خیال ہے کہ رسولِ خدا صلعم حضرت ابوبکر کو بھی اس منصب کا اہل سمجھتے تھے۔ چنانچہ حالات کو دیکھ کر جب آپ کو حضرت علیؓ کی طرف سے مایوسی ہوئی تو آپ نے حضرت ابوبکر ہی کو امامت کے لیے منتخب کیا۔ نماز پڑھانے والی حدیث متواتر ہے۔ حضرت عائشہ، ابن مسعود، ابن عباس، ابن عمر، عبداللہ بن زمعہ، ابن سعد، علی ابن ابی طالب وغیرہ سے الگ الگ روایت ہے۔ ابن زمعہ کا بیان ہے جس وقت آنحضرتؐ نے یہ حکم دیا کہ "ابوبکر سے کہو نماز پڑھائیں" حضرت ابوبکر وہاں موجود نہ تھے۔ حضرت عمر نماز پڑھانے کے لیے

---

[1] انت منی بمنزلہ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی من بعدی (بخاری، طبری، ابن ہشام وغیرہ)

[2] "من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ" (استیعاب ابن ہشام، صواعق محرقہ وغیرہ)

[3] انی امرت ان ابلغہ انا او رجل من اھل بیتی (خصائص نسائی، طبری وغیرہ)

آگے بڑھے، مگر آنحضرتؐ نے تین مرتبہ فرمایا۔ "نہیں نہیں خدا کو منظور نہیں ہے کہ ابوبکر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نماز پڑھائے[1]۔

ہاں! میں اس کا بالکل قائل نہیں کہ آنحضرتؐ سے اس دلی منشار کے اظہار میں کہ ان کے بعد حضرت علیؓ ہی ان کے خلیفہ ہوں خطار اجتہادی کا بھی امکان ہے۔ اس لیے کہ منشار نبوت کا تعلق محض حضرت علیؓ کی ذاتی قرابت سے نہیں تھا بلکہ حضرت علیؓ کی خداداد قابلیت اور ان کارناموں سے تھا جن کی نظیر صحابہ کی تاریخ میں ملنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ آنحضرتؐ کو حضرت علیؓ سے بالکل ویسی ہی محبت تھی جیسی ایک شفیق باپ کو اپنے ہونہار بیٹے سے یا ایک نیک دل استاد کو اپنے لائق شاگرد سے یا ایک فاتح بادشاہ کو اپنے شیر دل سپہ سالار سے ہوتی ہے۔ اس لیے آنحضرتؐ اگر اپنے بعد حضرت علیؓ ہی کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے تو اس میں کیا گناہ تھا؟ اس مسئلہ میں خطائے اجتہادی اگر تھی تو صرف ان لوگوں کی تھی جنہوں نے خواہ مخواہ "موروثی خلافت" کے فرضی خیال کو ایک ہوّا بنا لیا تھا اور اُس کی تیج میں کسی جائز اور ناجائز بات کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔

حضرت علیؓ بھی ان تمام پیچیدگیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اسی وجہ سے حضرت عباس نے جب انھیں مشورہ دیا کہ چلو رسولِ خدا صلعم سے مسئلہ خلافت کے متعلق طے کر لیں تو حضرت علیؓ بذاتِ خود اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور فرمایا کہ اگر کسی وجہ سے اس وقت آنحضرتؐ نے انکار کر دیا تو آئندہ پھر کوئی امید نہیں رہے گی۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؓ اس وقت کی پیچیدگیوں سے خود مایوس سے تھے۔ اور اپنے متعلق خلیفہ بنائے جانے کا یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک حضرت علیؓ کی ولیعہدی یا خلافت کا اعلان

---

[1] دیکھو استیعاب ذکر عبداللہ بن ابی قحافہ۔

بالکل نہیں ہوا تھا، ورنہ حضرت علی اور حضرت عباس وغیرہ کو اس کا علم ضرور ہوتا۔ اس قسم کی جتنی روایتیں ملتی ہیں جن سے حضرت علیؓ کی ولیعہدی یا خلافت کا اعلان ظاہر ہوتا ہے۔ غلط ہیں۔ علامہ قوشجی نے اس مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، چنانچہ وہ اس قسم کی لغو روایات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ اگر ایسے عظیم الشان مسئلہ میں جس کا تعلق تمام لوگوں کی دینی اور دنیوی مصالح سے وابستہ ہے اس قسم کے نصوص قطعیہ پائے جاتے تو یہ خبر ضرور متواتر ہوتی اور صحابہ میں مشہور ہوتی اور اس پر عمل پیرا ہونے میں لوگ اس کی وجہ سے توقف نہ کرتے اور نہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جہاں لوگ تقرر خلیفہ کے لیے جمع ہوئے کوئی ایسا اختلاف ہوتا کہ انصار کہتے کہ ایک خلیفہ ہم میں سے ہو جائے اور ایک تم میں سے۔ پھر ایک جماعت حضرت ابوبکر کو خلافت کے لیے موزوں سمجھتی اور ایک حضرت عباس کو اور ایک حضرت علی کو اور پھر حضرت علیؓ صحابہ سے بحث کرنے اور ان سے جھگڑنے اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے اور نص قطعی ثبوت میں پیش کرنے سے کبھی باز نہ رہتے۔ بلکہ وہ ضرور اپنی بات پر اڑے رہتے اور اپنے حق کا مطالبہ کرتے جیسا کہ وہ اپنے مطالبہ پر قائم رہے جب ان کی باری آئی اور جنگ بھی کی یہاں تک کہ صدہا آدمیوں کو فنا کر ڈالا۔ حالانکہ اس وقت معاملات زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے، شروع میں یہ بات زیادہ آسان تھی اس لیے کہ وہ زمانہ آنحضرتؐ سے زیادہ قریب تھا۔ اور لوگوں کی ہمتیں آنحضرتؐ کے احکامات کی بجا آوری کی طرف زیادہ مائل تھیں۔"

(شرح التجرید المقصد الخامس فی الامامۃ)

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اگرچہ حضرت علیؑ کو اپنے خلیفہ نہ ہونے پر افسوس تھا اس لیے نہیں کہ حضرت ابوبکر نے خلافت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا بلکہ صرف اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ حق سمجھتے تھے مگر بایں ہمہ انھوں نے محض اس وجہ سے کہ حضرت ابوبکر بھی ہر لحاظ سے خلافت کے لیے موزوں تھے کبھی مخالفت نہیں کی تا آنکہ حضرت عمرؓ کا دور آیا اور حضرت علی اب بھی یہ سمجھ کر خاموش ہو رہے کہ حضرت عمر بھی ریاست و تدبّر کے اعتبار سے اُن سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن یہ ناگواری اس وقت بہت زیادہ بڑھ گئی جب لوگوں نے انصاف کا خون کر کے محض اس خوف سے کہ خلافت کہیں موروثی چیز نہ بن جائے حضرت علیؑ کو ایک جائز حق سے محروم کر دیا اور حضرت عثمان کے ہاتھ پر بیعت کر لی، حضرت عثمان گو نیک دل اور پرہیزگار بزرگ تھے مگر وہ علم و فضل، شجاعت و بہادری، سیاست و تدبر کسی اعتبار سے بھی حضرت علیؑ کے ہم پلّہ نہیں تھے۔

حضرت علیؑ کا جام صبر لبریز ہو چکا تھا، اس وقت وہ ضبط نہ کر سکے، انھوں نے مجمع کے سامنے ایک تقریر کی جو روضۃ الاحباب میں بالتفصیل موجود ہے۔ آپ نے لوگوں کو مخاطب فرما کر کہا: ۔

> "لوگو میں تم کو قسم دیتا ہوں، کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا شخص ہے جس سے رسول خدا صلعم نے عقد مواخات کے موقعہ پر "انت اخی فی الدنیا والآخرۃ" کہا ہے؟ کیا کوئی ایسا شخص ہے جس کے حق میں آنحضرتؐ نے "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کہا ہو؟ کیا میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کو سورۂ برأت لے جانے کا امین قرار دے کر آنحضرتؐ نے یہ کلمات فرمائے ہوں؟ "لا یؤدی عنی الا انا او رجل من عترتی" کیا تم میں میرے علاوہ ایسا شخص ہے کہ آنحضرتؐ نے غزوات میں جب اُسے

> کہیں بھیجا ہو تو اس کو تمام مہاجرین و انصار پر امیر بنایا ہو، مگر اس پر کبھی کسی کو امیر نہ بنایا ہو؟ کیا تم میں کوئی ایسا ہے جس کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے "انا مدینۃ العلم و علی بابہا" فرمایا ہو؟ کیا تم میں میرے سوا کوئی ایسا ہے جو خطرات کے مواقع، اعدا کے نرغہ میں آنحضرتؐ کے ساتھ ہمیشہ ثابت قدم رہا ہو؟ کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو مجھ سے پہلے دائرہ اسلام میں داخل ہوا ہو؟ کیا تم میں کوئی ایسا ہے، جو سلسلۂ نسب میں رسول خدا صلعم سے مجھ سے قریب تر ہو؟"

لوگوں نے خاموشی سے تقریر سنی اور ہر ایک سوال پر حضرت علیؑ کی تائید کرتے ہوئے "کوئی نہیں"، "کوئی نہیں" کے نعرے لگائے۔ آخر میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ:—

> "آپ نے اس وقت جو کچھ بیان فرمایا سب صحیح ہے، لیکن لوگوں نے حضرت عثمان کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے، امید ہے کہ آپ بھی اس کی موافقت کریں گے۔"

میرے نزدیک اس پارٹی کی خصوصاً حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی یہ زبردست خطائے اجتہادی تھی جنہوں نے حضرت علیؑ کے مقابلہ میں ایک ایسے شخص کو ترجیح دی جو کسی طرح اس کا مستحق نہ تھا، چنانچہ بعد میں خود حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اپنی آخر عمر تک اس پر متاسف رہے۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی وہ تھی جس کو یاد کر کے اکثر حضرت عبداللہ ابن عباس آنسو بہایا کرتے تھے اور فرماتے تھے۔

"ان الرزیۃ کل الرزیۃ ما حال بین رسول اللہ صلعم و بین المسلمین ان یکتب لھم ذالک الکتاب" (بڑی مصیبت وہ

تھی جو رسولِ خدا صلعم اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہوئی۔ یعنی یہ کہ ان کے لیے کوئی وصیت نامہ مرتب کیا جائے)

(بخاری کتاب المرضیٰ)

سید جلیل الرحمن اعظمی

{نگار}

اس مسئلہ پر میرے مضمون کی اشاعت کے بعد سنّی و شیعہ حضرات کے مضامین بکثرت موصول ہوئے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جن میں طعن و تشنیع اور مناظرانہ کج بحثی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسی لیے میں نے ان کو شائع نہیں کیا۔ بعض البتہ ایسے تھے جن کی اشاعت کو گوارا کیا جا سکتا تھا اور انھیں میں سے ایک یہ مضمون ہے جو اس ماہ کے رسالہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فاضل مقالہ نگار نے بہت سلجھے ہوئے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے، لیکن افسوس ہے کہ جس اصول پر میں گفتگو چاہتا ہوں اس کا لحاظ اس میں بھی نہیں رکھا گیا۔ عام طور پر مناظرہ کرنے والوں کی عادت یہ ہے کہ فریق کو مطمئن کرنے کی کوشش وہ بالکل نہیں کرتے، بلکہ اپنی بات کی پیچ میں صرف الزامی جواب دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور اسی کو بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ گالی کا جواب گالی سے دینا بُرا نہیں لیکن اسی وقت جب ہم پہلے یہ تسلیم کر لیں کہ سب سے پہلے جس نے گالی دی تھی اس نے کوئی اچھا کام کیا تھا۔

سنی شیعہ نزاع کا قیام آج تک صرف اسی وجہ سے قائم ہے کہ ہر فریق بجائے اس کے کہ دوسرے کو معقول دلائل سے قائل کرے گالیوں پہ اُتر آتا ہے اور ایسی تلخ گفتگو کرتا ہے کہ دوسرے فریق میں بجائے سمجھنے کے انتقام کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس جذبہ کو معقولیت سے کیا واسطہ :

میں نے ہرنام کے مضمون کو صرف اسی لیے پسند کیا کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ نہایت سنجیدگی سے لکھا گیا تھا اور دلائل صرف وہی پیش کیے گئے تھے جن کے ماننے پر سنی جماعت کو مجبور ہونا چاہیے تھا کیونکہ تمام روایات سنیوں ہی کی معتبر کتابوں سے لی گئی تھیں ۔ اب اگر کوئی صاحب اس کے جواب میں ان روایات کو پیش کریں جنہیں شیعہ حضرات تسلیم نہیں کرتے ہیں تو بالکل بے نتیجہ بات ہوگی ۔

چنانچہ ہمارے دوست مولوی سید جلیل الرحمٰن صاحب اعظمی نے بھی اسی ادھیڑے طریقے سے کام لیا ۔ یعنی اپنے پورے مضمون میں جہاں تک روایات کا تعلق ہے کوئی ایک سند بھی ایسی پیش نہیں کی جس کے تسلیم کرنے پر شیعہ جماعت مجبور ہو ۔ فریق ثانی نہایت آسانی سے اس پورے مقالہ کا جواب یہ دے سکتا ہے کہ جو روایات اس میں درج کی گئی ہیں وہ یکسر لغو و مہمل ہیں ۔ بخلاف ہرنام صاحب کے مضمون کے کہ اس کا جواب سنیوں کی طرف سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ان روایات کو تسلیم نہیں کرتے ۔

میں نے جو کچھ فروری کے نگار میں لکھا وہ اسی اصول کے ماتحت تھا یعنی یہ کہ امامت و وصایت جناب امیرؑ کے باب میں تمام روایات کو تسلیم

کرنے کے بعد ایک انتہائی آزاد خیال شخص کی طرف سے اس کی تردید میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے اب فضائل وغیرہ کی بحث یا یہ کہ رسول اللہؐ نے جناب امیرؑ کی ولایت و امامت کا اعلان کیا یا نہیں بالکل دور از کار بات ہے اب تو اس امر کو اپنی جگہ مسلم قرار دے کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس سلسلہ میں لازماً انھیں تمام مسائل کی چھان بین کرنا پڑے گی جن کا ذکر میں نے اپریل کے نگار میں کیا ہے اور جن پر اظہار خیال کی دعوت میں نے خصوصیت کے ساتھ شیعہ علماء کو دی ہے۔

اعظمی صاحب نے تین عنوانات سامنے رکھ کر بحث کی ہے قبول اسلام، اعانت اسلام، مسئلہ امارت و خلافت۔ اوّل الذکر دو عنوانات تو قطعی قابل اعتنا نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کا کوئی اثر مسئلہ خلافت و امامت پر نہیں پڑتا۔ رہ گیا تیسرا مسئلہ۔ سو افسوس ہے کہ اس کو جیسا کہ چاہیے تھا طے نہیں کیا گیا۔

فاضل مضمون نگار نے ابتدا میں ظاہر کیا ہے کہ مسئلہ خلافت خالص مذہبی مسئلہ ہے لیکن آخر میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اس کا کوئی فیصلہ اپنی زندگی میں نہ کیا تھا۔ حیرت ہے کہ رسول اللہؐ معمولی نہلانے دھونے کے معمولی مسائل تو اپنی زندگی میں لوگوں کو بتا جائیں اور خلافت ایسے اہم معاملہ کو جس پر اسلام کے مستقبل کا انحصار تھا غیر طے شدہ چھوڑ جائیں۔ اگر امامت و خلافت کا مسئلہ واقعی خالص مذہبی مسئلہ ہے تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ رسول اللہؐ نے اس کا فیصلہ ضرور کیا اور وہ فیصلہ یقیناً حضرت علیؑ کے حق میں تھا جس کے بعد نہ اجماع کی کوئی اہمیت باقی رہ جاتی ہے نہ مصلحت وقت کی۔ اس سلسلہ میں اعظمی صاحب نے جن روایات یا جن کتابوں کی مدد سے فیصلہ فرمایا ہے وہ [illegible] ہی ہیں [illegible]

قاضی ہردی رضی آئی کے تحت میں آتی ہیں جبتک شیعہ سنی روایات کو سامنے رکھ کر اور سنی شیعی روایات کے استنادپر گفتگو نہ کریں دوسرا فریق مطمئن نہیں ہو سکتا۔ آپ لاکھ کہا کریں کہ رسول اللہ نے آخر وقت میں نماز کی امامت حضرت ابوبکر کے سپرد کر کے گویا خلافت کا مسئلہ بھی طے فرما دیا تھا لیکن شیعہ اس کو مانتے کب ہیں بات ایسی کہیے جو فریق مقابل کو مطمئن و ساکت کرے ورنہ یوں یہ جھگڑا نہ مٹا ہے نہ آیندہ مٹ سکتا ہے۔ گذشتہ ماہ کے رسالہ میں ہمزنام صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس پر ایک نوٹ کے ذریعہ سے میں نے شیعی علماء کو متوجہ کیا ہے کہ وہ ان عنوانات پر اظہارِ خیال فرمائیں جو ماہ مارچ ۳۶ء کے نگار میں میں نے متعین کیے ہیں۔

امید ہے کہ جنوری ۳۷ء میں اس موضوع پر میں کوئی بسیط مقالہ پیش کر سکوں گا۔ اعظمی صاحب اس کا انتظار کریں، ممکن ہے گفتگو کے لیے بعض بالکل جدید پہلو نکل آئیں اور وہ بھی میری طرح آخر میں یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں کہ جب تک روایات کو چھوڑ کر صرف درایت کے نقطۂ نظر سے گفتگو نہ کی جائے اس کا فیصلہ دشوار ہے۔

⁂

فضائل جناب امیرؑ کے امتیازی خصوصیات

روایت و درایت کے معیار پر اصولی بحث

(ایک وسیع الخیال غیر جانبدار انسان کے نقطۂ نظر سے)

از افادات

عالیجناب سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی

صاحب قبلہ مجتہد العصر ظلہ

فضائل جناب امیرؑ کے امتیازی خصوصیات[۱]

روایت و درایت کے معیار پر اصولی بحث

ایک وسیع الخیال غیر جانبدار انسان کے نقطۂ نظر سے

* * *

دنیا میں بے شمار جماعتیں ہیں اور ہر جماعت کے کچھ پیشوایان و بزرگان ہیں اور ہر ایک پیشوا و بزرگ کی روحانی و اخلاقی عظمت کے متعلق روایات ہیں جو اس جماعت میں شہرت رکھتی ہیں اور اس جماعت کے افراد ان روایات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

ان قدیم مذاہب کو جانے دیجیے جن کا وجود تاریخ کے صفحات پر ہزاروں یا صدیوں برس کی مدت سے چلا آ رہا ہے۔ ابھی وہ جماعتیں جن کی پیدائش آنکھوں کی دیکھی بات ہے ان میں بھی اپنے رہنمایاں کے متعلق اس قسم کی روایتیں موجود ہیں اور مقبولیت رکھتی ہیں۔

کون بابی بہائی مذہب کا پیرو ہوگا جو علی محمد باب کے گولیوں کی باڑھ سے ایک مرتبہ محفوظ رہ جانے کو ان کی عظیم طاقتِ روحانی کا نتیجہ نہ سمجھتا ہوگا اور مرزا حسین علی بہاء مازندرانی کے بغیر تعلیم ظاہری عالمِ علمِ لدنی ہونے پر ایمان نہ لایا ہوگا اور کون قادیانی مذہب کا نام لیوا ہوگا جو

---

[۱] سرفراز رجب نمبر ۱۳۵۵ھ

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو ان تمام کمالات کا حاصل نہ سمجھتا ہوگا جن کا وہ اپنے متعلق ادعا رکھتے تھے اور ان کے بیان کے مطابق اس کا یقین نہ رکھتا ہوگا کہ خدائے عز و جل ان کے خواب میں آیا اور لال روشنائی سے ان کے پیش کردہ کاغذ پر دستخط کیے جس کے قطرے جو قلم سے جھٹکنے میں گرے تھے ان کے لباس پر بیداری کے بعد بھی نمایاں تھے۔

اسلامی جماعت میں بدقسمتی سے شروع ہی میں افتراق پیدا ہو گیا اور وہ مذہب جو دنیا کو امتِ واحدہ بناتے اور حبلِ الہٰی سے بلا افتراق وابستہ کرنے کے لیے آیا تھا اس کے ماننے والے دو چار نہیں بلکہ تہتّر فرقوں میں منقسم ہو گئے جن میں سے ہر ایک نے اپنا قبلۂ مقصد اور کعبۂ عقیدت الگ قرار دے لیا۔

اس صورت میں یہ امر بالکل قابلِ تعجب نہیں کہ خود مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں بہ اعتبار اپنے بزرگوں کے ایسے روایات شائع ہو گئے کہ اگر وہ سب یک جا کیے جائیں۔ اور ایک غیر جانبدار انسان ان کو دیکھ کر کسی ایک متفقہ نقطہ پر پہنچنا چاہے تو حیرت و سرگشتگی کی ایک ایسی بھول بھلیاں میں گرفتار ہو جائے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں ہے۔

اب اگر وہ ڈاکٹر امبسید کر کی طرح حقیقت طلبی سے کوئی غرض نہیں رکھتا اور صرف رسمی حیثیت سے مختلف مذاہب پر ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ ڈال کر کسی ایک پہلو کی طرف مڑ جانا چاہتا ہے جدھر اس کا دماغ نہیں، مگر دل چلے جانے

کی تحریک کر رہا ہے۔ تو وہ اسی ہنگامۂ اختلاف کو پورے اسلام ہی سے کنارہ کشی کا بہانہ بنالے گا۔ اور ادھر چلا جائے گا جدھر جانے کا مشتاق ہے۔

لیکن اگر وہ سچ مچ نقطۂ حقیقت کی تلاش میں ہے تو اسے صرف یہ کہہ کر ایک چوراہے سے ہٹ جانے کا حق نہیں ہے کہ یہاں سے تو بہت راستے گئے ہوئے ہیں۔ کیا معلوم کون ٹھیک ہے۔ کیونکہ ان ہی بہت راستوں میں تو ایک وہ بھی ہے جو صحیح منزل تک پہنچانے والا ہے۔ اگر انسان "کاوش جستجو" سے ہمت ہار کر اس نقطۂ مشترک ہی سے ہٹ گیا تو منزل سے جتنا نزدیک ہوگیا تھا اس سے بہت زیادہ اب دور ہو جائیگا۔

ایسے شخص کی یہ "کج دلی" اور "پست ہمتی" بالکل اس انسان کے مانند ہے، جو مختلف مذاہب کے عظیم اختلافی مسائل کو دیکھ کر اصل مذہب ہی سے علیحدہ ہو کر "لامذہبیت" کے گوشہ میں پناہ گزیں ہوتا ہے۔ حالانکہ اس سے اعضاء و جوارح کو زحمت طلب سے آرام مل جائے لیکن روح کو وہ سکون حاصل نہیں ہو سکتا جو کسی حقیقت کو حقیقت سمجھ کر اختیار کرنے کی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔

ایسے لوگوں کی یہ "دماغی کاہلی" ہندوستانی مسلمانوں اور بالخصوص شیعوں کی اس "جسمانی کاہلی" کے مانند ہے جو اسباب معیشت کی گوناگونی اور نفع و نقصان کے اعتبار سے ان کی دگرگونی سے گھبرا کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا اپنے لیے سبب نجات سمجھ لیتے ہیں اور اس طرح تجارت و حرفت و صناعت سب چیزوں سے کنارہ کشی کرکے بے کاری کی زندگی گزارنا اپنے لیے سبب اطمینان سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یقیناً دونوں کا "فنا" ہے، بے شک ایک جگہ "دنیوی" اور ایک جگہ "اخروی"۔

* * *

"منزل حقیقت کا طالب" بے شک اس کا فرض ہے کہ ہر جادہ کو جانچے ہر راستہ کو پوچھے، ہر ہر گلی کوچے میں جستجو کرے کہ کہیں اس کی مطلوبہ منزل اسی کہ

میں نہ ہو جسے وہ چھوڑ کر آگے نکل گیا ہے۔

اسلامی روایتوں کے اختلاف کی صورت میں بھی جانچ پڑتال کی ضرورت ہے انتقاد و تبصرہ کی حاجت ہے۔ سچے جھوٹے کھرے کھوٹے کے امتیاز کے لیے روایت و درایت کے اصول پر بحث کی ضرورت ہے تب دودھ کا دودھ پانی کا پانی" الگ ہو جائے گا۔ حق نکھر کر باطل کی آمیزشوں سے علیحدہ اور واقعیت نکھر کر آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔

پہلے سب کے اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ کون فریق ہے جس نے نقد و نظر کے دروازوں کو بند کیا ہے۔ جرح و تعدیل کے راستوں پر پہرے بٹھلائے ہیں اور اپنے مجوزہ راستے کی طرف آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جانا چاہتا ہے۔

"الصحابۃ کلھم عدول" اصحاب سب کے سب عادل ہیں" اور اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم" اصحاب نبی سب ستاروں کے مانند ہیں جس کی بھی پیروی کی جائے (بلا استثناء) ہدایت ہی ہدایت ہے"

ادھر کسی صحابی کے کسی طرزِ عمل پر کتنی ہی متانت، ادب اور تہذیب کے ساتھ کیوں نہ ہو نکتہ چینی شروع ہوئی ادھر جبینِ عقیدت پر شکن آئی چہرۂ اخلاص غصہ سے تمتما گیا اور کاکلِ ارادت بل کھانے لگی۔ ہائیں! اصحابِ نبیؐ کی شان میں گستاخی۔ تبرا کھلا ہوا تبرا!!

گویا ان لوگوں کے لغت میں کسی اصولی اعتراض اور آئینی اظہارِ اختلاف کا نام ہے "تبرا" اور اسی کی دوسری تفسیر ہے "گالیاں دینا" جبھی تو جس صاف سادہ مسلمان سے پوچھیے۔ وہ لے گا کہ گالیاں دینا شیعوں کا جزوِ مذہب ہے اور یہ شعر پڑھ دے گا ؎

دشنام بہ مذہبے کہ طاعت باشد
مذہب معلوم و اہلِ مذہب معلوم

پھر کچھ کتابیں ایسی مقرر کریں کہ دنیا بدل جائے، زمین آسمان میں انقلاب آ جائے ان ہی کتابوں سے "رنگیلا رسول" ایسی رسوائے عالم کتاب تصنیف ہو جائے جس پر اس کے مصنف کو تلوار کے گھاٹ اتار کر خود سولی پر چڑھ جانا پڑے لیکن یہ زبان سے نہ نکلے گا۔ ان کتابوں کی سب روایتیں معتبر نہیں ہیں، کوئی ضعیف ہے، کوئی موضوع ہے اور کوئی غیر معتبر، بلکہ کہتے ہی رہیں گے کہ "اصح الکتب بعد کتاب الباری" اور یہ کہ ان کے روایات نقد و تبصرہ سے بلند و برتر ہیں۔

اگر کوئی بے چارہ اللہ کا بندہ ذوقِ تحقیق سے "رجال بخاری" ایسی کتاب لکھ دیگا تو اس پر اخباروں کے صفحات پر وہ شور برپا کیا جائے کہ شورِ محشر بھی شرما جائے اور وہ بے چارہ ایسا دم بخود ہو کہ پھر اتنی ہمت ہی نہ کرے اور نہیں تو دھمکی دی جائے کہ جو راجپال اور شردھانند کا انجام ہوا وہی تمہارا بھی ہو گا۔

⁂

فروعِ دین یعنی مسائل شرعیہ میں اجتہاد و استنباط یعنی ذاتی غور و خوض کا دروازہ بند، سُنّی کے چند اشخاص جو آپ سے ایک ہزار سال سے زیادہ پہلے اور پیغمبر اکرمؐ کے عہد سے کم و بیش ڈیڑھ دو سو برس بعد یعنی نہ زمانہ نزول احکام و تشریع مسائل کے وقت حاضر، نہ زمانہ اجرائے حکم اور ہنگام عمل کے ناظر، مگر پورا دار و مدار اُن ہی کی ذاتی راؤں پر اور تقلید کا پورا بار اُن کے مردہ و بوسیدہ کاندھوں پر، قاعدہ ہے کہ جس قوت کے فرائض اُس سے الگ کر لیے جائیں وہ قوت پھر ان فرائض کے ادا کرنے سے قاصر ہی ہو جاتی ہے۔

یقیناً صدیوں کی یہ پابندی عقول و افکار میں جمود پیدا کرے تو کوئی تعجب نہیں

اصولِ مذہب میں عقلی بحث کا دروازہ اس لیے بند کہ حسن وقبح عقلی کوئی چیز ہی نہیں اور اچھے یا بُرے کے کوئی معنی نہیں۔

اب رہا کیا؟ آنکھیں بند کرکے کانوں پر پردے ڈال کے، دماغی طاقتوں کو بے کار معطل بنا کے جو کچھ کہا جائے اسے مان لو اور جو بتایا جائے اسے جان لو۔ سمجھنے کی کوشش نہ کرو۔

ایک غیر جانبدار وسیع الخیال انسان کو اسی سے کھٹکنا چاہیے اور دل میں کہنا چاہیے یا الٰہی معاملہ کیا ہے۔ فرامیشن کا کارخانہ ہے؟ طلسمی قلعہ ہے؟ راہِ ظلمات ہے؟ آخر ہے کیا کہ چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ سوچنے سمجھنے کی اجازت نہیں۔ اس کا ضمیر ضرور بے اطمینانی کی کروٹیں بدلے گا اور شک وشبہ سے پیچ وتاب کھائے گا اور سمجھے گا کہ کچھ نہ کچھ ہے جس کی پردہ داری منظور ہے۔

اب اگر اس نے اس منزل سے عبور کر لیا اور ذرا آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی اور پیشوایانِ مذہب کے مدارج ومراتب پر اس کی خصوصیت سے نگاہ گئی اور تفصیل کے خارزار میں دامن الجھانے کے قبل اس نے اجمال کے وادی کو طے کر لینا چاہا اور یہ دیکھا کہ آخر اصولی حیثیت سے ایک بزرگ ترین پیشوا کے لیے معیار کیا مقرر کیا گیا ہے؟

اس نے ایک طرف نگاہ ڈالی۔ ایک فریق کے نمایندہ کو دیکھا کہ عرشۂ بلندی سے چیخ چیخ کر بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ بلند ترین انسانی اوصاف کی ایک فہرست ہے جو سنا رہا ہے۔ کہیں پر آواز میں ارتعاش نہیں۔ لہجہ میں اضطراب نہیں تقریر میں جھول نہیں۔ زبان میں لکنت نہیں، لبوں پر خشکی نہیں، گلے میں خرخراہٹ نہیں۔ وہ کہہ رہا ہے "پیشوائے مذہب، امامِ خلق، رہبرِ اُمم کا جانشین وہ ہو سکتا ہے، جو اعلمِ زمانہ ہو، افضلِ زمانہ ہو، ازہدِ زمانہ ہو، اورع ہو، اشجع ہو، اشرف

ہو، صحیح النسب ہو، وغیرہ وغیرہ کہتے کہتے سب سے زیادہ یہ ہے کہ معصوم ہو، یعنی اپنے افعال و اعمال میں مرضئ الٰہی کا بالکل آئینہ ہو۔ بھولے چوکے، ناواقفیت جہالت اور کسی سبب سے بھی اس سے بڑھاپے جوانی بلکہ بچپنے میں بھی کبھی گناہ سرزد نہ ہوا ہو اور غلطی نہ کی ہو۔ اور چونکہ اس مرتبہ کا حصول عام انسانوں کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اس لیے اس کی پیشوائی و جانشینی کا اعلان خدا کی جانب سے پیغمبر کی زبانی ہو گیا ہو۔

دوسری جانب نگاہ گئی تو یہ دیکھا کہ جوں جوں پیشوا کے اوصاف میں قیود عائد ہوتے جاتے ہیں اور شرائط میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اُدھر چہروں کا رنگ اڑتا جاتا ہے۔ سروں کا بلند کرنا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا، چہروں پر ہوائیوں کا چھوٹنا اور ہونٹوں پر زبان کا پھرانا سب کچھ وہ کہہ رہا ہے جو دل کی گہرائیوں میں مضمر ہے اور یہ اضطراب و پریشانی کا اظہار صاف غمازی کرتا ہے کہ اوصاف وہ سامنے آ گئے ہیں جو اپنے مشاہدہ و تجربہ نہیں بلکہ وہم و خیال سے بھی بالاتر ہیں اور اس لیے جب وہ فہرست ختم ہوئی اور فریق مقابل کے جواب کی نوبت آئی تو اس کے نمائندے نے کھڑے ہو کر ہر صفت کے لحاظ سے نہیں نہیں کی رٹ لگائی اعلم ہونے کی ضرورت ہے؟ نہیں، افضل ہونے کی ضرورت ہے؟ نہیں اشجع ہونے کی ضرورت ہے؟ نہیں، اشرف ہونے کی ضرورت ہے؟ نہیں معصوم ہونے کی ضرورت ہے؟ نہیں۔ یہاں جا کر بڑی ہمت یہ کی گئی کہ عدالت کی شرط قرار دی، مگر ساتھ ہی اس میں بھی انتخاب ابتدائی کی قید لگائی یعنی شروع شروع اس کا خیال رکھا جائے کہ عادل ہی منتخب ہو۔ لیکن اگر اتفاق سے فاسق ہی کی خلافت مسلّم ہو جائے تو بہرحال وہ خلیفہ ہے۔ فسق و فجور کی وجہ سے وہ خلافت کے عہدہ سے برطرف نہیں سمجھا جائے گا۔

یقیناً ایک جانبدار انسان اگر اس میں معاملہ فہمی کی طاقت بھی موجود ہے تو اس سے یہ اندازہ کرے گا کہ پہلے فریق کو اپنے پیشواؤں کے بلند ترین اوصاف پر واقعی حیثیت سے یا کم از کم ان دستاویزوں کے لحاظ سے جو موجود ہیں اتنا اعتماد ہے کہ وہ ان تمام اوصاف کو ان پر منطبق کر سکتا ہے اور دوسرے فریق کو اپنے پیشواؤں کی نسبت ان اوصاف کے منطبق ہونے کا یقین اور گمان کیا بلکہ زبردستی تاویل اور کج بحثی کے زور سے بھی منطبق ہونے کا امکان ہی نظر نہیں آتا۔ اس لیے وہ ان قیود کے متعلق سختی سے انکار کرنے ہی میں اپنی جیت سمجھ رہا ہے۔

میرے خیال میں فضائل کی بحث کا یہیں پر فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ایک غیر جانبدار انسان کو یہ زحمت ہی برداشت کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ تفصیل کے ساتھ ایک ایک کی فضیلت کا دوسرے کے ساتھ موازنہ کرے۔

لیکن ذوق طلب نے اس پر اکتفا کی اجازت نہ دی اور اس کی تحقیق کی پیاس اتنے میں نہ بجھ سکی تو اب وہ فریقین کی کتابیں اٹھائے گا۔ احادیث و سنن سیر و تواریخ سب کو اپنے سامنے رکھ کر تمام متعلقہ اشخاص بزرگان مذہب کے فضائل و حالات کی الگ الگ فہرست ان کے اسناد و روایات کے حوالے کے ساتھ مرتب کرے گا اور اس کے بعد اس کی نگاہ چند خاص پہلوؤں کی طرف جائے گی جو بہت حد تک واقعیت کے نقطہ تک پہنچنے میں اس کی رہنمائی کریں گے۔

⁂

یقیناً اگر وہ سنجیدہ و کامیاب تفتیش کے اصول سے واقف ہے تو وہ اس کی کوشش کرے گا کہ وہ ایک فریق کے مسلّمہ پیشوا کے خصائص و حالات مراتب و کمالات کی سندوں کو دوسرے فریق کے مستند کتب احادیث و تواریخ میں تلاش کرے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے تو سمجھے گا کہ میں نے ہفت خوان فتح کر لیا

لیے کہ کسی پیشوائے مذہب کے فضائل و کمالات کے متعلق خود اس کو پیشوا ماننے والی جماعت میں تو ایسی حکایتیں شائع ہوتی ہی ہیں جو اس فریق میں مستلم حیثیت رکھتی ہوں لیکن دوسرا فریق انھیں نہ تسلیم کرے، ایسے روایات ایک غیر جانبدار شخص کے دل و دماغ پر ہرگز کوئی نتیجہ خیز اثر نہیں ڈال سکتے۔

جب اس معیار پر وہ جانچے گا تو معلوم ہوگا کہ ایک فریق جو تعداد کی حیثیت سے اکثریت رکھتا ہے اور مالی و اقتداری ہر حیثیت سے غلبہ، اس کے پیشوایان خاص اور بزرگ مرتبہ مقتدایان کے لیے دوسرے فریق کے یہاں سوائے قدح کے کچھ ملتا ہی نہیں اور قدح بھی ہر طرح کی علمی، عملی، اخلاقی، اوصافی، نسبی حسبی لیکن دوسرے فریق کے مقتدایان اور بالخصوص پیشوائے اعظم علی ابن ابی طالب کے لیے اول الذکر فریق کی کتابوں میں فضائل کا اتنا ذخیرہ موجود ہے جو ان تمام شرائط و قیود کے منطبق کر دینے کے لیے کافی ہے جنھیں اس فریق نے امامت و خلافت کے لیے ضروری قرار دیا تھا اور قدح کا تو نام و نشان ہی نہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی ٹوٹی پھوٹی روایت کسی معمولی سی کمزوری کے متعلق لکھ بھی دی گئی ہے (جیسے حکایت خطبۂ بنت ابی جہل) تو اسی کے ساتھ اسی جماعت کے بلند مرتبہ حفاظ و محدثین نے لکھ دیا ہے کہ یہ روایت موضوع ہے اور اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

اسی کے اوپر وہ فضائل کی بحث کا تصفیہ کر سکتا ہے۔ اگر ان روایات فضائل کے پہلو بہ پہلو جو جناب علیؑ ابن ابی طالبؑ کے متعلق موجود ہیں دوسرے فریق کی نسبت اتنی ہی تعداد میں یا اس سے زیادہ فضائل کے روایات بھی موجود ہوں، لیکن پہلی قسم کے روایات حضرت علیؑ کے معتقدین خاص کے علاوہ اس جماعت کے کتب میں بھی موجود اور تسلیم شدہ ہوں جو آپ کو مذہبی حیثیت سے وہ درجہ نہیں دیتی لیکن دوسرے فریق کے متعلق وارد شدہ فضائل صرف ان ہی کے عقیدت مند

حلقہ کے ساتھ مخصوص ہوں تو یہیں سے ایک غیر جانبدار انسان کے نقطۂ نگاہ سے محل اعتبار میں دوسرے حضرات کے فضائل حضرت علیؑ کے فضائل کے پہلو میں ہرگز نہ آسکیں گے اور پھر اس کے ساتھ جب یہ دیکھا جائے گا کہ ان حضرات کے روایات مدح کے ساتھ خود اس جماعت کے کتب میں روایات قدح بھی موجود ہیں۔ جو ان کے مخالف فریق کی تائید کر رہے ہیں اور اس لیے یہ روایات قدح خود انکے روایات مدح کے ساتھ معارضہ رکھتے ہیں جس کی بنا پر اگر کسی ایک کو ترجیح بھی نہ دی جائے اور دونوں کو یکساں قرار دے کر پایۂ اعتبار سے حذف کر دیا جائے تو کیا ہوگا۔ دفتر فضائل میں (۰) اور حضرت علیؑ کے فضائل بلا معارض لائق تسلیم قرار پائیں گے۔

اس موقع پر کتنی بے بسی کا مظاہرہ ہے یہ کہنا کہ اہل سنت کے کتب میں شیعہ لوگوں نے اپنی دسیسہ کاریوں سے اس قسم کے روایات داخل کرا دیے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے ایک وہ جماعت جو دولت و سلطنت کی مالک ہو جہاں علوم حدیث و تاریخ حکومت و جہانبانی کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے ہوں جہاں کے فقہ و حدیث کے لیے درسگاہیں قائم ہوں جس کے حفاظ و محدثین کی تعداد ایک ایک زمانہ میں سینکڑوں تک پہنچی ہو وہ اپنے علمی سرمایہ کے بارے میں اتنی بے بس ہو جائے کہ دوسری جماعت کے افراد اس کی معتبر ترین کتاب پر قبضہ کر کے اس میں جو چاہیں اپنے دل سے ملا دیں اور اس جماعت کو خبر بھی نہ ہو بلکہ حفاظ و محدثین اسی تحریف شدہ ذخیرہ کی حفظ میں مصروف ہو جائیں، اسی کو نقل کریں اور اسی کی نشر و اشاعت میں اپنی جان کھپائیں۔

برخلاف اس کے وہ دوسری جماعت جو ہمیشہ مقہور و مغلوب رہی ہو جس کی گردنیں تلواروں کے لیے [illegible] تھ پاؤں ہتھکڑیوں، بیڑیوں کے لیے جس کی

زندگیاں جیل خانوں کے لیے وقف رہی ہوں۔ جس کی صدیوں تک کوئی چھوٹی سے چھوٹی درسگاہ بھی نہ ہو اور جس کو اپنے کتب کی نشر و اشاعت کا موقع بھی نہ حاصل ہو۔ جس جماعت کا کئی مرتبہ قتل عام ہوا ہو وہ اپنے علمی و مذہبی سرمایہ کی آتنی حفاظت کرے کہ کسی مخالف مذہب کو اس میں اپنے حسب دلخواہ قطع و برید اور الحاق و زیادتی کا موقع نہ ملے۔ کیا یہ عقل میں آنے کی بات ہے؟ کیا کوئی بے غرض غیر جانبدار انسان اس کی تصدیق کر سکتا ہے؟

پھر آخر کیا ہے کہ شیعوں کے موافق روایات اہل سنت کے یہاں کثرت سے مل جاتے ہیں اور اہل سنت کے موافق منشاء روایات شیعوں کے یہاں غیر ممکن۔

لڑائی نہیں ہے، سخن پروری نہیں ہے، مناظرہ نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ مجھ کو مناظرہ سے نفرت ہے اور میں اس کو تحقیقِ حق کا ذریعہ نہیں سمجھتا ہوں، مگر حقیقتاً یہ سوال ہے اور قابلِ غور بات ہے جس کے اوپر ہر بے غرض انسان کو غور کرنے کی ضرورت ہے"

اچھا اگر ایسا ہی ہوتا کہ وہ روایات شیعوں نے کتابوں میں ملحق کر دیے تھے تو کم از کم جب علمِ رجال و درایت کی تدوین ہوئی اور نقد احادیث پر کتابیں تصنیف ہونے لگیں اور صحیح، حسن، موثق، ضعیف، موضوع الگ الگ کی جانے لگیں تو وہ روایات جو فضائل علی ابن ابی طالبؑ سے متعلق تھے موضوع یا ضعیف قرار پاتے اور روایات فضائل حضرات خلفاء صحیح و حسن اور کم از کم موثق۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔

امام احمد بن حنبل اور قاضی اسمٰعیل بن اسحاق فرما رہے ہیں۔ لم یرد فی فضائل احد من الصحابة بالاسانید الحسان ماروی فی فضائل علی بن ابی طالب۔

"صحابہ میں سے کسی بزرگ کے متعلق حسن و معتبر سندوں کے ساتھ اتنے روایات

وارد نہیں ہوئے جتنے علی ابن ابی طالبؑ کے بارے میں وارد ہیں" (استیعاب مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۴۷۹) حافظ نسائی اور ابوعلی نیشاپوری کا ارشاد ہے:۔

لم یرد فی حق احد من الصحابۃ بالاسانید الصحاح اکثر مما ورد فی حق علی۔

"کسی صحابی کے بارے میں صحیح السند طرق سے اتنے روایات وارد نہیں ہوئے ہیں جتنے حضرت علیؑ کے بارے میں ہیں۔" (منہج مکیہ مصنفہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر صفحہ ۲۳۷)

پھر کیا اس سے ایک غیر جانبدار انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا نہ ہوگا کہ یہ حقیقت و واقعیت کا زور تھا۔ جس نے تمام مذہبی جذبات کے خلاف ان روایات کو مستند و معتبر راویوں کے زبان و قلم سے نکلوا دیا اور اس کے برخلاف دوسرے صحابہ کے فضائل کے متعلق چونکہ ان کی روایت صرف ان کے عقیدت مند حلقہ سے مخصوص ہے یہ شبہ پیدا ہو جائے گا کہ ان کی ساخت و پرداخت صرف ارادت و عقیدت کا نتیجہ ہے، اور اس لیے ان کی مخالف جماعت میں ان روایات کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔

بعض لوگوں نے حضرت علیؑ کے فضائل کی کثرت کی عجیب و غریب توجیہہ یہ کی ہے کہ چونکہ حضرت رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو غیبی طریقہ پر یہ اطلاع حاصل تھی کہ حضرت علیؑ کے خلاف ایک جماعت ایسی پیدا ہوگی جو آپ کی تنقیص کرے اور آپ کی مخالفت کرے اس لیے حضرتؐ نے آپ کے فضائل کثرت سے بیان فرمائے تاکہ لوگ آپ کے مخالفین کی باتوں میں آ کر آپ سے منحرف نہ ہوں، اور جادۂ حق سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں۔ (صواعق محرقہ مصنفہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر صفحہ ۷۴)

لیکن یہ تاویل عجیب و غریب ہے، رسولؐ کو اس کا علم تھا کہ حضرت علیؑ کی تنقیص کرنے والے پیدا ہوں گے۔ کون؟ بنی امیہ۔ اور اس لیے آپ نے اُن

جناب کے فضائل زیادہ بیان فرمائے۔ لیکن آخر حضرت سرورِ کائنات کو یہ بھی تو علم ہوگا کہ ایک جماعت ایسی موجود رہے گی جو خلفائے ثلاثہ کی مذہبی عظمت کی بالکل قائل نہ ہوگی بلکہ ان حضرات کی علمی و عملی حیثیت سے ہر طرح تنقیص کرتی ہوگی۔ وہ کون؟ یہی جماعت روافض۔

پھر اگر واقعی حضرات خلفاء کے فضائل وہی سب کچھ تھے جو حضرت علیؑ کے لیے بیان ہوئے یا ان سے کچھ زیادہ تو رسول اکرمؐ نے ان کے فضائل بھی کیوں نہ بیان فرما دیے تاکہ اس جماعت کے معتقدات کا سدِّ باب ہو اور امتِ محمدیہ گمراہی سے محفوظ ہو جائے۔

اگر دیکھا جائے تو حضرت علیؑ کے مخالف بھی آپ کی حکومت و سلطنت کو نہ تسلیم کرتے ہوں، آپ کے اصولِ جہانبانی و سیاست پر اعتراض کرتے ہوں مگر آپ کے علمی و عملی کمالات کا ایک بھی مخالف نہ تھا۔ یہاں تک کہ جماعت خوارج تک جو آپ کی حد درجہ مخالف ہے اور آپ سے برأت کو اپنا ایمان سمجھتی ہے وہ آپ کے بے نظیر علمی و عملی خصوصیات کی قائل ہے۔ جس کے متعلق میں اپنے ایک مخصوص مقالہ میں کافی تبصرہ کر چکا ہوں جو گذشتہ زمانہ میں کسی سال کے "سرفراز رجب نمبر" ہی میں شائع ہوا تھا اور پھر امامیہ مشن کی جانب سے کسی سال کے ماہِ رجب کے رسالہ میں وہ درج ہو کر دوبارہ بھی شائع ہوا ہے۔

اس کے برخلاف جماعت روافض (فرقۂ شیعہ) حضرات خلفاء کی نسبت کسی طرح کے بھی کمال کی نسبت کو اپنے ضمیر کی بناء پر قبول نہیں کرتی اور اگر ان حضرات کے تذکرہ میں کسی زبان و قلم پر کوئی تعظیمی لفظ نظر آئے (جیسا کہ میں پابند ہوں) تو اس کو صرف اپنے برادرانِ ملّی کی خاطرداری اور ایک اندازِ رواداری سمجھنا چاہیے، اور کچھ نہیں۔

پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ حضرت علیؑ کی مخالف جماعت جو کھلم کھلا اس درجہ

تک آپ کی دشمن رہی ہو جیسا کہ بنی امیہ تھے۔ اس کی عمر کتنی مختصر و کوتاہ تھی جو زیادہ سے زیادہ چند صدی میں ختم ہوگئی۔ جماعت خوارج ہر زمانہ میں موجود رہی اور اب بھی ہے۔ لیکن کچھ محدود علاقوں میں محصور ایک محدود تعداد میں منحصر۔ اس کے علاوہ جتنے مسلمان ہیں چونکہ وہ حضرت علیؑ کو پہلا خلیفہ نہیں تو چوتھا خلیفہ ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے وہ حضرت علیؑ کی نسبت ہرگز کسی ایسے امر کا اظہار نہیں کر سکتے جو کھلم کھلا آپ سے نفرت اور بیزاری کا ثبوت دے

اس لیے النجم بھی لکھے گا تو یہ کہ شیعوں کے (مفروضہ النجم) روایات کی بنا پر حضرت علیؑ (معاذ اللہ) ایسے تھے اور ایسے تھے لیکن اس سے پوچھا جائے کہ تمہارے نزدیک کیسے تھے تو وہ ہرگز کسی تنقیص کی نسبت کو اپنے ذمہ عائد نہیں کرے گا۔

اخبار "الجمعیتہ" دہلی بھی لکھتا ہے تو یہ کہ ہم کو ایک نئے علیؑ اور حسینؑ بنا کر تبرّے کا جواب تبرّے سے دینا پڑے گا۔"

میں تو چونکہ روادار انسان ہوں اور ہر بات میں صلح پسندی کے پہلو کی تلاش کرتا رہتا ہوں اس لیے میرے نزدیک تو شیعی جرائد کو اس کے جواب میں یہ لکھنا چاہیے تھا کہ اگر تم نئے علیؑ اور حسینؑ بنا کر تبرّے کا جواب دینا چاہو گے تو نہ وہ ہمارا جواب ہوگا نہ ہمیں اس پر بگڑنے کی ضرورت۔ اس لیے کہ ہم جنہیں مانتے ہیں وہ پرانے علیؑ و حسینؑ ہیں "نئے نہیں" ہیں۔ اگر کسی نئے کو بنا کر تم نے تبرّا کیا تو ہم سے مطلب؟

یہ صورت تو مخالفینِ علیؑ کی ہے۔ لیکن دوسرے صحابہ کی مخالف جماعت (شیعہ) وہ اصولِ تمدن اور معاشرت اور اتحادِ اسلامی کے مفاد و مقصد کی بنا پر سنجیدہ و فہمیدہ علماء و زعماء کی جانب سے رد کی جائے اس سے کہ وہ ملاءِ عام میں ان حضرات کی نسبت اپنے خیالات کا علانیہ اظہار کرے۔ یہ اور بات ہے لیکن واقعیت و حقیقت کے لحاظ سے جو کچھ یہ جماعت سمجھتی ہے اور کہنا جائز سمجھتی ہے اس کو دنیا جانتی ہے۔ وہ کبھی ان حضرات کی نسبت کسی اپنے خیال کا اظہار کرتے وقت

یہ کہتے نہیں جھجکے گی کہ ہمارا مقصد وہی ہے اور کچھ نہیں۔ اسے نئے بنانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ ان پرانے اشخاص کی نسبت جو کچھ عقیدہ رکھتی ہے اس کا اظہار بھی جائز سمجھتی ہے۔

اور یہ جماعت جب سے دنیا میں پیدا ہوئی اگرچہ اس کے فنا کی تدبیریں کوئی بھی اٹھا نہیں رکھی گئیں مگر اس کی مردم شماری میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اس وقت تمام دنیا کے طول و عرض میں ہر اقلیم اور ہر ملک میں اس کے نام لیوا موجود ہیں۔ اس کی سلطنتیں قائم ہوئیں، مٹیں اور پھر ان کی بنیاد پڑی اور اس وقت بھی اس کی خود مختار سلطنتیں، حکومتیں اور اجتماعی مراکز موجود ہیں۔

پھر کیا اگر اس جماعت کے وجود کی بنا پر حضرت علیؑ کے فضائل حضرت رسول اکرمؐ کو بیان کرنے کی ضرورت تھی تو اس جماعت کے وجود کی بنا پر دوسرے حضرات کے فضائل اگر ان کی کچھ اصلیت ہوتی تو اور زیادہ شد و مد کے ساتھ حضرت رسول اکرمؐ کو بیان نہ کرنا چاہیے تھے۔ اور کیا بیان نہ کرنے کی صورت میں اس جماعت کی گمراہی کی ذمہ داری حضرت کی طرف عائد نہیں ہو سکتی؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ توجیہ و تاویل بالکل بادر ہوا ہے۔ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حقیقت کے ترجمان اور واقعیت کے مفسر تھے۔ انھوں نے جس کے جتنے مراتب تھے، اتنے بیان فرما دیے۔ اس میں نہ کسی حکمتِ عملی کا دخل تھا نہ کسی پیش بندی کا اہتمام۔

آپ نے تو صحابہ میں سے ایسے ایسے افراد کے فضائل بیان فرمائے جنہیں مذہبی حیثیت سے کوئی منصب و عہدہ حاصل نہیں ہے اور نہ ان کی ذات کسی حیثیت سے بھی متنازع فیہ ہے۔ جیسے حضرت سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد، عمار ابن یاسر، خزیمہ بن ثابت، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، حذیفہ بن الیمان وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد اگر کچھ اشخاص کے فضائل آپ نے بالکل بیان

نہیں فرمائے تو ایک بے غرض انسان تو یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ دفترِ فضیلت سادہ تھا اور ورق منقبت میں کوئی حرف بھی نہ تھا، ورنہ عادل و منصف، بے لوث اور بے غرض پیغمبرؐ اس کے اظہار میں بُخل ہرگز نہ کرتا۔

⁂

حضرت علیؑ کے فضائل کی اہمیت اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب انسان اس ماحول پر نگاہ ڈالتا ہے جو اُن فضائل کے بالکل فنا کر دینے کا ضامن تھا۔

دو چار برس کی مدت نہیں ایک صدی کے قریب زمانہ اس حالت میں گزرا کہ علیؑ کا نام زبان پر لانا جرم تھا آپ کی فضیلت کا بیان کرنا ناقابلِ معافی گناہ۔

ابوالحسن مدائنی نے کتاب الاحداث میں اس حالت کی تصویر خوب کھینچی ہے جسے ابن ابی الحدید معتزلی نے شرح نہج البلاغہ میں درج کیا ہے۔ اور میں نے اپنے رسالہ "حسینؑ اور اسلام"[1] میں اس کے اقتباسات درج کیے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمام عمال حکومت کو قطعی حکم دے دیا گیا تھا کہ جو کوئی علیؑ کی کوئی فضیلت بیان کرے اس کا جان و مال مباح ہے۔

انتہا یہ ہے کہ لوگ حضرتؑ سے نقل حدیث کرتے وقت آپ کا نام لیتے ڈرتے تھے جس کا ثبوت حسن بصری کی روایت سے ملتا ہے۔ جس میں درج ہے کہ کسی ان کے شاگردِ خاص نے ان سے پوچھا کہ آپ نے رسالت مآبؐ کی زیارت تو کی نہیں ہے مگر آپ احادیث میں قال رسول اللہؐ بلا تکلف کہہ دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا "تم نے مجھ سے وہ بات پوچھی ہے جو آج تک کسی نے نہ پوچھی تھی اور اگر تم کو مجھ سے یہ خصوصیت نہ حاصل ہوتی تو میں ہرگز تم کو نہ بتلاتا اِنّی فی زمان کما تری کل شیٔ سمعتنی اقولہ قال رسول اللہ فھو

---

[1] شائع کردہ امامیہ مشن پاکستان لاہور

عن علی بن ابی طالب غبرانی فی زمان لا استطیع ان اذکر علیا۔

"میں ایک ایسے زمانہ میں ہوں جیسے تم دیکھ رہے ہو، جو کچھ تم مجھ سے سنو کہ میں قال رسول اللہؐ کہہ کر بیان کرتا ہوں وہ درحقیقت میں نے علیؑ ابن ابی طالبؑ سے سنا ہے۔ مگر زمانہ ایسا ہے کہ میں علیؑ کا نام نہیں لے سکتا۔" (لمعات فریدہ مصنفہ علامہ ابراہیم رادی رفاعی مطبوعہ بغداد صـ۸۳)

اس کے برخلاف دوسرے صحابہ کے فضائل میں روایت بیان کرنیوالے کو انعامات دیے جاتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کثیر التعداد موضوع روایتیں صحابہ کے فضائل میں تصنیف ہو گئیں۔ ابوالحسن مدائنی کی محولہ بالا عبارت میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس صورتِ حال کی بناء پر ایک طرف تو ان حضرات کے فضائل کی ذرا ذہور جو روایتیں تھیں وہ بھی ایک غیر جانبدار انسان کے نقطۂ نگاہ سے مشکوک ہو گئیں۔ کہ کہیں یہ اسی ٹکسال کی بنی ہوئی نہ ہوں جو حکومت وقت کی طرف سے روایتوں کے ڈھلنے کے لیے قائم ہوا تھا۔ اور دوسری طرف فضائل حضرت علیؑ کی امتیازی شان دوبالا ہو گئی کہ ان کے تواتر اور قطعیت کا وہ بے پناہ سیلاب تھا جو حکومتِ وقت کی انتہائی جدوجہد کے ساتھ رک نہ سکا، اور اس طرح دنیا میں پھیلا کہ اموی سلطنتیں اور ان کی وضع کردہ روایتیں فنا ہو گئیں لیکن ان فضائل سے تمام اسلامی کتب احادیث و تواریخ کے دامن چھلک رہے ہیں۔ بے شک ؎

کتاب فضلِ علیؑ را کم است آبِ بحار
کہ تر کنم سرِ انگشت و صفحہ بشمارم

بحث کے بہت سے پہلو باقی ہیں۔ جن پر تبصرہ پھر کبھی۔

والسلام"

مسئلہ خلافت و امامت

ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

مسئلہ خلافت[1] و امامت

ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

⁂

"کاوش تحقیق" فطرت کا سرمایہ ہے۔ جو بعض دماغوں میں خصوصیت کے ساتھ ودیعت کر دیا گیا ہوتا ہے۔ وہ انسان کو کبھی کبھی بحث و نظر کے ایسے خشک و ناہموار راستوں پر پہنچا دیتا ہے جن کے تصور سے بھی وہ افراد جو صرف "دماغی عیاشی" کا ذوق رکھتے ہوں کانوں پر ہاتھ رکھنے لگیں۔

بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ "نگار" کے صفحات پر "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" تذکروں کے بجائے ایک وقت میں مسئلہ "خلافت و امامت" کے سے "دقیانوسی" مسئلہ کو چھیڑا جائے گا۔ اور اتنی دلچسپی کے ساتھ کہ اس کا سلسلہ دو برس کے قریب عرصہ تک قائم رہے اور پھر جنوری کے مخصوص نمبر کا ایک اچھا خاصہ حصہ اس کی نذر کر دیا جائے۔

لطف یہ ہے کہ اس "سازِ بے آہنگ" کے چھیڑنے والے ایک غیر متعلق شخص متنازع فیہ مسئلہ کے ساتھ دور کا بھی رشتہ نہ رکھنے والے کوئی "ہرنام" صاحب ہیں جو اقراری "ہندو" ہیں، جس کے بعد ان کی نسبت کچھ اور خیال کرنے کی ضرورت نہیں اور جبکہ اسلام کی تعلیم بھی یہ ہے کہ "ما قال" کو دیکھو "من قال" پر نظر نہ ڈالو۔

"ہرنام" صاحب نے شروع شروع یہ بحث صرف "تاریخی حیثیت" تک محدود رکھی تھی، اور اعتقادی پہلوؤں پر کوئی توجہ نہیں کی تھی جس کا بقول ان کے ایک

---

[1] نگار جنوری نمبر ۱۹۳۷ء

غیر مسلم شخص کو حق بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس بحث پر شیعی جماعت کے ذمہ دار حلقوں کی طرف سے خاموشی ہی مناسب تھی کیونکہ تاریخی بحث میں مذہبی جانبداری کا پہلو پیدا ہوجانا واقعات کی بے لاگ سراغ رسانی پر مضر اثر ڈالتا ہے۔

اس سے بڑھ کر بے لوث تحقیقات کیا ہو سکتی ہے کہ تحقیق کرنے والا ایک غیر مسلم انسان "ہندو" اور فیصلہ کرنے والی ذات مدیر نگار کی سی ہو (بقول خود) اصل مذہب کی ضرورت ہی کو مشکوک نگاہ سے دیکھنے لگی ہو۔

جہاں تک تاریخی بحث کا تعلق ہے معاملہ ختم ہو گیا اور محترم مدیر نگار نے جیسا کہ "ہر نام صاحب" نے اپنے آخری مضمون میں نگار کے تائیدی سکوت کے ساتھ اظہار فرمایا ہے اس بحث کا آخری فیصلہ شیعوں کے حق میں کر دیا۔ یعنی انہوں نے تمام واقعات کی صحت کو تسلیم فرماتے ہوئے ان کا نتیجہ یہی قرار دیا کہ حضرت رسولِ اکرمؐ حضرت علیؑ ہی کا خلیفہ و جانشین ہونا پسند فرماتے تھے۔ اور آپ نے اس کا بار بار اظہار بھی فرمایا۔

مگر آپ نے اپنے محاکمہ کے دامن دار اطراف میں کچھ ایسے مسائل کو بھی چھیڑ دیا، جو خالص اعتقادی حیثیت رکھتے ہیں اور مارچ ۳۶ء کے پرچہ میں اسی محاکمہ کے پیش کردہ نتائج کی روشنی میں آپ نے چند سوالات بھی مرتب فرما کر شائع کیے جن کے جواب کے لیے آپ نے ہر دو مذاہب کے علماء و اہلِ نظر کو دعوت دی۔

ہر نام صاحب نے بھی "محاکمہ" کو دیکھنے کے بعد اپنا جو آخری بیان شائع کیا، اس میدانِ بحث اور محاذ گفتگو بدل جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کنارہ کشی کا اظہار کیا اور اب اس بحث کے لیے خاص شیعی جماعت کے ارباب علم سے تحریک کی کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کریں۔ جناب نیاز نے بھی اس مضمون کی تائید میں "ہر دو مذاہب" کے بجائے خصوصیت سے "شیعی علماء" کی جانب دعوت کا رُخ پھیر دیا۔ اور نگار کے جنوری نمبر کے اعلان میں یہ جملہ بھی شائع کر دیا کہ "مسئلہ خلافت پر ایک بسیط مضمون شائع کیا

جائے گا جو شیعی نقطۂ نظر سے آخری حرف ہوگا۔" میں نہیں کہہ سکتا کہ شیعی علماء کے طبقہ میں اس دعوت پر توجہ کیوں نہیں کی گئی؟

ممکن ہے اس کا سبب مدیر نگار کی طرف سے "مایوسی" ہو جیسا کہ مدرسۃ الواعظین کے اخبار "الواعظ" کی متعدد اشاعتوں میں ایک طویل مقالہ شائع ہوا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ مدیر نگار سنّی ہیں اور انہوں نے جتنے سوالات قائم کیے ہیں وہ صرف سنّیوں کی حمایت کے لیے۔

میں کم از کم اپنی "وسعتِ خیال" کے حدود میں جہاں تک مدیر نگار کے رویّہ پر غور کرتا ہوں مجھے اس "سوءظن" کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی اور بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو سوال کرنے والے کی نیّت سے جواب دینے والے کی زبان پر تو گرہ نہیں لگ سکتی۔ اُسے بہرحال اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کا موقع ہے۔ اور سوال کو بیانِ حقیقت کا پیش خیمہ قرار دینے کا حق ہے۔

بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ نگار میں اس مسئلہ کا اٹھایا جانا ایک تجارت ہے اور صرف پرچہ کی گرم بازاری میں اضافہ منظور ہے۔ ان اصحاب کا جواب بھی میری طرف سے یہی ہے کہ اگر کسی کی ذاتی تجارت کے سلسلہ میں کسی اہم مسئلہ کی تحقیق کا فرض انجام پا جائے تو کیا بُرا ہے؟

بہرحال یہ دیکھ کر کہ نگار کے سوالات تشنۂ جوابات ہیں اور ان کی تحقیق ہر حقیقت پرور انسان کا فرض ہے، میں نے اس مضمون کی داغ بیل ڈالی ہے۔

مجھے اپنے بے نیاز القاب کرم فرما جناب نیازؔ سے بھی یہ نیازمندانہ گذارش کرنا ہے کہ جہاں تک بحث کا صرف تاریخی پہلو تھا جناب کی غیر جانبدارانہ حیثیت مسلّم اور آپ کا بحیثیت حکم فیصلہ قابلِ قبول۔ لیکن اب اس بحث نے جو صورت اختیار کر لی ہے وہ مذہبی و اعتقادی ہے، جس کے دلائل و اصول کا بہت کچھ تعلق مابعد الطبیعاتی مبادی

کے ساتھ ہے۔ جن میں آپ خود مخصوص نظریات و معتقدات کے حامل ہیں جو اکثر و بیشتر عام مسلمانوں کے خلاف ہیں۔ اور ان اصول و نظریات کے ماتحت خود آپ اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان ایک محاذ اختلاف قائم ہے۔

اگر آپ نے اس بحث کا فیصلہ اپنے اصول کی بنیاد پر کرنا چاہا تو یہ ہرگز ایک غیر جانبدار حکم کا فیصلہ قرار نہیں پا سکے گا۔ بے شک اگر اس بحث کا بحیثیت حکم فیصلہ کرنا ہے تو ضرورت ہے کہ مراحل ابتدائی میں آپ انہیں اصول کو پیش نظر رکھیے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ اور مسلّمہ ہیں اور جن میں شیعہ و سنّی کی تفریق نہیں ہے اور ان "اصول موضوعہ" کو پیش نظر رکھ کر یہ دیکھیے کہ کون فریق ٹھیک کہہ رہا ہے۔

درصورتیکہ آپ اُن مبادی و اصول سے الگ ہو کر خود اپنے معتقدات کے اوپر بحث کرنا چاہتے ہیں تو اسے محاکمہ کا درجہ عطا نہیں کیا جا سکے گا۔ بلکہ ایک فریق بن کر دلائل کے ذریعہ سے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کا فرض ادا ہوگا جو ہر انسان کا حق ہے۔

سوالات کی تقسیم

جہاں تک سوالات کا تعلق ہے میں ان کو تین حصّوں میں منقسم کر سکتا ہوں:۔

۱۔ مسئلۂ خلافت کے مبادی و مقدمات۔
۲۔ نفسِ مسئلۂ خلافت
۳۔ مسئلۂ خلافت کے فروع و جزئیات۔

پہلی قسم میں حسب ذیل سوالات مندرج ہیں:۔

۱۔ عصمت و عقّت کا مفہوم کیا ہے، گناہ و خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش و نسیان اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے

کافی ہے تو کیوں ؟

۲۔ انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں ؟

ان سوالوں کو میں نے مسئلۂ خلافت کے مبادی میں اس لیے قرار دیا ہے کہ درحقیقت ان سوالوں کی بنیاد یوں ہی پڑی ہے۔ کہ خلافت جناب امیرؑ کے متعلق حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اظہارات و اعلانات سے استدلال پیش کیا گیا تھا، جس کو اصل حقیقت کے اعتبار سے جناب مدیر نگار نے تسلیم فرمایا لیکن آنحضرتؐ کے اعلانات کو حضرت علیؑ کے ثبوت حق خلافت کے لیے کافی قرار دینے میں اس بناء پر عذر فرمایا کہ خود رسولؐ سے بھی خطاء اجتہادی ممکن ہے اور اس لیے آپ نے جو اعلان فرمایا ممکن ہے وہ آپ کی ذاتی رائے کی بناء پر ہو۔ لیکن درحقیقت مسلمانوں کے لیے مفید و نتیجہ خیز نہ ہو۔ اس لیے مسلمانوں کا اس پر عمل نہ کرنا حق بجانب قرار پائے۔

اب اگر رسولؐ سے کلیتہً یا بالخصوص اس مسئلہ میں خطائے اجتہادی کا امکان غلط قرار پا جائے تو حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل کا ثبوت بلا کسی دغدغہ کے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیگا۔

دوسری قسم میں حسب ذیل سوالات ہیں :۔

۱۔ وصایت جناب امیرؑ ثابت کرنے کے لیے حضرات شیعہ کیا نصوص قطعیہ پیش کرتے ہیں۔

۲۔ مسئلۂ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے ؟

۳۔ اسلام نے ہیئت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی ایک خاندان کے لیے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

۴۔ ہر دو فریق کی روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں؟ اگر پڑا تو کیا؟

چوتھے سوال کو نفس مسئلہ خلافت سے متعلق میں نے اس لیے قرار دیا کہ خود انہیں روایات میں جو مسئلہ وصایت کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں یہ شبہ پیدا ہونے کا امکان ہے کہ ان پر سیاسی ماحول کا کچھ اثر پڑا ہے یا نہیں اور اس لیے وہ معتبر سمجھی جا سکتی ہیں یا نہیں؟

تیسری قسم میں ذیل کے سوالات داخل ہیں :۔

۱۔ کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے۔ اگر تھے تو اس کا کیا ثبوت ہے؟

۲۔ قیام امامت کی ضرورت کیا ہے؟ اور صرف اہل بیتؑ میں اس سلسلہ کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے؟

۳۔ امامت کے بارھویں امام پر ختم ہو جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟

۴۔ جو سلسلۂ امامت دوسرے شیعی فرقوں کے نزدیک صحیح ہے اس کو غلط قرار دینے کے لیے اثنا عشری جماعت کیا دلائل اپنے پاس رکھتی ہے؟

۵۔ امام مستور یا مہدیٔ موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہہ۔

میں نے ان سوالوں کو مسئلۂ خلافت کے فروع و جزئیات میں اس لیے مندرج کیا ہے کہ اصل بحث جیسا کہ ہرنام صاحب کے افتتاحی مضمون سے ظاہر ہے اور جس کا "ہرنام" نے برقی صاحب کے جواب میں صراحتًہ اظہار بھی کیا ہے صرف حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل کے متعلق ہے۔ یعنی سوال یہ درپیش ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت کا جانشین کس کو تسلیم کیا جائے؟

اور اس لیے "مسئلۂ خلافت و امامت" میں درحقیقت اسی کو یکسوئی کے ساتھ طے کرنا چاہیے۔

حضرت علیؑ کے بعد پھر یہ سلسلہ کس طرح چلے؟ خلافت کو حسنی شاخ میں تسلیم کیا جائے یا حسینی شاخ میں ؟

اس سلسلہ کو بارہ کی تعداد پر ختم ہو جانا چاہیے یا نہیں ؟

وجودِ امام سے کسی زمانہ کو خالی سمجھا جائے یا نہیں ؟

بارھویں نمبر پر حضرت امام مستور یا مہدیٔ موعود کو تسلیم کیا جائے یا نہیں؛ یہ تمام باتیں خارج از مبحث قرار پاتی ہیں۔

حضرت علیؑ کی خلافت کے مسئلہ میں جہاں محاذ اختلاف صرف "شیعہ اور سنی" کے درمیان ہے ایسے مباحث کا چھیڑ دیا جانا جن میں محاذِ اختلاف بالکل جدا گانہ ہو جاتا ہے سلسلۂ گفتگو کو "ژولیدہ" اور بحث کو پریشان بنانے کا باعث ہے جو معاملہ فہمی کے خلاف ہے۔

فرض کیجیے کہ کوئی "آزاد خیال مفکر" حضرت رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ کو خلیفۂ بلا فصل تسلیم کرتا ہے لیکن پھر بھی ان تمام معتقدات کو تسلیم نہیں کرتا جو اثنا عشری جماعت نے مذہبی حیثیت سے ضروری قرار دیے ہیں تو کیا ایسے شخص کے عقل و دماغ پر پہرہ بٹھایا جا سکتا ہے۔ اور اسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت علیؑ کو خلیفۂ بلا فصل تسلیم کرے تو بس آخر تک اس سلسلہ کو اسی طرح سے صحیح سمجھ لے جو اثنا عشری جماعت نے قائم کیا ہے جب ایسا نہیں تو حضرت علیؑ کی خلافت ایسے صاف اور واضح مسئلہ میں کیوں ان غیر متعلق باتوں کو چھیڑ کر بحث کو پراگندہ بنایا جائے؟

اس لیے میں اپنے زیر تحریر مقالہ میں ہرگز اس "خطاء اجتہادی" کے ارتکاب پر آمادہ نہیں ہوں۔ میرا جواب صرف پہلی دو قسم کے سوالات سے متعلق ہوگا۔ اور آخری قسم کے سوالات کی بحث کو اس وقت کے لیے اٹھا رکھا جائے گا۔ جب حضرت علیؑ کی خلافت کا مسئلہ بالکل طے ہو جائے۔ پھر میں خود اپنے مقام پر سنجیدگی کے ساتھ غور کروں گا

کہ اس سلسلہ کو آگے کس طرح بڑھایا جائے ؟

پہلا سوال

عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے ؟ گناہ اور خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اور اگر لغزش و نسیان، اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں ؟

"عصمت" کے لغوی معنی تو "حفاظت" کے ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے علمِ کلام کی اصطلاح میں انبیاء و ائمہ کے لیے اس کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک خاص طرح کی نفسانی کمزوریوں سے لازمی طور پر ان کے محفوظ ہونے کے معنی ہیں۔

چونکہ "حفاظت" کے معنی خود "متعلق" کے طالب ہیں یعنی کس شے سے حفاظت؟ اس لیے اس کے مفہوم اصطلاحی میں قیود عائد کرنا یعنی ان نفسانی کمزوریوں کی حد مقرر کرنا جن سے انبیاء و ائمہ کو لازمی طور پر محفوظ ہونا چاہیے خود عقلی بحث کا تابع ہے یعنی یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کون کون باتیں ایک نبی و امام کی شانِ نبوت و امامت کے خلاف اور اس مقصد کے منافی ہیں جس کے لیے نبی و امام کا تقرر ہوتا ہے۔ بس انہیں تمام باتوں سے حفاظت "عصمت" کے اس مفہوم کی تشکیل کرے گی جو اصطلاحی حیثیت سے نبی و امام کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

رہ گئی "عفت" اس کے معنی "پرہیزگاری" اور "پارسائی" کے ہیں اور وہ علمِ اخلاق کی اصطلاح میں قوتِ شہویہ کے اعتدال کا نام ہے۔ جو اپنے مکمل معیار کی حیثیت سے "عصمت" کا ایک شعبہ قرار پا سکتا ہے اس کی پوری تفسیر نہیں جیسا کہ سوال کے الفا
سے ظاہر ہوتا ہے۔

"گناہ" اور "خطا" میں بے شک فرق ہے یعنی "گناہ" میں ارادہ اور ضمیر کا تعلق ضرور ہے لیکن "خطا" لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کو بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ عصمت جو نبی و امام کے لیے عقلی فیصلہ کی بناء پر ضروری ہے وہ صرف "گناہ" سے عصمت ہے یا "غلطی اور بھول چوک" سے عصمت بھی ضروری ہے۔ اسی بنا پر سوال کے ان الفاظ سے مجھے اختلاف ہے کہ اگر "لغزش و نسیان اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں؟ اس لیے کہ لغزش و نسیان صرف انبیاء و ائمہ کو نہیں بلکہ ہر شخص کو ایک حد تک غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے یعنی یہ کہ وہ "معصوم عن الخطا" نہیں ہیں اور ایک حد تک یقیناً غیر معصوم بنانے کے لیے ناکافی ہے۔ یعنی لغزش و نسیان کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ وہ "معصوم عن الذنب" بھی نہ ہوں لہٰذا سوال کے الفاظ یوں ہوتے تو بہتر تھا کہ اگر لغزش و نسیان اجتہادی غلطی سے بھی انبیاء و ائمہ کو معصوم ہونے کی ضرورت ہے تو کیوں؟ اس طرح بحث اپنے اس راستہ پر آجائے گی جو اس کے لیے ہونا چاہیئے۔

مگر اس صورت میں سوال نمبر ۲ کے ساتھ اس سوال کا کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ اور اس لیے ان دونوں سوالوں کا الگ الگ مقرر کیا جانا صرف مجیب کی نکتہ رسی کا امتحان ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

بہرحال موجودہ صورت میں جبکہ سوال نمبر ۲ بھی موجود ہے جس میں مجھ کو انبیاء و ائمہ کے غلطی یا لغزش سے پاک ہونے کے دلائل لکھنا ضروری ہیں، میں اس سوال کے جواب میں گناہ اور خطا دونوں سے انبیاء کی عصمت کے مفہوم کو واضح کرنے پر اکتفاء کروں گا اور دوسرے جزو کو "یعنی یہ ضروری ہے تو کیوں؟" دوسرے سوال کے جواب کے لیے اٹھا رکھوں گا۔

اس کے لیے سب سے پہلے جناب نیاز کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جو آپ

نے اسلام کے پیش کردہ معیارِ نبوت کے متعلق اپنے محاکمہ (نگار فروری ۱۹۳۶ء) میں تحریر فرمائی ہے۔ پھر اس پر ضروری تبصرہ کروں گا۔

آپ تحریر فرماتے ہیں: —

> انسان کو دیگر مخلوقات کے لحاظ سے اشرف المخلوقات صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کو عقل و فراست عطا ہوئی ہے۔ اور وہ اپنے جذباتِ حیوانی سے مغلوب نہیں ہو سکتا، اگر وہ چاہے بالکل اسی طرح ایک نبی دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں صرف یہ شرف رکھتا ہے کہ اس میں وہ تمام قوتیں جو ایک انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہیں زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور وہ باوجود تمام جذباتِ حیوانی رکھنے کے ان کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہے۔
>
> ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو حد درجہ مسکین و غریب ہے، جو کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا۔ جو ہر شخص کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے۔ اور ہم اسکی صلاحیتِ نفس کی تعریف کرتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ وہ غیر معمولی ضبط سے کام لے کر اپنے جذباتِ حیوانی پر قابو رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ قدرتاً وہ حد درجہ بے حس واقع ہوا ہے تو ہم بجائے تعریف کرنے کے اس کو بزدل بے غیرت کہیں گے۔
>
> ایک شخص حد درجہ عفت مآب و پاکباز ہے اور ہم اس کے ضبطِ نفس کی تعریف کرتے ہیں لیکن اگر ہم یہ جان جائیں کہ اس میں قدرت کی طرف سے یہ مادہ ہی نہیں پایا جاتا اور وہ فطرتاً ناکارہ پیدا ہوا ہے تو پھر ہم بجائے تعریف کے اس کی حقارت کرنے لگتے ہیں۔ الغرض ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے وہ جھوٹ بول سکتا ہو، لیکن نہ بولے، وہ غصہ کر سکتا ہو لیکن نہ کرے، ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو لیکن

نہ ہو۔ اسی پر ایک نبی کے خصوصیات کا زیادہ وسیع پیمانہ پر قیاس کر لیجیۓ۔

اگر ہم یہ مان لیں کہ نبی فطرۃً معصوم پیدا ہوا ہے تو اس کی عصمت کوئی قابلِ تعریف بات نہیں، اگر وہ غیب کی باتیں جان لیتا ہے تو اس کی فراستُ پیش بینی بے معنی ہے، اگر فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں تو اس کامیابیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اگر اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی تو اس کی سلامت روی ہیچ ہے۔ ایک نبی کو دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں امتیاز اگر حاصل ہے تو صرف یہ کہ باوجود ان تمام جذبات رکھنے کے جو تمام لوگوں میں پائے جاتے ہیں ان کے ضبط پر دوسرے انسانوں سے زیادہ قادر ہے۔ اور وہ دوسرے انسانوں کی طرح سوچتا ہے لیکن بہت غائر نگاہ سے، وہ مخالف اور مقابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن بہت کم، وہ کسی غایت تک پہنچنے کے لیے ان ہی اسباب و دلائل کو سامنے رکھتا ہے جو دوسروں کے سامنے ہیں اور اکثر صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے۔

الغرض وہ ہماری طرح ایک انسان ہے۔ لیکن بلندترین سطح کا، اور انسانی فراست سے جو غلطی یا لغزش اس دنیا میں ہو سکتی ہے وہ اس سے بھی ممکن ہے، لیکن بہت کم۔ وہ اپنی نیت کے لحاظ سے اپنے مقاصد کے نقطۂ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان ہے لیکن اپنی تدابیر اپنی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کاروبارِ عالم میں وہ کبھی کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے، اور یہی وہ مفہوم نبوت کا تھا جسے سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا، اور جس کو سامنے رکھ کر ہم رسول اللہؐ کی غیر معمولی عظمت تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں

ممکن ہے مسلمانوں کی جماعت نبوّت کے اس مفہوم کو سن کر متعجب ہو، علی الخصوص حضرات شیعہ جو نہ صرف رسول اللہؐ بلکہ اہل بیتؑ کے تمام

افراد کو معصوم جانتے ہیں لیکن کیا کیا جائے کلامِ پاک سے نبوّت کا مفہوم میری سمجھ میں یہی آتا ہے اور اس سے ہٹ کر "پیدائشی معصومیت" سے نبی کو متصف کرنا میرے نزدیک منصبِ نبوّت کی توہین کرنا ہے۔

نبی آخرالزماںؐ سے قبل نبوّت کا جو مفہوم لوگوں کے ذہن نشین تھا، وہ یہ تھا کہ "رسول" نوعِ انسانی سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ اور اس کا تعلق فرشتوں سے ہے۔ اس کی تردید رسول اللہؐ کی زبان سے یوں کی گئی:۔

"قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يمشون مُطْمَئِنِّين لَنَزَّلْنَا عليهم من السماء ملكا رسولا" (سورہ بنی اسرائیل آیت (۹۵) یعنی اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتوں کی آبادی ہوتی تو ہم کسی فرشتہ ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔

اسی طرح سورۂ کہف (آیت ۱۱۰) میں رسول اللہؐ کی انسانی حیثیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

"قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ واحد" یعنی اے رسولؐ کہہ دے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں، اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ خدا مجھے تمھیں وحدانیت کی تعلیم دینے کی ہدایت کرتا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۹۳ میں "هل كنت إلّا بشرًا رسولا" کہہ کر اس کی اور زیادہ وضاحت کر دی جاتی ہے۔

تقریباً ایک صفحہ کی عبارت کے بعد جو غیب دانی کے مسئلہ سے متعلق ہے اور اس لیے ہماری بحث سے خارج، تحریر ہوتا ہے:۔

نبی کے متعلق یہ بھی عام اعتقاد پایا جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد

نہیں ہو سکتی یا یہ کہ وہ خطا و نسیان سے مبرا ہے لیکن کلام مجید سے اس کی بھی تردید ہوتی ہے۔

سورۂ سبا کی آیت ۴۹ میں رسول اللہؐ سے ارشاد ہوتا ہے۔ "قل ان ضللت فانّما اضل علی نفسی وان اھتدیت فبما یوحی الیّ ربّی انّہ سمیع قریب" (یعنی کہ دو کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوتی ہے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں، اور اگر سیدھی راہ اختیار کرتا ہوں تو وہ خدا کی ہدایت ہے)

سورۂ مومن آیت ۵۵ میں ایک جگہ رسول اللہؐ سے خطاب کیا گیا ہے کہ "استغفر لذنبک وسبّح بحمد ربّک" (اپنی غلطی سے توبہ کر اور خدا کی حمد بیان کر)

سورۂ محمدؐ آیت ۱۹ میں پھر "واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمؤمنات" کے الفاظ ارشاد ہوتے ہیں۔

سورۂ فتح کی آیت ۱، ۲ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"اِنّا فتحنا لک فتحاً مبینا لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک"

یہاں بھی وہی لفظ "ذنب" موجود ہے۔

ایک بار رسول اللہؐ نے کسی اندھے کی بات نہ سنی اور اس سے منہ پھیر لیا، اس پر آپؐ کو اس طرح تنبیہ کی گئی: "عبس وتولّیٰ، ان جاءہ الاعمیٰ" سورۂ عبس آیت ۱، ۲، ۳۔

سورۂ برأت (آیت ۴۳) میں رسول اللہؐ سے مطالبہ کیا جاتا ہے، کہ "عفا اللہ عنک لم اذنت لھم حتی یتبین لک الذین صدقوا وتعلم الکاذبین" کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے بعض

جنگوں میں رسول اللہ ؐ کا ساتھ نہ دیا تھا، لیکن رسول اللہ ؐ نے ان کو بھی شمولِ جنگ کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ سے کہا گیا کہ "جب تک سچے جھوٹوں کی تفریق نہ ہوئی تھی، کیوں انہیں اجازت دی گئی"۔ سورۂ انعام کی آیت ۶۸ سے یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سے وہ نسیان بھی سرزد ہو سکتا تھا جسے عام طور پر شیطان سے منسوب کیا جاتا ہے۔

آیات مذکورہ بالا کے مطالعہ سے دو باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ؐ کی ذات لغزش، غلطی، نسیان یا بھول چوک سے مستثنیٰ نہ تھی اور دوسرے یہ کہ آپ کو آیندہ کا کوئی حال معلوم نہ تھا۔ ممکن ہے بعض حضرات اسے منصبِ نبوت کی توہین سمجھیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ ؐ کی حقیقی عظمت و جلالت صرف اسی طرح ثابت ہو سکتی ہے کہ پہلے ان کو ایک انسان اور پھر نبی سمجھا جائے۔

میں کبھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ ؐ کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے، کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادے اور خرابیٔ ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے، ایک رسول کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے۔ یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ کی ذات مرکز تھی روحانی و مذہبی تعلیم کی بھی اور سیاسی رہنمائی کی بھی، یا بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ جس حد تک مذہب کا تعلق تھا آپ ؐ کی ہر تعلیم وحی و الہام کے ماتحت ہوتی تھی اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا، لیکن آپ کی سیاسی زندگی میں اس کا امکان تھا کہ آپ سے کبھی کوئی

فروگذاشت ہو جائے یا کوئی فیصلہ آپ ایسا کریں جو مناسب نہ ہو۔"

یہ عبارت تمام و کمال بغیر اندیشۂ طول کلام کے اس لیے نقل کی گئی کہ اس کے تمام اجزاء، قارئین کرام کے پیش نظر رہیں۔ کوئی اور ہوتا تو اسے خود نگار کے لیے مضمون لکھنے کے سلسلہ میں اس امر میں پس و پیش ہوتا کہ وہ خود جناب نیاز کے فیصلہ ہی کو محل بحث قرار دے کر نقد و تبصرہ سے کام لے۔ لیکن چونکہ میں ممدوح کی وسیع الخیالی کا دل سے معتقد ہو چکا ہوں اور دیکھ چکا ہوں کہ انہوں نے ہر نام کے آخری مضمون کو جس میں محاکمہ کے بعض اجزاء کی تردید بھی کی گئی تھی بغیر کسی "ناگواری" کے جو "تنگ ظرف" افراد کا شیوہ ہے اور بلا کسی اظہار اختلاف کے بلکہ ایک طرح کی تائیدی نوٹ کے ساتھ شائع کر دیا اور پھر جبکہ میں دیکھتا ہوں کہ ممدوح نے محاکمہ میں ان خیالات کے اظہار کے بعد پھر اپنے سوال میں اس مسئلہ کو زیر بحث قرار دیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اہل نظر کو خود اپنے خیالات کے نقد و موازنہ کا موقع دے رہے ہیں۔ اس لیے ہرگز مجھے کوئی پس و پیش نہیں ہے۔ اس میں کہ خود جناب نیاز کے رسالہ میں ان خیالات پر نکتہ گرفتیں کروں کیونکہ جو شخص ایک نبی و رسول کی ذات کو خطا اجتہادی سے مستثنیٰ نہیں سمجھتا وہ اپنی ذات کے لیے اس سے مستثنیٰ ہونے کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

جہاں تک عبارت کے ابتدائی حصہ کا تعلق ہے، یہ کہ "عصمت" "سلب اختیارات" کا نام نہیں ہے اور نہ قوائے معصیت کے مفقود ہونے کا، بلکہ یہی کہ باوجود تمام جذبات حیوانی کے ان کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہو۔ اور ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے۔

یہ ایسی بات ہے جس سے سنجیدہ اور محقق علمائے اسلام و متکلمین شیعہ کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور عصمت کا یہی مفہوم ہے جس کے لحاظ سے وہ ایک نبی و امام کے لیے معصوم ہونا ضروری سمجھتے ہیں اور اسی لیے ان کا قول ہے کہ نبی و امام فرشتوں

سے افضل ہوتا ہے۔ کہ فرشتہ (وہ کوئی وجود حقیقی رکھتا ہو یا نہیں لیکن جو مفہوم اس کا قرار دیا گیا ہے اس کے لحاظ سے) وہ مخلوق ہے جس میں قوائے معصیت خلق ہی نہیں ہوتے اس لیے وہ اگر گناہ نہیں کرتا تو کوئی قابلِ تعریف بات نہیں، لیکن معصوم باوجود گناہ کی تمام قوتیں رکھنے کے پھر بھی گناہ نہیں کرتا، اس لیے وہ فرشتہ کے درجہ سے بلند درجہ رکھتا ہے اس کا نتیجہ وہی ہوا جو مدیر نگار نے بایں الفاظ تحریر فرمایا ہے۔ کہ:۔

> "پیدائشی معصومیت سے نبی کو متصف کرنا میرے نزدیک منصبِ نبوت کی توہین کرنا ہے۔"

اس خیال میں کوئی ایسی ندرت نہیں ہے جس کو سُن کر مسلمانوں کی جماعت اور علی الخصوص شیعہ متعجب ہوں۔ سند کے لیے بطور ایک ذمہ دارانہ تصدیق کے جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی صاحب قبلہ کی عبارت نقل کی جاتی ہے، جو "زندگی کا حکیمانہ تصوّر" شائع کردہ "امامیہ مشن" لکھنؤ کے صفحہ ۳۸ اور ۴۰ پر مندرج ہے اس میں صاف صاف اسی نظریہ کی تلقین موجود ہے۔

> "خود اختیاری حیثیت سے علمی و عملی ترقی کرنا یہ انسان کا جوہرِ خاص ہے — یہی وہ چیز ہے کہ جس نے ایک طرف تو جمادات، نباتات، حیوانات سب سے انسان کو اشرف قرار دیا۔ دوسری طرف صنف ملائکہ سے بڑھا دیا۔ ملک، وہ بے شک بلند مرتبہ ہستی ہے۔ رفیع المنزلت وجود ہے بھلا کیا حق مجھ کو کہ میں ملائکہ کی منزل کو پست کہوں، عالم بالا کے رہنے والے سدرہ پر منزل رکھنے والے، جوارِ حضرت احدیت میں بسنے والے، ان کی منزلت کو میں پست کہوں یہ ناممکن ہے، بہت بلند، بہت رفیع المرتبہ بہت اعلیٰ منزلت، مگر میں نے عرض کیا، خود اختیاری ترقی کی صلاحیت"

---

[1] یہ کتاب [illegible] شائع کردہ ہے، (ناشر)

اختیار کے معنی ہمیشہ دو پہلوؤں کے طالب، وجود اور عدم، ہست و نیست، فعل و ترک، ملائکہ بہت بلند ہیں۔ لیکن ان کی بلندی محل، مرتبہ، منزل کی رفعت ظاہری اعتبار سے ہمارے لیے ویسی ہی ہے جیسے معمار نے یہ عمارت بنائی۔ اس کا کنگرہ وہاں رکھا، اینٹیں یہاں رکھیں، ہے ضرور وہ کنگرہ بلند مگر معمار نے وہاں رکھا ہے ـــ وہ ہے بلند، لیکن تعریف ویسی ہی کروں گا، جیسی موتی کی آب و تاب کی۔ بطور ثنا و ستائش کے میں کمال کا اعتراف کروں۔ یہ ناممکن ہے۔ اس لیے کہ بنانے والے نے بلند ہی رکھا اختیاری حیثیت سے بلند ہوتا، تب میں تعریف کرتا۔ وہاں کی یہ بلندی رمز ہے انسان سے اس کے پست درجہ پر ہونے کی اس کی پاک و مقدس ذات ہے، اس کی ذات میں عصیاں کا وجود نہیں ہے لیکن بایں معنی کہ قوتِ عصیاں خلق ہی نہیں ہوئی۔ طاقتِ گناہ پیدا ہی نہیں کی گئی۔ صاف و شفاف جس کے دامن پر کوئی دھبا نہیں، بالکل پاک و منزہ، لیکن انسان کے مقابلہ میں ملک ناز کر سکے؟ ناممکن ہے۔ تمام ملائکہ بے شک بہت بڑے درجہ پر، بہت منزہ اور معصوم لیکن ان کی عصمت خود اختیاری نہیں ہے پیدا کیے گئے ہیں معصوم، ہیں معصوم۔ مگر انسان متحارب قوتوں کا مالک ایک جنگ ہے جو اس مختصر سی دنیائے جسمِ انسانی میں برپا رہتی ہے ـــ ایک طرف نفسِ امارہ کی طاقتیں ہیں ـــ وہ اپنی طرف لے جانا چاہتی ہیں ایک طرف عقل کا لشکر ہے وہ اپنی سی چاہتا ہے کہ کر کے رہے۔ یہ تصادم ہے۔ ان متحارب طاقتوں میں انسان رکھا گیا ہے۔ کہ وہ اپنی نظر سے امتیاز کر کے ساتھ دے۔ اب اگر انسان نے ان تمام متحارب طاقتوں کو دیکھ بھال کر ایک کا ساتھ دیا، دوسرے سے بیزاری اختیار کی تو کیا کہنا

> پھر تو لڑ بھڑ کر فتح کرنے والا ظفریاب مجاہد ہے۔ راستہ چلنے کوئی مال و دولت ہاتھ نہیں آگیا ہے، بلکہ اپنی قوت بازو سے جنگ کر کے فتح و ظفر حاصل کر کے ملک طاعت پر قبضہ کیا ہے۔ یہ انسان ہے۔ یہ ملک کے سامنے آتا ہے، فتح مندی کا نشان سر پر لہراتا ہوا آتا ہے۔ ملک سے کہتا ہے: جو ملک تم کو دیا گیا تھا بغیر لڑے بھڑے ہوئے صرف عطیہ کے طور پر اس کو میں نے لڑ بھڑ کر فتح کیا۔ وہ ملک عصمت ہے اور انسان کی طاعت ہے۔"

نبی و رسول کے متعلق ہرگز یہ خیال درست نہیں کہ اس میں خصوصیات انسانی کو مفقود ہونا چاہیے۔ بلکہ درحقیقت اس میں خصوصیات انسانی کو پایۂ تکمیل پر ہونا چاہیے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ "انسانِ کامل" کہے جانے کا مستحق ہو اور مدیر نگار کے الفاظ میں وہ "ہماری طرح ایک انسان ہو لیکن بلند ترین سطح کا۔"

مگر خصوصیات انسانی کی تعیین میں اکثر دھوکا ہوتا ہے۔

پست درجہ کے افراد کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں واقفیت ہے تو اس کے ساتھ اس کے ساتھ بہت سی باتوں سے ناواقفیت، سلامت روی ہے تو اس کے ساتھ کج روی۔ تحفظ و تذکر ہے تو اس کے ساتھ سہو و نسیان۔ اصابت رائے ہے تو اس کے ساتھ غلطی۔ یعنی محاسن کے ساتھ معائب کی شرکت اور کمالات کے ساتھ نقائص کی آمیزش ہے۔

"خصوصیات انسانی" کے تحت میں اگر نقائص کا شمار کیا گیا جن کے ساتھ ان محاسن کا دامن آلودہ ہے تو "خصوصیتِ انسانی" کے پایۂ تکمیل پر ہونے یا "انسانِ کامل" کے مفہوم پیدا ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ سب سے زیادہ جاہل، سب سے زیادہ کج رو، سب سے زیادہ بھلکڑ اور سب سے زیادہ غلطی کرنے والا ہو۔

لیکن "خصوصیاتِ انسانی" اگر نام ہے اس کمال کے پہلو کا جو پست افراد میں ان

نقائص کے ساتھ آمیختہ ہے تو خصوصیاتِ انسانی کی تکمیل اور انسان کامل کی امتیازی حیثیت یہ ہوگی کہ زائد سے زائد واقف کار، زائد سے زائد سلامت رو، زائد سے زائد باہوش اور زائد سے زائد صائب الرائے ہو۔

غالباً انسانی کمال کی بلند حیثیت کو کوئی شخص پہلی صورت کے ساتھ وابستہ نہیں قرار دیتا اور اسی لیے جناب نیاز بھی باوجود اس کہنے کے کہ "ایک نبی کی شان یہ ہے کہ اس میں انسانی قوتیں زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہوں" اور یہ کہ "وہ ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا" نبی کے لیے اس کی ضرورت قرار دیتے ہیں کہ وہ تمام دوسرے انسانوں سے زیادہ ضبطِ نفس پر قادر ہے، سب سے زیادہ غائر نگاہ سے سوچتا ہے۔ بہت کم مخالفت و مقابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے اور غلطی بہت کم کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ انسانی خصوصیات کا کمال ان ہی محاسن کی تکمیل کے ساتھ وابستہ قرار دیتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ نقائص "انسانی خصوصیات" کا جزو نہیں بلکہ ان کے ساتھ ایک متضاد حیثیت رکھتے ہیں، جو ان خصوصیات کے پست اور ناقص درجہ میں ہونے کی بنا پر کسی حد تک پائے جاتے ہیں اور جتنی خصوصیت انسانی کی تکمیل زیادہ ہو اتنے ہی یہ نقائص گھٹتے چلے جاتے ہیں، پھر اگر کوئی ایسی ہستی فرض کی جائے جس میں یہ نقائص موجود ہی نہ ہوں تو وہ ایک "غیر انسانی ہستی" یا انسانی خصوصیات سے معرّا ذات کیونکر قرار پائے گی، بلکہ نتیجہ یہی قرار پائے گا کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس میں خصوصیات انسانی اپنے پورے درجۂ کمال پر پائے جاتے ہیں، اس لیے وہ نقائص بالکل فنا ہو گئے ہیں اور دوسرے لفظوں میں وہ ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا۔

اس کے بعد پھر آخر انسانیت کا لازمہ یہ کیوں قرار دیا جائے کہ اسے غلطی ضرور کرنا چاہیے، اسے بے راہ روی میں ضرور مبتلا ہونا چاہیے۔ اسے اپنی خواہشوں کی رَو میں کبھی کبھی ضرور بہنا چاہیے ورنہ وہ انسان نہیں سمجھا جائے گا۔

پھر یہ دیکھیے کہ جذبات کی پیروی کرنا جس کا نام ہے گناہ، تحفظ و تذکر میں کوتاہی ہونا جس کا نام ہے سہو و نسیان، غور و خوض میں صحیح نتیجہ پر نہ پہنچنا جس کا نام ہے غلطی اور خطاءِ اجتہادی یہ سب ایک ہی سطح کے نقائص ہیں جنہیں "انسانی کمزوری" کے نام سے یاد کر کے عام طور سے انسانیت کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ اگر "انسانیت" ان ہی نقائص کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے کہ کچھ نہ کچھ ان کی پٹ انسان میں ضرور ہونا چاہیئے ورنہ وہ انسانیت سے خارج ہے تو پھر ان میں تفریق کیوں کہ بعض تو نبی میں بالکل مفقود فرض کی جائیں۔ اور بعض کو کم درجہ پر تسلیم کیا جائے،

آخر یہ کس لیے کہ گناہ تو رسول سے بالکل نہیں ہوتا اور غلطی یا لغزش جو انسانی فراست سے اس دنیا میں ہو سکتی ہے وہ اس سے ممکن ہے لیکن بہت کم۔

اگر یہ دونوں ہی انسانی کمزوریاں ہیں اور ان کو ایک انسان میں ہونا چاہیے تو گناہ کو بھی یہ کہا جائے کہ وہ رسولؐ سے ہو سکتا ہے مگر دوسروں کی بہ نسبت کم اور غلطی یا لغزش بھی ہو سکتی ہے مگر دوسروں کے لحاظ سے کم۔ اور اگر گناہ ایک انسان سے باوجود انسان ہونے کے بالکل مفقود ہو سکتا ہے اور اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ "وہ اپنی نبیّت کے لحاظ سے" اپنے مقاصد کے نقطۂ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان ہے" تو غلطی بھی ایک انسان سے باوجود انسان ہونے کے بالکل مفقود ہو سکتی ہے۔ پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ "لیکن اپنے تدابیر، اپنی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کار و بار عالم میں وہ کبھی کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے"

اگر یہ کہا جائے کہ "اجتہادی غلطی" درحقیقت ایک انسان کے لیے کسی طرح کا نقص اور عیب ہے ہی نہیں۔ تو پھر آخر رسولؐ میں جسے کہا گیا ہے کہ وہ بلند ترین سطح کا انسان ہے غلطی کو دوسرے تمام افراد کی بہ نسبت بہت کم قرار دینے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟

اس کو دوسروں کی بہ نسبت رسول میں کم قرار دینا ہی صاف غمازی کر رہا ہے کہ یہ ایک دھبہ ضرور ہے جو انسانیت کے دامن پر بد نما حیثیت رکھتا ہے۔ پھر ایک ایسی ہستی کے لیے جو بقول آپ کے ایک بلند ترین سطح سے تعلق رکھتی ہے اسے بالکل مفقود مان لیا جائے تو کیا گناہ ہے؟ اس صورت میں وہ انسانیت سے خارج کیونکر ہو گا جبکہ اس دھبے کے کم ہونے سے اس کی انسانیت کی کمی نہیں ثابت ہوئی بلکہ انسانیت میں بلندی پیدا ہوئی تو اس کے معدوم ہو جانے سے انسانیت مفقود کیونکر ہو گی بلکہ وہ بلند ترین سطح پر پہنچ جائے گی جو حقیقتاً نبوت کا اصلی معیار ہے۔

⁂

"نہ کرنے" اور "نہ کر سکنے" کے لفظی اُلٹ پھیروں سے حقیقت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی مگر میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ "عصمت" بایں معنی کسی نہ کسی درجہ تک دنیا کے ہر شعبہ میں کار فرما ہے۔

یونیورسٹی اور کالجوں کے امتحانات میں ایک لڑکا بہت غلطیاں کرتا ہے۔ فیل ہو جاتا ہے۔ ایک ذہین ذکی لڑکا ہر درجہ میں کبھی فرسٹ ڈویژن سے کم معیار کے نمبر پاتا ہی نہیں، بے شک کہا جائے گا کہ یہ ذہین لڑکا کبھی فیل نہیں ہو سکتا اور کبھی غلط پرچہ نہیں لکھ سکتا۔

ایک حاذق طبیب کبھی نسخہ غلط نہیں لکھ سکتا۔ ایک ماہر وکیل کبھی بحث میں غلطی نہیں کر سکتا، ایک کامل قانون دان جج کبھی فیصلہ غلط نہیں کر سکتا ایک کامل زباں دان کبھی محاورہ کی غلطی نہیں کر سکتا۔

وہ لڑکا جب غلطی کرے گا اس کی ذہانت و محنت کی کمی سمجھی جائے گی۔ وہ جب نسخہ غلط لکھے گا حذاقت کے نقص کا نتیجہ ہو گا۔ وہ جب بحث میں غلطی کرے گا۔ اس کی مہارت کی کمزوری ثابت ہو گی، وہ جب فیصلہ غلط کرے گا اس کی قانون دانی محل

بحث قرار پائے گی۔ وہ جب محاورہ کی غلطی کرے گا اس کی زبان دانی کا قصور ہوگا۔

اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اس سے زیادہ ذہین طالب علم ہو۔ جو اس سے زیادہ حاذق طبیب ہو۔ جو اس سے زیادہ ماہر وکیل ہو۔ جو اس سے زیادہ قانون دان جج ہو۔ جو اُس سے زیادہ محاورہ داں اہلِ زبان ہو اس سے یہ غلطی غیر ممکن ہے۔

”غیر ممکن ہے“ کیا معنی؛ یعنی اس ذہانت، اس کی حذاقت، اس کی مہارت، اس کی قانون دانی، اُس کی زبان دانی غلطی سے مانع ہے۔ اس لیے غیر ممکن۔

یوں ہی اگر کہا جائے کہ نبی و رسول سے گناہ ہونا غیر ممکن، غلطی ہونا غیر ممکن تو اُس غیر ممکن کے یہی معنی کیوں نہ قرار دیے جائیں کہ اس کا کامل احساسِ فرائض، اس کی پوری معرفت و حقیقت شناسی اور اس کی کامل عقل و معاملہ فہمی گناہ اور غلطی سے مانع ہے۔

لطف یہ ہے کہ جناب مدیر نگار اس ”نہ کر سکنے“ پر ایک جگہ سخت احتجاج کرنے کے بعد اور یہ کہنے کے بعد کہ ”ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پہ قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے، وہ جھوٹ بول سکتا ہو لیکن نہ بولے وہ غصہ کر سکتا ہو لیکن نہ کرے، ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو لیکن نہ ہو“ اس کے بعد پھر خود ہی حضرت رسولؐ کی عصمت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ تحریر فرما گئے ہیں کہ:۔

> ”میں کبھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہؐ کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابیٔ ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے۔ ایک رسولؐ کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا جس حد تک مذہب کا تعلق تھا آپ کی ہر تعلیم وحی و الہام کے ماتحت ہوتی تھی۔ اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا“

اب فرمایئے کہ اس ”مرتکب نہیں ہو سکتا“ اور ”امکان نہیں ہے“ کے کیا معنی ہیں؟

لفظی تعبیر کے اسی الجھاؤ میں پھنس کر فرقۂ شیعہ کے اس عقیدہ پر کہ خدا کے لیے ظلم محال ہے، فعلِ قبیح محال ہے، کذب محال ہے، وعدہ خلافی محال ہے جس کے دوسرے الفاظ یہی ہوئے کہ خدا ظلم نہیں کرسکتا، فعل قبیح نہیں کرسکتا، جھوٹ اور وعدہ خلافی کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ جمہور اہلِ اسلام کی جانب سے بڑی لے دے ہوتی ہے کہ دیکھو یہ خدا کی قدرت کے منکر ہیں اور اس کو عدل پر مجبور قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے شیعہ عمومِ قدرت کے منکر نہیں ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی حکیمانہ شان اس کی قدرت کو ان امور کے ساتھ متعلق ہی نہیں ہونے دے سکتی۔

بالکل اسی صورت سے عصمت کے مسئلہ میں "گناہ نہ کرسکنے" یا "گناہ کے غیر ممکن ہونے" کے یہ معنی قرار دینا کہ معصوم گناہ پر قادر ہی نہیں ہے بالکل غلط ہے۔

" وہ گناہ نہیں کرسکتا " اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی عفتِ نفس اور پارسائی قدس و نزاہت اور حکیمانہ رفعت ارادۂ گناہ سے مانع ہے۔

وہ چاہے تو گناہ کرسکتا ہے مگر اپنے بلند انسانی خصوصیات کی بنا پر وہ چاہے ہی گا نہیں۔

اس سے ہرگز قدرت سلب نہیں ہوتی اور نہ پیدائشی معصومیت سے نبی کا متصف کرنا لازم آتا ہے، جو بے شبہ منصبِ نبوت کی توہین کرتا ہے۔

دوسرا سوال

" انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلائل کیا ہوسکتے ہیں؟"

یہی پہلے سوال کے آخری جزو کا محصل ہے جس کے الفاظ یہ تھے کہ "اگر لغزش و

نسیان، اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و آئمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں ؟

جناب نیاز کا فیصلہ اس کے متعلق جو کچھ ہے وہ ان کی سابقہ عبارت سے ظاہر ہو چکا ہے۔ یعنی ان کا خیال ہے کہ گناہ سے تو ایک نبی یا رسولؐ کا معصوم ہونا ضروری ہے لیکن لغزش و نسیان اور اجتہادی خطا کا امکان ہے۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ رسول کسی معاملے میں جو رائے قائم کرے وہ درست نہ ہو اور اس میں غلطی ہوئی ہو۔

ان کی دلیل اس کے اوپر یہ ہے کہ ”گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابیٔ ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے ایک رسول کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے۔“

میں سمجھتا ہوں کہ ایک نبی کے ساتھ امت کا تعلق اگر وہ ہوتا جو ایک سالک و مرتاض پیر و مرشد کے ساتھ اس کے پاک باطن مرید کا یعنی نبی صرف روحانی حیثیت سے بندگانِ خدا کو خدا سے تقرب حاصل کرنے کا ایک باطنی ذریعہ ہو۔ تاکہ اسکی روحانی قدس و پاکیزگی سے فیض حاصل کر کے خلقِ خدا واصل الی اللہ ہو جائے۔ اور اپنے نفس کو پاکیزہ بنا کر خدا کی بارگاہ سے نزدیکی حاصل کرے تو بے شک اس کے لیے صرف رسول کا پاک باطن اور ضمیر کی خرابیوں سے علیحدہ ہونا ضروری تھا تاکہ اس کی باطنی صفائی اور نیت کی پاکیزگی سے مرتاض مرید کی روحانیت میں اضافہ ہو اور اس کے نفس میں صفائی پیدا ہو۔ اس کے لیے اس میں کسی قسم کی معاملہ فہمی اور اصابت رائے عقلی کمال کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ آخرت کی نجات کا تعلق ضمیر و نیت ہی کے ساتھ ہے اور اس لیے صاف سادہ مسلمانوں کے لیے یہ روایت نوک زبان ہے کہ ”اہل الجنۃ بلہ“

(یعنی بہشت کے لوگ سادہ لوح بھولے بھالے ہوتے ہیں) اور اسی لیے ایک بہت بڑے عالمِ اسلام کا مقولہ ہے:۔

"رب رجل نرجو شفاعتہ ولا نقبل شہادتہ"

"(یعنی) بہت سے ایسے آدمی ہیں کہ ہم اپنے لیے ان کی شفاعت کے متوقع ہوسکتے ہیں (کیونکہ یہ آخرت کا معاملہ ہے) لیکن محکمہ قضا میں ان کی گواہی قبول نہ کریں گے (کیونکہ اس میں معاملہ فہمی اور عقل و تدبر کی ضرورت ہے)"

مگر ایک نبی و رسول کی نسبت یہ خیال اگر کوئی "ملائے مسجد" یا صاف سادہ مقدس "مولوی" ظاہر کرتا تو پھر بھی قابلِ تعجب نہ تھا۔ لیکن جناب مدیر نگار ایسے روشن خیال وسیع النظر، منوّر الفکر انسان کی جانب سے ہرگز اس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔

پھر جبکہ رسول کی حیثیت صرف ایک واسطۂ روحانی اور وسیلۂ باطنی کی نہیں ہے بلکہ وہ امت کی عملی اصلاح کا ذمہ دار، ان کے انسانی خصوصیات کا مکمل اور اپنے قول و عمل سے ان کا حقیقی رہنما اور ان کے لیے اتباع و پیروی کے واسطے ایک نمونہ ہوتا ہے تو اب اس کے لیے صرف باطن کا صاف اور ضمیر کا پاک ہونا ہرگز کافی نہیں ہے۔ وہ اپنے باطن اور ضمیر کے لحاظ سے کتنا ہی مکمل ہو لیکن اگر وہ قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا رہے، رائے قائم کرنے میں غلطیاں کرتا ہے۔ غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط سمجھ لیتا ہے اور غلط طرزِ عمل کو صحیح سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ اور غلط راستہ پر چلتا اور دوسروں کو چلاتا ہے۔ تو ایسا شخص ہرگز اصلاحِ خلق اور رہنمائی امت کے قابل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اور کسی طرح نبوت و رسالت کے عہدہ کا اہل نہیں ہے۔

دنیا کے ہر شعبہ میں اسی عصمت کی تلاش ہوتی ہے۔ مریض کو لاکھ یقین دلائیے کہ فلاں حکیم تمہارے بارے میں "بدنیت" ہرگز نہیں ہے، یعنی وہ جان بوجھ کر تمہیں نہیں مار ڈالے گا، لیکن اس کی اس "نیک نیتی" سے کبھی اس کے مرض کا "درماں" نہیں ہو

سکتا جبکہ وہ نسخوں میں غلطی کر جائے یعنی زہر کو تریاق سمجھ کر دے دیتا ہو، وہ تلاش کرے گا "حاذق" کی یعنی جس سے غلطی نہ ہوتی ہو۔

ایک موکل کو ہزار یقین دلائیے کہ فلاں وکیل تمہارا دشمن نہیں ہے اور سمجھ بوجھ کر تمہارے مخالف پیروی نہیں کرے گا مگر کیا نتیجہ جبکہ اسے معلوم ہو کہ اس میں اصابت رائے نہیں یعنی وہ مضر پوائنٹس کو مفید سمجھ کر عرضی دعوے میں تحریر کرتا اور بحث میں پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے مقدمہ ہار جاتا ہے۔ وہ تلاش کرے گا "ماہرِ فن" وکیل کی یعنی جو دھوکا نہ کھاتا ہو۔

ایک طالب علم کو کتنا ہی مشورہ دیجیے کہ فلاں استاد سے تعلیم حاصل کرو، وہ تمہیں غلط مطلب غلط سمجھتے ہوئے نہیں بتائیں گے، وہ کہے گا پھر میرا کیا فائدہ جبکہ وہ غلط مطلب صحیح سمجھ کر مجھے بتلائیں اور میری ذہنی گمراہی کا سبب قرار پائیں، وہ تلاش کرے گا ایسے معلّم کی جو صحیح مطلب سمجھا ہوا اور اُسے صحیح طریقہ سے سمجھا بھی دے۔

وکالت، بیرسٹری، پروفیسری، ماسٹری، تھانہ داری، ججی، کلکٹری، ڈاکٹری، کلرکی غرض ہر عہدہ و منصب کو سارٹیفیکیٹوں اور ڈپلوماؤں کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے، اور یہ تمام اسناد امتحانوں کی کامیابی کے ساتھ وابستہ اور کامیابی کے بھی مراتب اور بوقت اختلاف ترجیح ہمیشہ ممتاز درجہ کے پاس ہونے والوں کو دی جاتی ہے، اور کامیابی و ناکامی نیز کامیابی کے درجوں کی تفریق امتحان کی کاپیوں کی جانچ پر مبنی اور ممتحنین کی طرف سے کاپیوں کی جانچ، نمبروں کا دینا سب غلطیوں کی کمی اور زیادتی کے ساتھ متعلق۔ جس نے غلطیاں زیادہ کیں اس کے نمبر سب سے کم جس نے غلطی سب سے کم کی یا بالکل نہیں کی اس کے نمبر سب سے زیادہ، وہ فیل یہ پاس، وہ سند سے محروم یہ سند سے سرفراز وہ عہدہ و منصب سے مایوس، یہ عہدہ کا مستحق، اب جائیے ممتحنین کے پاس، قسمیں کھا کھا کر انھیں یقین دلائیے کہ طالب علموں کی نیت صاف ہوتی ہے اور ضمیر

میں خرابی نہیں ہوتی۔ یعنی وہ جو غلطی کرتے ہیں غلطی سمجھ کر ہرگز نہیں کرتے۔ ممتحن یہی کہیں گے کہ ہمیں نیت سے نہیں بحث۔ غلط پرچہ لکھنے والا صحیح سمجھ کر اس غلطی کا مرتکب ہوتا ہے یہی تو اس کی غلطی ہے، اس لیے پاس ہونے کا مستحق نہیں ہے۔

یونیورسٹی کے ارکان اہلِ حل و عقد کے پاس جائیے کہ یہ طالب علم فیل ضرور ہوا ہے مگر جان بوجھ کر فیل نہیں ہوا، نیّت اس کی پاک ہے لہٰذا سند سے محروم نہ کیا جائے وہ کہیں گے ہمیں نیت سے بحث نہیں، بہرحال پاس ہونے کے قابل نہ تھا، اس لیے سند پانے کا مستحق نہیں۔

خداوندانِ عہدہ و منصب کے پاس جائیے کہ اس کو منصفی، ججی، پروفیسری وغیرہ کے عہدوں سے محروم نہ کیجیے۔ اس نے پرچے غلط لکھے، غلطیاں ضرور کیں مگر غلط سمجھ کر نہیں کیں، یہ پاس نہیں ہوا مگر جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا، وہ کہیں گے ہمیں اس سے مطلب نہیں ہمارے یہاں تو اتنی قابلیت کی ضرورت ہے۔ اس سند کی حاجت ہے۔ بہرحال جب غلطیاں کیں معلوم ہوا قابلیت ناقص ہے لہٰذا عہدہ و منصب کی اہلیت نہیں، غرض دنیا کے ہر شعبہ میں جس عصمت کی تلاش ہے اور جس پر دنیا کا نظام قائم ہے وہ یہی عصمت ہے، یعنی غلطیوں سے عصمت۔

اب چونکہ ہماری قدرت کوتاہ ہے اس لیے ہم ہر شعبہ میں اپنے مقلد و رہبر تلاش کرتے ہیں، ہم کو بالکل "مکمل عصمت" نہیں ملتی مگر اس کے زیادہ سے زیادہ کامل نمونہ کو ہم اختیار کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض انجام دے دیا۔ طبیب کی تلاش ہوئی تو ایسا طبیب ڈھونڈ لیا جو ہمارے حدود دسترس میں کم از کم غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہو۔ وکیل ڈھونڈا تو ایسا جو کم از کم غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہو۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

درحقیقت یہ "کم از کم" کی تجدید ہماری "کوتاہ دستی" کا نتیجہ ہے۔ ہماری پیاس بھی اس "کم از کم" پر بجھتی نہیں مگر عصمت بی بی بے چادری؟ ہمارا امکان اس سے زیادہ

نہیں۔ اس لیے اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں۔

لیکن اگر ان میں سے ہر شعبہ میں منتخب کرنے والی ایسی ہستی ہو جس کی قدرت محدود نہیں ہے اور اطلاع کوتاہ نہیں ہے۔ اور جس سے خود بھی غلطی کا امکان نہیں ہے تو ہم کو سمجھنا لازمی ہے کہ اس نے بھی "عصمت" کے جوہر کو نظر انداز نہیں کیا ہوگا۔ اور چونکہ اس کے علم و قدرت میں کوتاہی نہیں اس لیے اس کو "کم از کم" والی مجبوری پیش نہ آئی ہوگی۔ اور اس نے کامل "غلطی سے مبرا" ہی کو مقرر کیا ہوگا۔ جس کا اصطلاحی لفظ ہے "معصوم"۔ میں طبیب ڈھونڈتا ہوں "معصوم" مگر مجھے ملتا نہیں اگر خدا میرے لیے کسی طبیب کو خود مقرر کر دے تو مجھے یقین کرنا چاہیے کہ وہ اس کے علم میں "معصوم طبیب" ہے اور اس کے علم میں تخلف نہیں ہے۔

میں وکیل ڈھونڈتا ہوں "معصوم" مگر میرے امکانی ہاتھوں سے دستیاب نہیں ہوتا۔ اگر خدا میرے مقدمہ کی پیروی کے لیے کوئی وکیل مقرر کر دے تو میں یقینی طور پر سمجھوں گا کہ وہ "معصوم وکیل" ہے۔ ایسے ہی ہر شعبہ میں۔

نبی و رسول کا تقرر اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں بھی اپنے نزدیک نبوت و رسالت کے لیے "معصوم" ہی کو ڈھونڈتا۔ مگر جیسے طبیب مجھے بالکل معصوم ملا، وکیل بالکل معصوم نہ ملا ویسے ہی نبی و رسول بھی بالکل معصوم میرے ہاتھوں سے دستیاب نہ ہوتا۔ مگر جو سب سے زیادہ مکمل درجہ میری تلاش میں ملتا، اس کو اپنا مقصد قرار دے لیتا۔ میں بے شک ایسے کو نبی بنا لیتا اور رسول منتخب کر لیتا جو میرے حدود اطلاع میں غلطیوں سے زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو۔ یعنی کم سے کم غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہو لیکن نبوت کا عہدہ تو براہ راست خدا سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کی قرار داد پر مبنی ہے۔ اس نے اگر "معصوم" کو نہ ڈھونڈا تو وہ اپنے "حکیمانہ انتخاب" میں مجھ سے بھی پست ہو گیا۔ اس لیے

منتخب کرے گا تو وہ معصوم ہوگا اور چونکہ اس کا ڈھونڈ کر منتخب کرنے والا ہیں نہیں ہوں بلکہ خدا ہے اس لیے وہاں "کم از کم" والی حد بندی کے کوئی معنی نہیں۔ وہ مقرر کرے گا تو ایسے ہی کو جو بالکل غلطیوں سے مبرّا معصوم عن الخطاء ہو۔

اور یہی رمز ہے کہ شیعوں نے امامت میں بھی عصمت کی شق لگا دی ہے۔ چونکہ امامت و خلافت بھی ان کے نزدیک مثل نبوت کے خدا کی طرف کا مقرر کردہ منصب ہے۔ اس لیے "رمزِ عصمت" میں نبوت و امامت دونوں مشترک حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسی عصمت کی ضرورت "نبوت" میں ویسی ہی "امامت" میں تفرقہ کی کوئی گنجائش نہیں

بھلا بتائیے تو سہی کہ صرف نیک نیتی اور ضمیر کی پاکیزگی ایک نبی و رسول کے لیے کس مرض کی دوا ہوگی۔ اور مقصدِ نبوت و رسالت کو کس طرح پورا کرے گی۔ جبکہ ان کی غلطیوں کی بناء پر اس کے ہاتھوں خلقِ خدا کے گمراہ ہونے کا اندیشہ موجود ہے۔ چلتی ہوا کے جھونکے کو جبرئیل کے پر کی ہوا سمجھتا اور نیک نیتی کے ساتھ حقیقتاً یقین کر لیتا ہے۔ دیوار کے پیچھے چھپے ہوئے انسان کی آواز کو صدائے غیبی جانتا اور اس پر ایمان لے آتا ہے اور اپنے دل میں پیدا شدہ خیالات کو خواہ مخواہ خدا کی طرف سے نازل شدہ خیال کرتا اور واقعی اعتقاد کر لیتا ہو۔ غلط باتوں کو صحیح سمجھتا اور اپنے نزدیک لوگوں کو اسی صحیح راستہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ غیر ضروری باتوں کو ضروری اور ناروا افعال کو لازم العمل سمجھ کر دنیا کو دعوت دیتا، سختی کے ساتھ ان پر خود کاربند ہوتا اور دوسروں کو کاربند بناتا ہے یقیناً ایسے شخص کے دامن پر "گناہ" کا دھبہ مشکل سے لگایا جا سکے گا۔ اس کے ضمیر پر حملہ ہرگز روا نہ ہوگا۔ سزائے اخروی کا ایسے شخص کو مستحق ثابت کرنا بہت دشوار ہے لیکن کیا مقصد نبوت و رسالت ایسے شخص سے انجام پایا؟ ہدایتِ خلق کا مقصد حاصل ہوا اور دنیا حیات یافتہ ہوئی؟

میں سمجھتا ہوں کہ کسی چھوٹے موٹے گناہ کو گناہ سمجھ کر کرنا اور دنیا کو بتلا دینا کہ یہ گناہ ہے اتنا خطرناک اور مقصدِ نبوّت کے لیے مضرت رساں نہیں ہے۔ جتنا غلط فہمیوں میں مبتلا ہونا، گناہ کو ثواب سمجھ کر کرنا اور غلط مسلک کی طرف صحیح سمجھ کر رہنمائی کرنا۔

مسائل الوہیت و نبوت کے بارے میں جہاں تک اربابِ تحقیق کا خیال ہے ان کا اصل تعلق عقلی احکام کے ساتھ ہے اور دلائل نقلیہ کو ثانوی حیثیت حاصل ہے کیونکہ نقل کے حدود عمل ہی ان دونوں مرحلوں کے بعد سے شروع ہوتے ہیں۔ نیز عقلی احکام قطعی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن نقلی دلائل زیادہ تر مظنون الدلالۃ۔ اس لیے ظاہری الفاظ کسی مسلّمہ عقلی کے خلاف بھی نظر آتے ہیں تو انھیں بہرحال ایسے معنی پر محمول کیا جاتا ہے جو قطعی الثبوت نتائج کے خلاف نہ ہوں۔

اسی لیے "الرحمٰن علی العرش استویٰ" کے الفاظ سے خدا کے تمکّنِ جسمانی اور "یداہ مبسوطتان" سے خدا کے لانبے لانبے ہاتھوں کا عقیدہ درخورِ قبول نہیں قرار دیا گیا اور اس کے معنی بہرحال ایسے قرار دیے گئے جو ذوقِ سلیم کے بالکل خلاف بھی نہ ہوں اور ایک قطعی الثبوت حقیقت کے منافی بھی نہ قرار پائیں۔ یہی صورت نبوت کے عقیدہ کی ہے، اسی بنا پر خود جناب نیاز کو بھی تاویل سے چارۂ کار نظر نہیں آیا کیونکہ "گناہ" سے انبیاء کی عصمت کا خود انھوں نے اقرار کیا ہے۔ مگر ان کے پیش کردہ آیات میں گناہ ہی کے مرادف لفظ کا تذکرہ ہے۔ استغفر لذنبکؔ اور لیغفر لکؔ اللہ ماتقدم من ذنبکؔ ان دونوں آیتوں میں صاف "ذنب" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں گناہ، اور مغفرت کے لفظ کا تعلق بھی یہی بتلاتا ہے اور "عفا اللہ عنکؔ" کے الفاظ بھی اسی کی ترجمانی کرتے ہیں مگر چونکہ گناہ کی نسبت کو خود ان کی عقل نے بھی قطعی طور پر منتفی قرار دیا ہے اس لیے انھوں نے ان تمام آیات کو خطائے اجتہادی پر ڈھالا ہے حالانکہ اجتہادی غلطی ہرگز "ذنب" کا مصداق نہیں ہوتی۔

انھوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ رسول کسی "معصیت" یا گناہ میں مبتلا نہیں ہو سکتا لیکن "عصیٰ آدم ربّہ فغویٰ" قرآن مجید میں موجود ہے جس میں صاف لفظ معصیت کا استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ایسے آیات موجود ہیں جن سے رسالت مآبؐ کے غلطیوں سے بری ہونے کا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور جسے صحیح نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جبکہ شان نبوت و رسالت قطعی طور سے اس کی مقتضی بھی ہو جیسا کہ اس کے قبل توضیح کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

آیت "قل ان ضللت فانّما اضلّ علیٰ نفسی وان اھتدیت فبما یوحیٰ الیّ ربّی" میں بطور تعلیق ضرور کہا گیا ہے کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو تو میں اس کا ذمہ دار ہوں گا۔ اور اگر سیدھی راہ اختیار کروں تو خدا کی ہدایت سے ہے۔"

لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ جملہ شرطیہ کے دونوں طرف کے لیے وقوع ضروری نہیں ہے اس میں ثبوت اور نفی دونوں کی گنجائش ہے۔ مگر دوسری آیت میں صاف پہلے جملہ والی شرط کو منتفی قرار دیا گیا ہے یعنی ارشاد ہوا ہے۔ "ماضلّ صاحبکم وماغویٰ" اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ بیشک امکانی حیثیت کے حدود میں بحیثیت بشری رسول لغزش پر بھی قدرت رکھتا ہے لیکن اس لغزش کا وقوع نہیں ہے رہ گیا اس کا عدم وقوع وہ ان خصوصیات انسانی کے اعلیٰ معیار کی بنا پر ہے جو رسول کو حامل وحی بنانے کا باعث ہیں جسے "فبما یوحیٰ الیّ ربّی" کے لفظوں میں ذکر کیا گیا ہے اور انھیں دونوں پہلوؤں کو "قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ" میں نمایاں کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے جزو میں رسول اور دوسرے افراد کے درمیان جو نقطۂ اشتراک ہے اس کا تذکرہ ہے اور دوسرے میں مابہ الامتیاز کا ذکر ہے جو رسول کی ذات کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ کیونکہ خدا کی وحی بغیر استحقاق نہیں ہوا کرتی اور استحقاق خصوصیاتِ ذاتی پر مبنی ہے۔

„وَمَا ینطق عن الھویٰ ان ھو الّا وحی یوحیٰ“ میں صاف ظاہر کیا گیا ہے کہ پیغمبر کا کوئی کلام مرضئ الٰہی کے خلاف ہوتا ہی نہیں اور جو کچھ زبان سے کہیں وہ وہی ہے کہ اگر وحی بھی اُترتی تو وہی کہتی جو انھوں نے اپنے ذاتی ارادہ سے کہا ہے۔

آیاتِ اتباع جیسے :-

„ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ“ „ان کنتم تحبّون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ“ وغیرہ یہ بھی غیر مبہم طریقہ سے پیغمبر کے اتباع کو ضروری قرار دیتے ہیں „اتباع“ اور „اطاعت“ میں فرق ہے۔ کیونکہ اطاعت صرف احکام سے تعلق رکھتی ہے اور اتباع اور تاسّی دونوں عمل سے متعلق ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول کو نمونۂ عمل قرار دیا گیا ہے جس کے بعد غلطی کے امکان کے کوئی معنی نہیں۔

„انّک لعلیٰ خلق عظیم“ میں بھی خدائے عظیم کی جانب سے رسول کے افعال و اعمال کو اعتدالِ عظیم پر فائز قرار دے کر اس میں کسی طرح کے نقص و کمزوری کے شبہہ کا سدباب کر دیا ہے اور „النّبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم“ کے الفاظ میں ان کو تمام مومنین کے متعلق خود ان مومنین کے ذاتی اختیارات سے بالاتر اختیارات تفویض کر کے اس کی ذمہ داری لے لی ہے کہ یہ جو کچھ مسلمانوں کے حق میں کریں گے۔ وہ مسلمانوں کے لیے مفید ہی ہوگا جس کے بعد اس کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ جو کچھ انھوں نے مسلمانوں کے لیے سوچا ہو اور طریقِ عمل اختیار کیا ہو اور انھیں ہدایت کی ہو وہ درحقیقت موزوں نہ ہو اور خود مسلمان ان کے حکم کے خلاف اپنے لیے جو صورت تجویز کریں وہ مناسب و اصلح ہو۔

* * *

درحقیقت ایک نبی و رسول کے لیے غلطی کا امکان ہونے کی صورت میں

پھر تو اس کے کسی قول و فعل پر قطعی طور سے اعتماد ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ ٹھیک ہی ہے زیادہ سے زیادہ ظن حاصل ہوگا۔ لیکن اصول عقائد میں ظن کوئی چیز نہیں۔

"ان الظن لا یغنی من الحق شیئا" اسی لیے بعض وہ علمائے اسلام جنھوں نے خطاء اجتہادی کو رسول کے لیے جائز کہا ہے انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ رسول سے خطاء اجتہادی ممکن تو ہے مگر خدا اس خطا پر رسول کو برقرار نہیں رہنے دیتا۔ اس کی طرف سے اس خطا کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کے نظائر میں یہی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

"عبس و تولی ان جاءہ الاعمیٰ" ــــ اور "عفا اللہ عنک لم اذنت لھم" ــــ وغیرہ۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ جہاں پر خطا کی اصلاح نہ ہو اور کسی آیت کے ذریعہ سے اس خطاء پر متنبہ نہ کیا گیا ہو وہ خطا نہ سمجھی جائے گی بلکہ رسول کا قول و عمل خداوندِ عالم کی جانب سے متنبہ نہ کیے جانے کے ضمیمہ کے ساتھ دلیل قطعی ہوگا اس طرزِ عمل اور ہدایت کی صحت کا۔

اب یہ ملاحظہ کیجیے کہ خلافت جناب امیرؑ کے مسئلہ میں اگر رسول سے خطاء اجتہادی ہوئی تو اس کا سلسلہ کب سے شروع ہوا؟ اس وقت سے کہ جب نبوت کا ابتدائی دور تھا اور بعیت العشیرہ میں پیغمبرؐ نے لوگوں سے اپنی نصرت کا وعدہ لینا چاہا۔ اور کوئی تیار نہ ہوا اور صرف حضرت علیؑ تھے جنھوں نے لبیک کہی اور اس وقت رسولؐ نے ارشاد کیا کہ یہی میرا وزیر ہوگا، خلیفہ ہوگا اور جانشین ہوگا۔

اس وقت خطاء اجتہادی کی بنیاد پڑی اور پھر ہر موقع پر رسولؐ اپنی اس خطاء اجتہادی کا پروپگنڈا کرتے رہے، جس میں ماہ گزرے، سال گزرے، رزم و بزم کے کتنے ہی موقع سامنے آ گئے اور ہر جگہ پیغمبرؐ نے اپنے اس پروپگنڈے کو نہیں چھوڑا یہاں تک کہ سب سے آخر میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں حج آخر کے بعد بڑے شد و مد کے ساتھ رسولؐ نے تقریر کر کے مسلمانوں کے سامنے اپنے اس نظریہ کو پیش کیا خلق خدا

کو عام دعوت دی اور علیؑ کی خلافت کا اعلان کیا۔

اس کے بعد جب مدینہ واپس آئے تب بھی جب تک مرض الموت کی شدت انتہا تک نہیں پہنچی جب تک کہ بات کرنے اور تقریر کرنے کا دم رہا اپنی اس خطاءِ اجتہادی کی تبلیغ کرتے رہے اور اس طول طویل مدت، تمام زمانۂ رسالت میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خدا نے تنبیہ کی۔ اندھے کی بات نہ سنی اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا تنبیہ ہوئی۔ بعض لوگوں کو جنگ میں شمولیت کی اجازت دی تنبیہ ہوئی۔ بعض عورتوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تنبیہ ہوئی۔ سورۂ برأت سنانے کسی غیر مستحق کو بھیج دیا تنبیہ ہوئی۔ لیکن اتنے مہتم بالشان مسئلہ میں رسولؐ آخر عمر تک خطاءِ اجتہادی پر برقرار رہے، اس کی تبلیغ کرتے رہے اس کی جانب دعوت دیتے رہے مگر خدا نے آدھی بات بھی نہ کہی، ذرا کمزور سے کمزور اور چھوٹی سے چھوٹی تنبیہ بھی نہ ہوئی، یہاں تک کہ سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہوا پھر قرآنی وحی کا سلسلہ بھی بند ہو گیا، مگر رسولؐ اس کے بعد بھی اپنی خطاءِ اجتہادی پر قائم رہے۔

بلکہ اس دوران میں خدا نے عوض اس کے کہ رسولؐ کو ان کی خطاءِ اجتہادی پر تنبیہ کرتا اپنے رویہ سے ان کی خطاءِ اجتہادی کو اور تقویت دی۔ مثلاً:۔

علیؑ نے سائل کو حالتِ رکوع میں انگوٹھی دے دی، وہاں سے آیت اُتری ”اِنّما ولیّکم اللہ و رسولہ والّذین اٰمنوا الّذین یقیمون الصّلوٰۃ و یؤتون الزّکوٰۃ وھم راکعون۔“

اہل سنت کی تفسیریں اٹھا کر دیکھو، سب نے یہ روایت لکھی ہے کہ مراد اس سے علیؑ ہیں۔ اب لاکھ اہل سنت شور مچائیں کہ ”ولی“ کے معنی یہاں مددگار، ناصر دوست وغیرہ کے ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ولی کے معنی حاکم و متصرف کے بھی ہیں ضرور۔ اب فرض کرو کہ خدا کا مقصود اس لفظ سے وہی ناصر و مددگار

رہا بھی ہو لیکن۔ کیا اس سے رسولؐ کی اس خطاء اجتہادی کو تقویت حاصل نہیں ہوئی؟

رسولؐ نے کہا: "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا فمن اراد العلم فلیات الباب" میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں، تو جو شخص علم کا طالب ہو وہ دروازہ پر آئے۔

خدا نے ارشاد کیا:-

"لیس البر ان تاتوا البیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقیٰ واتوا البیوت من ابوابھا" یعنی ہرگز بہتر عمل نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے داخل ہو بلکہ گھروں میں جاؤ تو دروازوں کی طرف سے جاؤ۔

اب سنّی کہیں اور ممکن ہے سچ بھی کہتے ہوں کہ یہ عام بات ہے۔ اس کا علیؑ سے کوئی تعلق نہیں مگر رسولؐ کے اس قول کے ساتھ اس آیت کے اترنے نے رسولؐ کے پروپگنڈے کو کیا قوت نہیں پہنچائی؟

رسولؐ سورۂ برأت لے جانے پر حضرت ابوبکر کو مامور کرتے ہیں۔ خدا واپس منگواتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ تمہاری نمائندگی صرف علیؑ ہی کرسکتے ہیں۔ اس سے مقصود خلافت کی قرارداد نہ ہو لیکن کیا رسولؐ کی خطاء اجتہادی کہ جو حضرت علیؑ کے بارے میں تھی، اس سے قوت نہیں حاصل ہوئی؟

رسولؐ غدیر خم میں تقریر کرتے ہیں اور اپنی "خطائے اجتہادی" کے وسیع "پروپگنڈے" کی سب سے آخری اور پُرزور کارروائی عمل میں لاکر علیؑ کی خلافت کا اعلان کرتے ہیں اور خدا کی طرف سے آیت اترتی ہے۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" (یعنی) "آج میں نے تمہارا دین مکمل کیا آج اپنی نعمت پوری کی اور آج تمہارے لیے دین اسلام کو پسندیدہ کیا۔"

اس سے حقیقت میں مقصود جو کچھ بھی رہا ہو لیکن کیا اس سے رسولؐ کی خطاءِ اجتہادی پر مہرِ تصدیق ثبت نہیں ہوتی؟

میں سچ کہتا ہوں اور خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر شیعہ واقعاً گمراہی میں مبتلا ہیں اور روزِ قیامت سوال ہوا تو شیعہ صاف کہہ دیں گے کہ ہماری گمراہی کی ذمہ وار تیرے حبیب کی خطاءِ اجتہادی ہے اور اُن کی خطاءِ اجتہادی کو تقویت پہنچانے کی ذمہ واری تیرے رویہ اور جانبداری و حمایت پر ہے جس کے بعد اگر ہم گمراہ ہوئے تو تیرے ہاتھوں اور تیرے حبیبؐ کے ہاتھوں، ہم بالکل بے قصور ہیں اور بالکل بے گناہ اور پھر جب تیرا حبیبؐ خطاءِ اجتہادی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور عمر بھر مبتلا رہ سکتا ہے تو ہم تو گنہگار انسان ہیں — ہم اگر خطاءِ اجتہادی میں مبتلا ہوئے اور عمر بھر مبتلا رہے تو ہمیں سزا دینے کا کیا حق حاصل ہے؟ اس کا کوئی جواب ہرگز نہ ہوگا اور یقیناً اگر خدا ظالم نہیں ہے تو کبھی وہ ہم کو اس کے بعد آتشِ جہنم میں نہیں بھیج سکتا۔ ہم نجات کے حق دار ہیں اور کوئی طاقت ہم کو ہمارے اس حق سے محروم نہیں کر سکتی۔

تیسرا سوال

”وصایت جنابِ امیرؑ ثابت کرنے کے لیے حضرات شیعہ کیا نصوصِ قطعیہ پیش کرتے ہیں؟“

اس بحث کے بہت سے اجزاء ناقص اور غیر مکمل صورت میں ”ہر نام“ صاحب کے مضمون میں آ چکے ہیں۔ اس لیے کہ ایک غیر متعلق ہندو دوسرے مذہب کے متعلق کتنی ہی وسعتِ نظر حاصل کرے، لیکن اسی ب کے ایک واقف کار انسان کے برابر کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور ان اجزاء کے ثبوت و صحت کے اوپر جناب نیاز کی

مہرِ تصدیق بھی ثبت ہو چکی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ ہم ان کو اس جگہ مکمل اور حقیقی صورت کے ساتھ پیش کریں جس کی بنا پر ان کو شیعہ بطور نصوصِ قطعیہ سمجھتے اور پیش کرتے ہیں:۔

(۱)

واقعۂ بیعتِ عشیرہ جس میں حضرت رسولِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ:۔

"ھٰذا اخی وصیی وخلیفتی فیکم" اس ارشاد کے لب ولہجہ اور صورت واقعہ کی بنا پر یہ کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں کہ یہ رسولؐ نے بطور مشورہ ارشاد کیا تھا اور مطلب یہ تھا کہ اگر خلیفہ کا انتخاب کیا جائے تو میرا ووٹ بحق علیؑ سمجھنا۔

بلکہ الفاظ اور عنوان واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک قرارداد اور اعلان ہے جو رسولؐ کی جانب سے کیا جا رہا ہے۔

رسولؐ کا سب سے پہلے تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر یہ کہنا کہ کون شخص تم میں سے میرا ساتھ دیتا ہے تاکہ وہی میرا خلیفہ و وزیر ہو اور پھر جب سب نے سکوت کیا اور علیؑ نے اقرارِ نصرت کیا تو رسولؐ کا یہ ارشاد فرمانا کہ "دیکھو یہ ہے میرا وصی و خلیفہ و وزیر" غیر مبہم طریقے سے بتلاتا ہے کہ (الف) رسولؐ خلافت کی قرارداد کا اختیار اپنے لیے سمجھتے تھے ورنہ آپ کو اس معاہدہ کا کوئی حق ہی نہیں پیدا ہوتا کہ جو شخص میری نصرت کا اقرار کرے گا وہی میرا خلیفہ و وزیر قرار پائے گا۔

(ب) یہ کہ جب علیؑ نے وعدۂ نصرت کر لیا تو اسی وقت معاہدہ کی تکمیل اور ولیعہدی و جانشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ اب جس وقت تک کہ یہ حکم منسوخ نہ ہو اس وقت تک اس سے تخلف کی کوئی گنجائش نہیں اور اسی بنا پر بعض روایات میں موجود ہے کہ جب اس کے بعد مجمع متفرق ہوا تو قریش جناب ابوطالب (حضرت علیؑ کے والد) سے بطور

تمسخر کہہ رہے تھے کہ لیجیے اب تو اپنے بیٹے کی اطاعت کیجیے۔ ان کو آپ پر حاکم مقرر کر دیا گیا۔

پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ پوری کارروائی رسولؐ کی جانب سے بنا بر وحی عمل میں آئی تھی جس کے متعلق قرآنِ مجید میں آیت موجود ہے:۔

”انذر عشیرتک الاقربین واخفض جناحک لمن اتبعک من المؤمنین“ (یعنی) ”اپنے قریب کے عزیزوں کو متنبہ کرو اور اپنے بازوؤں کو جھکا دو اُس شخص کے لیے جو مومنین میں سے تمہارا اتباع کرے۔“

اس میں صاف دو حکم نظر آرہے ہیں۔ ایک (عشیرتک الاقربین) کا انذار دوسرے اس شخص کے لیے جو اتباع کی حامی بھرے اور نصرت کا اقرار کرے ایک خاص قسم کا امتیاز جسے ”واخفض جناحک“ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے یہ ظاہر ہے کہ تمام مذہبی شعبوں میں ”وحی متلو“ یعنی قرآن کی ہدایتیں مجمل حیثیت رکھتی ہیں جن کی تفصیل رسولؐ کے عمل سے ہوئی ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے ”اقیموا الصلوٰۃ“ رسولؐ نے نماز پڑھ کے دکھلائی کہ نماز یوں پڑھی جاتی ہے ”کتب علیکم الصیام“ رسولؐ نے روزہ رکھ کر دکھلایا کہ اس طرح۔ ”للہ علی الناس حج البیت“ رسالتمآبؐ نے مناسکِ حج ادا کر کے ان کی تشریح کی۔ بہرحال جہاں تک دیکھا جائے مذہب کے ہر شعبہ میں قرآنی مندرجات ایک اجمال کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تشریح ہمیشہ افعالِ پیغمبرؐ سے ہوئی ہے۔

”واخفض جناحک لمن اتبعک“ کا جزو جو ”انذر عشیرتک الاقربین“ کے ساتھ لگا ہوا ہے اور جس سے باجماع مفسرین بعیتِ عشیرہ کا واقعہ مراد ہے صاف بتا رہا ہے کہ یہ ”واخفض جناحک“ کا حکم کوئی عام بات نہیں ہے جو اس موقع سے کوئی خصوصی تعلق نہ رکھتی ہو بلکہ اس کا تعلق اس موقع کے ساتھ ضرور ہے

"واخفض جناحك" کے معنی "حسن اخلاق سے پیش آنے" کے لینا رسولؐ کی وسعتِ اخلاق کی توہین کرنا ہے کیونکہ وہ رسولؐ تو ایسا تھا کہ جو کفار و مشرکین تک سے حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آتا تھا۔

یقیناً یہ "واخفض جناحك" جو "من اتبعك من المؤمنين" کے ساتھ مخصوص قرار دیا گیا ہے کسی طرح کے امتیازِ خصوصی کا پتہ دیتا ہے جو اس موقع پر اتباع کا اقرار کرنے والے کی ذات سے متعلق ہے۔ رسولؐ کے عمل سے ظاہر ہے کہ انہوں نے دونوں جزوں کا امتثال کیا اور اسی امتثال سے درحقیقت ان کے معانی کی تشریح ہوئی۔

انھوں نے اپنے اعزا و اقارب کو جمع کر کے تبلیغ و دعوت کے ساتھ "انذر عشيرتك الاقربين" کی ہدایت کو انجام دیا اور "لمن اتبعك من المؤمنين" کے لیے خصوصی حیثیت سے "واخفض جناحك" کے اتباع میں انہوں نے اتباع و نصرت کا اقرار کرنے والی ذات کے لیے ایک امتیاز خصوصی عطا کیا۔

معلوم ہوتا ہے رسولؐ "خفض جناح" (یعنی بازو جھکا دینے) کا مطلب سمجھے ایک طرح کے معاہدہ و اقرار کا بار اپنے کاندھوں پر لے لینا۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ خیال کرے کہ پیغمبرؐ نے خدا کے الفاظ سمجھنے میں غلطی کی "خفض جناح" کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے مگر اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ رسولؐ نے جو کچھ کیا وہ "نیک نیتی" کے ساتھ اپنے خیال میں "بر بنائے وحی" اب اگر اُن سے الفاظ وحی کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی تو خدا کا فرض تھا کہ وہ اُن کو اس غلطی پر متنبہ کرے اور اس کی اصلاح کر دے اور پھر وحی کے مفاد اور تبلیغ احکام خداوندی میں غلطی تو ایسی چیز ہے جسے غالباً جناب نیاز صاحب بھی رسولؐ کی ذات کے لیے غیر ممکن قرار دیتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ کی جانشینی کا یہ اعلان بر بنائے وحی تھا اور حکم خداوندی کی بنا پر تھا۔ جو وحی متلو یعنی قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔

(۲)

آیتِ ولایت۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

" انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون "

اس کے لیے ملاحظہ ہوں ذیل کے روایات :

الخطیب فی المتفق عن ابن عباس، عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابوالشیخ ابن مردویہ، عن ابن عباس، طبرانی فی الاوسط، ابن مردویہ عن عمار بن یاسر، ابوالشیخ ابن مردویہ عن علی بن ابی طالب - ابن ابی حاتم - ابوالشیخ - ابن عساکر عن سلمہ بن کہیل - ابن جریر عن مجاہد - ابن جریر عن السدی و عتبہ بن حکیم - طبرانی و ابن مردویہ ابونعیم عن ابی رافع ابن مردویہ عن ابن عباس -

(درمنشور للحافظ السیوطی جلد ۲ صفحہ ۲۹۳ ، ۲۹۴)

ان روایات میں متفقہ طور پر یہ مذکور ہے کہ یہ آیت اس موقع پر اُتری ہے، کہ جب حضرت علیؓ نے ایک سائل کو نماز میں انگشتِ شہادت کے اشارہ سے انگوٹھی دی تھی

فضا کے سیاسی تقاضا کی بنا پر علیؓ کی کوئی فضیلت بلامعارض تو رہ ہی نہیں سکتی تھی اس لیے اس آیت کی نسبت بھی بعض روایات دوسرے موجود ہیں مگر مذکورۂ بالا محدثین کی شہادتیں جو بہرحال علیؓ کے ساتھ کوئی جانبداری نہ رکھتے تھے اور نہ مذہبی حیثیت سے ان کو اس روایت کے گھڑنے کی ضرورت تھی ان دوسرے معارض روایات کو جو بجائے خود بھی متعارض ہیں، بالکل مشکوک بنا دیتی ہیں۔ اور اسی لیے تمام مفسرین اہلِ سنت اس روایت کے بالکل انکار کی گنجائش ہرگز نہیں پاتے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ "ولی" کے معنی ناصر و مددگار کے ہیں۔ حاکم و متصرف کے معنی مراد لینے کی کیا ضرورت ہے؟

بے شک کیا ضرورت ہے اگر قرائن کی بنا پر ان ہی معنی کا تعین نہ ہوتا ہو کیونکہ لفظ

مشترک کا کسی ایک معنی کے ساتھ تعلق ہمیشہ قرائن ہی کی بنا پر ہوتا ہے۔

یہاں مددگار و ناصر مراد لینے سے ایک تو خاص کوئی محصل اس آیت کا ہوتا ہی نہیں اس لیے کہ مددگار و ناصر تو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:۔

"والمؤمنون بعضہم اولیاء بعض" (یعنی مومنین آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں)، پھر اس میں تخصیص کے کیا معنی؟ اور پھر رسولؐ اپنے قول و عمل سے اسی لفظ کی حاکم و متصرف کے معنی میں تکرار کر کے برابر تفسیر کرتے رہے جیسے بریدہ کی روایت جس میں آپ نے فرمایا۔ "وھو ولیکم بعدی"

ان الفاظ کا تذکرہ کثیر التعداد روایات میں موجود ہے جن میں سے بعض "ہزنام" صاحب کے مضمون میں آ چکی ہیں۔ پھر جبکہ رسولؐ کے ان ارشادات میں واضح طور پر یہ معین ہے کہ ولی کے معنی حاکم و متصرف کے ہیں اور اسی بناء پر جناب مدیر نگار بھی تحریر فرماتے ہیں:

> "اس میں شک نہیں کہ رسول اللہؐ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب امیرؑ خلیفہ قرار دیے جائیں جیسا کہ آپ نے بارہا اشارۃً و کنایۃً کیا بلکہ ایک حد تک صراحتاً اس کو ظاہر بھی کیا۔"

اور جب کہ یہی "ولی" کا لفظ قرآن مجید میں بھی موجود ہے اور جبکہ بروایت مفسرین وہاں بھی ولایت کی صفت علیؑ کے لیے قرار دی گئی ہے تو پھر آخر رسولؐ کے ان ارشادات کے بربنائے وحی ماننے میں کیوں توقف کیا جاتا ہے؟ اتنا تو کم از کم ضرور ہی ثابت ہوتا ہے کہ رسولؐ نے اس "ولی" کے لفظ کے معنی جو قرآن میں ہے "حاکم و متصرف" ہی کے سمجھے اور اس سے مراد علیؑ ہی کی ذات قرار دی اور اس لیے وہاں چونکہ خدا و رسولؐ کے بعد ولایت میں علیؑ کا درجہ رکھا گیا تھا لہٰذا آپ نے بھی ارشاد کیا "ھو ولیکم بعدی"

اب اگر رسولؐ سے الفاظ کے سمجھنے میں غلطی ہوئی تو خدا کا فرض تھا کہ متنبہ کر دیتا اور اس غلطی پر رسولؐ کو برقرار نہ رہنے دیتا اور پھر الفاظ وحی کے غلط معنی سمجھنے کے

امکان کا رسولؐ کی نسبت غالباً کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

(۳)

آیتِ تبلیغ جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس"

"(یعنی) اے پیغمبرؐ پہنچا دو اس شے کو جو نازل کی گئی ہے تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کی رسالت کو کچھ پہنچایا ہی نہیں اور خدا لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا"

یہی وہ پُرزور حکم محکم ہے جس سے حضرت علیؑ کی ولایت کا منجانب اللہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور اسی کو غالباً "ہرنام" صاحب نے لکھا ہے کہ "شیعہ علیؑ کی امامت کے متعلق قرآنی ہدایت کو بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کرتے ہیں"

حسب ذیل روایات اہل سنت اس باب میں متفق ہیں کہ یہ آیت حجۃ الوداع میں ولایت علیؑ کی تبلیغ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

ابن ابی حاتم وابن مردویہ وابن عساکر عن ابن سعید الخدری، ابن مردویہ عن ابن مسعود ابن ابی حاتم عن عنترہ عن علی ابوبکر الشیرازی فیما نزل من القرآن فی علی عن ابن عباس، ابواسحق احمد بن محمد الثعلبی عن البراء بن عازب۔ محمد بن طلحۃ القرشی فی مطالب السئول باسناد الواحدی عبدالرزاق الرسعنی عن ابن عباس، نظام الدین النیشاپوری فی غرائب القرآن عن ابی سعید الخدری و ابن عباس والبراء بن عازب ومحمد بن علی السید علی الہمدانی فی مودۃ القربیٰ عن ابن عباس، نورالدین ابن الصباغ المالکی فی الفصول المہمۃ با نادالواحدی۔ بدرالدین العینی فی عمدۃ القاری جمال الدین المحدث الشیرازی فی کتاب الاربعین شہاب الدین ا مدفی توضیح الدلائل۔ محمد بن معتمد خان البدخشی فی

مفتاح النجا — وغیرہ۔

جو اشخاص اس بارے میں شک و شبہ کرتے ہیں وہ کسی خاص ایسے حکم کا پتہ نہیں دیتے جس کی تبلیغ کا اس زور شور کے ساتھ تاکیدی حکم ہوتا ہو۔ ان میں سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ "ما انزل الیک" سے قرآن و شریعت مراد ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ابتدائے زمانہ بعثت سے رسولؐ کی عمر گزری تبلیغ قرآن و شریعت کرتے کرتے توحید و رسالت اور معاد ایسے اصول دین سے لے کر نماز و روزہ حج و زکواۃ اور احکام معاملات و قصاص و دیات تک آپ نے سب کی تبلیغ کی اور کبھی نہ ہچکچائے، نہ پس و پیش کیا نہ کسی خوف و اندیشہ کے احساس سے متاثر ہوئے۔ پھر آخر اب ساری رسالت کی عمر ختم ہونے کے بعد یہ کہنے کے کیا معنی کہ اے رسولؐ تبلیغ کرو دین و شریعت کی اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو کچھ رسالت پہنچائی ہی نہیں ؟

کیا رسولؐ اب تک تبلیغ دین و شریعت نہ کر چکے تھے ؟ کیا آپ نے خداوندی پیغام دنیا کو نہ پہنچائے تھے ؟ کیا آپ نے احکامِ الٰہی سے لوگوں کو خبردار نہ کیا تھا ؟ پھر آخر اب اس حکم کا حاصل ؟

اور پھر تبلیغ رسالت کے معنی ہی تبلیغ دین و شریعت کے ہیں۔ اس کے بعد "ما انزل الیک" کو بھی دین و شریعت کے معنی میں لے لینا قرآنِ پاک کی آیت کو جسے مسلمان فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ کہتے ہیں معنی و مفہوم کے جوہر سے بے نیاز سمجھنا ہے۔

مفہوم آیت کا اس وقت یہ ہوگا کہ "اے رسول دین و شریعت کی تبلیغ کرو۔ اگر تم نے دین و شریعت کی تبلیغ نہیں کی تو تم نے دین و شریعت کی تبلیغ نہیں کی۔"

کیا یہ "دندانِ تو جملہ در دہاں اند، چشمانِ تو زیرِ ابرو اند۔" کا سا صحیح نمونہ یا اس سے بڑھ چڑھ کر نہیں ہے۔

الفاظ کی یہ ترکیب صاف بتلاتی ہے کہ "ما انزل الیک" سے کوئی خاص اہم حکم مراد ہے اور اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ یہ حکم ایسا اہم حکم ہے کہ اس کی اگر تم نے تبلیغ نہیں کی تو گویا تمام دین و شریعت کی تبلیغ نہیں ہوئی۔

اس کی مثالیں روزمرہ کی زبان میں برابر آتی رہتی ہیں۔ محل تاکید میں برابر کہتے ہیں کہ "تم نے اگر یہ کام نہ کیا تو کچھ کیا ہی نہیں"۔ اب وہ خاص حکم کیا ہے؟

آیت سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ حکم ایسا ہے جس میں خطرات پائے جاتے ہیں اور ان ہی خطرات کا اندیشہ رسولؐ کو اب تک اس حکم کی تبلیغ سے مانع رہا ہے اور درحقیقت رسولؐ حکیمانہ مصالح کی بنا پر اس کے منتظر تھے کہ اس طرح کا تاکیدی حکم خدا کی جانب سے آجائے تو آپ اس اہم اعلان کی طرف اقدام فرمائیں۔ پھر وہ خطرات کیا ہیں؟

یہ بھی آیت سے ظاہر ہے کہ خطرہ کسی آفت ارضی و سماوی، کسی بلائے ناگہانی، کسی آندھی، پانی کا نہیں ہے بلکہ لوگوں سے خطرہ ہے، لوگوں کی مخالفت سے صرف نہیں، بلکہ ضرر رسانی اور اتلاف جانی سے اور اگر ایسا نہ ہو تو "واللہ یعصمک من الناس" کے ٹکڑے کا کوئی محل نہیں ہے۔

آیت سورۂ مائدہ کی ہے جو حجۃ الوداع میں اترا ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمام قبائل عرب اسلام لا چکے تھے اور حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطیع ہو چکے تھے۔ یہود کی شورشیں ختم ہو گئیں۔ عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ میں صلح ہو چکی۔ مشرکینِ قریش کی جنگجویانہ روح خندق کے بعد ختم ہو گئی اور ان کی عداوت و عناد نے صلح حدیبیہ میں آخری سانسیں لیں جس کے بعد فتح مکہ میں اس کی حس و حرکت بالکل باقی نہ رہی۔

پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کا آخری سال اور آخری حج، ستر ہزار مسلمان مکۂ معظمہ میں آکر رسولؐ کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرنے میں مصروف۔ اس صورت میں یہ خوف و دہشت، یہ خطرہ

کا احساس یہود سے ہو نہیں سکتا۔ نصاریٰ سے ہو نہیں سکتا۔ مشرکین سے ہو نہیں سکتا، کیونکہ آیت سورۂ مائدہ کی ہے جو کسی قول، کسی روایت، کسی معمولی سے معمولی اسناد پر بھی ابتدائے اسلام کا نازل شدہ نہیں ہے بلکہ اسی موقع کا ہے جب اسلام کو انتہائی قوت حاصل ہو گئی تھی اور غیر مسلمین سے پیغمبرؐ کو کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔

پھر "واللہ یعصمک من الناس" کے الفاظ کیا یہی نہیں بتاتے ہیں کہ حکم کوئی ایسا تھا جس میں خود مسلمانوں کی جماعت سے خطرہ تھا اور ان ہی کے متعلق رسولؐ سے برگشتگی اور نقصان رسانی کا اندیشہ۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اقلیت کی مخالفت اور اکثریت کی موافقت کے ساتھ "الناس" کی تعمیم درست نہیں ہو سکتی اور نہ خطرہ کا کوئی محل ہے۔ بلکہ "واللہ یعصمک من الناس" کے الفاظ یہ بتلاتے ہیں کہ معاملہ ایسا تھا کہ جس میں جمہور رسولؐ کی رائے کے خلاف تھے اور آپ کو اس میں عام مخالفت کا خیال تھا۔

یقیناً مفسرین اس نقطہ سے ہٹ کر جو اکثر ارباب تفسیر میں متفقہ حیثیت رکھتا ہے آیت کے ان تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی خاص تاویل و تفسیر کر ہی نہیں سکتے۔

آیت اپنے تمام خصوصیات کی بنا پر صرف خلافت حضرت علیؑ کے بارے میں منطبق ہوتی ہے۔ رسولؐ کو اس معاملہ میں یقیناً عام مخالفت کا اندیشہ تھا۔ اور خود مسلمانوں کے بارے میں آپ کو احساس تھا کہ وہ اس سے ہرگز متفق نہیں ہوں گے جیسا کہ مدیر نگار نے تحریر فرمایا ہے کہ :-

"آپ اچھی طرح واقف تھے کہ جناب امیرؑ کا خلیفہ بن جانا آسان نہیں ہے اور اُن کے اتنے مخالف موجود ہیں کہ اس پر اصرار کرنا سخت فتنہ و فساد کا باعث ہوگا"۔ آگے چل کر آپ نے تحریر کیا ہے :-

"یہ فطرتِ انسانی ہے کہ جب ایک محبوب کے متعدد چاہنے والے ہوتے

ہیں تو اُن میں سے ہر ایک اپنا ہی درخور حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اگر اسے کسی خاص شخص سے زیادہ تعلق ہو جاتا ہے تو دوسروں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ رسالت مآبؐ جس خصوصیت کا اظہار جنابِ امیرؑ سے کیا کرتے تھے اسے فطرتاً تمام صحابہ کے لیے باعثِ رشک ہونا چاہیے تھا اور غالباً حقیقت سے انکار ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ جو عزت جناب امیرؑ کی رسول اللہؐ کے دل میں تھی، بالکل وہی دوسروں کی نگاہ میں تھی۔ اس کے علاوہ حضرت علیؑ کی طرف سے ایک عام جذبۂ ناپسندیدگی کا سبب یہ بھی تھا کہ غزوات میں سب سے زیادہ آپ ہی نے دشمنوں کو قتل کیا تھا اور شاید ہی کوئی خاندان یا قبیلہ ایسا ہو جو متاثر نہ ہوا ہو۔ ہر چند یہ جو کچھ ہوا سب اسلامی نقطۂ نظر سے تھا اور اس میں ذاتی اغراض و مقاصد کا مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا، لیکن اہلِ عرب اپنی کینہ پرور طبیعت کی وجہ سے مجبور تھے اور یہ کانٹا ان کے دل سے کسی طرح نہ نکلتا تھا۔“

ہرنام صاحب نے بھی اپنے ابتدائی مضمون میں کافی شواہد اس امر کے لکھے ہیں۔ کہ کس کس طرح صحابہ حضرت علیؑ کے معاملہ میں رسولؐ کے رویہ پر اعتراض و مخالفت کرتے تھے۔ نیز یہ کہ خود رسولؐ کو صحابہ کی نسبت اس معاملہ میں کتنی بے اطمینانی تھی اور آپ اپنی فراست کی بناء پر گویا دیکھ رہے تھے کہ کس طرح صحابہ آپؐ کے بعد علیؑ سے روگردانی کریں گے اور ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں گے۔

اس صورتِ حال کی بناء پر بے شک اصولِ درایت کے لحاظ سے بالکل قرینِ قیاس ہے یہی امر کہ حضرت رسولؐ کو اشارۃً و صراحتہً خاص خاص موقعوں پر علیؑ کی خلافت کا اظہار کرتے رہتے تھے لیکن آپ کو اس کے عمومی اعلان و اظہار میں خطرہ کا اندیشہ ہو اور آپ منتظر ہوں کہ خدا کی طرف سے پُرزور تاکیدی حکم

آئے جس کے بعد میرے لیے کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے تب میں اس کا سرانجام کروں۔

خدا نے بھی اس آیت میں اطمینان دہی کے طور پر یہ وعدہ نہیں کیا ہے اور نہ خبر دی ہے کہ تم جو کچھ تبلیغ کروگے اُسے سب تسلیم کرلیں گے اور اختلاف نہ کریں گے، بلکہ صرف یہ وعدہ کیا ہے کہ تمہاری جان کو ان کے ہاتھ سے کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس حکم کے خلاف مخالفانہ شورش برپا ہوگی اور اس کے مخالف بھی ہوں گے، مگر رسولؐ کی جان کو صدمہ نہیں پہنچے گا۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگر آیت کا مقصود یہی تھا تو اس میں صاف صاف علیؑ کے نصب وخلافت کا ذکر کیوں نہ کر دیا گیا اور نام لے کر تصریح کیوں نہ کر دی گئی۔

مگر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ متکلّم قرآنی کی ایک حکیمانہ روش تھی۔ اگر قرآن میں کہیں اس طرح کے مضامین کو صاف صاف نام کی تصریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہوتا تو اس وقت مسلمانوں کے قرآن بھی دو ہوتے۔ ایک قرآن میں وہ آیتیں درج ہوتیں اور ایک میں سرے سے وہ آیتیں درج ہی نہ ہوتیں۔ اس صورت میں جو کچھ حقیقت کا اظہار قرآنی آیات سے اس وقت ہو رہا ہے۔ اتنا بھی نہ ہوتا، اس لیے یہ قرآن کا ایک خاص حکیمانہ انداز تھا کہ اس نے اپنے مقاصد کو ایک طرح ابہام کے پردہ میں رکھا ہے لیکن قرائن ایسے قائم کیے ہیں جن سے ایک سنجیدہ غور کرنے والا انسان حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔

ورنہ یہ تو یقینی ہے کہ قرآن میں خاص خاص آیتیں منافقین کے تذکرہ پر مشتمل ہیں اور ان کا کوئی نہ کوئی مصداق ضرور ہے مگر نام نہیں لیا گیا۔ سورۂ طلاق وتحریم میں رسول اللہؐ کے بعض ازواج کی نسبت خاص خاص واقعات کی طرف اشارہ موجود ہے۔ ان کا بھی مصداق کوئی ہے مگر نام نہیں لیا۔

اسی طرح سیکڑوں آیات متعدد مواقع پر کثیر التعداد صحابیوں کی تنبیہہ، تعریف یا مذمت میں اتاری گئیں اور کہیں کسی ایک کا بھی نام نہیں آیا۔ تمام صحابۂ کرام میں صرف

زید بن حارثہ" کا نام قرآن میں لایا گیا۔ فلما قضی زید منہا وطرا زوجنا کہا۔ لیکن زید کی ہستی کسی حیثیت سے مسلمانوں کے درمیان محلِ اختلاف تھی ہی نہیں کیونکہ زید کی شہادت حیاتِ رسولؐ اللہ ہی میں ہو گئی اور اس مسئلہ کو ابھی مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلافی درجہ حاصل نہ تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کسی ایک جگہ بھی کسی کا نام موجود نہیں ہے۔

اس کی وجہ سے یہ تو کہا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ تمام آیات فرضی و تمثیلی افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا مصداق کوئی اس زمانہ میں تھا ہی نہیں بلکہ حقیقتاً مصداق ہر ایک کا معین تھا مگر قرآن کی "وحیِ متلو" میں اس کا نام نہیں ہے۔

اس کے لیے بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ نام تھے اور وہ حذف کر دیے گئے مگر میں اس کا قائل نہیں ہوں، میں اس کو جیسا کہ میں نے کہا قرآن کی ایک حکیمانہ کاروائی سمجھتا ہوں، جس میں مفادِ اسلامی کا پہلو مضمر تھا۔ بعض روایات میں بعض صحابہ کے قرآن میں جو کہیں کہیں بعض ناموں کا بہ تصریح اضافہ ہونا مذکور ہے۔ اسے میں "تفسیری نوٹ" کی حیثیت سے قرار دیتا ہوں۔ جس سے تعینِ مراد میں مدد ضرور مل سکتی ہے چنانچہ زیرِ بحث آیت کے متعلق بھی یہ روایت موجود ہے کہ ابنِ مسعود اس آیت کو بایں الفاظ پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ حضرت رسولؐ کے زمانہ میں وہ یوں ہی پڑھی جاتی تھی کہ:۔

یا ایّھا الرّسول بلّغ ما انزل الیک من ربّک ان علیّا
مولی المومنین) وان لم تفعل فما بلّغت رسالتہ

(درمنثور جلد ۲ صفحہ ۲۱۸)

اس سب کے بعد جہاں تک روایت و درایت کا تعلق ہے میں تو اس میں شک شبہ کی گنجائش ہی نہیں پاتا کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی خلافت ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کے بعد خدا کی ہدایت اس باب میں صراحتہً ظاہر ہے۔

* * *

(۴)

حدیثِ غدیر

جس کے متعلق جناب نیاز صاحب نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ" یہ شیعوں کے پاس ولایت جناب امیرؑ کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل "ہرنام" صاحب نے اپنے مضمون میں لکھی ہے۔ نیز جناب مدیر نگار نے بھی اپنے محاکمہ میں اس کی تکرار کی ہے یہ حضرت رسولؐ کا وہ صاف کھلا ہوا تاریخی اعلان ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ اور اس میں آپ نے یہ ارشاد کیا ہے کہ:۔

"خدا میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں، اور اس کے بعد جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولا ہے۔"

خود الفاظ سے ظاہر ہے کہ اس اعلان میں مذہبی شان پائی جاتی ہے یہ کوئی سیاسی مشورہ نہیں ہے نہ ذاتی اظہار خیال ہے بلکہ بحیثیت رسولؐ بحیثیت پیغمبرؐ آپ اپنے بعد کے لیے اعلان کر رہے ہیں۔

بعض لوگ حدیث کے معنی میں کلام کرتے ہیں اور اس لیے کہتے ہیں کہ "نص" نہیں ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ "نص" ہوتا تو اس کے اور کیا الفاظ ہو سکتے تھے؟

اس کے پہلے "وزیر" کہہ چکے "وصی" کہہ چکے "خلیفہ" کہہ چکے "ولی" کہہ چکے اب کہتے ہیں کہ "خدا میرا مولا ہے اور میں تمہارا مولا ہوں، اب جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؑ بھی مولا ہیں"۔

اس سے کیا پتہ نہیں چلتا کہ علیؑ کا مولا ہونا اسی طرح حاکم ومتصرف ہونے کی شان سے ہے جس طرح خدا کا اور رسولؐ کا؟ مگر تاویل کی دنیا تنگ نہیں ہے، طے

ہے کہ ہر معاملہ میں رسولؐ روزمرہ کی زبان میں بات چیت کرتے ہیں اور وہی معنی سمجھ لیے جاتے ہیں جو عام محاورہ کے مطابق اس لفظ کے ہیں۔ مگر اس معاملۂ خاص میں دربارۂ علی بن ابی طالبؑ جو کچھ رسولؐ کی زبان سے نکلے اس کو دوسرے معنی پہنا لیے جائیں۔

"خلیفہ" کہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے اہل و متعلقین میں وہ ان کی جگہ پر ہیں اور "وزیر" کہا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زندگی بھر وہ آپ کی کمر کو مضبوط رکھنے والے اور "وصی" کہا تو صرف آپ کے قرضوں کے ادا کرنے کے لیے اور "ولی" کہا تو بمعنی دوست اور "مولیٰ" کہا تو وہ "ناصر" کے معنی میں۔

اس طرح یقیناً ایک متکلم گنگ ہو جائے گا۔ الفاظ کا دفتر ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے مافی الضمیر معنی کسی کے ذہن نشین نہ ہوں گے۔ آج کل دنیا "درایت درایت" پکارتی ہے اور یہاں پر عقل سے کام نہیں لیتی کہ حضرت رسولؐ اپنا سفر قطع کرتے ہیں ہزاروں آدمیوں کو چٹیل بیابان میں، خاص تمازتِ آفتاب کے وقت مجتمع کرتے ہیں منبر پر جاتے ہیں، پرزور الفاظ میں تمہید قائم کرتے ہیں، اپنی وفات کی خبر دیتے ہیں۔ لوگوں سے اپنی ہر طرح کی سرداری، حکومت، لوگوں کے نفس پر کامل سلطنت کا اقرار لیتے ہیں اور اس کے بعد کہتے کیا ہیں! یہ کہ جس کا میں "دوست" ہوں اس کے علیؑ بھی "دوست" ہیں یا جس کا میں "مددگار" ہوں اس کے علیؑ بھی "مددگار" ہیں۔

آخر یہ کون سی ایسی بات تھی جو لوگوں کی طبیعتوں پر بار ہو جس کے لیے اپنے اختیارات جتلانے کی ضرورت ہو اور اپنی حکومت کے اقرار لینے کی حاجت؟ اس تمام کارروائی کا حاصل کیا ہوا اور یہ کون سی ایسی بات تھی جس کا اس شد و مد کے ساتھ اعلان ہو؟ پھر یہ کون سا ایسا امر تھا جس پر حضرت عمر بڑھیں اور جناب امیرؑ کو مبارکباد دیں کہ "هنيئاً لك اصبحت مولى كل مؤمن ومؤمنة" یعنی "مبارک ہو آپ کو کہ ہر مومن و مومنہ کے مولا قرار پا گئے" یہ مبارکباد کاہے کی ہے؟

اس کی ہے کہ آپ آج ہر مومن و مومنہ کے مددگار بن گئے"؟

کہا جاتا ہے کہ مولا کے معنی حاکم و متصرّف کے ہیں ہی نہیں۔ مگر نہیں ہیں وہیں تک کہ جہاں تک غدیر خم کے واقعہ کا تعلق ہے لیکن ادھر یہ موقعہ دل سے اترا اور کسی دوسری جگہ مولیٰ کا لفظ آیا، پھر اس کے معنی مالک، متصرّف، حاکم وغیرہ کے اقرار پا جائیں گے۔

ملاحظہ ہو تفسیر سراج منیر خطیب شربینی (مطبوعہ مصر ج ا ص ۴۰۸) سورۂ انعام:۔

"ثم ردّوا ای الخلق الی اللہ ای الی حکمہ وجزائہ مولاھم ای سیدھم ومدبر امورھم کلھا الحق ای ثابت الولایۃ وکل ولایۃ غیرہ تعالیٰ عدم"

یعنی قرآن مجید کی اس آیت میں کہ "ثم ردّوا الی اللہ مولاھم الحق" مولا کے معنی ہیں سید و آقا اور امور کا منتظم۔ حق کے یہ معنی ہیں کہ درحقیقت حکومت اسی کی برقرار ہے اور اس کے سوا ہر ایک کی حکومت کالعدم ہے۔

سورۂ یونس کی آیت :۔ "وردّوا الی اللہ مولاھم الحق" میں بھی لکھا ہے۔

"مولاھم ای ربھم ومتولی امورھم علی الحقیقۃ" یعنی مولا کے معنی ہیں مالک اور ان کے امور کا حقیقی منتظم" (سراج منیر جلد ۲ صفحہ ۱۶)

تفسیر بیضاوی میں بھی سورۂ یونس اور انعام دونوں جگہ اس کی تصریح ہے۔

تاج العروس شرح قاموس مصنفہ سید مرتضیٰ زبیدی (مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۳۹۹) میں ہے:۔

"المولیٰ ایضا الولی الذی یلی علیک امرک وھما بمعنی واحد ومنہ الحدیث ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن مولٰھا ورواہ بعضھم بغیر اذن ولیّھا وروی ابن سلام عن یونس المولیٰ فی الدّین

هوالولیّ وذالک قوله تعالیٰ ذالک بان الله مولی الّذین امنوا وان الکافرین لا مولیٰ لهم ای لا ولیّ لهم ومنه الحدیث من کنت مولاه فعلی مولاه ای من کنت ولیّه"

اس عبارت میں صاف تصریح موجود ہے کہ مولیٰ کے معنی صاحبِ اختیار اور حاکم کے ہیں اور یہ کہ مولا اور ولی دونوں مترادف حیثیت رکھتے ہیں۔

اگر واقعات کا مطالعہ کرنے والا بے لوث نگاہ رکھتا ہو تو وہ صاف سمجھے گا کہ رسولؐ نے حضرت علیؑ کی خلافت، حکومت و جانشینی کا اعلان کیا اور لوگوں نے بھی اس وقت یہی سمجھا اور اسی لیے حضرت علیؑ کو مبارکبادیں دیں۔

* * *

ان کے علاوہ بھی متعدد احادیث کو شیعہ اپنے مدعا کے اثبات میں پیش کرتے ہیں اور پیش کرنا درست بھی ہے۔ جیسے حدیث منزلت جس میں حضرت رسولؐ نے جناب امیرؑ کو مخاطب کرکے اشارہ کیا ہے۔

"کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے حاصل تھی۔ سوائے اس کے میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے"

یہ حدیث آپ نے اس وقت ارشاد فرمائی ہے جب غزوۂ تبوک میں رسول اللہؐ نے اپنے ساتھ تمام صحابہ کو چلنے کا حکم دیا تو حضرت علیؑ کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ مدینہ ہی میں قیام کریں۔

اگر آخر کا فقرہ "الّا انّہ لا نبیّ بعدی" نہ ہوتا تو شاید کہا جا سکتا تھا کہ منزلت ہارونی کا تعلق صرف اتنے زمانہ سے تھا جب آنحضرتؐ تشریف لیے جا رہے تھے مگر اس جملہ نے آکر اپنے قبل میں تعمیم کا پتہ دے دیا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ہارونؑ موسیٰؑ کے جانشین اور نائب اور شریکِ کار تھے بیشک

اگر نبوت کا سلسلہ رسولؐ کے بعد قطع نہ ہوتا تو نبوت بھی جنابِ امیرؑ کے لیے ثابت ہوتی۔ لیکن چونکہ نبوت کا دروازہ بند ہوگیا اس لیے خلافت و جانشینی بہ شکلِ امامت آپ کے لیے ثابت رہے گی۔

حدیثِ ثقلین جس کو خصوصیت کے ساتھ آنحضرتؐ نے علیؑ بن ابی طالب کے اعلانِ ولایت کے موقع پر بھی بیان فرمایا۔ اور اس کے بعد اپنے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے بعد بھی ارشاد کیا۔ اس میں تمام امت کو جن میں اس وقت تو صحابۂ کرام ہی تھے اور تمام اکابر داخل تھے اہل بیتؑ کے ساتھ تمسک کا حکم دیا۔ اور یہ کہ ان کا دامن چھوڑو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امت نے اس کے اوپر عمل کس طرح کیا اور اس پر عمل کی صورت کیا تھی؟ جبکہ مذہبی اور سیاسی دونوں طرح کی پیشوائی خلفائے وقت کے لیے حاصل تھی جس کے بعد اہل بیتؑ کی حیثیت ایک معمولی امتی سے زیادہ نہ رہی تھی اور کوئی امتیاز خصوصی ان کے لیے ہرگز حاصل نہ تھا۔

یہ احادیث بے شک "وحی متلو" کی حیثیت نہیں رکھتے یعنی حدیث اور قرآن میں امتیاز ضرور ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ قرآن کا تعلق فرمانِ خداوندی سے ہے اور دوسرے کا رسول اللہؐ کی ذاتی رائے سے۔ احادیثِ رسولؐ بھی اکثر بربنائے وحی ہوتے تھے لیکن خود وحی میں یہ تفرقہ ہے کہ وہ کبھی "وحی متلو" کی حیثیت رکھتی تھی جس کو کہتے ہیں "قرآن" اور کبھی "وحی غیر متلو" جس کی مظہر ہے حدیث۔ اس لیے اکثر مسائل مذہبی یعنی روزہ اور نماز وغیرہ ایسے خالص عبادات کے احکام بھی احادیث سے ثابت ہوتے ہیں حالانکہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے خود مقالہ نگار بھی قائل ہیں کہ رسولؐ کے احکام تمام بربنائے وحی ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ حدیثِ ثقلین کے بیان فرمانے میں غدیرِ خم والے خطبہ میں خود

آنحضرت صلعم نے صاف صاف اس کو خداوندِ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے۔
ارشاد ہوتا ہے:۔ "قد نبّأنی اللطیف الخبیر انهما لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض"

(یعنی) "مجھ کو خدائے تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں (قرآن اور اہل بیتؑ) ہرگز جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوں"۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا اعلان اہل بیتؑ کے بارے میں صرف اپنی ذاتی رائے سے نہ تھا، بلکہ وحی خداوندی کی بنا پر تھا جس کے بعد شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

چوتھا سوال

مسئلۂ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے؟

میرے خیال میں وہی تعلق جو ایک اہم مذہبی حکم کو کسی مذہب کے ساتھ ہو سکتا ہے جناب مدیرِ نگار کی رائے ہے کہ:۔

> "کہ اس کا مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ اصولاً ہونا چاہیئے بلکہ اس کا تعلق صرف سیاسیات سے تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کلامِ مجید اس مسئلہ میں ساکت ہے یعنی رسول اللہؐ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا۔
>
> اس میں شک نہیں کہ رسول اللہؐ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب امیرؑ خلیفہ قرار دیے جائیں — لیکن — اس نامزدگی کی حیثیت صرف ایک

ذاتی رائے کی ہی تھی جس کو وحی سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یوں تو بارہا رسول اللہؐ نے جناب امیرؑ کو ولی، مولیٰ وصی وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا۔ لیکن جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں خاموشی اختیار کر لی ۔ اگر رسول اللہؐ کی یہ خواہش کسی وحیٔ الٰہی کا نتیجہ ہوتی تو آپ بلا پس و پیش نہایت صاف الفاظ میں اس کا اظہار کر جاتے اور وہ الفاظ کلامِ مجید میں بھی ہوتے ۔ اگر حضراتِ شیعہ کے قول کو صحیح باور کیا جائے تو ہم کو حسبِ ذیل باتیں معارض نظر آتی ہیں :-

۱- اگر خلافت جناب امیرؑ کے متعلق کوئی نصِ قطعی موجود ہوتی تو اسے کلامِ مجید میں ہونا چاہیئے تھا، حالانکہ نہیں ہے ۔

۲- اگر واقعی فرمانِ خداوندی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ حضرات شیعہ سمجھتے ہیں تو علاوہ اس کے کہ دیگر احکام کی طرح نہایت صاف و واضح الفاظ میں اس کا ذکر کلامِ مجید میں ہوتا۔ رسول اللہ خود اپنے سامنے ہی حضرت علیؑ کی باقاعدہ خلافت سب لوگوں سے تسلیم کرا کے رخصت ہوتے ، حالانکہ یہ بھی تاریخ سے ثابت نہیں۔

۳- اگر یہ کوئی خالص مذہبی مسئلہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ خود اس سے واقف ہوتے اور چونکہ وہ احکامِ مذہبی کے نہایت سخت پابند تھے اس لیے وہ باوجود تمام مخالفتوں کے اپنی خلافت کی کوشش ضرور کرتے ۔ لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کر لی تو آپ خاموش ہو رہے ۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کیے لیتے ہیں کہ آپ نے خود حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، لیکن آپ کا اس بیعت کو گوارا کر لینا اسی سے ظاہر ہے کہ آپ صحابہ کے تمام مشوروں میں شریک ہوتے تھے اور اکثر آپ کی رائے پر عمل بھی کیا جاتا۔

اگر حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کو غاصب خلیفہ سمجھتے یا ان کی خلافت آپ کے نزدیک خلاف منشاءِ خداوندی ہوتی تو کم از کم آپ یہ ضرور کرتے کہ ان سے ہمیشہ کے لیے کٹ کر علیحدہ ہو جاتے اور مراسمِ موالات ترک کر دیتے، اگر جنگ کرنا مناسب نہ تھا، اگر یہ تمام زمانہ واقعی غاصبانہ دورِ خلافت کا تھا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایسا مبغوض عہد تھا جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا تھا نہ اس کا رسولؐ۔ لیکن حیرت ہے کہ جناب امیرؑ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں بسر کر دیا۔ اور انھوں نے نہ کبھی صدائے احتجاج بلند کی اور نہ منشاءِ خدا اور رسولؐ کو پورا کرنے کی کوشش کی ـــ حضرت علیؓ کا خلفائے ثلاثہ کے زمانہ میں حد درجہ امن پسندانہ زندگی بسر کرنا اور سب کے ساتھ صلاح و مشورہ میں شریک ہونا سوائے اس کے اور کسی سبب کی بناء پر نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ مسئلۂ خلافت کو خالص مذہبی مسئلہ نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو سیاسی معاملہ جان کر واقعات و حالات کے لحاظ سے اپنی خلافت پر زور دینا یا اُس کے لیے کوشش کرنا مناسب خیال نہ فرماتے تھے۔"

مذکورہ بالا عبارت میں جس شد و مد کے ساتھ اس کا ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ مسئلۂ خلافت کوئی مذہبی مسئلہ نہ تھا وہ ناظرین کے پیش نظر ہے۔ اس کے سامنے ایک کاتب کے قلم میں بڑی طاقت کی ضرورت ہے۔ کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر سکے۔

آفرین ہے جناب "ہرنام" صاحب کو کہ اُنھوں نے باوجود اجنبیت اور اظہارِ عجز و اعترافِ قصور کے اپنے آخری مضمون میں اس بحث کے اکثر پہلوؤں کو اتنی خوبصورتی سے روشن کیا ہے جس کے بعد کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں۔

اُنھوں نے کہا ہے کہ خلافت کا تعلق مذہب سے اسی وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اسے صرف سیاسیات کے شعبہ سے متعلق رکھا جائے لیکن خلافت

کی حیثیت اس سے مختلف ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کی جانب سے اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ یہ کہ :—

"ھیَ نیابۃ عن النّبی فی امور الدین والدّنیا"، تو اس کا تعلق مذہب سے ظاہر ہے۔

اُنھوں نے واقعات کی بنا پر یہ بھی دکھلایا ہے کہ پیغمبرؐ نے اس کو بطور ایک سیاسی مسئلہ کے پیش نہیں کیا تھا۔ بلکہ معیارِ نجات بتایا تھا۔ اور اس پر آخرت کی باز پُرس کا حوالہ بھی دیا تھا جس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے اور خالص سیاسی مسئلہ نہیں ہے۔ جنابِ "ہمنام" کا مذکورہ بالا استدلال یقینی بہت مضبوط ہے۔ جس سے ان کی نکتہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ کہنا کہ "کلامِ مجید اس مسئلہ میں ساکت ہے"، اسی وقت تک حق بجانب قرار پاسکتا ہے جب تک حقیقت پر اطلاع نہیں ہے۔ لیکن گذشتہ سوال کے جواب میں ہمارے بیانات نے یہ امر بالکل صاف کر دیا ہے کہ کلامِ مجید اس مسئلہ میں ساکت نہیں ہے اور یہ کہ رسول اللہؐ کی تبلیغ اس باب میں وحی الٰہی اور ہدایتِ خداوندی پر مبنی تھی۔

اگر رسول اللہؐ کی نامزدگی کی حیثیت صرف ایک ذاتی رائے کی حیثیت رکھتی تو آپ کو صاف صاف اس کا اظہار کرنا چاہیئے تھا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ آپ کو یہ ہرگز روا نہیں تھا کہ بطور مذہبی حکم اس کا اعلان کریں اور اسے نجات اور فلاحِ اخروی کا معیار قرار دیں۔ کیونکہ ایک نبی سے اگر خطاء اجتہادی ممکن بھی ہو تو بھی یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک غیر مذہبی چیز کو مذہبی لباس میں پیش کرے کیونکہ یہ ایک بدترین فریب دہی اور تلبیس ہے جس کا ایک دیانتدار آدمی کبھی مرتکب نہیں ہوسکتا۔

یہ کہنا کہ "جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں

خاموشی اختیار کر لی"۔ یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے جس کے متعلق ہر نام صاحب اپنے مضمون میں روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ فرقۂ شیعہ کے قول کے لیے جو باتیں بطور معارض پیش کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ہے۔

خلافت جناب امیرؑ کا اعلان بربنائے وحی تھا اور وہ وحی قرآن میں بھی موجود ہے اور رسولؐ نے بھی اس کا اظہار کیا اور عام مجمع کے سامنے اعلان کیا۔ روایت میں موجود ہے کہ آپ نے سب سے اقرار لیا۔ کہ کیا میں تم سب کا مولا نہیں ہوں؟ جب سب نے اقرار کیا تب آپ نے یہ کہا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔

اس سے بڑھ کر اعلان کرنے اور اقرار لینے کی کیا صورت ہو سکتی تھی جبکہ قرآن نے رسولؐ کے فرائض کو بھی اس سے زیادہ نہیں بتلایا ہے۔ ارشاد کیا ہے:- "وَمَا عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلَاغ" نیز یہ بھی کہا ہے کہ رسولؐ کا کام جبر کرنا نہیں ہے۔ "وَمَا انت علیھم بمصیطر"

اور ایک جگہ ارشاد ہوا ہے۔ "انت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین"

اس اصول کے مطابق یہاں رسولؐ پر فرض یہی عائد کیا گیا تھا کہ وہ تبلیغ کریں۔ "یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک"۔ چنانچہ انھوں نے تبلیغ کر دی اور اتنے غیر معمولی اور اہم طریقہ سے کسی حکم کی اس سے پہلے تبلیغ نہیں کی تھی۔ پھر اب اس کے بعد رسولؐ کیا کرتے اور کس طرح لوگوں سے تسلیم کراتے۔

* * *

حضرت علیؑ ضرور واقف تھے کہ یہ مذہبی مسئلہ ہے لیکن ہر مذہبی حکم کے اجرار کے لیے ہر حال میں خونریزی اور مسلمانوں کا قتلِ عام تو روا نہیں ہے۔ آپ فضا سے خوب واقف تھے آپ جانتے تھے کہ اس وقت ہوا کا رُخ کدھر ہے اور سیلاب کا بہاؤ کس طرف؟

آپ کو معلوم تھا کہ اس وقت اس حق کا حصول اور اس فرضِ مذہبی کا قیام بغیر عظیم کشت و خون کے نہیں ہوسکتا اور اس طرح کا ہنگامہ پیدا ہوجانا اس وقت اصل اسلام ہی کے لیے سببِ فنا۔

آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایک مذہبی مسئلہ کے متعلق رہنمائی کا فرض کس طرح پورا ہوتا ہے؟ صرف تبلیغ و تلقین سے جس کی تمام منزلوں کو پیغمبرؐ خود طے کرچکے تھے جس سے اتمامِ حجت پورے طور پر ہوچکی تھی۔

آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں کی جماعت میں خود حضرت رسولؐ کے زمانہ میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جن کے دلوں میں روحِ اسلامی جاگزیں نہیں ہوئی تھی۔ جو ذرا ذرا سی بات پر پیچھے پلٹ جانے پر تیار تھے جو رسولؐ پر احسان جتلاتے تھے کہ ہم آپ پر اسلام لائے۔ جن نگاہوں میں احکامِ مذہبی کی وقعت اتنی سُبک تھی کہ رسولؐ کے پیچھے سے نمازیں توڑ کے باجا دیکھنے چلے جاتے تھے اور رسولؐ کو اکیلا چھوڑ دیتے تھے، جو کفار و مشرکین کو خبر رسانی کرتے تھے، جو سامنے آکر کہتے تھے کہ ہم آپ پر ایمان لائے اور پیچھے مذاق اڑاتے تھے اور تمسخر کرتے تھے، جو رسولؐ کی طرف گمراہی کی نسبت دیتے تھے، جو آپ کی باتوں پر اعتراض کرتے تھے اور نبوت میں شک کرتے تھے، لیکن آنحضرتؐ نے ان تمام باتوں کو گریز کیا۔ ان لوگوں پر کبھی تشدد نہیں کیا۔ ان کو اپنی جماعت سے باہر نہیں نکالا، ان پر کبھی تلوار نہیں چلائی، بلکہ ان کے رازہائے درونِ پردہ کو نام لے کر اپنی جانب سے ظاہر بھی نہیں کیا۔ صرف

اس لیے کہ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں تو یہی سہی ظاہری اسلام کے نام لیوا ہیں یہی سہی۔ قومیتِ اسلامی کی تشکیل ہوگی تو ان میں کھرے افراد پیدا ہو ہی جائیں گے۔

یقیناً اگر حضرت علیؑ اپنے پیش رو کے حقیقی جانشین تھے تو ان کو اسی تعلیم کو پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا اور اگر آپ ایسا نہ کرتے تو آپ کی خلافت حقیقی کی صحیح شان ہی باقی نہ رہتی۔

بے شک جس طرح رسولؐ کا فرض تھا کہ وہ غلطیوں پر ٹوکتے رہیں لغزشوں پر متنبہ کریں کجرویوں کا اظہار کرتے رہیں اور حقیقت کا انکشاف کرتے رہیں اور بس اسی طرح حضرت علیؑ کا بھی فرض تھا کہ وہ اختیار کردہ رویہ سے اپنی ناراضگی نیز اس طرزِ عمل کی غلطی کا اظہار کر دیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا کیا۔

اگر شیعوں کی روایت کو نہ بھی مانا جائے کہ حضرت علیؑ نے بالکل حضرت ابی بکر کی بیعت نہیں کی تب بھی اتنا تو بر بنائے روایت امام بخاری مسلّم ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہؑ کی زندگی تک قطعی بیعت نہیں کی۔ اس لیے کہ اس وقت تک آپ کی کچھ نہ کچھ وجاہت مسلمانوں میں سمجھی جاتی تھی لیکن جب حضرت فاطمہؑ کا انتقال ہو گیا تو لوگ آپ سے بالکل رو گرداں ہو گئے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسولؐ کی اس بیٹی نے جس کو حضرت "سیدۃ نساء العالمین" فرما گئے تھے اور "بضعۃ منی" کے لفظ سے یاد کر گئے تھے اس نے مرتے مرتے تک اس بیعت کو تسلیم نہیں کیا اور حضرت علیؑ نے بھی اپنی ناراضگی کا ثبوت پیش کیا۔

بقول بعض اہلِ تحقیق حقیقت یہیں سے منکشف ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی متفقہ حدیث ہے: "من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ جاھلیۃ"

(یعنی) جو شخص مر جائے اور اپنے امام زمانہ کے ساتھ معرفت و عقیدت نہ حاصل

کرے اس کی موت جاہلیت کی موت ہے"۔ اب مسلمانوں کو غور کرنا چاہیئے، اپنے رسولؐ کی مقدس بیٹی "سیدۃ نساء العالمین" کی موت کے بارے میں جو بغیر خلیفہ وقت کی اطاعت کے حاصل ہوئی۔

اگر سیدۂ عالمؑ کی ذات کو اس حدیث کی زد سے الگ کرنا ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ خلافت مذہبی حیثیت سے درست نہ تھی۔ اسی طرح حضرت علیؑ کا صرف ایک دن کا توقف بھی قبولِ بیعت میں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ اس کو صحیح خلافت نہ سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ موت کے اندیشہ سے کوئی بشر کسی وقت خالی نہیں ہے اور ایک امامِ جائز کی اطاعت سے انحراف کی صورت میں موت بہرحال موتِ جاہلیت ہوتی ہے رہ گیا حضرت علیؑ کا ان حضرات کے مشوروں میں شریک ہونا۔ ان کو صحیح رائے بتلانا اور ان کی موقع بہ موقع رہنمائی کرنا، یہی تو درحقیقت دلیل ہے حضرت علیؑ کی اس طہارتِ ضمیر اور ہمدردئ اسلامی کی جو آپ کو حقیقی جانشینِ رسولؐ و محافظِ اسلام کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

جبکہ حالات کی بناء پر رسولؐ کے اس حکم سے انحراف ہوگیا جو آپ نے خلافتِ علیؑ کے اعلان کی صورت میں دیا تھا اور لوگوں نے اس فرض کی انجام دہی سے عدول کیا تو اب اگر کوئی خود غرض، پست طبیعت اور چھوٹے نفس کا انسان ہوتا تو اس کے بعد بددل ہو کر اسلام اور مسلمین کی خدمت سے بالکل جدا اور بقول مدیر نگار کٹ کر ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہوجاتا لیکن اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا کہ اس شخص کی قدیم خدمات اور اسلام کے ساتھ ہمدردیاں صرف حصولِ خلافت کی امید میں تھیں۔

نیز اگر مسلمانوں نے کسی ایک حکم مذہبی کی مخالفت کی تو اس کا یہ اثر تو نہیں ہونا چاہیئے کہ اب اسلام کے دوسرے احکام کو بھی بدل جانے دیا جائے یا خود مذہب اسلام کے صدمات کو گوارا کر لیا جائے۔

حضرت علیؑ کے مشورے ہمیشہ یہی دو حیثیتیں رکھتے تھے۔ ایک جب کبھی کوئی مسئلہ شرعی پیش ہوا اور دربارِ خلافت سے حکم خداوندی کے خلاف فیصلہ ہونے لگا اس وقت موقع ملا تو علیؑ نے اصلاح کی اور دوسرے یہ کہ مفادِ اسلامی کو کسی جنگ یا دوسری طرح کی دشواری میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا تو آپ نے صحیح مشورہ دیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ حفاظتِ اسلام اور صیانتِ مذہب کی ذمہ داریاں آپ کے ساتھ وابستہ تھیں جنھیں آپ کسی نہ کسی طرح انجام دیتے تھے اور یہی وہ حقیقی خلافت و امامت ہے جو ان کے لیے محفوظ تھی۔ اور جس کے فرائض وہ کسی نہ کسی پردہ میں ادا ضرور کرتے تھے۔ اگرچہ ظاہری خلافت یعنی مسندِ حکومت پر دوسرے افراد نے قبضہ بھی کرلیا ہو۔

حضرتِ رسولؐ کا سلوک منافقین کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو اکثر آپ کی حکم عدولی کرتے رہتے تھے صاف اسی رویہ کا مظہر ہے۔

آپ نے باوجود ان کے مخالفانہ حالات کے کبھی ان سے ترکِ موالات نہیں کیا۔ اور ہمیشہ اصلاح کی کوشش فرماتے رہے۔ اسی طرح جانشینِ رسولؐ حضرت علیؑ۔

اس میں کیا کوئی شبہ ہے کہ منافقین کی زندگی کا تمام دور مبغوضِ الٰہی ہے جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا ہے نہ اس کا رسولؐ۔ پھر کیا حیرت کا اظہار کیا جا سکتا ہے اس امر پر کہ حضرت رسولؐ نے اپنی عمر کا کثیر حصہ ان غیر اسلامی افراد کے ساتھ بسر کیا۔

یقیناً اگر رسولؐ کا منافقین کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا اور اسلامی سلوک کرنا ان کے نفاق کی تائید نہیں ہے جبکہ آیاتِ قرآنی ان کو ان کے نفاق پر متنبہ کرتی رہتی تھیں۔ تو اسی طرح حضرت علیؑ کا تعلقاتِ معاشرت قائم رکھنا ان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے مسئلہ خلافت میں رسولؐ کی مخالفت کی ان کے اس اقدام کی تائید نہیں قرار پا سکتی جبکہ آپ نے اس پر احتجاج کیا اور اظہارِ اختلاف کر دیا۔ اور جس طرح اُن

کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ اُن کو آخرت میں رستگار و نیک کردار بنانے کا ضامن نہیں ہے اسی طرح اُن اشخاص کے ساتھ حضرت علیؑ کا یہ حسنِ سلوک ان کے نجاتِ اُخروی اور نیکوکرداری کا ہرگز ثبوت نہیں ہے۔

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس دور میں اصل خلافتِ اسلامی کے معاملہ میں کتنا ہی حکمِ خداوندی سے کنارہ کشی کی گئی ہو مگر دوسرے معاملات میں اپنے حدودِ علمی کے اندر بہت حد تک ظواہرِ اسلامی محفوظ رکھے جاتے تھے۔ اور پابندیٔ شریعت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یعنی شریعتِ اسلام اور احکامِ خداوندی کے ساتھ کھلم کھلا بغاوت کا اعلان نہیں تھا۔ محرمات و کبائر کی تلقین نہیں تھی۔ بلکہ ان کے اوپر حدود کا اجراء کیا جاتا تھا اور بغیر کسی تاویل و توجیہ کے اس سے اغماض نہیں برتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے حقیقتِ اسلام کو کتنا ہی صدمہ پہنچا ہو لیکن بہرحال اسلام کی ظاہری صورت محفوظ تھی اور چونکہ اس وقت تلوار اٹھانے کی صورت میں یقیناً اسلام کی عمر ختم ہی ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے علیؑ ایسے محافظِ اسلام نے تلوار نیام میں رکھی اور ۲۵ برس کی طویل مدت اپنے حقوق کی پامالی اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں گزار دی اور خاموش فضا میں ذرا بھی سنسنی پیدا نہیں کی۔

نفسیاتی حیثیت سے دیکھنے کے قابل ہے یہ بات کہ ایک بہادر اور شیر دل انسان جس کی عمر بچپنے سے لے کر جوانی اور بھرپور جوانی تک برابر میدانِ جنگ میں گزری جس کی تلوار سے برابر خون ٹپکتا رہا اور جس نے سینکڑوں آدمیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ اسی کے ساتھ جس نے کبھی شکست نہیں کھائی بلکہ ہمیشہ فتح پائی۔ وہ ایک مرتبہ پچیس برس تک اتنا خاموشی پسند ہو جاتا کہ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ تحریک اس کی جانب سے عمل میں نہیں آتی اور کسی جنگجویانہ رویہ کا اظہار اس کی طرف سے نہیں ہوتا۔

کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ علی ایک جذباتی انسان نہیں تھے، انھوں نے خون کے دریا بہا دیے۔ مگر جوشِ غیظ و غضب کی بناء پر نہیں بلکہ فرض کا احساس کر کے اور

سکوت اختیار کیا تو کمزوری سے نہیں بلکہ مصلحت کا احساس کر کے۔

انھوں نے یہ دیکھا کہ وہی اسلام جس کی حفاظت اس وقت تلوار کھینچ کر کی جا رہی تھی اسی کی حفاظت اس وقت تلوار کو نیام میں رکھنے پر موقوف ہے اس لیے آپ نے اسلام کی موجودہ ظاہری صورت کی بقاء کو غنیمت سمجھا اور فوج کشی و شمشیر زنی سے پرہیز کیا۔

بے شک جب یہ خلافت بنو امیہ تک پہنچی اب اسلام کے ظاہری شعائر بھی مٹائے جا رہے تھے۔ اب احکامِ مذہبی کے مقابلہ میں کھلم کھلا مخالفت ہو رہی تھی۔ اب شریعت کے مقابلہ میں صاف بغاوت کا اعلان تھا۔ اس لیے ان ہی علیؑ کے فرزند حسینؑ نے کربلا کے معرکہ کو برپا کر کے دنیا کو دکھلا دیا کہ اسی اسلام کی حفاظت کے لیے جس طرح ایک وقت میں فاتحانہ شان سے جنگ کی جا سکتی ہے۔ جس طرح ایک وقت میں مظلومانہ شان سے سکوت کیا جا سکتا ہے اسی طرح ایک وقت میں مقہورانہ اور بیکسانہ شان سے قتل بھی ہوا جا سکتا ہے۔

البتہ حضرت علیؑ نے ابتدائی دور میں جنگ مناسب نہیں سمجھی لیکن آپ نے اپنے حقِ خلافت کے اظہار سے بھی کبھی چشم پوشی نہیں کی نیز کسی دوسرے کے انعقادِ خلافت کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لی۔ یہاں تک کہ تیسرے دور میں جب مجلسِ شوریٰ کے اندر آپ کو بھی ایک رُکن قرار دیا تو آپ نے خاموشی کے ساتھ ووٹ بحق حضرت عثمان نہیں دیا۔ بلکہ پورے شدّ و مد کے ساتھ اپنے حقِ خلافت کو مرجح ثابت کیا۔ اور وہ تاریخی خطبہ پڑھا جو دنیائے تاریخ میں یادگار رہے گا۔ جس میں تمام احادیث فضائل کو بھی ایک ایک کر کے پیش کیا ہے۔ اور غدیر نیز دوسرے موقعوں کے صریحی اعلانات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور جب جناب عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ سیاسی چال چلی کہ جو شخص اپنے تئیں خلافت سے علیحدہ کرے وہ حُکم ہو جائے تو حضرت علیؑ

نے فیصلہ اپنے خلاف ہوجانا گوارا کیا۔ جو صورتِ حال کی بنا پر پہلے سے یقینی تھا لیکن خود اپنے تئیں خلافت سے علیحدہ کرنا گوارا نہیں کیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری کو جہاں تک کے پُرامن طریقہ سے ہو سکتا تھا برابر پورا کرتے رہے اور مسلمانوں کی گمراہی کے اسباب میں خود عملی طور پر شریک نہیں ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ خلفاء کے ساتھ حقیقتاً اتحاد رکھتے تھے اور آپ کو کوئی ناگواری اُن حضرات کی خلافت سے نہ تھی۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ بہادر جرنیل جو ابتدائے بعثت سے لے کر رسولؐ کے آخر عمر تک برابر ہر لڑائی میں علمدار یا سپہ سالار رہا ہو جس نے کبھی شکست کی صورت نہ دیکھی ہو جس کی شجاعت کا بہادرانِ عرب کے دل پر سکہ ہو، رسولؐ کے بعد اتنی لڑائیاں ہوجائیں روم و شام کے ممالک فتح ہوں، ایران و عراق پر اسلامی فوج کشی ہو اور قبائل سے اسلامی جہاد، مگر وہی بہادر، ہاں وہی جرنیل اس پوری طویل مدت میں کسی ایک لڑائی میں بھی شرکت نہ کرے، بالکل علیحدہ رہے اور ایسا معلوم ہو کہ اس کے بازوؤں کی طاقت سلب ہوگئی، اس کے دل کی ہمت جاتی رہی اور اس کی تلوار کُند ہوگئی۔

فوجوں کی سپہ سالاری نئے نئے جرنیلوں کے سپرد ہو۔ خالد بن الولید سیف اللہ ہوجائیں، سعد بن الوقاص فاتح عراق و ایران مشہور ہوں مگر علیؑ کا کہیں نام نظر نہ آئے۔ بے شک کسی خاص موقعہ پر جب کوئی ایسی ہی ضرورت پیش آئے اور دربارِ خلافت کی طرف سے مشورہ کے لیے بُلائے جائیں تو چلے جائیں اور اس وقت صحیح مشورہ دیدیں۔

یہ رزم کا تذکرہ تھا اور جہاد کا مرحلہ، اب علمی کارنامہ کا حال سنو کہ قرآن کے جمع و تالیف ایسی اہم خدمت جس پر مسلمانوں کی ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کا انحصار اور علیؑ کی ایسی ذات جس کے متعلق حضرت رسولؐ نے ارشاد کیا ہو:" انا مدینۃ العلم وعلیؑ بابہا"

اور خاص طور سے علم القرآن کی یہ فرما کر گواہی دی ہو کہ :-
"علیؑ مع القرآن والقرآن مع علی" اور "لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض" کے الفاظ میں بھی قرآن اور اہل بیتؑ کی دوامی معیت کا ثبوت دیا ہو اور خود علیؑ کا یہ دعویٰ رہا ہو کہ :- سلونی عن کل آیۃ من کتاب اللہ عز و جل " مجھ سے قرآن کی ہر آیت کے بارے میں سوال کرو" لیکن جب قرآن کی جمع و تالیف کا مرحلہ پیش آئے تو زید بن ثابت کے خدمات حاصل کیے جائیں مسجد کے دروازہ پر آدمی بٹھائے جائیں اور ایک ایک سے قرآن کی آیتوں کے متعلق سوال کیا جائے اور دو دو آدمیوں کی گواہی پر آیتیں درج کی جائیں اور بعض آیتیں بڑی جستجو کے بعد کسی ایک صحابی کے پاس دستیاب ہوں اور اسی کے اعتماد پر لکھی جائیں مگر علیؑ کو اس خدمت میں شریک نہ کیا جائے اور ان کا نام تک نظر نہ آئے کہ وہ بھی اس اہم کام میں کوئی دخل رکھتے تھے۔

کیا اس کے بعد یہ دعویٰ قرینِ قیاس ہے کہ علیؑ اور خلفاء میں اتحاد تھا اور کسی طرح کی کوئی رنجش درمیان میں نہ تھی ؟ یا یہ کہنا درست ہے کہ اگر حضرت علیؑ اس خلافت کو جائز تصور نہ کرتے تھے تو آپ کٹ کر علیحدہ ہو جاتے ؟

اس کے بعد اگر یہ نظر آئے کہ جب کبھی علیؑ کو مشورہ کے لیے بلایا گیا تو آپ نے مشورہ سے عذر نہیں کیا اور مشورہ وہی دیا جو حقیقتاً آپ کے نزدیک صحیح تھا تو اسے صرف علیؑ کی بلند نفسی اور عالی ظرفی سمجھنا چاہیے۔ امانت و دیانت سمجھنا چاہیے۔ بے لوثی اور اسلامی ہمدردی سمجھنا چاہیے اور یہی وہ بلند اخلاقی معیار ہے جو رسولؐ کے بعد علیؑ کو بلند ترین سطح کا نشان ثابت کرتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ آپ نے مذہبی حیثیت سے خلفاء کی خلافت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور آپ کو اس پر اعتراض نہیں تھا۔

پانچواں سوال

اسلام نے ہیئتِ اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی ایک خاندان کے لیے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اس سوال کے متعلق جناب مدیر نگار کی رائے جس پر اس سوال کی بنیاد قائم ہے حسب ذیل ہے:-

"اسلام جمہوری حکومت کا حامی تھا اور مسئلۂ نیابت کی بنیاد خاندانی یا ذاتی وجاہت پر قائم کرنا نہ چاہتا تھا، اس لیے رسول اللہؐ کا اپنے بعد کسی کو نامزد کر جانا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔"

یہ حقیقتاً وہ ایک ہمہ گیر خیال ہے جو اس وقت فی صدی ننانوے مسلمانوں کے دماغ میں مضمر ہے یہاں تک کہ بہت سے افراد شیعہ بھی دانستہ و نادانستہ اس کے ساتھ رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ عراق و ایران کا فتنۂ "مشروطہ و مستبدہ" اسی ایک خیال میں کشمکش کا نتیجہ تھا۔

اور اس لیے مسلمانوں کی جماعت متعجب ہوگی اگر میں اس کے خلاف اظہارِ خیال کروں لیکن کیا کروں کہ کلام پاک اور نیز درایتِ اسلامی کی رو سے میری سمجھ میں اس کے خلاف ہی آتا ہے۔

جیسا کہ جنابِ نیاز نے متعدد بار تحریر فرمایا ہے اور حقیقت ثابتہ بھی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو حیثیتیں حاصل تھیں، ایک حیثیت معلّمِ روحانی ہونے کی اور دوسری حیثیت حاکم و متصرف ہونے کی۔ نگار کے الفاظ میں پہلی حیثیت مذہبی ہے اور دوسری سیاسی۔

پہلی حیثیت کے متعلق خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ براہِ راست الہامی چیز ہے اس لیے اس کا تعلق خدا سے ہونا چاہیئے۔ لیکن دوسری حیثیت کے لحاظ سے تو پیغمبر ایک بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے جو سیاسی حیثیت سے نافذ الحکم ہو۔

اگر اسلام میں حکومت کی بنیاد بہر صورت جمہوریت ہی پر ہوتی تو آخر خود رسولؐ کا انتخاب بہ حیثیت حاکم و متصرف کے کس انتخاب عام اور افراد جامعہ کے عمومی اختیار و قرار داد سے ہوا تھا۔ اور جب رسولؐ کی خود مختارانہ بادشاہت میں افرادِ امت کا کوئی دسترس نہیں ہے تو رسولؐ اگر اپنے بعد کے لیے بحیثیت خلیفہ و جانشین کسی شخص کو حاکم و متصرف قرار دے جائیں تو اس میں جمہور کو مداخلت کا کیا حق ہوگا اور یہ کہنا کہاں صحیح ہوگا کہ یہ اسلام کی روح جمہوریت کے خلاف ہے۔

میرے خیال میں "روحِ جمہوریت" جسے عام لوگ جمہوریت کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ تو اسی وقت رخصت ہو گئی جب پیغمبرؐ کا انتخاب خدا کی جانب سے ہوا اور عام افراد کو اس رائے دہندگی کا حق نہیں دیا گیا۔

احکام و تجویزات پیغمبرؐ کے مقابلہ میں عام افراد کا سلبِ حقوق اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ صاف صاف اعلان کر دیا:۔ "ما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ و رسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم"

(یعنی) "ہرگز مسلمانوں میں کسی شخص کو کوئی حق نہیں ہے کہ جب خدا اور رسولؐ کوئی بات طے کر دیں تو انھیں کوئی اختیار باقی رہے اپنے امر میں"

بلکہ اسلام نے رسولؐ کے لیے اتنی بڑی مکمل ڈکٹیٹر شپ قرار دی ہے جس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے اس طرح کہ "النّبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم" (یعنی) "نبیؐ کو تمام مومنین پر خود ان کے نفوس سے زائد اختیار ہے"

اور جب غدیر کے واقعہ پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ نے اپنی

اس مستقل حاکمانہ حیثیت (مکمل ڈکٹیٹر شپ) کا حوالہ دیتے ہوئے اور سب سے اس کا اقرار لیتے ہوئے خود اپنے اختیارات امتیازی سے بالکل اپنی ہی حیثیت اپنے ہی اختیار و اقتدار کو اپنے بعد علیؑ کو تفویض کیا۔ یہ کہہ کر کہ: "من کنت مولاہ فھٰذا علیؑ مولاہ"

اس کے بعد یہ کہنا کہاں صحیح ہے کہ اسلام روحِ جمہوریت کا حامی ہے اور اس لیے کسی کو نامزد کرنا روحِ اسلامی کے خلاف ہے۔

"جمہوریت" یقیناً خوش آیند مفہوم ہے لیکن اس کا اصلی مفاد یہ ہے کہ تمام افراد جامعہ کے حقوق یکساں حیثیت سے محفوظ رہیں۔ اس میں تغلّب و تصرّف کا اندیشہ نہ ہو۔ یہ اس "جمہوریت" سے جس کی تشکیل دنیا میں ہوا کرتی ہے غیر ممکن ہے۔

جب تک اہلِ دنیا میں دو طبقے ہیں عوام و خواص اور عوام کی اکثریت ذاتی رائے نہ رکھنے والی بلکہ "بھیڑیا دھسان" صورت سے ہر پکارنے والے کی آواز پر ناسمجھی سے چلی جانے والی اور خواص کی اکثریت بندۂ ہوا و ہوس ہونے کی جہت سے اغراض شخصیہ کا پتلا اور ذاتی جاہ طلبی و اقتدار پسندی کا مجسمہ ہے۔ اس وقت تک صحیح جمہوریت کا دنیا میں وجود ہو ہی نہیں سکتا اور جسے "جمہوریت" کہا جاتا ہے وہ ایک سخت ترین "مغویانہ" استبداد ہے جسے "جمہوریت" کے نام سے بھولی بھالی جمہور کے سر خواہ مخواہ منڈھا جاتا ہے اور اس دھوکے کی ٹٹی میں اغراض نفسانیہ کا شکار کھیلا جاتا ہے۔

بے شک مفادِ "جمہوریت" کے حاصل ہونے کے لیے ایک اطمینان بخش صورت ہے یہ کہ نمائندہ خداوندی جس کے بارے میں یہ حقیقت مسلّم ہو چکی ہے کہ وہ جانبداری و رعایت اور دوسرے لفظوں میں ضمیر کی خرابیوں سے پاک و منزّہ یعنی بالکل معصوم ہے خود اپنے صوابدید سے کسی شخص کو مصالح عامہ کا ذمہ دار بنایا جائے۔

اس طرح یقیناً تمام افراد کو سمجھ لینا پڑے گا کہ اب کسی کے ساتھ ظلم و تشدد، جبر و استبداد نہ ہوگا اور سب یکساں طور پر حریت کی ہوا میں سانس لیں گے اور مساوات کی نعمت سے بہرہ اندوز ہوں گے۔

اس نکتہ کو کافی تفصیل کے ساتھ جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب نے اپنے رسالہ "وجودِ حجت" میں اپنے خاص اندازِ تحریر میں لکھا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

> "امام اور بالفاظِ دیگر حافظِ شریعت کا تقرر اگر باہمی پنچایت اور انتخاب، خود اختیاری و کثرتِ آرا کی بنا پر ہو تو اس حافظ و نگہبان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ خود شریعت کے بارے میں اکثریت جس طریقہ پر جائے گی وہی حق سمجھا جائے گا۔ اگرچہ وہ شریعت کی تبدیل و تحریف اور اس کی تراش و خراش ہی کیوں نہ ہو اور اگر نظامِ شریعت پر عمل درآمد کے بارے میں اکثریت سے غلطی کا احتمال ہے تو حافظِ شریعت کے انتخاب میں اس غلطی کا امکان زیادہ ہے۔ ملکی و ملی عہدوں کے انتخابات اور ان کے نتائج ہمارے سامنے ہیں اور ہر شخص ان سے واقف ہے۔
>
> بے جا رو رعایت، جانبداری، بے انصافی، تقاضائے مروت اور آپس کے تعلقات، موجودہ منافع اور آیندہ کے توقعات، جھوٹے مواعید کا فریب اور بے حقیقت طفل تسلیاں، ذاتی نفوذ و اقتدار اور حکام کی بارگاہ میں بے حقیقت، اثر و رسوخ، ظاہری ترک و احتشام اور طمع کار و جاہت و اعزاز یہ چیزیں وہ ہیں جو اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کر دینے کے کامیاب ترین ذرائع ہیں اور اکثریتوں کی تشکیل اکثر و بیشتر ان ہی بنیادوں پر ہوتی ہے۔

امامت کسی محدود جماعت یا مخصوص قریہ، شہر یا صوبہ کی حکومت و سلطنت نہیں ہے بلکہ وہ تمام امت کی مصلحت و انتظام کی ذمہ دار ہے اور جہاں جہاں تک کسی شریعت کا دامن وسیع ہو امامت کو وسعت حاصل ہوگی۔ وہ ایسا منصب ہے جس کے سبب سے یتیم بچے، بیوہ، کمزور اور مظلوم، غنی، فقیر، قوی، ضعیف، سب کو برابر فائدہ پہنچے اور عالم میں بشری نظام خدائی منشا کے مطابق پورے طور پر درست ہو۔ اگر امامت ایک ایسے شخص کے سپرد کر دی گئی جو خود خواہشاتِ نفس کا پابند ہے تو اس سے خود دوسروں پر ظلم و ستم کا اندیشہ ہے چہ جائیکہ اس کے ذریعہ ظالم و مظلوم میں پورے طور سے انصاف کا فرض انجام پائے۔

بلکہ یہ غرض اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس کا تقرر اس علام الغیوب ہستی کے سپرد کر دیا جائے جو بنی نوع بشر کے باطنی رموز و نیات سے پورے طور پر واقف ہے اس سے بڑھ کر مصالح عامہ کا لحاظ کیونکر ہو سکتا ہے۔

درحقیقت یہ اصول کہ امامت کے انتخاب کو رسولؐ کے واسطہ سے حضرت باری تعالیٰ عز اسمہ تک منتہی ہونا چاہئے۔ مکمل طور سے جمہوریت و مساوات پر مبنی ہے۔ درحقیقت حاضر و مستقبل میں بشری مصالح کی نگہداشت اور تمام طبقات بشر کے مساوی طور پر حقوق کی حفاظت جو الٰہی لطف و عدل و حکمت کی روشنی میں انجام پائے۔ اور جس میں دھوکے دھڑی، مکر و فریب، تعصب و استبداد، حق تلفی و ناحق کوشی، اہل حل و عقد اور امت کے نمائندوں میں اہلِ تدلیس و نفاق کے مداخلہ اور آزادی رائے کے نام سے کمزور افراد کے اختیارات

سلب کرنے اور جبر و قہر سے ان کی زبان بند کرنے کا امکان نہ ہو اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتی۔"

یہ اس مسئلہ کا تصفیہ کن پہلو ہے جس کے بعد کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چھٹا سوال

ہر دو فریق کے روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں؟ —— اگر پڑا تو کیا؟

اس سوال کے جواب میں اگر واقعات سے استناد کیا جائے تو یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سیاسی ماحول کا جہاں تک اثر پڑا ہے وہ خلافت جناب امیرؑ کے روایات کے مظہر پہلو سے تعلق رکھتا ہے یعنی اہل سنت کے وہ روایات جن سے دوسرے خلفاء کی افضلیت ظاہر ہوتی ہے یا جن سے خلافت جناب امیرؑ یا آپ کی افضلیت کے روایات کا معارضہ کیا جاتا ہے ان میں بہت زیادہ سیاسی اثرات کارفرما ہیں اور اسی لیے اس کی تائید فرقۂ شیعہ کے روایات سے بالکل نہیں ہوتی لیکن فرقۂ شیعہ کے روایات جن کی تائید خود اہل سنت کے روایات میں بھی موجود ہے ان میں کسی سیاسی ماحول کا اثر پڑنا حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔

بلکہ سیاسی ماحول تو ان روایات کے بالکل مخفی اور نسیاً منسیاً ہو جانے کا متقاضی تھا جس کے بعد میں تو حق کی طاقت کا ایک حیرت انگیز معجزہ سمجھتا ہوں کہ یہ فضائل باقی رہے اور اتنے نمایاں طریقہ سے کہ باوجود انتہائی کوششوں کے ان کے مقابل روایات فضیلت ان کے برابر کیا عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔

اس سوال کے جواب میں اس سے زیادہ لکھنے کا اب قلم کو حوصلہ نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر ضرورت باقی رہی تو پھر دیکھا جائے گا۔

والسلام

قیامِ امامت کی ضرورت

امامت کے بارھویں امام پر ختم ہوجانیکا سبب

اور

امامِ موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہہ

نوشتہ

عالیجناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ

قیام امامت کی ضرورت[1]

امامت کے بارھویں امام پر ختم ہو جانے کا سبب

اور

امام موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ

رسالہ "نگار" میں جو ملک کے مشہور جدت پسند ادیب جناب نیاز فتحپوری کی ادارت میں شائع ہوتا ہے دو برس سے مسئلہ خلافت و امامت پر ایک عجیب سلسلہ جاری ہے۔

جناب نیاز کے خیالات مذہبیات کے شعبہ میں ہمیشہ دلچسپی کا مرکز رہے ہیں اور ایک زمانہ ہوا جب "معجزات حضرت عیسیٰ" کے بارے میں مجھے بھی موصوف سے دو دو باتیں کرنا پڑی ہیں۔

حیرت ہے کہ جو شخص مذہب کی ضرورت ہی کا قائل نہ ہو اور ملائکہ و جنت و نار سب کا منکر ہو۔ وہ مسئلہ امامت کے ساتھ اتنی دلچسپی کا اظہار کرے اور اپنے رسالہ کے صفحات کو اس سلسلہ کے بڑے بڑے بسیط مضامین کے لیے وقف کر دے۔ یہ راز بالکل سربستہ ہے اور بہرحال "امور مملکت خویش خسرواں دانند" کے مطابق

---

[1] اسد قائم نمبر ۱۳۵۵ھ

کسی شخص کو اس میں دخل در معقولات کی ضرورت بھی نہیں۔

مارچ ۳۶ء کے پرچہ میں موصوف نے "خلافت و امامت" سے متعلق گیارہ سوالات شائع کیے ہیں، جن کے جواب کے لیے آپ نے ہر دو مذاہب کے علماء و اہل نظر کو دعوت دی ہے۔

جو لوگ ڈاکٹر امبیدکار کی مذہب اسلام کے ساتھ دلچسپی سے فریب خوردہ ہو کر ان کے سامنے تبلیغ و دعوت کے فرائض ادا کرنے اور اس سلسلہ میں اپنے وقت و سرمایہ کے صرف کرنے کو ضروری سمجھے ہوں، انھیں مدیر نگار کے اس اعلان پر بھی لبیک کہنا فرض ہے۔ چاہے نتیجہ میں جس طرح ڈاکٹر امبیدکار کے اعلان دعوت کی نوعیت ایک سیاسی شعبدہ بازی سے بڑھ کر نہ نکلی اسی طرح مدیر نگار کی جانب سے بھی نتیجتہً مایوسی ہی ہو اور کوئی فائدہ نہ نکلے۔

بہرحال نگار میں یہ سلسلہ جاری ہے اور نگار کی شطرنجی بساط بحث کے مہرے جن میں اکثر اب تک نقاب پوش ہیں وہ اس کے صفحات پر اپنی چالیں دکھلائیں ہی گے۔ جس سے مجھے کوئی بحث نہیں ہے۔ لیکن نگار کے شائع کردہ سوالات میں سے چند سوالات کا تعلق چونکہ حضرت امام ثانی عشر عجل اللہ فرجہ کے ساتھ ہے لہٰذا اسد کے کالموں میں چاہتا ہوں ان سوالات کو حل کر دوں جس سے مجھے مدیر نگار کو کوئی اطمینان دلانا نہیں ہے بلکہ نفس حقیقت کا انکشاف منظور ہے۔

قیام امامت کی ضرورت کیا ہے اور صرف اہلبیتؑ میں اس سلسلہ کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے

یہ سوال ہے جس کے پہلے جزو کے متعلق میں اپنے رسالہ "وجودِ حجت" میں کافی

تذکرہ کر چکا ہوں، میں نے لکھا ہے کہ "افرادِ نوع" کی تلوّن مزاجی اور خواہش پرستی اس امر کی ذمہ دار نہیں ہے کہ ایک مرتبہ صحیح تعلیمات حاصل کرنے کے بعد وہ پورے ثبات و استقامت کے ساتھ ان کو باقی رکھیں، ورنہ کسی ایک نبی کے مبعوث ہونے کے بعد پھر دنیا کو کسی نبی کی ضرورت نہ تھی۔ اور اس صورت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے مبعوث ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

قانونِ قدرت بدل نہیں سکتا۔ نظامِ طبیعت پلٹنے کا نہیں، امم سابقہ کی تاریخ کا مطالعہ کرو، اقوامِ عالم کے طبائع و انقلاب پر نظر ڈالو۔ صاحبِ شریعت رسولوں کے علاوہ ایک ہی شریعت کی تجدید کے لیے متواتر انبیاء کی بعثت کے فلسفہ میں تعمق کرو۔ کس طرح ایک نبی کی ہدایت کا نقش تازہ رکھنے کے لیے برابر اس شریعت کی تعلیم کے لیے انبیاء کی بعثت ہوتی تھی اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہتا تھا جب تک کہ مصالحِ نوعی میں تغیّر نہ ہو اور نظامِ ارتقاء و تجدد کی بناء پر ایک دوسرا رسول نئی شریعت کے ساتھ مبعوث نہ کیا جائے۔ اسی طرح زمانہ کا کوئی دور کسی ہادی اور رہنمائے حقیقی اور معلمِ ربانی کے وجود سے خالی نہیں رہا ہے۔ "وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر" ولکل قوم ہاد" یونہی خدا کی حجت ہر زمانہ کے لوگوں پر تمام ہوتی تھی کہ جو ارسالِ رسل اور بعثتِ انبیاء کا اصل مقصد ہے"۔ "لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل" اور یہی سنتِ الٰہیہ سابق زمانہ کی امتوں پر برابر قائم تھی۔ "ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا"

یہ ان انبیاء کا تذکرہ ہے جن کی شریعتیں مقید اور جن کی نبوت محدود زمانہ کے ساتھ محدود تھی۔ آسان تو [illegible] کے ساتھ دوسرے نبی کا مبعوث ہو کر اس کی شریعت کے نقش کو از سر نو تازہ کر دینا اور دوسری شریعت کے ذریعے نوع

بشر کی ہدایت کا احیائے ثانیہ ہونا لیکن ان شریعتوں میں بھی ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت کے آنے تک اس پہلی شریعت کی حفاظت وصیانت اور تعلیم وتلقین کے لیے رہنمایانِ خصوصی خدا کی جانب سے موجود رہتے تھے۔ پھر وہ نبوّت جو صحیفۂ انبیاء کے لیے مہر اختتام ہوا اور جس کی خاتمیت کا اعلان "ولٰکن رسول اللہ وخاتم النبیّین" اور "لا نبی بعدی" کے صاف وتصریح الفاظ میں ہو چکا ہو جس کی انتہا انتہا۔ دورِ فلک کی ہم عناں اور جس کا امتداد، امتداد عمر دنیا کا ہم نفس ہو۔ یعنی اس نبی کی نبوّت جس کے بعد کوئی نبی اور جس رسول کے بعد کوئی رسول آنے والا نہ ہو، اس نبی و رسول کے انتقال پر اس کی شریعت کے لیے کیا حافظ کی ضرورت نہیں ہے جو اس شریعت کی نگہداری کرے اور افرادِ خلق کو اس کے احکام کی جانب صحیح رہنمائی کر سکے اسی کا نام امام ہے اور وہی جانشین رسول اور خلیفۂ بالحق کہے جانے کا مستحق ہے۔

کیا ایسے امام کو ہر زمانہ میں موجود رہنا چاہیے؟ بے شک موجود رہنا چاہیے اس لیے کہ ضرورت اس کی ہر زمانہ میں موجود ہے۔ شریعتِ اسلام اگر کسی خاص جزوِ زمانہ سے محدود ہوتی تو حافظِ شریعت کا وجود بھی اس خاص جزو کے ساتھ مخصوص ہوتا، لیکن جبکہ شریعت کا دائرہ وسیع اور آخری حدودِ دنیا تک پہنچا ہوا ہے تو اس کی حفاظت کا سامان بھی آخر تک ہونا ضروری ہے۔

بے شک حفاظت ملّت ورہنمائی امت کا فرض ادا کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ظاہری طور سے جس کی پشت پر حکومت کا اقتدار اور سلطنت کا جاہ و جلال موجود ہو، اور دوسرے مخفی صورت پر جس میں کارِ ہدایت پردہ کے اندر انجام دیا جائے۔

پہلی صورت یقیناً مقصد کے حصول میں پورے طور پر کامیابی کا واحد ذریعہ ہے

لیکن جب عام افراد کا جذبۂ اقتدار پسندی اس غرض کے حصول میں سدِّ راہ ہو جائے، تو قدرتاً امام کا فرض دوسرے جزو کی طرف منتقل اور فریضۂ ہدایت کا پردہ کے اندر ادا ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔

اب رہا دوسرا جزو کہ صرف اہل بیت میں اس کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے؟ نہیں، بالکل ضروری نہیں ہے، یعنی امامت کے شرائط عقلیہ میں ہرگز نہیں ہے کہ وہ اہل بیتؑ ہی میں ہو، اس کے شرائط جو ہیں وہ افضلیت، عصمت اور منصوص من اللہ ہونا ہے۔ یہ خصوصیات اگر اہل بیت کے علاوہ کسی فرد میں پائے جائیں تو یقیناً وہ امامت کا مستحق ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خصوصیات صرف اہل بیتؑ کے ان مخصوص افراد میں پائے جاتے ہیں جس کی امامت کا شیعہ اعتقاد رکھتے ہیں اور ان کے علاوہ ان کا موجود ہونا کیسا دنیا میں اس کا کوئی مدعی بھی نہیں ہے۔

یہی ہستیاں وہ ہیں جن کے بارے میں حضرت رسولؐ نے نام بنام اپنی جانشینی وخلافت کے متعلق نص فرمائی اور ان کو امامت کے لیے نامزد فرمایا اور یہیں سے دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ:-

کیا انبیاءؑ و آئمہؑ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے؟
اگر تھے تو کیوں؟

کیونکہ مدیر نگار نے اپنے محاکمہ میں جو نتائج نکالے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ:-

> "چونکہ رسول اللہؐ عالم الغیب نہیں تھے اور مستقبل کا علم آپ کو حاصل نہیں تھا اس لیے آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اہل بیتؑ میں کون کس اہلیت کا پیدا ہوگا اور وہ مستحق امامت وخلافت ہوگا یا نہیں؟
>
> اور اگر یہ کہا جائے کہ آلِ رسولؐ کا اصلح و مکمل انسان ہونا حقائق ثابتہ

میں سے ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس وقت بھی تمام سادات کو انھیں صفات سے متصف ہونا چاہیئے، حالانکہ یہ بالکل خلافِ واقعہ ہے"

موصوف نے اپنے محاکمہ میں مرتبۂ نبوت کی توضیح کرتے ہوئے بھی یہ بحث کی ہے کہ انبیاء علمِ غیب نہیں رکھتے تھے اور اس کے ثبوت میں وہ آیتیں پیش کی ہیں جن میں رسولؐ نے ذاتی طور پر اپنے نفس سے علمِ غیب کی نفی کی ہے۔ حالانکہ اسی قرآن میں یہ موجود ہے "الا من ارتضیٰ من رسول" یعنی خدا اپنے رسولوں میں سے جس کو پسند کرتا ہے غیب کی باتوں کا علم عطا بھی فرماتا ہے اور یہ امر مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور حقیقتِ ثابتہ بھی ہے کہ تمام پیغمبروں میں ہمارے رسول اکرمؐ کا مرتبہ سب سے بلند تھا اس لیے اگر کوئی اور نہ بھی ہو "من ارتضیٰ من رسول" کا مصداق تو ہمارے پیغمبرؐ ضرور تھے اس لیے نفی اگر ہوئی ہے تو بذاتِ خود کلیتاً تمام غیب کی باتیں جاننے کی لیکن خصوصی حیثیت سے جن امور کا علم خداوندِ عالم کی جانب سے عطا ہو جائے ان کی اطلاع حاصل ہونا رسول اللہؐ کے لیے بلاشبہ ثابت ہے۔

اگر تھے تو کیوں؟ اس لیے کہ ان کے معلومات ظاہری ذرائع تک محدود نہ تھے بلکہ ان کے علم کا بڑا ذریعہ تعلیم و القائے الٰہی تھا اور خود حضرت حق سبحانہٗ کے علمِ غیب ہونے میں کوئی کلام نہیں، لہٰذا جس کو وہ علم عطا فرمائے اس کے عالم ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

اب یہ کہنا کہ آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اہلِ بیتؑ میں کون کس اہلیت کا پیدا ہوگا اور وہ مستحقِ امامت و خلافت ہوگا یا نہیں؟ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب خدا کو بھی نہ معلوم ہو سکے اور اگر خدا کو یہ معلوم ہو سکتا ہے تو بتعلیمِ الٰہی رسولؐ کو بھی معلوم ہو سکے گا اور جب آپ نام بنام بتائیں گے کہ میرے بعد یہ اشخاص خلیفہ و امام ہوں گے تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ خداوندِ عالم نے ان اشخاص کو نامزد کیا ہے اور اس نے رسولؐ کی زبان سے اس کی تبلیغ کرائی ہے جس کے بعد ان کے منصوص من اللہ ہونے میں

کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے گا۔

امامت کے بارھویں امام پر ختم ہونے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟

یہی کہ علمِ الٰہی میں صفاتِ امامت کا حامل ان ہستیوں کے سوا کوئی اور نہ تھا، اور حضرت رسولؐ نے اپنی جانشینی کے لیے صرف بارہ ہی اشخاص کو نامزد کیا جن کے متعلق فرما بھی دیا کہ وہ قیامت تک باقی رہیں گے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے احادیث :۔

۱۔ عبداللہ بن مسعود کی روایت :۔ ینابیع المودۃ مطبوعہ استامبول ص۴۴۵

"عهد الینا نبیّنا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انّہ یکون بعدہ اثنا عشر خلیفۃ بعدد نقباء بنی اسرائیل"

ہمارے رسولؐ نے ہم سے یہ عہد و پیمان قرار دیا ہے کہ آپ کے بعد نقبا بنی اسرائیل کی تعداد کے موافق ۱۲ خلیفہ ہوں گے۔

۲۔ صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"لا یزال الدین قائماً حتی تقوم الساعۃ ویکون علیہم اثنا عشر خلیفۃ کلہم من قریش" "ہمیشہ دین قائم رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آئے اور تمام لوگوں کے خلیفہ بارہ ۱۲ ہونگے جو سب قریش کے ہونگے" دین کے قیامت تک قائم رہنے کی امید کے ساتھ افرادِ بشر میں بارہ خلفاء ہونگی خبر دینا صاف طور سے بتلاتا ہے کہ وفاتِ رسولؐ سے روزِ قیامت تک کی مجموعی مقدار کہ جس میں دین کا قیام و بقا ہے پورے بارہ خلفاء پر منقسم ہے۔

سنن ابوداؤد کی روایت :۔

"لا یزال ھذا الدین عزیزاً الی اثنی عشر خلیفۃ کلہم من قریش"

لوگوں کا دین اس وقت تک جاری و نافذ رہے گا کہ جب تک بارہ خلفاء ان کے والی ہیں کہ جو سب قریش سے ہوں۔

"ان ھذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیھم اثنا عشر خلیفۃ کلھم من قریش"

یہ امرِ دین منقضی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ بارہ خلفاء نہ گذر جائیں جو سب کے سب قریش ہوں گے۔"

ان احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ دین کا قیام و بقا ان خلفاء کے دم تک ہے اور حدیث میں تصریح ہے کہ دین کا قیام و بقا روز قیامت تک ہے اس سے صریحی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان بارہ خلفاء کو وفات رسولؐ سے لے کر قیامت تک کی مدت میں موجود رہنا چاہیئے اگر ان احادیث کے مفاد پر غور کیا جائے تو یہ احادیث ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کی خلافت کے سوا کسی اور پر منطبق ہی نہیں ہو سکتے اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان ہی کے وجود تک شیرازۂ عالم قائم ہے اور ان کے بعد قیامت آنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

امام مستور یا مہدی موعود ظہور کی عقلی توجیہہ؟

یہی اس کے لیے کافی ہے کہ ایک صادق و مصدق پیغمبر نے اس کی خبر دی اور عقلی حیثیت سے اس میں کوئی استحالہ و امتناع نہیں، جو شخص اسے عقلی حیثیت سے غیر ممکن کہنا چاہتا ہو اُسے دلیل پیش کرنا چاہیئے۔

یہ کہ ایک موجود ہستی آنکھوں سے اوجھل کس طرح ہو سکتی ہے؟ بالکل قابلِ قبول نہیں جب کہ مذہب کی بنیاد ہی غیب کے اعتقاد پر ہے۔ یعنی جو کسی غائب چیز پر ایمان کو اپنے ذوقِ مشاہدہ کے لیے ننگ سمجھتا ہو اسے آخری نقطہ سے لے کر اوّل تک تمام

حقائق مذہب کا انکار ضروری ہے۔ لہٰذا کم از کم ایک صاحبِ مذہب کو تو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ کسی حقیقت کا اس بناء پر انکار کرے کہ وہ آنکھوں سے غائب ہے۔

جبکہ وہ کارسازِ عالم کے وجود کا اقرار کرچکا اور وہ غائب ہے انبیاءؑ کی صداقت کو تسلیم کرچکا اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں، روزِ محشر اور اس کے خصوصیات نیز جنّت و دوزخ کا اقرار کرچکا حالانکہ وہ سب غائب ہیں، ملائک پر ایمان لاچکا اور وہ اس کی آنکھوں سے غائب ہیں۔ غرض قرآنِ مجید اور تعلیماتِ رسول کریمؐ کے تحت نہ معلوم کتنی باتوں پر اسے ایمان لانا پڑا جو اس کے مشاہدہ سے بلند ہیں۔ اتنی غیبی باتوں پر ایمان لانے کے بعد بھی کیا اس کا موقعہ ہے کہ وہ کسی عقیدہ سے اس لیے روگردانی کرے کہ وہ مشاہدہ سے خارج اور غیب پر مبنی ہے۔

مضمون سابق پر مدیرِ محترم
نگار کا
ادارتی نوٹ

جنوری ۱۹۳۷ء

(نگار) مسئلۂ خلافت و امامت کے متعلق یہ بالکل پہلا مقالہ ہے جس میں "نقل" سے ہٹ کر "عقل" سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے اور جو عقائدِ اہلِ تشیع کی "روایتی سطح" پر بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے میں نے جو چند سوالات قائم کیے تھے ان سے مدعا یہی تھا کہ اس بحث کا علمی پہلو سامنے آجائے اور اسی لیے میں نے سب سے پہلے شیعی علماء کو متوجہ کیا تھا کیونکہ جب تک ان کی "درایت" کا صحیح علم نہ ہوجائے بحث و گفتگو کے حدود متعین نہیں ہوسکتے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے یہ مقالہ شیعی نقطۂ نظر کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔ اور اس سے زیادہ اگر کچھ لکھا جاسکتا ہے تو وہ اس کی "شرح و بسط" ہوگی۔ الغرض شیعی جماعت کی طرف سے یہ چیز قطعی و آخری حجت کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے۔ اور اس کے "ردّ و قبول" پر فیصلہ کا انحصار ہے۔

میرا ارادہ ہوا تھا کہ اپنی رائے بھی ساتھ ہی ساتھ شائع کر دوں ، لیکن چونکہ بدقسمتی سے میرا شمار ان لوگوں میں ہے جنہیں نہ تشیع سے کوئی واسطہ ہے نہ تسنن سے (اور اگر ہے تو دونوں سے یکساں) اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اہلِ تسنن کی رائے معلوم کیے بغیر (جو واقعی فریق ثانی کی حیثیت رکھتے ہیں) اس مسئلہ پر کچھ لکھوں ۔

بہرحال یہ مقالہ تمام علماء اہلِ سنت کے سامنے ہے اور نگار کے صفحات ان کے خیالاتِ گرامی کے اظہار کے لیے کھلے ہوئے ہیں اگر انھوں نے توجہ کی تو یہ نہ صرف میرے لیے بلکہ تمام اہلِ علم کے لیے باعثِ مسرت ہوگا ، ورنہ بدرجۂ مجبوری مجھ ہی کو وہ کچھ کہنا پڑیگا جس کا دوسرا نام دنیا نے "ناگفتہ بہ" رکھ چھوڑا ہے ۔

تکرار طلب یا تقاضا

نگار فروری ۱۹۳۷ء

سُنّی علمائے کرام سے

جنوری ۱۹۳۷ء کے نگار میں جو مقالہ مسئلۂ خلافت و امامت پر شائع ہوا ہے وہ شیعی نقطۂ نظر سے ایسا صاف و روشن مقالہ ہے کہ اگر اس کو سامنے رکھ کر جواب دینے کی کوشش کی جائے تو بہت سی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اس بحث کو میں نے جس پہلو سے اٹھایا ہے اور جس مخصوص انداز کے دلائل پیش کرنے کی پابندی میں نے عائد کی ہے اس نے گفتگو کی نوعیت کو بدل دیا ہے۔

اب نتیجہ تک پہنچنے کے لیے صرف ایک منزل درمیان کی اور باقی رہ گئی ہے۔ یعنی یہ کہ سُنّی علماء کرام جنوری کے مضمون کو سامنے رکھ کر اپنی تحقیقات پیش کریں۔ میں خود اس وقت تک کچھ نہیں لکھنا چاہتا جب تک کہ فریق ثانی کو اظہار خیال کا موقع نہ دیا جائے۔ امید ہے کہ جن حضرات کو اس مقالہ کی موافقت یا مخالفت کرنا ہے وہ جلد توجہ فرمائیں تاکہ جولائی تک مجھے بھی اظہار خیال کا موقعہ مل سکے۔

مسئلۂ خلافت و امامت

انسانیت اور اسلام کے نقطۂ نظر سے

نوشتۂ عالیجناب

ابو سعید صاحب بزمی

ایم۔ اے

مسئلۂ خلافت و امامت

انسانیت اور اسلام کے نُقطۂ نظر سے

مذہب کے کسی اختلافی موضوع پر قلم اٹھانا بالعموم مفید و نتیجہ خیز نہیں ہوتا کیونکہ اس قسم کے مباحث پر نہ تو ٹھنڈے دل سے غور کیا جاتا ہے اور نہ اُنھیں اس کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں مذہب انسانی معاشرت میں اس طرح دخیل ہے کہ ایک انسان کو تبدیلی مذہب کے تصوّر سے بھی لرزہ آنے لگتا ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں مذہب کسی شخص کے انفرادی ایمان وضمیر سے تعلق رکھنے والی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق ماں، باپ، بیوی بچے، اعزّہ و احباب نیز اُس معاشرتی دائرہ سے ہے جس میں ایک آدمی زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر مذہب کا دائرہ اتنا تنگ اور محدود ہے کہ ایک وہابی اپنے عقائد وخیالات کو ایک جداگانہ اور مستقل مذہب کی نوعیت دیتا ہے (گو وہ زبان سے اس کا اقرار نہ کرے) اور اپنے مذہبی امتیاز کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرنے کے لیے بہت سی جزوی اور فروعی باتوں پر حد سے غلو برتنے لگتا ہے۔ چنانچہ وہ نماز میں چلّا کر آمین کہنے کو فرض کا مرتبہ قرار دیتا ہے اور اپنے مخالف عقائد رکھنے والوں کی ضد میں عام اخلاق انسانی کی ان حدوں کو بھی پھاندنے کی کوشش کرتا ہے جن کو کسی حیثیت سے بھی معقول قرار نہیں دیا جا سکتا مثلاً عام انسانی اخلاق کب اس کا مقتضی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی شخص کو گالی دیں، بُرا بھلا کہیں اس پر ہنسیں، اس کا مضحکہ اڑائیں، محض اس لیے کہ ہمارے اور اس کے مابین بعض باتوں میں رائے اور ضمیر کا ایماندارانہ اختلاف ہے لیکن ایک وہابی یا غیر مقلد اس کی

پرواہ نہیں کرتا اور وہ آزادی کے ساتھ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی جیسے ائمہ کبار کو علانیہ
موردِ طعن و تشنیع بنانے میں لطف و راحت محسوس کرتا ہے۔

بدقسمتی سے ہندوستان کا جہل و تعصب اس باب میں اور بھی بڑھا ہوا ہے،
یہاں ہم ابھی اپنے مخصوص پیر و مرشد اور اپنے مخصوص مسجد و مُلّا کے جھمیلوں ہی سے
آزاد نہیں ہوئے ہیں چہ جائیکہ مذہب کے اہم اختلافات پر عقل و دیانت کے ساتھ
سکونِ قلب سے غور کرسکیں۔ پھر یہ چیز کچھ جہلا ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ دیوبند
اور ندوہ کے فارغ التحصیل حضرات سے لے کر انگریزی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ
فضلاء تک سب اسی جہل میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ میرے ایک دوست جو ایم۔ اے
کے آخری سال میں میرے شریکِ درس تھے صرف اتنی سی بات پر حد سے زیادہ برہم
ہو گئے کہ میں نے اس بات کے ماننے میں تامل کیا تھا کہ کعبہ کی چھت کے اوپر
سے کوئی پرندہ اُڑ کر نہیں جاسکتا۔ گو وہ نہایت سنجیدہ نوجوان تھے۔ کلاس میں اُن
کا شمار ذہین طلباء میں ہوتا تھا۔ عام مطالعہ بھی ان کا اچھا تھا لیکن مذہبی رواداری اور
وسیع النظری کی وادی میں وہ اسی طرح کے کٹھ ملّا تھے جس کے ایک ہاتھ میں مسجد
کا بدھنا ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں استنجے کا ڈھیلا۔

پھر میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی وسیع القلب اور وسیع
الخیال انسان بستا ہی نہیں بلکہ صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ ان کی تعداد آٹے میں
نمک سے زیادہ نہیں۔ اور اسی لیے صرف اس قسم کے مٹھی بھر افراد کے سامنے
”حقائق و معارف“ کے دفتر کھولنا عمومی نقطۂ نظر سے کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا
چنانچہ ۱۹۳۵ء میں ”امامت و خلافت“ پر میرا جو مضمون نگار جولائی میں شائع ہوا تھا
اس پر میرے ایک نہایت ہی مخلص شیعہ دوست نے جو ایم۔ اے میں میرے
شریکِ درس بھی رہ چکے ہیں اپنی انتہائی وسیع النظری، وسیع القلبی اور استثنائی رواداری

کے باوجود مجھے خط میں لکھا تھا ــــ "ابلہ فریبی کے اعتبار سے آپ کا مضمون بہت کامیاب ہے"

اور اس لیے میں اس مقالہ میں کتنی ہی دیانت و ایمانداری کے ساتھ بحث کروں اور کتنے ہی اطمینان بخش انداز سے اپنے مقصد کو پیش نظر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں لیکن لکھنؤ میں "مدح صحابہ" کا قضیہ پھر بھی بدستور رہے گا اور ایک مجتہد سے لے کر سڑک پر چلنے والے راہگیر تک کے خیالات میں رتی برابر کوئی فرق نہ آئے گا۔

یہی وجہ تھی کہ اگرچہ "امامت و خلافت" کا مسئلہ تقریباً دو سال سے ناسور کی طرح "نگار" کے صفحات پر رِس رہا ہے اور اس دوران میں کئی مرتبہ خود میرا دل بھی چاہا کہ اس پر اپنے افکار و خیالات کو اہلِ علم کے سامنے پیش کروں، میرے بعض بے ریا دوستوں نے مجھ سے اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے اصرار بھی کیا۔ "نگار" کے مدیر محترم نے بھی اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کو میرے لیے ناگزیر قرار دیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میری ہمت نہ پڑی کہ اس پر کچھ لکھوں، اس لیے کہ "نیکی کر او دریا میں ڈال" کا نظریہ ابھی تک پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ اس وقت تک اس سلسلہ میں "نگار" میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان سے جو اثر مترتب ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ شیعہ اور سنی دونوں حضرات کو جدید تاویلات پر غور کرنے اور اپنے مقصود کو واضح سے واضح تر کرنے کے لیے استدلال تلاش کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑ رہی ہے۔ خیر ان لوگوں کو چھوڑ ہی دیجیے جو ہر ایسے موقع پر اپنی گردن کی رگوں، منہ کے جھاگ، آنکھوں کی سرخی اور چہرہ کی تمتماہٹ کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتے لیکن وہ لوگ بھی جو آزاد خیالی اور وسیع المشربی کی دوڑ میں اپنے کو سوشلسٹ اور کمیونسٹ تک کہنے میں پس و پیش نہیں کرتے جب شیعہ سنی کے اختلافی مسائل پر آتے ہیں تو "قوم کی عزت" کی خاطر وہی سب کچھ کرتے اور کہتے نظر آتے ہیں جو نہ کرنا اور نہ کہنا چاہیے۔

تاہم میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں کوئی حلقہ ایسا ہے جو مذہبی امور پر نسبتاً زیادہ سنجیدگی اور سکونِ قلب کے ساتھ بحث کر سکتا ہے تو وہ شاید

صرف "نگار" کے خریداروں ہی کا حلقہ ہوگا۔ ورنہ یوں تو وہ سب کچھ الحاد و زندقہ ہے جس کی تائید ندوہ تھانہ بھون، بریلی یا دیوبند جیسی "خانقاہوں" سے نہ ہوتی ہو۔

لیکن ان تمام امور کے باوجود جس چیز نے اس مسئلہ پر قلم اٹھانے میں میری ہمت افزائی کی ہے وہ شاعروں کا نقطۂ نگاہ ہے جس کے ماتحت وہ کسی کو سنانے کے لیے نہیں بلکہ خود سننے کے لیے شعر گوئی کیا کرتے ہیں اس کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر واقعی میں غلطی پر ہوں تو ممکن ہے اس گفتگو کے سلسلہ میں میری اصلاح ہو جائے۔

⁂

اس مسئلہ کے متعلق نیاز صاحب نے اپنے محاکمہ (نگار ۱۹۳۶ء) میں یہ فیصلہ کیا ہے:—

> "اس میں شک نہیں کہ رسول اللہؐ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب امیرؑ خلیفہ قرار دیے جائیں جیسا کہ آپؐ نے بارہا اشارۃً و کنایۃً بلکہ ایک حد تک صراحتہً اس کو ظاہر بھی کیا۔"

لیکن اس فیصلہ کے باوجود آپ کا خیال ہے کہ رسولِ کریمؐ کی یہ خواہش صحیح اور جائز قرار نہیں پا سکتی اور اس لیے اسے ان کی "اجتہادی غلطی" سمجھنا چاہیے۔ لیکن چونکہ اس رائے سے انبیاءؑ کی عصمت پر حرف آتا تھا اس لیے انھیں بہت بڑا گھیرا ڈال کر یہ ثابت کرنا پڑا ہے کہ "خطاء" اور "غلطی" میں فرق ہے اور اس لیے اس "اجتہادی غلطی" کے باوجود رسولؐ کی "عصمت عن الخطا" پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ممکن ہے یہ دلیل صحیح ہو لیکن اسے موجود مبحث سے متعلق کرنا میرے نزدیک صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انبیاء سے بھول چوک ہو سکتی ہے، تب بھی اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ کسی ایسے اہم مسئلہ میں بھی انبیاء سے مسلسل غلطی ممکن ہے جس کا تعلق مذہب کی اساس سے ہو، اور جس غلطی کی وجہ سے ملت کا شیرازہ ہو جائے۔

تلواریں نیام سے کھنچ جائیں اور ابدالآباد تک کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا افتراق و انتشار کھڑا ہو جائے ـــــ پس میرا محاکمہ یہ ہے کہ :-

۱ - رسولِ اکرمؐ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ان کی وفات کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں اور پھر یہ سلسلہ شاہانِ خود مختار کی طرح نسلاً بعد نسلٍ قائم رہے۔

۲ - حضرت علیؓ کی الوہی امامت کے سلسلہ میں جتنی روایات و احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب یا تو موضوع جعلی اور خود ساختہ ہیں یا ان کا مفہوم حقیقتہً وہ نہیں ہے جو "الوہی امامت" کی تائید کرتا ہو اور جس کے ماتحت خلافت کے حقدار صرف علیؓ اور آلِ علیؓ قرار پائیں۔

میں اپنے اس "محاکمہ" کی تائید میں دلائل پیش کرنے سے قبل مندرجہ ذیل تنقیحات قائم کرتا ہوں :-

۱ - کیا عام مذاہبِ عالم کا بالعموم اور اسلام کا بالخصوص یہ دعویٰ ہے کہ وہ روئے زمین پر بسنے والے ہر انسان کی دنیوی اور اُخروی صلاح و فلاح کا پیغام لے کر آیا ہے بالفاظ دیگر کیا ہر مذہب بالعموم اور اسلام بالخصوص اس کا مدعی ہے کہ وہ انسان کی معاشرتی، سیاسی، ذہنی اور اخلاقی بھلائی کا مکمل پروگرام رکھتا ہے اور یہ کہ دنیا کا کوئی اور مذہب اس سے زیادہ عمدہ، زیادہ قابلِ قبول اور عام انسانوں کے لیے زیادہ مفید پروگرام پیش نہیں کر سکتا ؛

۲ - کیا کسی مذہب کی حقانیت کا پہلا اور آخری ثبوت یہ ہے کہ وہ انسان کے انفرادی و معاشرتی اور ملّی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت کرتا ہو ؟

۳ - کیا کوئی ایسا مذہب الہامی ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے۔ جو معمورۂ ارضی پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے یکساں مفید اور قابلِ عمل نہ ہو اور جس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ اور خواہش پر ضرب لگتی ہو ؟

۴ ۔ کیا کوئی ایسا مذہب الہامی ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے۔ جس کا کوئی اہم ترین اور بنیادی فیصلہ دنیا کی عقل عمومی کے خلاف ہو اور دنیا کے بسنے والوں کو اُن کے کسی جائز حق سے محروم کرنا چاہتا ہو؟

اب مناسب ہوگا کہ ان چاروں تنقیحات میں سے ہر ایک پر فرداً فرداً بحث کی جائے۔

پہلی تنقیح

یہ تنقیح اس قدر واضح و روشن ہے کہ اسے کسی تفصیلی بحث و نظر کا محتاج قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جس شخص میں معمولی سی عقل و بصیرت بھی ہوگی وہ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ مذہب کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو زیادہ منور و تابناک بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ روئے زمین کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو دنیا کی تمام بھلائیوں اور خوبیوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کا مدعی نہ ہو۔ چنانچہ آج جب اچھوت قوم نے ان معاشرتی اور مجلسی مظالم کے خلاف احتجاج کیا جو برہمنوں اور پنڈتوں کی جانب سے صدیوں سے اُن پر توڑے جا رہے ہیں تو ہندوستان کے ہر گوشہ سے ہندومت کے خیرخواہ یہ کہتے ہوئے سنائی دینے لگے کہ ـــ

“اصل ہندو دھرم اس الزام سے بری ہے اور یہ ظلم و زیادتی بعد کے خودغرض اور جاہ پرست برہمنوں کی ذاتی اختراع و ایجاد ہے۔”

یہی وجہ ہے کہ جن مذاہب کے پاس انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو استوار و بہتر بنانے کا کوئی مکمل لائحہ عمل نہیں ہے وہ رفتہ رفتہ یا تو فنا ہو رہے ہیں یا اپنی قدیم شکل کو دانستہ یا نادانستہ طور پر بدل رہے ہیں۔ دور نہ جائیے خود آپ کے ہندوستان میں ہندو مذہب میں جو تغیرات روز بروز ہو رہے ہیں وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے کی بات ہے

۔ کل تک نہ تو کوئی غیر ہندو ہندو بنایا جاسکتا تھا اور نہ کوئی ہندو کسی غیر مذہب کو قبول کر لینے کے بعد ہندو مذہب میں دوبارہ داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن آج کھلم کھلا اس عقیدہ کے خلاف بغاوت کی جا رہی ہے۔ اور سوامی دیانند جی کے پیرو علانیہ اس کا پرچار کر رہے ہیں کہ نہ صرف "مرتد ہندو" دوبارہ ہندو بنایا جاسکتا ہے بلکہ مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی۔ غرض کہ ہر مذہب و ملت کے فرد کو ہندومت کے آغوش میں پناہ دی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں ہندو مذہب میں بُت پرستی، توہم پرستی، بطل پرستی اور اسی قسم کے سیکڑوں ایسے نقائص ہیں جن کے خلاف آج علانیہ طور پر پروپیگنڈا ہو رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ اصل ہندو دھرم ان تمام عیوب سے پاک ہے۔ چنانچہ بنگال میں برہمو سماج اور پنجاب میں آریہ سماج انھیں مساعی کا نتیجہ ہیں۔

اس چیز کو دلائل و براہین سے واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام کا دعویٰ بھی ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ دنیا میں ہر انسان کی صلاح و فلاح کے لیے خدا کی "آخری آواز" ہے اور ایک ایسا پروگرام خدا کی طرف سے لیکر آیا ہے کہ جس پر عمل پیرا ہونے سے انسان دنیوی و اخروی ہر اعتبار سے نشو و ارتقار کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتا ہے۔

دُوسری تنقیح

اس تنقیح پر بھی مجھے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ ڈاکٹر امبیدکار کے تبدیل مذہب کے اعلان کے لبعد سے ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اس موضوع پر اتنی بحث و تمحیص ہوئی ہے کہ اب سلسلہ میں غالباً کسی مزید تحقیق و تفتیش کی گنجائش باقی نہیں رہی حتیٰ کہ پنڈت مالوی جیسا متعصب الخیال و قدامت پرست ہندو جو آج بھی کسی "نیچ ذات" کے ہندو کو اپنے خاندان میں قرابت و عزیزداری کا شرف دینے کے لیے تیار نہیں، یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ آج کل "اچھوت" کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے

اسے اصلی ہندو دھرم سے کوئی واسطہ نہیں — گویا انھیں اس حقیقت کے آگے مجبوراً سپر ڈالنا ہی پڑی کہ کسی مذہب کی حقانیت کا پہلا اور آخری ثبوت یہ ہے کہ وہ انسان کے انفرادی، معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت کرے۔" اور اس لیے ہندو دھرم کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے لازم ہوا کہ اسے ان تمام امور سے پاک صاف ظاہر کیا جائے جن کی بنا پر اس کرۂ ارض پر بسنے والی چھ کروڑ مخلوق کے عام انسانی حقوق پر دن کی روشنی میں ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔

آج دنیا میں روس کی اشتراکیت عوام کے لیے اتنی جاذب نظر کیوں بنی ہوئی ہے؟ اور وہ کون سی وجہ ہے جس کی بنا پر شہنشاہیت پرست ممالک کے اتنے شدید بندشوں کے باوجود یہ خیالات روئے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرعت کے ساتھ پھیل رہے ہیں؟ اور وہ کون سے محرکات و دواعی ہیں جن کی وجہ سے عامۃ الناس اپنی آبائی روایات، اپنے مسلک، مذہب اور اپنے معتقدات کو اشتراکیت کی پیروی میں قابلِ ترمیم قرار دے رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مذہب نے سرمایہ پرستوں کے بقاء و تحفظ کے لیے جو تدابیر اختیار کر رکھی ہیں وہ قطعاً ناجائز اور ظالمانہ ہیں اور اس لیے کوئی ایسا مذہب حقانیت و صداقت کا صحیح دعویدار قرار نہیں دیا جا سکتا جو موجودہ سرمایہ پرستی کا حامی و ناصر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ میں عیسائیت کا صرف نام رہ گیا ہے ورنہ کسی شخص کے دل کے اندر اس کی وہ عظمت و بزرگی باقی نہیں رہی جو مذہب ہونے کی حیثیت سے اسے حاصل ہونا چاہیئے۔

الغرض یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی مذہب کا معیار صداقت یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے کسی انسانی جماعت کا کوئی حق غصب نہ ہوتا ہو۔

تیسری تنقیح

مذکورۂ بالا دوسری تنقیح کے واضح ہو جانے کے بعد یہ تنقیح کسی بحث و تشریح کی محتاج نہیں رہتی۔ اس لیے کہ کسی مذہب میں "انسان کے انفرادی، معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی نگہداشت" نہ کرنا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہ الوہی اور الہامی نہیں ہے۔ کیونکہ خدا کی طرف سے کوئی ایسی چیز اپنے بندوں کے سر نہیں منڈھی جاسکتی جو اُن کے کسی ایک جائز حق کو بھی سلب کرتی ہو۔ عقلِ سلیم اس بات کو کسی صورت سے نہیں مان سکتی کہ انسان پر ظلم و بے انصافی کے پہاڑ توڑنے کے لیے خدا کی جانب سے کوئی مذہب بھیجا جائے اور اس لیے اگر کسی مذہب کے اصول و نظریات تمام انسانوں کے لیے یکساں مفید و قابلِ عمل نہ ہوں۔ یا اُن سے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ و خواہش پر ضرب لگتی ہو تو بلا پس و پیش یہ فیصلہ دیا جاسکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب سرے سے الہامی نہیں ہے، یا کم از کم اس کا وہ حکم غیر الہامی ہے جو عام انسانوں کے لیے کسی جائز و معقول شکایت کا باعث ہو۔

چوتھی تنقیح

دوسری اور تیسری تنقیح کے بعد اس تنقیح کے قائم کرنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن چونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا ہر پہلو نہایت وضاحت کے ساتھ روشنی میں آجائے اس لیے میں نے اس تنقیح کو قائم کرنا ضروری سمجھا، لیکن اس پر کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ بالکل روشن حقیقت ہے کہ اگر کسی مذہب کا کوئی بنیادی اور اساسی عقیدہ ایسا ہو کہ اسے عقلِ عمومی جائز قرار نہ دیتی ہو تو ہم یا تو اس عقیدہ کو مذہب کا بنیادی و اساسی عقیدہ ماننے سے انکار کر دیں گے اور یا سرے

سے اس مذہب کے الہامی ہونے سے منکر ہو جائیں گے۔ کیونکہ اگر کوئی مذہب انسان کو "خیر و نیکی" کے اتباع سے باز رکھتا ہے تو اس کے دائرہ سے علیحدگی اختیار کر لینا انسانیت کا سب سے پہلا فرض ہے۔

لیکن یہاں میں جس چیز پر خصوصیت کے ساتھ زور دینا چاہتا ہوں وہ "عقل عمومی" کا لفظ ہے "عقل عمومی" سے میری مراد وہ معمولی فہم و فراست ہے جس سے روزمرّہ کے کاروبار میں ہم کام لیتے ہیں اور جس کے ذریعہ ہم بہت سی ابتدائی صداقتوں کو پہچانتے ہیں۔ ایسی صداقتیں جن پر بنی نوعِ انسان عمومیت کے ساتھ متفق ہوتے ہیں اور جن سے عامۃ الناس کو اعتقاداً نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوتی مثلاً "سچ بولنا اچھا ہے" یہ ہماری عقل عمومی کا فیصلہ ہے۔ اسی طرح "انسان کا قتل کرنا وحشیانہ فعل ہے۔" یا "جھوٹ بولنا بُری بات ہے۔" اس نوع کے تمام اصول و کلیات ایسے ہیں کہ جنہیں ہماری عقل عمومی تسلیم شدہ قرار دیتی ہے۔

یہ میں نے اس لیے عرض کر دیا کہ کہیں اس موقع پر "عقل و نقل" کے اُن مباحث کی طرف ذہن منتقل نہ ہو جائے۔ جن سے معتزلہ وغیرہ کی تصانیف بھری پڑی ہیں اس لیے کہ ان مباحث میں "عقل" کے لفظ سے بالعموم جس مفہوم کو مراد لیا گیا ہے وہ استدلال و قیاس آرائی کی وہ شکل ہے جس کے بعد مذہب سائنس و فلسفہ کی موشگافیوں میں پھنس کر صرف گھرے فلسفیوں کی باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں کے سوا اور کسی مصرف کا نہیں رہتا اور عوام کی نظروں میں اس کا ہر مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن میری مراد یہاں اس قسم کے "استدلال و قیاس آرائی" سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف میرے پیشِ نظر استدلال و استنتاج کی وہ سادہ و سلیس صلاحیت ہے جس سے ہم عملی زندگی کے روزانہ کاروبار میں مدد لیتے ہیں اور اس لیے گو مذہب کو "عقل" سے علیحدہ رکھنے کی کتنی ہی کوشش کی گئی ہو لیکن یہ کسی کا عقیدہ نہیں ہے کہ مذہب کے اصول و

ضوابط کو "عقلِ عمومی" سے کوئی علاقہ دسرکار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تو پھر مذہب کے دوسرے معنی "جنون و [illegible]" کے سوا اور کچھ نہ ہوسکیں گے۔

ان چاروں تنقیحات کو بخوبی ذہن نشین کرلینے کے بعد اب آپ حضرت علیؓ کی "الوہی خلافت" کے عقیدہ پر غور کیجیئے۔ دیکھیئے "الوہی خلافت" کا مطلب یہ ہے کہ:۔

> "خداوندِ کریم نے یہ طے کردیا تھا کہ رسولِ کریمؐ کے بعد اُن کے داماد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں، اور علیؓ کے بعد اُن کی اولاد میں سے کسی کو یہ منصب جلیل تفویض کیا جائے اور اسی طرح یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے"

اب اگر آپ اسلام کے اس بنیادی عقیدہ کا تجزیہ کریں تو اس سے مندرجہ ذیل ضمنی عقائد مستنبط کرسکتے ہیں:۔

۱۔ خلافت و امامت حضرت علیؓ کی نسل کے لیے مخصوص ہے۔

۲۔ خلیفہ (یا امام) کی وفات پر اس کی جانشینی کے لیے پیش رو کا بیٹا یا بیٹے کی عدم موجودگی میں پیش رو کا کوئی اور قریب ترین عزیز ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح شاہانِ خودمختار کے یہاں ولیعہدی کے لیے۔

۳۔ اگر روئے زمین کے تمام باشندے مسلمان ہوجائیں تب بھی ان میں سے کوئی خلافت کی مسند کا مستحق قرار نہیں پاسکتا۔

۴۔ دنیا کے تمام مسلمان حضرت علیؓ کی نسل کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں۔

۵۔ چونکہ رسولؐ کے بعد علیؓ اور ان کی اولاد ہی خلافت و امامت کی حقدار ہے اور وہی اولوالامر آقا اور مولا ہیں اس لیے روئے زمین پر بسنے والے ہر مسلمان کے لیے یہ فرض ہے کہ وہ ابدالآباد تک "آلِ علیؑ" کے ہر اشارہ پر بلاچون وچرا

سرِ تسلیم خم کرتا رہے۔

۶۔ اگر دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع، متقی، باخدا، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو تب بھی جانشینی کے وقت اس کو زیر بحث نہیں لایا جائے گا، بلکہ علیؑ کی اولاد میں سے ولیعہدی کے مروجہ اصول کے بموجب کسی "حقدار" کو مسندِ خلافت و امامت پر متمکن کر دیا جائے گا۔

اب ان عقائد کو بغور دیکھیے اور معلوم کیجیے کہ آیا یہ عقائد آپ کی "عقلِ عمومی" کے بنیادی اور اصولی مسلمات کے مخالف تو نہیں؟ یعنی آیا ان عقائد کو مان لینے کے بعد انسان کے انفرادی، معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت ممکن ہو سکے گی؟ آیا اس قسم کا عقیدہ معمورۂ ارضی پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے یکساں مفید اور قابلِ عمل ہو سکے گا؟ آیا اس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی جائز مطالبہ و خواہش پر ضرب نہ پہنچے گی؟ اور آیا یہ عقیدہ دنیا کے بسنے والوں کو اُن کے کسی جائز حق سے محروم کرنے کا موجب تو نہ ہوگا؟

دیکھیے ان عقائد کا منشا یہ ہے کہ بانیٔ اسلام کی خواہش یہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد مسلمانانِ عالم پر ان کی نسل تا قیامِ قیامت سلطانِ مطلق کی حیثیت سے حکمرانی کرے، اور ان کی نسل کے افراد کے ہوتے ہوئے روئے زمین کا کوئی مسلمان مسندِ خلافت کا امیدوار نہ ہو سکے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ اجتماعی اور عمرانی نقطۂ نظر سے نبی کریمؐ نے دنیا کے سامنے دو چیزیں پیش کیں:۔

۱۔ غیر مسئول مطلق العنان حکومت جو خلیفہ کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہے۔

۲۔ "نسلی امتیاز" جس کے ماتحت اولادِ رسولؐ دنیا کے تمام انسانوں پر ابدالآباد تک حکمران ہونے کی حقدار ہے اور آلِ علیؑ کا ہر بچہ ماں کے پیٹ سے یہ استحقاق لے کر پیدا ہوا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کی گردنیں اس کے سامنے عقیدت و احترام

کے ساتھ ختم ہو جائیں۔ محض اس لیے کہ وہ "یکے از آلِ علیؑ" ہے (نہ کہ اس لیے کہ اس نے اپنی ذاتی صلاحیت و استعداد اور خدمت و ایثار کے ماتحت عِلم ہر لعزیزی حاصل کی ہو)

اب پوری سنجیدگی اور انصاف پسندی کے ساتھ غور کیجیے کہ اگر کوئی مذہب دنیا پر اس قسم کے مطلق العنان نسلی امتیاز کو مسلط کرنا چاہے تو کیا وہ مذہب انسانی حقوق کے احترام و تحفظ کے تمام مذکورہ بالا دعاوی نیز "عقل عمومی" کے اعتبار سے دنیا کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے؛ اور کیا اسلام کے اُن کھلے ہوئے اور واضح احکام کی موجودگی میں جن میں انسانی مساوات، حریتِ شخصیہ، آزادئ فکر و رائے اور نسل و نسب کے امتیازات کے انعدام پر بار بار زور دیا گیا ہے، اس عقیدہ کو تسلیم کرنا اسلام کے اصولی عقائد میں ناقابلِ فہم تضاد و تباین کو داخل کرنا نہیں ہے؟

پھر ممکن ہے کہ آج سے پانچسو برس یا پانچہزار برس پہلے اس مسئلہ میں اختلاف آرا ہو سکتا لیکن ۱۷۸۹ء کے بعد سے فرانس کے ہمہ گیر انقلاب نے دنیا کے بچہ بچہ کو ہماری معاشرتی اور سماجی زندگی کی اس بنیادی اور ابتدائی صداقت سے روشناس کر دیا ہے اور آج مشرق سے لے کر مغرب تک کوئی دماغ ایسا نہ ملے گا جو اس بات کا خواہاں ہو کہ دنیا کو ۱۷۸۹ء سے پہلے کے زمانہ کی طرف لوٹ جانا چاہیئے۔ آج دنیا میں چار ڈکٹیٹر فرمانروائی کر رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے بھی کوئی ایک اس بات کا خواہشمند نہیں ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی سی خود مختاری اور مطلق العنانی کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ گذشتہ جنوری میں مسولینی نے روس کے ایک مشہور اخبار کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں نہ تو اشتراکیت کے سماجی نظام کا قائل ہوں اور نہ موجودہ جمہوریت کا مفہوم میرے دل کے لیے باعثِ کشش ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں دنیا کو ایک مرتبہ پھر اس غیر مسؤل و مختارِ مطلق عہد کی طرف لوٹا لے جانا چاہتا ہوں۔ جو انقلابِ فرانس

سے پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔

آج کل ڈکٹیٹروں کے موجودہ غلبہ و تسلّط کو دیکھتے ہوئے کسی قدر غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس لیے اس بات کو خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ ڈکٹیٹر اور آٹوکریٹ رولر (مطلق العنان فرمانروا) میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ڈکٹیٹر قوم کی خواہشات و جذبات کی زندہ تصویر ہوتا ہے اور وہ قوم کے عمومی مطالبہ سے ایک انچ متجاوز نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی چوبیس گھنٹے ایک ان تھک عملی انسان کی طرح بسر ہوتی ہے جو محض اپنی سابقہ قربانیوں اور حد سے بڑھتے ہوئے حبِ وطن اور حبِ قوم کی وجہ سے اپنے اہلِ ملک کی آنکھ کا تارا بنا ہوتا ہے۔ وہ قوم کی صلاح و فلاح کے لیے تمام امکانی تدابیر عمل میں لاتا ہے اور اس کا دماغ و جسم ایک لمحہ کے لیے بھی اس عیش و تنعم سے دوچار نہیں ہوتا جو شاہانِ ماسبق کے حرم سراؤں کی خصوصیتِ خاصہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک ڈکٹیٹر اپنے ذاتی رجحانات اور ذاتی خبط ——— کے موجب کام نہیں کرتا۔ بلکہ قوم کی عمومی خواہشوں کا ایک مکمل نقشہ ہر وقت اس کے دماغ میں موجود رہتا ہے۔ الغرض ایک ڈکٹیٹر اور ایک آٹوکریٹ رولر میں بُعد المشرقین ہے۔ اور اس لیے ان دونوں کو باہم مخلوط کر کے مبحث کو الجھانا نہ چاہیئے۔

علاوہ ازیں مسولینی اور ہٹلر کی آمریت کے اصول کو دنیا قابلِ قبول بھی نہیں سمجھتی۔ خود ان کی اپنی قومیں بھی پوری طرح اُن کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کی زندگی ہر لحظہ خطرہ میں ہے اور گو سردست ان کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے لیکن بین الاقوامی سیاست سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان کی شہرت و عزت کی بنیادیں بہت ہی کمزور اور پتلی زمین پر رکھی گئی ہیں اور وہ وقت جلد آنے والا ہے جب خود انھیں کی قوم ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے گی۔

پس اگر "الوہی خلافت" کے مذکورۂ بالا استحقاق کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا

صاف مطلب یہ ہوگا کہ اسلام دنیا میں غیر مسئول، مطلق العنانی اور ناجائز نسلی امتیاز کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کو یوں سمجھیے کہ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا۔ جیسے آج ہر ہٹلر یہ طے کر دے کہ — "مجھے خدا کی طرف سے پیغام ملا ہے کہ میں اور میرے بعد میری اولاد نسلاً بعد نسلٍ ابدالآباد تک جرمن قوم پر فرمانروائی کرے۔"

فرمائیے اگر آج ہٹلر، مسولینی، مصطفےٰ کمال یا اسٹالن کی طرف سے اس قسم کا دعوے آپ کے گوش گزار کرایا جائے تو آپ **اس کا** خیر مقدم کس طرح کریں گے؟ اور آپ اس قسم کے اعلان کو دنیا کے لیے برکت سمجھیں گے یا لعنت؟ — خیر آپ تو برکت و لعنت کا سوال طے کرنے میں سلف کے اقوال ہی کو لوٹ پلٹ کرتے رہیں گے۔ لیکن یورپ کے باشندے جو اجتماعی اور شخصی حریت کے مفہوم سے بخوبی آشنا ہو چکے ہیں۔ بہت جلد اصل حقیقت کو اپنے اس ڈکٹیٹر کے گلے اتار دیں گے اور ابھی "نگار" کا دوسرا پرچہ شائع بھی نہ ہونے پائیگا کہ اخبارات میں آپ موٹے موٹے حروف سے لکھی ہوئی یہ سرخی پڑھ لیں گے:۔

> "یورپ کے ایک مخبوط الحواس ڈکٹیٹر کی لاش دریائے رائن کے سپرد کر دی گئی۔"

میں اس وقت آیات و احادیث سے اس حقیقت کو ثابت کرنا نہیں چاہتا کہ اسلام جمہوریت کا مدعی ہے یا نسلی مطلق العنانی کا۔ میں تو آپ کی عقل عمومی سے یہ سیدھا سا سوال کرتا ہوں کہ اگر آپ اسلام کو سچا اور الہامی مذہب قرار دیتے ہیں تو کیا آپ کے نزدیک اس کا ایک بنیادی اور اساسی عقیدہ اس نوع کا ہو سکتا ہے؟ کیا اسلام دنیا کے رہنے والوں پر اس طرح ایک نسل کو قیامت تک کے لیے فرمانروائی کرنے کا ٹھیکہ دے سکتا ہے؟ اور اگر اسلام ایسا حکم دے تو کیا آپ اسے الہامی اور الٰہی مذہب قرار دیں گے؟

دیکھیے اگر آج "الٰہی خلافت" کا مسئلہ طے شدہ ہوتا اور اسلام میں "آلِ علیؓ" کو بلا چون و

چرا استحقاق" یکے بعد دیگرے خلیفہ تسلیم کر لیا جایا کرتا تو ہر سید کے دماغ آسمان پر ہوتے وہ اپنے کو حکمران خاندان کا فرد سمجھتا، اور شاید آج راقم الحروف بھی اس مساوی سطح پر "ناظرین" نگار" سے مخاطب ہونے کی "ذلت" گوارا نہ کرتا۔ اس لیے کہ بہر حال سید ہونے کی تھوڑی بہت قیمت تو اس خاکسار کو ملتی ہی۔

پھر یہ چیز کوئی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق صرف میری ذاتی پیشینگوئی یا قیاس آرائی سے ہو۔ جی نہیں دور نہ جائیے۔ اپنے ہندوستان ہی میں ان فرقوں کو دیکھیے جن کے یہاں اس قسم کا "الوہی استحقاق" تسلیم شدہ ہے اور پھر اندازہ کیجیے کہ اگر یہی چیز سارے اسلامیان عالم پر مسلط کر دی جاتی تو ہم مسلمانوں کی کیا درگت ہوتی

آپ ہز ہائی نس سر آغا خاں سے ناواقف نہ ہوں گے۔ یہ اہل تشیع کے اس مخصوص فرقہ کے "امام" ہیں جو خوجہ فرقہ کہلاتا ہے۔ آپ براہ راست حضرت علیؓ سے نسلی تعلق رکھتے ہیں۔ خوجہ فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ آغا خاں خدا کی طرف سے مذہبی اور دنیوی دونوں اعتبار سے کل مسلمانان عالم کے سردار و آقا ہیں اور ان کے بعد اُن کے صاحبزادہ پرنس علی خاں اس سرداری و خواجگی کے مستحق ہیں ——— بعینہٖ وہی عقیدہ جو اس وقت زیر بحث ہے اس کا نتیجہ کیا ہے:

آغا خاں اور ان کے صاحبزادے پرنس علی خاں کی زندگیوں سے کون ناواقف ہے؟ یورپ کی حسن بار و حسن پاش رنگینیوں میں وہ رہتے ہیں۔ ان کی بیویاں بے پردہ ہیں۔ ریس (گھوڑ دوڑ) میں وہ کروڑوں روپیہ ہر سال لٹا دیتے ہیں۔ ایک ایک لاکھ روپے کا ایک ایک گھوڑا خریدا جاتا ہے۔ غرضیکہ زندگی کا وہ کون عیش ہے جو انہیں حاصل نہیں؟ لیکن اس کے باوجود خوجہ فرقہ ذہنی اعتبار سے ان کا غلام ہے، ان کے غسل کا پانی حفاظت سے جمع کیا جاتا ہے اور بیماروں کو شفا کی خاطر پلایا جاتا ہے اور کیوں نہ پلایا جائے؟ جبکہ "نور محمدی" سلسلہ بہ سلسلہ ان میں منتقل ہوتا ہے ——— ان کے پاؤں دھو کر

پیے جاتے ہیں، ان کے قدموں کے نیچے کی خاک کو خاکِ شفا قرار دیا جاتا ہے۔ المختصر وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جسے سنکر آپ کو یقین بھی بمشکل آئے گا۔

آغاخاں کو چھوڑیئے، اگر کبھی بمبئی جانے کا اتفاق ہو تو "سیدنا" پیر سیف الدین طاہر کی بارگاہِ جلال میں قدم رکھیے۔ آپ بھی "آلِ رسولؐ" ہیں۔ براہِ راست حضرت علیؓ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور "الوہی امامت" کی وجہ سے ساری دنیا کے بوہرہ فرقہ کے روحانی اور دنیوی پیشوا ہیں۔ ہر بوہرہ پر فرض ہے کہ ہر سال آپ کی "بارگاہ" کو ایک مخصوص "ٹیکس" (جس کا کوئی خاص مذہبی نام ہے) ادا کرے پھر عقیقہ، ختنہ، نکاح اور موت کے مواقع پر بھی مختلف قسم کے ٹیکس مقرر ہیں جو اس "بارگاہ" کو دیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس وقت کئی کروڑ روپیہ کی رقم کے "واحد مالک" "حضور سیدنا" ہیں۔ آپ ایک نہایت پُرتکلف عالیشان کوٹھی میں رہتے ہیں۔ کئی کئی موٹریں ہر وقت آپ کی سروس میں رہتی ہیں۔ دسترخوان پر ہارون و مامون کے الوان نظر آتے ہیں۔ فرسٹ کلاس یا غالباً اسپیشل سیلون میں آپ سفر کرتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں لوگ سچ مچ آپ کے قدم لیتے ہیں اور ماشاءاللہ شرعِ محمدی کے بموجب آپ کی چار بیویاں بھی ہیں۔ ممکن ہے کچھ لونڈیاں بھی ہوں۔

کیا ان مناظر کو دیکھنے کے بعد آپ یہ نتیجہ بآسانی نہیں نکال سکتے کہ اگر "الوہی خلافت" کے مذکورۂ بالا مسئلہ پر عامۃ المسلمین کا ایمان ہوتا تو پھر اسی قسم کا ایک خلیفہ یا امام ہم سب "ایمان والوں" کا بھی ہوتا اور ہم سب "چالیس کروڑ فرزندانِ توحید" ایک ایسے "آغاخاں" کے مطیع و منقاد ہوتے جو پیرس و نیپلز میں گھوڑے دوڑایا کرتا اور ہماری جیبوں سے ہر سال کروڑوں بلکہ اربوں "چہرہ شاہی کلدار" وصول کرتا رہتا۔

پھر یہ طریقِ عمل کچھ میرے ہی نزدیک قابلِ اعتراض نہیں بلکہ خود بوہروں اور خوجوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایسے دماغ پیدا ہو چکے ہیں جو علانیہ اس چیز سے اپنی بیزاری کا اعلان کر رہے ہیں۔ بوہروں میں تو ایک جماعت ہی ایسی تشکیل پا گئی ہے جس نے

"سیدنا" کی اس امتیازی "شانِ کبریائی" کے خلاف علانیہ علمِ بغاوت بلند کردیا ہے، اور جس پر "حضور سیّدنا" اپنی قہر وجلال کی تلوار کا آخری وار بھی صرف فرما چکے ہیں یعنی اس قسم کے تمام "گستاخ و بے ادب" افراد کو "ذات سے باہر" کر دیا گیا ہے۔ اور اب وہ "سیدنا" کے "مخلصین" کے یہاں نہ تو شادی کر سکتے ہیں، نہ ان کی کسی تقریب میں بلائے جاسکتے ہیں اور نہ کوئی اور "صحیح العقیدہ" بوہرہ ان کی کسی تقریب میں شریک ہو سکتا ہے۔

الغرض یہ ہے وہ عالم جو الوہی خلافت کے عقیدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر یہ صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام میں اسی کا حکم ہے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یا تو ہر معقول وسنجیدہ انسان اس فیصلہ کی صداقت وحقانیت سے انکار کر دے اور یا پھر اسلام کو غیر الہامی یا کم از کم ناقابلِ عمل مذاہب کی صف میں رکھ کر ہمیشہ کے لیے اسے الوداع کہہ دے۔

⁂

مَیں یہاں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس بحث میں میں نے اپنا سارا زورِ استدلال عقلِ عمومی کے فیصلہ پر موقوف کیا ہے۔ اور اسی بنا پر مجھے یقین ہے کہ اس ضمن میں میں نے جن بدیہی اور روشن حقیقتوں کو پیش کیا ہے ان میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں ہو سکتی۔ یعنی کوئی معقول اور سنجیدہ انسان عقلِ عمومی کے اعتبار سے اس امر میں مجھ سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ اہلِ تشیع الوہی امامت کے عقیدہ کو جس نوع سے مانتے ہیں، وہ نہ تو صرف انسانیت کے عام نقطۂ نظر سے ناقابلِ قبول ہے بلکہ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو انسان کے قوائے فکر وعمل کی صحیح نشو ونما ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ کردار وگفتار کی آزادی ابداً آباد تک کے لیے معدوم ہو جائے۔ انسانوں کے مابین امتیاز وتفریق کی ابدی خلیجیں حائل ہو جائیں، ذہنی استعداد اور معاشرتی تفوق وبرتری کی وہ مکروہ فضا پیدا ہو جائے جو انسانیت کو رفتہ رفتہ ہندوؤں جیسی ذات

بات کے تصور سے قریب نہ کر دے، انسانی عقل و فکر پر پہرے بیٹھ جائیں اور دنیا کے بسنے والے خدائے واحد کے علاوہ بہت سے ایسے بتوں کی پرستش کرنے لگیں جن کو پاش پاش کرنے کی کوشش آج دنیا کے ہر گوشہ میں کی جا رہی ہے۔ جو انسانیت کے نشوونما کے راستہ میں سنگِ گراں کی طرح حائل ہیں اور جن پر محمدؐ عربی نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مؤثر اور تباہ کن ضرب لگائی تھی۔

ممکن ہے میری اس گذارش کو مذہبی تعصب و جانبداری پر مبنی قرار دیا جائے لیکن میں ایمان و ضمیر کی پوری صداقت و پاکبازی کے ساتھ ربِ جلیل کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ میں نے ان نتائج تک پہنچنے میں فرقہ وارانہ عصبیت و تنگ نظری سے کنارہ کش ہو کر غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کوشش کے نتیجہ کے طور پر میں نے جس چیز کو صحیح سمجھا ہے اسی کو اوپر کی سطور میں عرض کیا گیا ہے حتیٰ کہ مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا ہوتا تب بھی غور کرنے کے بعد میرا عقیدہ یہی ہوتا جو پیش کیا گیا — لیکن چونکہ اتفاق سے میں اہلِ تسنن کے خاندان میں پیدا ہو گیا ہوں اس لیے یقیناً شیعہ حضرات مجھ پر فرقہ وارانہ جنبہ داری اور مذہبی عصبیت کا الزام عائد کرنے سے دریغ نہ کریں گے اور اس لیے میں ان کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اس امر کے فیصلہ کے لیے دنیا کی کسی غیر جانبدار شخصیت کو بطورِ حکم مقرر کر لیں۔ حتیٰ کہ مجھے اس میں بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر وہ مسولینی اور ہٹلر کو — جن کے آمرانہ اصول کو وہ اپنے دعوے کے اثبات میں اکثر پیش کیا کرتے ہیں — اس فیصلہ کے لیے ثالث بنا لیں۔

پس اگر وہ یہ فیصلہ کریں کہ اہلِ تشیع کا "عقیدۂ امامت" انسان کی عقلِ عمومی کے منافی نہیں ہے۔ اور یہ کہ اس کو ماننے کے بعد انسانی معاشرت اور انسانی ذہن و فکر کی طاقتوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنا یقینی نہیں ہے — تو سب سے پہلا شخص جو علانیہ شیعیت کو قبول کر کے آلِ رسولؐ کی شہادت پر سینہ کوبی کرتا ہوا "الوہی خلافت و امامت"

کے عقیدہ کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر میدان میں نکلے گا، وہ یہ خاکسار ہوگا۔

خلافت کا مسئلہ آیات و احادیث کی روشنی میں

عقلی نقطۂ نظر سے اس مختصر سی گذارش کے بعد اب میں ان آیات و احادیث پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو "الوہی خلافت" کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ بحث کا کوئی شعبہ تشنہ نہ رہے اور اس کا ہر پہلو پوری پوری طرح روشنی میں آجائے۔

اس حقیقت سے شیعہ حضرات کو بھی اتفاق ہے کہ قرآن نے حضرت علیؑ کی جانشینی کا کہیں صراحتہً تذکرہ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۶ء کے "نگار" میں کسی فاضل اہلِ قلم نے شیعہ حضرات کی نمائندگی کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اس مسئلہ میں قرآن نے "اپنے مقاصد کو ایک طرح کے ابہام کے پردہ میں رکھا ہے۔ لیکن قرائن ایسے قائم کیے ہیں جن سے ایک سنجیدہ غور کرنے والا انسان حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ پھر اسی ضمن میں یہی حضرت ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ:۔

"بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ (قرآن میں بالتصریح) نام تھے اور وہ حذف کر دیے گئے ہیں مگر میں اس کا قائل نہیں ہوں"

گویا اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوا کہ "الوہی خلافت" کے مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے:۔

۱۔ ان قرائن سے نتائج اخذ کرنا چاہئیں جو قرآنی آیات سے مستنبط ہوتے ہیں۔

۲۔ احادیث نبوی کو دیکھنا چاہیے۔

۳۔ صحابہ اور تابعین کی ان تصریحات کو دیکھنا چاہیے جو آیات و احادیث کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً انھوں نے بیان کیں۔

آیات

وہ قرآنی آیات جن کی بنا پر حضرات شیعہ کی جانب سے عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے حضرت علیؓ کی الوہی خلافت پر مضبوط قرائن قائم ہوتے ہیں یہ ہیں:۔

۱۔ لیس البرّ بان تأتوا البیوت من ظھورھا ولکنّ البرّ من اتّقیٰ
واْتوا البیوت من ابوابھا (سورۃ بقرہ رکوع ۲۴)

"نیکی یہ نہیں ہے کہ گھروں میں اُن کی پشت کی طرف سے داخل ہو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو۔"

۲۔ "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت
لکم الاسلام دینا" (سورۃ مائدہ رکوع ۱)

"آج میں نے تمھارے دین کی تکمیل کر دی اور اپنے احسان کو تم پر پورا کر دیا اور میں نے پسند کیا کہ تمہارا دین اسلام ہو۔"

۳۔ "انذر عشیرتک الاقربین واخفض جناحک لمن اتبعک
من المؤمنین" (سورہ شعراء رکوع ۱۱)

"اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو متنبہ کر دے اور جو ایمان والے تیرے ساتھ ہیں اُن کے سامنے اپنے بازو نیچے رکھ (یعنی ان کے ساتھ نرمی سے پیش آ)

۴۔ انّما ولیّکم اللہ ورسولہٗ والّذین اٰمنوا الّذین یقیمون
الصّلوٰۃ ویؤتون الزّکوٰۃ وھم راکعون۔ (سورۃ مائدہ رکوع ۸)

"تمہارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اس کا رسولؐ اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور عجز و انکساری سے زندگی گزارتے ہیں۔"

۵۔ یاایّھاالرّسول بلّغ ما انزل الیک من ربّک وان لم تفعل فما بلّغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔ (سورۂ مائدہ رکوع ۱۰)

"اے رسولؐ وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دے جو تیرے رب کی جانب سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور اگر تُو نے ایسا نہ کیا تو تُو نے کچھ نہ پہنچایا، اس کا پیغام، اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔"

ان آیات کو دیکھنے سے آپ کو پتہ چلا ہوگا کہ بظاہر ان سے کسی طرح بھی یہ مترشح نہیں ہوتا کہ ان کی غایت نزول حضرت علیؓ کی الوہی خلافت کو ثابت کرنا تھا۔ اس کے برعکس ان میں چند ایسے عمومی مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو بجائے خود مکمل ہیں اور جن کی توضیح وتشریح کے لیے کسی مقدمہ یا تمہید کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان آیات سے حضرت علیؓ کی امامت کا حکم مستنبط کرنے کے لیے شیعوں کی جانب سے چند احادیث نبوی کو پیش کیا جاتا ہے۔

اس بحث کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی خاطر میں ہر ایک آیت کے شیعی استدلال کو ذیل میں درج کرتا ہوں۔

آیتِ اوّل} رسول کریمؐ نے فرمایا ہے:۔ انا مدینۃ العلم وعلی بابھا فمن اراد العلم فلیأت الباب (یعنی "میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس شہر کا دروازہ ہے، پس جو شخص علم حاصل کرنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس دروازہ سے داخل ہو")

شیعہ حضرات کا استدلال یہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا آیت کو رسولؐ کے اس قول کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس کا صراحتہً یہ نکلتا ہوگا کہ قرآن اس بات کا مؤید ہے کہ رسولؐ کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے، تو وہ صرف علیؓ ہیں۔

لیکن اس استدلال پر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ نکتہ سنج نظریں خود اس بات کو معلوم کر سکتی ہیں کہ یہ تاویل کس حد تک قرین عقل ہے۔ جبکہ خود شیعہ مفسرین بھی اس کے مدعی نہیں ہیں کہ آیت زیر بحث کے نازل ہونے کے فوراً بعد حضور اکرمؐ نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہو۔ اور اس لیے اب استدلال کی منطق صرف یہ رہ جاتی ہے کہ "رسولؐ کے اس قول کے ساتھ اس آیت کے اترنے نے کیا رسولؐ کے پروپیگنڈے کو قوت نہیں پہنچائی"؟

اگر اس وقت اس بات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ اس طرح غیر واضح انداز سے اپنے مقصد کا اشارۃً پروپیگنڈا کرنے سے رسول کریم کی ذات پر موجودہ زمانہ کی ڈپلومیسی اور شاطرانہ چال کا الزام عائد ہوتا ہے تب بھی اس سے اصل مقصد ثابت نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اگر سعی و کوشش کے بعد اپنے شیعہ دوست کی خاطر سے کچھ روا دارانہ انداز بھی اختیار کیا جائے تب بھی زیادہ سے زیادہ "یہ ظن" قائم کیا جا سکتا ہے۔ کہ ممکن ہے اس آیت سے قرآن کریم نے حضرت علیؓ کی برتری مراد لی ہو۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ "اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِی مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا"

آیتِ دوم

یہ آیت بھی امامت و خلافت سے براہِ راست کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ لیکن اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نبی کریمؐ کی اس تقریر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ جو آپ نے "غدیرِ خم" میں کی تھی اور جس میں حضرت علیؓ کو "مولی المومنین" کہا تھا اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

> "خدا میرا مولیٰ ہے اور میں تمام مومنین کا مولیٰ ہوں اور اس کے بعد جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا علیؓ بھی مولا ہے۔"

جس کے متعلق جناب نیاز نے اپنے محاکمہ میں یہ لکھا ہے کہ:۔

> "شیعوں کے پاس جناب امیر کی ولایت کی یہ سب سے بڑی شہادت ہے۔"

لیکن مذکورہ بالا نصِ قرآنی میں نہ تو مولیٰ کا لفظ مذکور ہے اور نہ خلافت و امامت کے متعلق کوئی بعید ترین اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور اس لیے دلیل کی ساری بنیاد اصل آیت

کے بجائے صرف مذکورۂ بالا حدیث قرار پاتی ہے۔ مگر قرآن کی زیرِ بحث آیت کے مفہوم میں کوئی ایسا خلا یا نقص نہیں ہے جس کے پیشِ نظر اسے کسی دوسری بات سے متعلق کرنا یا کسی حدیث کے ساتھ اسے ضم کرنا قرینِ عقل قرار دیا جائے۔ اس کے برعکس آیت کا مفہوم بالکل صاف ہے۔ ایک سیدھی سادھی صداقت کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے شیعہ سنّی کے اختلاف سے ہٹ کر غور کیجیے کہ رسولِ کریمؐ اپنی وفات سے قبل یہ اعلان فرماتے ہیں کہ "آج تم پر خدا نے اپنی تمام نعمتیں مکمل کر دیں" اور اس طرح قرآن کے احکام و ہدایات کو ابدالآباد تک کے لیے اہلِ عالم کے واسطے شمعِ راہ بنانے کی اپیل کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کون سا ایسا خلا یا نقص ہے جس کو پورا کرنے کے لیے "غدیرِ خم" کی حدیث کے ساتھ اس کا دامن باندھنا ضروری ہو۔

آیتِ سوم

مجھے شیعہ حضرات کی اس بیکسی پر رحم آتا ہے جس کے ماتحت وہ ڈوبتے آدمی کی طرح ہر تنکے کا سہارا ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ میں نے پورے سکونِ قلب کے ساتھ قطعاً غیر جذباتی انداز سے کئی گھنٹے مسلسل اس امر پر غور کیا کہ آیا واقعۃً اس آیت کو "خلافتِ علیؑ" سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے کوئی تاویل ایسی نہ مل سکی جسے بہر نوع اطمینان بخش کہا جا سکے۔

شیعہ حضرات اس آیت کو بیعتِ عشیرہ کے واقعہ سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا خود انھیں بھی اعتراف ہے کہ اگر اس آیت کو بیعت مذکورہ سے علیحدہ کر لیا جائے تو اس سے اُن کے مقصود پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ مگر اس کے لیے وہ یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ "تمام مذہبی شعبوں میں "وحیِ متلو" یعنی قرآن کی ہدایتیں مجمل حیثیت رکھتی ہیں جن کی تفصیل رسولؐ کے عمل سے ہوئی ہے۔"

اگرچہ اہلِ تشیع تاویل کرنے اور اصل مفہوم کو کچھ سے کچھ کر دینے میں استاد مانے جاتے ہیں اور اسلام میں اس نوع کی تاویل کا دروازہ سب سے پہلے اسی فرقہ نے کھولا ہے[1]

---

[1] ملاحظہ ہو [illegible] مصنفہ [illegible]

مگر پھر بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تخیل کی کون سی پرواز سے اس آیت کو "مجمل" کی صفت میں رکھا جاسکتا ہے۔ جبکہ یہ بذاتِ خود بالکل مکمل اور اپنے مفہوم و معنی کے اعتبار سے بہر نوع غیر ناقص و کامل ہے۔ پھر اس کا فیصلہ مجھ سے نہیں۔ روئے زمین کے کسی صاحب الرائے (مگر غیر شیعہ) انسان سے حاصل کر لیجئے۔ یورپ و امریکہ کے مستشرقین سے پوچھیئے۔ چین و جاپان کے کسی بالکل غیر متعلق آدمی سے دریافت کیجئے۔ فلپائن اور آسٹریلیا کے کسی ناواقف حالات انسان سے معلوم کیجئے اور اگر کسی ایک جگہ سے بھی یہ آواز اُٹھے کہ یہ آیت کسی نوع سے بھی کسی واقعہ خاص سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور بجائے خود کسی مضبوط و مکمل صداقت کی حامل نہیں ہے تو میں سپر ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔

بہرحال یہ قرآنی آیت ہماری بحث سے خارج ہو جاتی ہے۔ رہ گئی بیعتِ عشیرہ والی حدیث۔ سو اس پر میں "احادیث" کے ذیل میں اپنی رائے عرض کروں گا۔

آیتِ چہارم

اس آیت میں بھی کوئی ایسا ابہام و خلا نہیں ہے جس سے حضرت علیؑ کی خلافت پر استدلال قائم کیا جائے اور تصوّر و تخیل کی کسی بعید ترین پرواز سے بھی اسے خلافت و امامت کے مسئلہ کے ساتھ متعلق کیا جائے۔ لیکن شیعہ حضرات حسب عادت اس آیت کے "فحوائے منصوص" سے نہیں بلکہ اس کے "شانِ نزول" سے استدلال کرتے ہیں اور اس لیے قرآن کے بجائے شانِ نزول والی حدیث معرضِ بحث میں آجاتی ہے۔ پس اگر شانِ نزول کی بے شمار روایات کے باہمی تضاد و تخالف کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی اس استدلال کا تعلق قرآن سے نہیں بلکہ صرف حدیث سے رہ جاتا ہے۔

آیتِ پنجم

اس آیت کے متعلق شیعہ حضرات کے فاضل نمائندہ کا بیان ہے کہ:۔

"یہی پُر زور حکمِ محکم ہے جس سے حضرت علیؑ کی ولایت کا منجانب اللہ ہونا

ثابت ہوتا ہے۔"

لیکن یہاں بھی استدلال کا سارا زور اصل آیت کے بجائے صرف شانِ نزول سے حاصل کیا گیا ہے۔ اور اہل سنت کی تصانیف سے بہت سی روایات کو نقل کر کے یہ کہا گیا ہے کہ "یہ سب اس باب میں متفق ہیں کہ یہ آیت حجۃ الوداع میں ولایتِ علیؓ کی تبلیغ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔"

لیکن اس آیت کے الفاظ سے جو مفہوم اخذ ہوتا ہے وہ اپنی جگہ اتنا مکمل ہے کہ اس کی توضیح و تفصیل کے لیے شانِ نزول کی کسی حدیث کو سامنے رکھنے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ تنہا اس آیت سے حضرت علیؓ کی الوہی خلافت کا حکم ہرگز مستفاد نہیں ہوتا ہاں اگر شانِ نزول کو صحیح مان لیا جائے تب البتہ یہ کہنا درست ہو سکتا ہے اور اس لیے یہاں بھی قرآن پر بحث کرنے کے بجائے صرف حدیث معرضِ گفتگو میں آجاتی ہے۔

ان تصریحات کے بعد یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں اشارۃً یا صراحتہً کسی طرح حضرت علیؓ کی امامت کا تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے مختلف احادیث و واقعات کو کھینچ تان کر قرآنی آیات سے متعلق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس قسم کی تمام کوششیں اتنی سفسطہ آمیز اور غیر تسلی بخش ہیں کہ عام انسانی دماغ اُن کو قبول نہیں کر سکتا۔ اور گو تعصب و تنگ نظری کے ماحول میں ذاتی اغراض و مفاد کے دائرہ میں وہ کتنی ہی دل خوش کُن نظر آئیں لیکن علم و تحقیق کی روشنی میں وہ بے حقیقت سی ہو جاتی ہیں۔ اور اس اہم اور بنیادی مسئلہ میں قرآن کی خاموشی شیعہ حضرات کے مشن کے لیے شدید طور پر نقصان رساں ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ اسی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے شیعوں کے متعدد مجتہدین یہ دعویٰ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ قرآن سے وہ آیات و احادیث حذف کر دی گئی ہیں جن میں حضرت علیؓ کی امامت کے مسئلہ کو ناقابل انکار طور پر بیان کیا گیا ہے۔ غالباً اہلِ تشیع عام طور پر تحریفِ قرآن

کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کے قابلِ احترام مجتہدین کی وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں قرآن کی بہت سی آیات کو بزعمِ خود صحیح کر کے نقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ حیات القلوب وغیرہ کے صفحات اس امر کی کھلی ہوئی شہادت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ جمہور شیعہ درحقیقت تحریفِ قرآن کے قائل نہیں ہیں لیکن جب ان کو اپنے مخصوص عقائد کی تائید میں ایک آیت بھی "بین الدفتین" دستیاب نہیں ہوتی تو انھیں قدرتاً اپنے عقائد پر شک و شبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اسی شک و شبہ کو دور کرنے کے لیے بعض شیعی مجتہدین نے قرآن کی تحریف کا دعویٰ کیا ہے۔ اور اپنے متشکک مریدوں کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے کہ "سنیوں نے قرآن سے وہ آیات حذف کر دی ہیں جن میں آل بیت کی امامت کے متعلق بالتصریح احکام مذکور تھے۔

چنانچہ میں نے اپنے ایک مخلص شیعہ دوست کے سامنے جب شیعہ حضرات کے "عقیدہ تحریفِ قرآن" کا تذکرہ کیا تو انھیں یہ سن کر بڑا تعجب ہوا اور گو وہ نہایت فاضل نوجوان تھے لیکن پھر بھی میرا یہ قول ان کے لیے ایک حیرت انگیز انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اس بات کے ماننے سے اس وقت تک انکار کرتے رہے جب تک کہ میں نے خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کے تحریف شدہ قلمی نسخہ اور حیات القلوب وغیرہ کا مطالعہ ان کو نہ کرا دیا۔

وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے فرمایا۔ "یہ کتابیں ہمارے یہاں معتبر نہیں ہیں۔ اور ——— کم از کم میں ——— کسی ایسے قرآن پر ایمان رکھنا کفر سمجھتا ہوں جو قرآن کے موجودہ "بین الدفتین" نسخہ سے ایک حرف اور ایک کا بھی اختلاف رکھتا ہو۔

احادیث

مذکورۂ بالا بیان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عقل سلیم اور قرآن دونوں اعتبار سے خلافت و امامت کا مسئلہ شیعہ حضرات کے حق میں فیصل نہیں ہوتا۔ عقل سلیم کا فیصلہ تو کھلے طور پر شیعہ حضرات کے مخالف ہے۔ جیسا کہ اس مقالہ کے ابتدائی صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔ قرآن میں اس مسئلہ کا کہیں تذکرہ نہیں حتیٰ کہ بعید ترین تاویلات کے بعد بھی شیعہ حضرات اپنے مفید مطلب قرآن سے کوئی حکم مستنبط کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ البتہ احادیث کے میدان میں جنگ اور مبارز طلبی کی کافی گنجائش ہے۔ بلکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس نے اس قضیہ کو قضیہ بنا دیا ہے۔ ورنہ عمر بن عبدالعزیز یا زیادہ سے زیادہ بنی امیہ کی خلافت کے سقوط کے بعد سے یہ اختلاف ہمیشہ کے لیے دماغوں سے محو ہو چکا ہوتا۔

لیکن میں اس وقت احادیث کی صحت و عدم صحت پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اور نہ اس مبحث میں پڑنا مناسب سمجھتا ہوں کہ کون کون سی احادیث صحیح ہیں یا صحیح ہو سکتی ہیں اور کون کون سی غلط۔ اس لیے کہ اد اس طرح یہ بحث اتنی طویل ہو جائے گی کہ اس کا مطالعہ ہر شخص پر بار ہو جائے گا۔ اور دوسرے نتیجہ کے اعتبار سے بھی بالکل غیر مفید رہے گی۔ اس لیے کہ احادیث میں اس قدر اختلاف ہے کہ سعی و کوشش کے تمام مراحل طے کرنے کے باوجود بھی کسی شخص کو اس ذریعہ سے مطمئن کر دینا محال نہیں تو قریب قریب ناممکن ضرور ہے اور اس لیے میں کسی حدیث کی صحت و عدم صحت کے متعلق کوئی رائے دے کر کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ لیکن اس سلسلہ میں کم از کم اتنا ضرور عرض کروں گا۔ کہ چونکہ احادیث کے اعتبار سے دونوں فریقوں کے پاس برابر کا "بوجھ" ہے۔ اس لیے اس استدلال کو بحث سے خارج کر دینے

کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بہت سی باہم متضاد و مخالف احادیث کے ہجوم میں ایک غیر جانبدار جج کا فیصلہ یہی ہو سکتا ہے کہ صرف ان احادیث کو قابلِ غور سمجھا جائے جو عقلِ سلیم پر پوری اتریں یا جنہیں مسلمانانِ عالم کی اکثریت صحیح تسلیم کرتی ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان ہر دو اعتبارات سے شیعہ حضرات کے ساتھ بے انصافی نہ کروں گا۔ اگر اس میدان میں انھیں دعوتِ مقابلہ نہ دوں۔

لیکن ڈر ہے کہ کہیں شیعہ حضرات میرے اس طریقِ عمل کو قابلِ اعتراض قرار دیں اور جس طرح ڈوبتا آدمی تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے اسی طرح وہ بھی اسی ایک نقطہ پر میری کل عرضداشت کو ناقابلِ قبول قرار نہ دے دیں۔ اس لیے میں اس پہلو کو بالکل نظر انداز کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ ان تمام احادیث پر جو اس سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں یا پیش کی جا سکتی ہیں فرداً فرداً بحث کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں، اس کے برخلاف میرا خیال ہے کہ اگر شیعہ حضرات کی مستند احادیث کی مدد سے اپنے قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو غالباً میں اپنی ذمہ داری سے باحسن الوجوہ عہدہ برآ ہو جاؤں گا۔ اور اس لیے میں بالکل غیر مناظرانہ طور پر یہاں اُن احادیث کو نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جو شیعہ حضرات کے لیے ہر حیثیت سے قابلِ قبول ہیں اور جن کے اعتبار سے خلافت و امامت کے مسئلہ میں میرے نقطۂ نظر کی کامل تائید ہوتی ہے:۔

خُلفائے راشدین

یہ کُھلی ہوئی حقیقت ہے کہ حضرت علیؓ نے خلفائے ثلٰثہ کی خلافت کو کبھی بھی اسلام کے منافی قرار نہیں دیا۔ یہی نہیں کہ ان حضرات کو ہمیشہ نہایت مقدس و قابلِ احترام سمجھا اور ہمیشہ ان کے ساتھ تعاون و اشتراکِ عمل کرتے رہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر خلفائے ثلٰثہ کا زمانہ واقعی غاصبانہ دورِ خلافت ہوتا تو حضرت علیؓ جیسا جلیل القدر مسلمان اپنی عمر کا بڑا حصہ اس

غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں ہرگز بسر نہ کرتا۔ اور پوری طاقت کے ساتھ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے خدا و رسولؐ کے منشا کو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ جس کے بعد یا تو وہ اعلان کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر مسندِ خلافت پر متمکن ہو جاتے اور یا حسینؑ کی طرح میدانِ کارزار میں خاک و خون میں تڑپتے نظر آتے۔ ہمارے شیعی نمائندہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:۔

> (خلفائے ثلثہ کی خلافت کے) دور میں اصل خلافتِ اسلامی کے معاملہ میں کتنا ہی حکمِ خداوندی سے کنارہ کشی کی گئی ہو مگر دوسرے معاملات میں اپنے حدودِ علمی کے اندر (؟) بہت حد تک ظواہرِ اسلامی محفوظ رکھے جاتے تھے۔ اور پابندیٔ شریعت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یعنی شریعتِ اسلام اور احکامِ خداوندی کے ساتھ کھلم کھلا بغاوت کا اعلان نہیں تھا۔ محرمات و کبائر کی تلقین نہیں تھی۔ بلکہ ان کے اوپر حدود کا اجرا کیا جاتا تھا۔ اور بغیر کسی تاویل و توجیہ کے اس سے اغماض نہیں برتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے حقیقتِ اسلام کو کتنا ہی صدمہ پہنچا ہو لیکن بہرحال اسلام کی ظاہری صورت محفوظ تھی۔ اور چونکہ اس وقت تلوار اٹھانے کی صورت میں یقیناً اسلام کی عمر ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے علیؑ ایسے محافظِ اسلام نے تلوار نیام میں رکھی اور پچیس برس کی طویل مدت تک اپنے حقوق کی پامالی (ا) اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں گزار دی۔ اور خاموش فضا میں ذرا بھی سنسنی پیدا نہ کی۔،، (نگار جنوری ۳۷ء صفحہ ۸۹)

اس کے جواب میں میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ صرف ذیل میں ان کتابوں سے جن کو اہلِ تشیع قابلِ استناد و لائقِ استشہاد مانتے ہیں چند ایسی روایات نقل کیے دیتا ہوں جن سے ظاہر ہو گا کہ حضرت علیؓ کی رائے میں ابوبکر و عمر کی ذات نیز اُن کے

عہدِ خلافت کی کیا وقعت تھی؟ پھر اگر یہ روایتیں بخاری سے نقل کی جاتیں تو بلاشبہ ہمارے شیعہ بھائی ان پر ہنسی اڑا سکتے تھے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں خود انھیں کی قابلِ اعتنا کتابوں سے یہ حوالے پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

۱۔ جس زمانہ میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے مابین خلافت کا قضیہ چل رہا تھا اس وقت جنابِ علیؑ نے امیر معاویہ کو ایک طویل خط بھیجا تھا جس کا مفہوم[1] یہ تھا کہ :۔

"اے معاویہ آنچہ نوشتہ بودی کہ فاضل تر اصحاب مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوبکر صدیق وبعد ازاں عمر فاروق بودند بجان وسرتن کہ نصیب ایشاں بزرگی بودہ است"

آگے چل کر اسی خط میں آپ لکھتے ہیں کہ :۔

"ان دونوں کی وفات نے مجھ کو اور تمام مسلمانوں کو عظیم صدمہ پہنچایا ہے خداوند تعالیٰ ان پر رحمت کرے۔ انھوں نے دین کے استحکام کے لیے بہت سی نیک باتیں کیں اور اسلام کو بہت سی بدعتوں سے پاک کر دیا۔ خدا انھیں جزائے خیر دے۔ لیکن اے معاویہ تجھ کو ان بزرگوں سے کیا نسبت؟ وہ ہمارا صدیق تھا اور ہم ہی سے تعلق رکھتا تھا، تجھے اس سے کیا سروکار؟ اسی طرح عمر فاروق ہمارا فاروق تھا جو حق کو باطل سے جدا کرتا تھا، وہ ہمارے دوستوں کا دوست اور ہمارے دشمنوں کا دشمن تھا۔"

۲۔ سوید بن غفلہ ایک صحابی تھے، آپ نے ایک روز حضرت علیؓ سے کہا کہ "اے علیؓ آج میں نے ایک ایسا مجمع دیکھا جو ابوبکر و عمر کی حقارت کرتے تھے، اور عبداللہ ابن سبا ان کا سرغنہ تھا۔ میں نے یہ دیکھ کر ان کو بدکلامی سے روکا۔ لیکن انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہم حضرت علیؓ کی مرضی سے ایسا کرتے ہیں۔"

---

[1] کتاب الفتوح ابن عاصم کوفی شیعہ صفحہ ۵۷۔ شرح نہج البلاغہ مطبوعہ ایران

صحابی مذکور فرماتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت علیؑ بہت غضبناک ہوئے اور اسی روز آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں رو رو کر یہ فرمایا کہ:۔

> "میں اس قوم کو عذاب کروں گا آخر وہ ہیں کون؟ بیزار ہوں میں اس قوم سے جو رسولؐ کے دو بھائیوں، رسولؐ کے دو وزیروں اور مسلمانوں کے دو باپوں کی توہین کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن کا دوست اونچے پایہ کا مومن اور ان کا دشمن فاسق و بے دین ہے[1]"

۳۔ قمی شیعہ نے اپنی تفسیر قرآن میں سورۂ توبہ کی مشہور آیت "ثانی اثنین اذھما فی الغار" کے ذیل میں اپنے باپ کی سند سے بحوالہ امام جعفر صادقؒ یہ روایت نقل کی ہے

> "قال لما کان رسول اللہ فی الغار قال لابی بکر کانی انظر الی سفینۃ جعفر واصحابہ تقوم فی البحر وانظر الی الانصار فقال ابوبکر وتراھم یا رسول اللہ انت الصدیق"

" مروی ہے کہ جب نبی کریمؐ غار میں تھے تو آپ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا کہ مجھے ایسا نظر آتا ہے گویا کہ میں جعفر اور اس کے رفقاء کی کشتی کو سمندر میں کھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں اور انصار کو بھی دیکھ رہا ہوں۔" اس پر حضرت ابوبکر نے دریافت کیا کہ "اے رسول خداؐ کیا آپ سچ مچ انھیں دیکھ رہے ہیں؟" آپ نے جواب دیا "ہاں"۔ پھر حضرت ابوبکر نے کہا کہ "تو مجھے بھی دکھا دیجئے۔" یہ سن کر آپ نے ان کی دونوں آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور ان کو بھی دکھلا دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر نے کہا "آپ صدیق (سچے) ہیں۔"

۴۔ سورۂ نور کی ایک آیت ہے "ان الارض یرثھا عبادی الصالحون" (یعنی خدا اس زمین کا وارث اپنے نیک بندوں کو بناتا ہے) اس کی تفسیر میں خلاصۃ المنہج کے

---

[1] اطواق الحمامۃ از یحییٰ ابن حمزہ شیعہ زیدی ۱۲

شیعہ مجتہد صاحب فرماتے ہیں:-

" دراندک زمانہ حق تعالیٰ وعدۂ مومناں را وفا نمودہ جزیرۂ عرب ودیار کسریٰ و بلادِ روم بدیشاں ارزانی نمودہ"

اس توضیح کی ضرورت نہیں کہ جزیرۂ عرب ودیار کسریٰ اور بلادِ روم خلفائے ثلٰثہ ہی کے عہد میں مفتوح ہوئے ہیں۔

۵ ۔ شیعوں کی کتاب "کشف الغمہ" میں یہ روایت مذکور ہے کہ "جو ابوبکر کو صدیق نہ کہے خدا اس کی عاقبت خراب کرے ۔"

۶ ۔ جس وقت حضرت صدیق اکبر نے وفات پائی۔ تو حضرت علیؓ زار وقطار روتے ہوئے خلیفۂ اوّل کے جنازہ پر تشریف لائے اور فرمایا کہ آج کے دن نبوت کی خلافت منقطع ہو گئی اور فرمایا احسنت الخلافۃ حین ارتداد الناس۔

فصول امامیہ میں ہے:-

عن ابی جعفر محمد بن علی الباقر علیہ السلام انہ قال لجماعۃ خاضوا فی ابی بکر وعمر وعثمان اما تخبرونی انھم من المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا وینصرون اللہ ورسولہ؛ قالوا لا فانھم من الذین تبوء والدار والایمان قبلھم یحبون من ھاجر الیھم؛ قالوا لا قال "اما قد برئتم ان تکونوا احد ھذین الفریقین وانا اشھد انکم لستم من قال اللہ تعالیٰ فیھم والذین جاؤا من بعدھم یقولون ربنا اغفر لنا ولا اخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رؤف رحیم"

"ابو جعفر محمد بن علی باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ ایک جگہ بیٹھے

ابوبکر، عمر اور عثمان کے بارہ میں گفتگو کر رہے تھے۔ آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ "کیا تم مجھے بتلاؤ گے کہ یہ لوگ (یعنی ابوبکر و عمر اور عثمان) ان مہاجرین میں سے تھے جن کے متعلق خدا نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ "الذین اخرجوا من دیارھم ..... الخ (یعنی وہ لوگ جو محض اس لیے بے خانماں کیے گئے کہ وہ خدا کی خوشنودی کے طلبگار تھے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے تھے) اس کے جواب میں ان لوگوں نے کہا "نہیں" پھر آپ نے دریافت کیا کہ "تو کیا پھر یہ لوگ (ابوبکر و عمر و عثمان) اُن لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ "من الذین بتوءالدار الایمان ... الخ۔ (یعنی وہ جنھوں نے اپنا سب کچھ مہاجرین کے لیے وقف کر دیا) اس کا جواب بھی ان لوگوں نے نفی میں دیا۔ یہ سن کر آپ نے کہا" بیشک تم خود بھی مذکورۂ بالا دونوں گروہوں (یعنی مہاجرین و انصار) میں سے کسی ایک میں بھی نہیں ہو۔ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں سے بھی نہیں ہو جو مہاجرین و انصار کے بعد آئیں گے۔ اور جو اپنے لیے اور اپنے ان بھائیوں کے لیے جو ان سے پہلے گزر چکے دعائے مغفرت کریں گے، اور یہ کہیں گے کہ "اے اللہ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے بغض و عناد پیدا نہ کر۔ اے اللہ تو مہربان رحمت والا ہے۔"

۸ ۔ نہج البلاغت میں حضرت علیؓ کا ایک خطبہ درج ہے۔ یہ خطبہ اس وقت دیا گیا ہے جبکہ حضرت عمر جہادِ روم پر جانے کا قصد فرما رہے تھے۔ اس خطبہ میں جناب امیرؑ نے حضرت عمر کو مسلمانوں کا ملجاؤ ماوا ظاہر فرمایا ہے اور یہ مشورہ دیا ہے کہ تم بذاتِ خاص جہاد پر نہ جاؤ۔ تم عرب کی جان ہو۔ اس لیے تمھاری جان کو نقصان پہنچنا کل اہلِ عرب کو نقصان پہنچنے کے مترادف ہے۔

یہ خطبہ بہت طویل ہے اور نہج البلاغہ میں بتمام و کمال درج ہے۔

۹ ۔ جلاء العیون کے باب وصایا میں حضرت علیؓ کی یہ وصیت درج ہے:۔

"اصحابِ رسولؐ کی رعایت کرو، انھوں نے خدا کے دین میں کوئی بات جاری نہیں کی اور نہ بدعتی کو اپنے پاس آنے کی راہ دی[1]"

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ خلفائے ثلثہ کو کسی نے صحابہؓ کی صف سے خارج نہیں کیا ہے۔

الوہی خلافت

صفحات ماقبل میں یہ امر بخوبی واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرت علیؑ کی خلافت کے متعلق قرآن مجید بالکل ساکت ہے اور اس میں کوئی نص قطعی ایسی موجود نہیں ہے جس سے اس خلافت پر استدلال کیا جا سکے۔ شیعہ حضرات کے نمائندہ نے اس سلسلہ میں جتنی آیات کو کھینچ تان کر اس واقعہ سے متعلق کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان سب پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔ لیکن اس پر ایک اور پہلو سے بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر قرآنِ مجید میں جناب امیرؑ کی خلافت کے بارے میں نصوصِ قطعیہ موجود ہوتیں تو بعض شیعہ اہلِ علم کو قرآن میں تحریف کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے شیعہ مجتہدین کی جانب سے قرآن میں تحریف کی گئی ہے اور تحریف شدہ عبارتوں میں صرف جناب امیرؑ کی خلافت و وصایت کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس لیے ظاہر ہے کہ اگر قرآن اس بارے میں ساکت نہ ہوتا تو یہ غریب اتنے بڑے اقدام کی زحمت کیوں گوارا کرتے۔

چنانچہ ملا باقر مجلسیؒ نے اپنی کتاب حیات القلوب کی جلد سوم میں خوب جی بھر کر قرآنی آیات میں حک و اضافہ کیا ہے۔ ولایتِ علیؑ کے ثبوت کے لیے حسبِ دلخواہ مناسب الفاظ بڑھا دیے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ "در حدیث وارد شدہ کہ ثلث قرآن در فضائل اہلِ بیتؑ و ثلثے در مثالبِ دشمنانِ ایشاں است"[2]

---

[1] جلاء العیون جلد اول صفحہ ۲۰۸ [2] حیات القلوب حصہ سوم صفحہ ۴۱

اسی طرح اس مصنف نے اپنی ایک دوسری کتاب "تذکرۃ الائمہ" میں بھی آیات کو تحریف کیا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس شیعوں کی کتاب "حدیث کلینی" میں قرآن کی ستر ہزار آیات بیان کی گئی ہیں، حالانکہ موجودہ قرآن میں صرف چھ ہزار آیات ہیں۔

پٹنہ کی خدابخش لائبریری میں بھی ایک تحریف شدہ قرآن مجید موجود ہے جس میں چند آیات کے اضافہ کے علاوہ ولایت و وصایت پر مستقل دو سورتیں بڑھائی گئی ہیں۔

یہاں میں اس بات کو ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے غالباً جمہور شیعہ تحریفِ قرآن کے قائل نہیں ہیں اور اس لیے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں عام شیعہ حضرات کو تحریفِ قرآن کا قائل ثابت کروں بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن میں خلافتِ علیؓ کے متعلق نصوصِ قطعیہ موجود نہیں ہیں، اور اسی بنا پر بعض شیعہ مجتہدین کو اپنے اس عقیدہ کے ثبوت کے لیے قرآنِ مجید میں تحریف کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار سمجھ میں نہیں آیا۔

حضرت علیؓ کی الوہی خلافت کے ثبوت میں بہت سی احادیث پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں غدیرِ خم کی حدیث کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لیکن میں ان احادیث پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے برخلاف میں تو شیعہ حضرات کی مستند کتابوں سے صرف یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ الوہی خلافت کا اعتقاد غلط ہے — یعنی خدا یا رسولؐ خدا کا یہ منشا، ہرگز نہ تھا کہ رسولِ کریمؐ کے بعد حضرت علیؓ ہی خلیفہ بنائے جاتے۔

اہلِ تشیع کے مشہور مجتہد بحرانی نے شرح نہج البلاغہ (مطبوعہ طہران) میں یہ روایت نقل کی ہے کہ: —

> "ایک رات رسولِ کریمؐ اپنی زوجہ حضرت حفصہ کے حجرہ میں تشریف رکھتے تھے مگر اتفاق سے حضرت حفصہ اس وقت موجود نہ تھیں اور اس لیے آپ نے یہ رات اپنی دوسری زوجہ ماریہ قبطیہ کے حجرہ میں بسر فرمائی۔ صبح حضرت حفصہ کو اپنی حق تلفی کی شکایت ہوئی۔ اس پر آپ نے فرمایا، کہ "اے حفصہ تم ناخوش نہ ہو" ہم تم کو دو خوشخبریاں سناتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماریہ قبطیہ کو ہم نے اپنے اوپر حرام کیا، دوسرے یہ کہ ہمارے بعد ہمارا خلیفہ ابوبکر ہوگا اور اس کے بعد تمہارا باپ عمر۔ لیکن دیکھو یہ راز ہے۔ اس کو کسی پر ظاہر نہ کرنا ورنہ خدا تعالیٰ ہم پر ناراض ہوگا۔ اس پر حفصہ نے دریافت کیا کہ آپ کو یہ خبر کس نے دی؟ حضورؐ نے فرمایا "کہ علیم و خبیر نے" مگر حضرت حفصہ نے مارے خوشی کے یہ خبر عائشہ صدیقہ کو کر دی۔ اور تمام مدینہ میں اس کا چرچا ہو گیا۔ اس پر فوراً یہ آیت نازل ہوئی۔
>
> "اے رسولؐ جو چیز ہم نے تجھ پر حلال کر دی ہے تجھ کو اس کے حرام کرنے کا کیا اختیار حاصل ہے اور اے نبیؐ کی بی بیو اپنے نبیؐ کا راز کسی پر ظاہر نہ کیا کرو۔" (سورۂ تحریم)

اس روایت سے اس بات کا بوضاحت پتہ چلتا ہے کہ خدائے کریم کو یہ ہرگز منظور نہ تھا کہ رسول کریمؐ کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں بلکہ اس کے برعکس ابوبکر و عمر کی خلافت ایک طے شدہ مسئلہ تھا جو خود رسولؐ کے علم سے بھی باہر نہ تھا۔

۲۔ جلاء العیون میں لکھا ہے کہ جب رسول کریمؐ پر مرض الموت کا غلبہ شدید ہوا تو آپ نے چاہا کہ اپنی میراث و جانشینی اپنے چچا حضرت عباس کے سپرد فرما دیں مگر حضرت عباس نے کہا کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا، میرے بجائے حضرت علیؓ کے سپرد کر دیجیئے[1]۔

---

[1] جلاء العیون مطبوعہ مطبع جعفری لکھنؤ صہ ۶۔

اس روایت سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ رسولِ کریمؐ اپنی وفات کے بعد صرف حضرت علیؓ ہی کو خلافت کا حقدار تصور نہ کرتے تھے۔

۳۔ ملّا باقر مجتہد نے حضرت امام جعفر صادقؒ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ "ایک بار نبئ کریمؐ نے بارگاہِ ایزدی سے ہزار حاجتیں طلب کیں۔ خدا تعالےٰ نے سب روا کر دیں۔ آخر شب میں حضرت علیؑ بھی مسجد میں تشریف لائے رسولِ خداؐ نے فرمایا۔ "اے علیؑ تمہاری ولایت اور خلافت کے واسطے ہم نے جو دعا کی وہ بارگاہِ خداوندی سے منظور نہیں ہوئی۔"[1]

غالباً میں اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لیے اس سے زیادہ روشن دلیل اور کوئی پیش نہیں کر سکتا حتیٰ کہ اگر میں حدیث گھڑنے پر آتا تب بھی اس سے زیادہ واضح اور غیر مبہم حدیث گھڑنے میں شاید مشکل کامیاب ہو سکتا۔

۴۔ "عیون الاخبار" شیعوں کی معتبر کتاب ہے۔ اس میں حضرت علیؑ سے حسب ذیل روایت منقول ہے۔

فبينا انا نمشي مع النبي في بعض طرق المدينة اذ لقينا شيخ طويل ـــ فسلم على النبي وارحب ثم انصرف اليّ فقال سلام عليك يا رابع الخلفاء رحمة الله وبركاته' اليس ذلك هو يا رسول الله ؟ قال بلى ـ ثم مضى۔

"ایک مرتبہ ہم رسولِ کریمؐ کے ساتھ مدینہ کی کسی سڑک پر چل رہے تھے۔ کہ دفعۃً ہم سے ایک طویل قد انسان سے ملاقات ہوئی۔ اس شخص نے رسولِ کریمؐ کو سلام کیا اور مرحبا کہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔ سلامٌ علیک اے چوتھے خلیفہ۔ آپ پر اللہ کی رحمت اور برکت ہو" (اس کے بعد اس نے

---

[1] حیات القلوب جلد سوم صفحہ ۱۸۶

رسولِ کریمؐ کی طرف مخاطب ہوکر پوچھا، کیا یہ چوتھے خلیفہ نہیں ہیں؟ اے رسولِ خداؐ۔ آپؐ نے فرمایا "ہاں" اس کے بعد وہ چلا گیا[1]۔

ان روایات کو نقل کر دینے کے بعد غدیرِ خم کے قسم کی تمام احادیث اگر قابلِ اعتبار نہیں تو کم از کم مشکوک و مشتبہ ضرور قرار پا جاتی ہیں۔ جس کے بعد ان کو صحیح ثابت کرنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ یعنی (۱) درایت یا (۲) جمہورِ مسلمین کا عقیدہ۔ جسے فقہا کی اصطلاح میں اجماع کہا جاتا ہے۔

درایت کے نقطۂ نظر سے الٰہی خلافت کا عقیدہ جس قدر نا قابلِ قبول ہے اس پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ رہ گیا جمہورِ مسلمین کا مسئلہ، سو اس میں بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ روئے زمین پر جو مسلمان بستے ہیں ان میں سے دس بارہ فیصدی سے زیادہ شیعہ عقیدہ کے قائل نہیں ہیں۔ ممکن ہے میری اس دوسری شق یعنی جمہورِ مسلمین کے عقیدہ کو صحیح ماننے سے شیعہ حضرات کو کچھ اختلاف ہو۔ اس لیے میں اس سلسلہ میں عقلی دلیل پیش کرنے کے بجائے حضرت علیؑ کا وہ قول نقل کر لینا کافی سمجھتا ہوں جو شیعوں کی معتبر کتاب نہج البلاغت میں درج ہے یعنی

ان امیرالمومنین قال الناس جماعۃ ید اللہ علیھم وغضب اللہ علی من خالف ..... انا واللہ اھل السنۃ والجماعۃ۔

"امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ "لوگ جماعت ہیں اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ (یعنی کرم) ہوتا ہے اور جو شخص جماعت کی مخالفت کرتا ہے خدا اس پر غضبناک ہوتا ہے ...... خدا کی قسم میں اہلِ سنت والجماعت ہوں" (یعنی سنتِ رسولؐ کا پابند ہوں اور مسلمانوں کی مجموعی جماعت کا فرد ہوں)

ان روایات کو پیش کر دینے کے بعد غالباً مجھے کسی مزید توضیح و تشریح کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

---

[1] علمائے شیعہ اس باب میں متفق ہیں کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

سیاسی اختلاف

اہلِ تشیع اپنے اختلافات کو مذہبی عقیدہ اور مذہبی مسلک کا اختلاف قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ حضرت علیؓ کی خلافت کے وقت تک الوہی امامت کی قسم کا کوئی عقیدہ یا شیعیت کے موجودہ اختلافی عقائد میں سے کوئی عقیدہ موجود نہ تھا۔ حضرت علیؓ کا خلیفہ ہونا یا نہ ہونا محض ایک سیاسی اختلاف تھا، بلکہ میں تو اسے سیاسی بھی نہیں صرف رائے کا ایماندارانہ اختلاف کہتا ہوں۔ یعنی بعض اصحاب کی رائے میں وہ موزوں تھے اور بعض کی رائے میں ناموزوں۔ اس امر کو مذہب کی بنیاد و اساس سے کوئی دور کا علاقہ بھی نہ تھا۔ لیکن بدقسمتی سے حضرت علیؓ کے زمانہ میں ایک نومسلم یہودی عبداللہ بن سبا نے الوہی امامت کے عقیدہ کو سب سے پہلے اہلِ اسلام کے کان میں پھونکنا شروع کیا۔ یہ عقیدہ یہودی مذہب میں پایا جاتا ہے اور اس لیے اس نے کچھ تو اپنے سابق مذہب کے اثرات کے ماتحت اور کچھ دیگر سیاسی اغراض کے پیشِ نظر اس عقیدہ کی تبلیغ شروع کر دی اور حضرت علیؓ کی ذات کے ساتھ وہ صفات منسوب کی جاتی ہیں۔ چنانچہ شیعوں کے مشہور مجتہد فاضل استرآبادی فرماتے ہیں:۔

وکان (عبداللہ بن سبأ) اوّل من شرع القول بفرضیۃ امامۃ علی۔

"عبداللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ بات نکالی کہ حضرت علیؓ کی امامت فرض ہے"

اس کے علاوہ منہج المقال، مجمع البحرین، تاریخ طبری اور جلاء العیون وغیرہ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

عبداللہ بن سبا نے ائمہ کے ساتھ بالکل الوہی صفات منسوب کر کے انھیں انسان سے خدا بنا دیا۔ چنانچہ شیعوں کے مشہور جامع احادیث "کلینی" نے عمار جہنی سے ایک روایت

نقل کی ہے جس میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں: -

انا عین اللہ انا ید اللہ انا جنب اللہ انا باب اللہ

" ہم اللہ کی آنکھ ہیں، ہم اللہ کے ہاتھ ہیں، ہم اللہ کا پہلو ہیں، ہم اللہ کا دروازہ ہیں"

بحار الانوار جلد دہم صفحہ ۱۱ میں حضرت امام حسینؓ کی زبان سے یہ جملہ منقول ہے: -

" ہم اللہ کی اولاد ہیں"

اسی کتاب کے صفحہ ۷۰ پر ہے کہ امام حسینؓ شہید نہیں ہوئے بلکہ عیسٰے ابن مریم کی طرح زندہ آسمان پر اُٹھا لیے گئے۔

تفسیر ہندی میں شیخ ابوجعفر طوسی شیعہ داؤد بن کثیر سے مروی ہے کہ "ایک مرتبہ میں نے ابوعبداللہ علیہ السّلام یعنی امام جعفر صادق سے پوچھا کہ کیا "نماز، زکواۃ اور حج سے آپ ہی کی ذات مبارک مراد ہے؟" اس پر مستفسر کو جو جواب دیا گیا وہ یہ تھا کہ "نہ صرف نماز، زکواۃ اور حج ہی سے ہماری ذات مراد ہے، بلکہ بیت الحرام، بلد الحرام، کعبۃ اللہ اور قبلۃ اللہ سے بھی ہم ہی مراد ہیں۔"

شیعوں کے مشہور مستند مجموعہ احادیث "اصول کافی" میں لکھا ہے کہ قرآن میں جس جگہ "رب یا ربک" کا لفظ آیا ہے اس سے حضرت علیؓ مراد ہیں۔

الغرض اس قسم کے عقائد کو اس زمانہ میں بڑی شدت کے ساتھ پھیلایا گیا لیکن حضرت علیؓ نے ہمیشہ ان کے خلاف اپنی نفرت و بیزاری کا اعلان کیا۔ مگر چونکہ مجھے استناد میں صرف اہلِ تشیع کی کتابوں کے حوالے پیش کرنا ہیں اس لیے "کلینی" کی مندرجہ ذیل روایت پر اکتفا کرتا ہوں جو سدی سے مروی ہے۔

" فرمایا حضرت علیؓ نے، اے اللہ لعنت کر ہمارے دشمن پر اور لعنت کر ہمارے اس دوست پر جو حد سے بڑھ جائے، یعنی مجھ کو میرے رتبہ سے بڑھا دے"

اسلام نے توحید پر جتنا زور دیا ہے اور جس بیباکی اور بلند آہنگی کے ساتھ خود رسن

کو ایک معمولی انسان ظاہر کیا ہے اس کے پیش نظر مذکورہ بالا اعتقاد کا غیر اسلامی اور غیر قرآنی ہونا کسی طرح بھی محل نظر قرار نہیں پا سکتا۔ اور غالباً اگر سیاسی رائے کا اختلاف اور قبیلوں کی باہمی عصبیت کی بنا پر حضرت علیؓ اور آپ کے فرزندوں کی خلافت کا مسئلہ یوں الجھ نہ جاتا تو اس قسم کے عقائد رکھنے والا کوئی ایک فرد بھی اسلام میں نہ پایا جاتا۔ لیکن حضرت علیؓ اور معاویہ کی جنگ حسینؓ کی شہادت اور بنو امیہ کی سخت گیر پالیسی کی بنا پر یہ عقائد خفیہ خفیہ علیؓ کے حامیوں میں پھیلنا شروع ہو گئے جنھوں نے رفتہ رفتہ ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کی۔ اور یہی وہ چند عقائد ہیں جن کو آج شیعیت کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ یہ عقائد غیر منظم طور پر ہر شخص کے اپنے ذاتی جذبات و احساسات اور ذاتی عصبیت و اتفاقی حالات کے موجب شائع ہوتے اس لیے شیعوں میں بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے جیسا کہ "کلینی" وغیرہ کتب شیعہ سے پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ کسی صاحب نے تو "بدر الدجی" نام ایک رسالہ میں بتایا ہے کہ شیعوں میں ستّر سے زیادہ فرقے ہیں۔ اور ان کے نام اور عقائد بالتفصیل سے گنائے گئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ اوّل اوّل تو حضرت علیؓ کی خلافت کا قضیہ محض ایک سیاسی قضیہ تھا اور اصل مذہب کے بنیادی اور اساسی اعتقادات سے اُسے کوئی دور کا علاقہ بھی نہ تھا لیکن بعد میں ناواقف، غیر محتاط اور خود غرض افراد نے اپنے معتقدوں کے دائرہ کو وسیع کرنے اور ان کو شدّت کے ساتھ اس مسلک پر عمل پیرا بنانے کے لیے خواہ مخواہ اسے مذہبی رنگ دینا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک سیدھا سادا سیاسی مسئلہ رفتہ رفتہ ایک مذہبی عقیدہ میں تبدیل ہو گیا۔ اور عالمِ اسلام میں دو مختلف کیمپ بن گئے۔

لیکن مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہے کہ اگرچہ ہندوستان کے شیعہ حضرات یہاں کی دیگر اقوام کی طرح ابھی تک بدستور جہل و تعصب کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں لیکن بلادِ مقدسہ کے شیعہ حضرات کی نظروں کے سامنے رفتہ رفتہ یہ حقیقت بے نقاب ہو رہی ہے۔ چنانچہ

مشہور شیعی فاضل مرزا عبدالکریم زنجانی نے شیعہ سنی کے قضیہ پر ایک مبسوط و مفصل مقالہ تحریر فرمایا ہے اس میں آپ لکھتے ہیں کہ :-

"اگر ہم شیعہ و سنی دونوں کے خیالات کے مرکزی اور بنیادی اصولوں کو علمی طور پر اور خلوص دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ صرف ایک اہم سیاسی اختلاف رائے ہے جو دونوں گروہوں میں پایا جاتا ہے اور وہ امامت یا خلافت کے نظریہ سے تعلق رکھتا ہے جو زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی اختلاف ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں سنی ایک سیاسی نظریہ کو مانتے ہیں اور شیعہ دوسرے نظریہ پر ایمان لاتے ہیں۔"

لیکن اس سے بھی زیادہ قابل مسرت وہ الفاظ ہیں جو شیعیان عراق کے مذہبی پیشوا شیخ زنجاری نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں کامل ذمہ دارانہ حیثیت سے جامعہ ازہر مصر میں ایک تاریخی تقریر کرتے ہوئے بیان فرمائے ہیں۔ آپ نے فرمایا :-

"شیعہ سنی کا اختلاف فی الحقیقت ایک فرعی اختلاف ہے جس طرح کہ سنیوں میں حنفی اور شافعی کا اختلاف ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ اختلاف شیعہ سنیوں کے درمیان حدِ فاصل بن گیا ہے۔"

آخر میں شیعہ مذہب کے بارے میں ایک بات اور پیش کر کے اس بحث کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

محبت و ہمدردی ہر اصلاحی ادارہ کا بنیادی اصول ہے اور یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہر اصلاحی ادارہ کی بنیاد اخوت عامہ محبت و ہمدردی کی مضبوط و مستحکم چٹان پر نصب کی جاتی ہے۔ اور دنیا کی کوئی تحریک عام اس سے کہ اسے الہامی مذہب کے نام سے تعبیر کیا جائے یا اصلاحی ادارہ کے نام سے اس وقت تک خالص الوہی یا

اصلاحی قرار نہیں دی جاسکتی جب تک کہ اس کی بنیادیں نفرت وعناد کے بجائے خالص محبت و ہمدردی پر استوار نہ کی گئی ہوں۔ یعنی کوئی سچا اور الٰہی مذہب اس لیے نہیں آیا کہ انسانوں کے کسی خاص طبقہ کے خلاف نفرت وحقارت کی اسپرٹ پھیلائے ہرچند اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر اصلاحی ادارہ نفرت کی اسپرٹ سے بالکل ناآشنا ہوتا ہے کیونکہ بہرحال وہ اپنے مخالفوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے لیکن اس کی یہ ناپسندیدگی اصل مذہب کی بنیاد نہیں ہوتی۔ یعنی کسی مذہب کا بنیادی عقیدہ یہ نہیں ہوتا کہ الف کو ذلیل سمجھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ب اچھا ہے اب اس سلسلہ میں ضمناً الف بُرا ہو جاتا ہے۔ تو ہو جائے اور اس لیے دنیا کے ہر اصلاحی ادارہ میں نفرت وعناد کی اسپرٹ منفیانہ یا سلبی طور پر پائی جاتی ہے نہ کہ اثباتی اور وجوبی طور پر۔

لیکن دنیا میں یہ امتیاز صرف شیعہ مذہب ہی کو حاصل ہے کہ اس کی بنیاد محبت واخوت کے بجائے نفرت وعناد کے جذبات پر قائم کی گئی ہے یعنی جہاں شیعوں کے بنیادی عقائد میں حضرت علیؓ کو امام ووصی ماننا داخل ہے، وہاں خلفائے ثلاثہ پر تبرا کرنا اور ان کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کرنا بھی مذہب کا جزو قرار دیا گیا ہے۔

نفرت وعناد کے اس عقیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ تشیع کے عقائد کی بنیاد درحقیقت محبت واصلاح پر نہیں ہے بلکہ نفرت وانتقام پر ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس میں کسی کو بُرا بھلا کہنا ہرگز فرض نہ قرار دیا جاتا۔ حالانکہ خلفائے ثلاثہ کے خلاف دادِ سخن دینا ہی درحقیقت اصل شیعیت سمجھا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ [illegible] صحابہ کی مدح تک سننے کو تیار نہیں۔

شیعہ حضرات کے یہاں خلفائے ثلاثہ کے برحق ماننے والوں کو کوسنا پیٹنا

فرض بتلایا گیا ہے۔ چنانچہ شیعوں کے مجموعۂ احادیث "جامعۂ عباسی" میں لکھا ہے کہ اگر کبھی کسی شیعہ کو اتفاقاً کسی غیر شیعہ کے جنازہ کی نماز پڑھنا پڑ جائے تو اس کے لیے یہ دعا مانگے :۔

> "اے اللہ اس کی قبر میں سانپ اور بچھو متعین کر دے اس کے پیٹ میں آگ بھر دے، اس کو دوزخ میں ڈال دے۔"

پس جب تک اہل تشیع میں تبرے کو اثباتی اور وجوبی حیثیت حاصل ہے اس وقت تک اس فرقہ کے عقائد کو اصلاحی یا الہامی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اسے انتقام و نفرت کے اس جذبہ سے منسوب کیا جائے گا۔ جو عام اخلاق و شائستگی کے بھی سراسر منافی ہے۔ چہ جائیکہ اعلیٰ اخلاق و روحانیت سے۔

ابوسعید بزمی ایم اے

رسالہ "نگار" بابت جولائی ۱۹۳۷ء

مسئلۂ خلافت و امامت

”م، ح“ کے قلم سے

مسئلہ خلافت و امامت

یادش بخیر! میرے محترم نیاز فتحپوری صاحب عجیب دلچسپ انسان واقع ہوئے ہیں۔ مجھے آپ کا وہ زمانہ یاد ہے جب آپ عالم بالا تشریف لے گئے تھے اور جنت و دوزخ کی سیر میں مصروف تھے۔ لیکن نتیجہ وہی "ہبوط" ہوا۔ پھر اسی رزمگاہ زہد و معصیت کی طرف لوٹے، پھر وہی لیل و نہار، وہی کاروبار اور وہی نقش و نگار!

نہ جانے کیوں انھیں لامذہب کہا جاتا ہے۔ لامذہبیت ہی میری دانست میں کوئی مفہوم حقیقی نہیں رکھتی۔ مذہب کی وسیع گہرائیوں سے کوئی انسان باہر نہیں جاسکتا۔ لامذہبیت بھی ایک مذہب ہے جسے دہریت یا نیچریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر نیاز کو لامذہب کہنا کیونکر روا ہو سکتا ہے؟

میں نقش و نگار کا پرستار نہیں لیکن پھر بھی مجھے جس قدر لطف نظارگی حاصل ہوسکا میں سمجھتا ہوں کہ نیاز صاحب کو مذہب اور بالخصوص مذہب اسلام سے بہت کافی شغف ہے۔ ہمیشہ نگار کے صفحات پر مذہبیات کی ایک جاذب توجہ دنیا آباد رہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں کوتاہ نظروں کے لیے کوئی وجہ کشش نہ ہو۔ امامت و خلافت کا مسئلہ زہد و تقویٰ کی طرح کس قدر خشک واقع ہوا ہے لیکن آج وہی مسئلہ نیاز کے لیے موضوع بحث ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلی بار اس مشہور مختلف فیہ مسئلہ میں "سنجیدگی" کے ساتھ نگار ہی کے صفحات پر بحث جاری ہوئی ہے کہ جس نے بھی اس میں حصہ لیا متانت نگاری سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سب سے پہلے کسی (حقیقی یا فرضی) ہرنام صاحب (جس میں ہرنام کی گنجائش ہے) کے نام سے اس بحث کا آغاز ہوا، مجھے خبر نہیں کہ انھوں نے کیا لکھا اور کیونکر اس مسئلہ میں شیعی نقطۂ نظر کی تائید فرمائی تھی۔ لیکن محمد فاروق صاحب کا تردیدی مضمون "فاران بجنور" میں میری نظر سے گزرا تھا، مگر بدقسمتی سے وہ بھی اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں ہے۔ پھر خود جناب نیاز صاحب کا محاکمہ شائع ہوا۔ اور اس پر "آزاد خیال شیعہ کے قلم سے" تبصرہ شائع ہوا۔ یہ دونوں مضامین اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔

مجھے علم نہیں کہ علماء اہلسنت کی جانب سے نیاز صاحب کی دعوتِ جواب تاہنوز مستجاب ہوئی یا نہیں میں اپنے ذاتی خیالات کے پیش کرنے میں سبقت کر رہا ہوں ممکن ہے میری تحریر آزاد خیالی و تنگ خیالی کے اصلی خط و خال کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

تیرہ سو برس کا زمانہ دراز گزر چکا لیکن آج تک "گرفتارانِ بوبکر و علیؓ" کے درمیان یہ امر محقق ہی نہ ہو سکا کہ مستحقِ خلافت بلا فصل حضرت ابوبکر تھے یا حضرت علیؓ۔ یقین کیجیے ایسے تفرقہ انگیز مباحث پر قلم اٹھانا سخت گرانبارِ خاطر ہوتا ہے لیکن ضرورتیں مجبور کر دیتی ہیں کہ ایسے فیصلہ طلب مواقع پر اپنے بے لاگ خیالات کا نہایت صفائی کے ساتھ اظہار کر دیا جائے۔

ایجاز و اختصار بیان کے لحاظ سے میں نیاز صاحب کے محاکمہ کی بابت براہِ راست کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کہ جو کچھ ان کے ارشادات ہیں وہ ان کے ذاتی خیالات یا بلفظِ دیگر "ناگفتہ" معتقدات ہیں۔ فریقین میں سے ان کی بات کا کوئی پابند نہیں۔ نہ وہ بقولِ خود کسی کے ترجمان ہیں۔ میرا مقصود صرف آزاد خیال شیعہ صاحب کے تبصرہ پر تبصرہ کرنا ہے اس سلسلہ میں اگر نیاز صاحب کے فرمودات بھی معرضِ بحث میں آ جائیں گے تو انکی تنقیح بھی میرے لیے ناگزیر ہو گی۔

تبصرہ میں چند امور پر خصوصیت کے ساتھ زورِ قلم صرف کیا گیا ہے اور فی الحقیقت وہ مباحث ایسے ہی ہیں کہ اگر ان کے تمام پہلو روشنی میں آجائیں تو کم از کم فہم و بصیرت رکھنے والوں کے لیے صحیح فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی ۔ ان مباحث ضروریہ کو چند حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :-

۱- عصمتِ انبیاء و ائمہ۔

۲- وصایت جناب امیرؑ کے اثبات کے لیے نصوصِ قطعیہ۔

۳- نفسِ مسئلۂ خلافت۔

۴- اسلام کے نزدیک ہیئت اجتماعیہ کا مفہوم و اصول۔

۵- ہر دو فریق کے روایات پر سیاسی ماحول کا اثر

* * *

یہ ترتیبِ سوال صاحبِ تبصرہ کی ہے ۔ اس میں چند سوالات غیر ضروری بھی ہیں جیسا کہ میرے آئندہ بیان سے ظاہر ہوگا اور ترتیب بھی میرے نزدیک کچھ زیادہ مناسب نہیں یوں رکھیے :-

۱- عصمتِ انبیاء و ائمہ

۲- مسئلۂ امامت

۳- مفہومِ خلافت

۴- امورِ استحقاقِ خلافت

۵- نصوصِ قطعیہ دربارۂ خلافت۔

بس انہیں امور پر اگر سیر حاصل بحث ہو جائے تو مسئلۂ خلافت کے تمام گوشے روشنی میں آجائیں۔

میں اسی ترتیب کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

عصمتِ انبیاء وائمہ

فریقین کے درمیان عصمتِ انبیاء کا مسئلہ میرے خیال میں مختلف فیہ نہیں ہے۔ معرضِ بحث میں صرف ائمہ کی عصمت آتی ہے لیکن چونکہ نیاز صاحب نے عصمتِ انبیاء کی بحث چھیڑ دی جس کی وجہ سے صاحبِ تبصرہ کو ضرورت پیش آئی کہ وہ عصمتِ انبیاء کو بھی بکمال و تمام منقح کر دیں۔ اس لیے اخفاءِ حقیقت ہوگا اگر میں اس کا اعتراف نہ کروں کہ اس مسئلہ پر صاحبِ تبصرہ نے معقولیت کے ساتھ بحث کرنے میں بہت کامیاب کوشش کی ہے۔ اگرچہ ذاتی طور سے مجھے ان کے خیالات سے چنداں اتفاق نہیں ہے۔ اور میں اس مسئلہ میں ایک حد تک نیاز صاحب کے نظریہ کی تائید کروں گا۔

درحقیقت اس مسئلہ میں الفاظ کی نزاکت کے باعث التباس پیدا ہو گیا ہے، صرف دو چیزیں ہیں گناہ اور خطاءِ اجتہادی، بھول چوک کو بھی اس خطا میں داخل سمجھا گیا ہے حالانکہ یہ ایک علیحدہ امر ہے۔

گناہ کی بابت محاکمہ اور تبصرہ دونوں میں بالاتفاق یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ انبیاء گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک بھی یہ درست ہے۔

خطاءِ اجتہادی اور بھول چوک میں اختلاف ہے۔

نیاز صاحب کے نزدیک انبیاء سے خطاءِ اجتہادی کا وقوع و صدور ممکن ہے اور بھول چوک ہو جانا بھی منافیِ عصمت نہیں، صاحبِ تبصرہ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ خطاءِ اجتہادی کو بھی ناممکن الوقوع سمجھتے ہیں۔ (میں ناممکن کا لفظ اسی معنی میں استعمال کر رہا ہوں جو صاحبِ تبصرہ نے بیان کیے ہیں) ان کے پاس اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر نبی سے امکانِ خطا و نسیان اور اس کا وقوع تسلیم کر لیا جائے تو سارا دین مشکوک ہو جاتا ہے۔ شریعت سے اطمینان و اعتبار ساقط ہو جاتا ہے اور پھر یہ سارا بنا بنایا گھروندہ دم کی دم میں ڈھیر نظر آئے گا

حالانکہ یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔

رسول کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک وہ جو خالق سے وابستگی کی صورت میں ہوتی ہے اور دوسری وہ جو حیثیت اس کے بندہ ہونے کے بندوں کے ساتھ وابستگی ہوتی ہے۔ خالق سے اس کے تعلقات کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ وہ احکامِ الٰہیہ کو صحیح طریقہ سے حاصل کر کے باحسن وجوہ اس کو بندوں تک پہنچا دے۔ اسی حیثیت کا اصطلاحی نام رسالت ہے۔ لیکن اس رسالت کے مسئلہ میں اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ رسول کے لیے دو امر ضروری ہیں، اوّل اخذ صحیح دوسرے نشر صحیح۔ یعنی احکامِ الٰہیہ کو اچھی طرح سمجھ لینا اور پھر اس کی صحیح طریقہ پر نشر و اشاعت کرنا۔

دوسری حیثیت نبی کی وہ ہے کہ دیگر انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان اور جملہ لوازماتِ انسانیہ کے ساتھ متصف ہوتا ہے اسی حیثیت کو بشریت کہتے ہیں۔ اس امر کے واضح ہونے کے بعد یہ امر غور طلب ہے کہ نبی کی عصمت کس حیثیت کے لیے ضروری ہے، آیا رسالت اور بشریت دونوں کے لیے یا صرف رسالت کے لیے؟

میرے خیال میں رسالت کے لیے عصمت ضروری ہے اور اس کا اعتراف سب کو ہے، وہ گناہ نہیں کر سکتا، وہ خدا سے غلط احکام نہیں حاصل کر سکتا، اور نہ اس کو غلط طریقہ سے وہ دوسروں تک پہنچانے کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

البتہ بشریت کے لیے میرے نزدیک عصمت ضروری نہیں ہے۔ یعنی نبی کے وہ ذاتی امور کہ جو اسی حیات دنیویہ یا صرف ضروریاتِ بشریہ سے تعلق رکھتے ہیں اس میں اگر کبھی لغزش ہو جائے تو اس کا کوئی مضر اثر عصمتِ رسالت پر نہیں مرتب ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ صاحبِ تبصرہ نے قابل وکیل اور حاذق طبیب کی مثال پیش کی ہے۔ بیشک ماہر قانون دان وہی سمجھا جائے گا۔ جو پیروی مقدمات کے بارے میں غلطی کرتا ہی نہ ہو یا غلطی ہو جاتی ہو لیکن کم از کم طبیب حاذق کے لیے ضروری ہے کہ وہ تشخیص امراض و تجویزِ علاج میں خطا نہ کرتا ہو یا بہت کم

کرتا ہو یقیناً "کم" کی قید ہم اپنی انسانی کوتاہی کے باعث لگاتے ہیں، اگر خدا کسی طبیب حاذق کو متعین کرے تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ایسا طبیب "کم سے کم" بھی غلطی نہیں کر سکتا۔ نہ تشخیص امراض میں نہ تجویز علاج میں، لیکن ایسے طبیب کے لیے یہ تو ضروری نہیں قرار دیا جائیگا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں غلط روی سے معصوم ہو۔ جہاں تک اس کی حذاقتِ طبابت کا تعلق ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا کوئی قدم جادۂ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا۔ باوجود اس کے وہ زندگی کے کسی دوسرے شعبہ میں اگر کوئی لغزش کر جائے تو اس سے اس کی حذاقتِ طبابت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اس تقریر سے میرا صرف یہ مقصد ہے کہ انسان کے لیے کسی امرِ واحد میں کمال اس کو مستلزم نہیں کہ وہ جملہ کمالات کا حامل ہو۔ ٹھیک اسی طرح رسالت کا مسئلہ ہے رسول، خدا سے احکام حاصل کرتا ہے اور بندوں تک اسے پہنچاتا ہے۔ اس کے لیے عصمت لازم و مسلّم ہے اور اس عصمت پر کوئی دھبہ نہ آئے گا، اگر وہ اپنے دنیاوی امورِ بشریت میں کوئی لغزش کر جائے۔ بشریت کی بار بار قید کا اضافہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ کہیں کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ نبی اخلاقی غلطی مثلاً کذب و سرقہ وغیرہ کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ واضح رہے کہ میرا یہ مقصد نہیں ہے، اخلاقی غلطی تو گناہ کے حدود میں داخل ہے اور یہ پہلے ہی سے طے شدہ امر ہے کہ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے نبی معصوم رہتا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک مسئلۂ عصمت میں رسالت و بشریت کی حیثیات کی وہ تفریق موجود ہے جس کی عقل مقتضی ہے جس کو میں اوپر پیش کر چکا۔

تعجب ہے کہ آزاد خیال شیعہ صاحب نے اپنے مذہب سے اغماض کرتے ہوئے عصمتِ انبیاء کے مسئلہ میں اس قدر غلو سے کام لیا ہے، حالانکہ اگر مجھے معاف کیا جائے تو میں عرض کر دوں کہ مذہبِ شیعہ میں تو عصمت نہ الوہیت کے لیے ضروری ہے نہ رسالت کے لیے لازم، نہ امامت کے لیے واجب، وہ خدا سے صریح غلطی کے وقوع کا اعتراف کرتے ہیں چہ جائیکہ رسالت۔ ملاحظہ ہو بحار الانوار میں روایت ہے جسے علامہ طوسی نے بھی

نقد المحصل میں نقل کیا ہے :-

عن جعفر الصادق انہ جعل اسمٰعیل القائم مقامہ بعد فظہر من اسمٰعیل مالم یرتضہ فجعل القائم مقامہ موسیٰ فسئل عن ذالک فقال بدا اللہ فی اسمٰعیل۔

" جعفر صادقؒ سے روایت ہے کہ انھوں نے اسمٰعیل کو اپنا قائم مقام اپنے بعد کے لیے قرار دیا مگر اسمٰعیل سے وہ بات ظاہر ہوئی جس کو انھوں نے پسند نہیں کیا، لہٰذا انھوں نے موسیٰ کاظمؑ کو اپنا قائم مقام بنایا' اس کے متعلق اُن سے پوچھا گیا تو کہا' اللہ کو اسمٰعیل کی بابت بدا ہوگیا۔"

ساتھ ہی ساتھ آپ لغت کے ذریعہ سے لفظ بدا کو بھی سمجھ لیں۔

بدالہ ای ظہر لہ مالم یظہر۔

" یعنی جو بات معلوم نہ تھی اس کے معلوم ہوجانے کو بدا کہتے ہیں۔"

اب روایت کا مفہوم واضح ہوگیا کہ اللہ نے پہلے تو اسمٰعیل کی امامت کا حکم دیا، پھر اللہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور موسیٰؑ کی امامت کا حکم دیا۔

شیخ صدوق رسالۂ اعتقادیہ میں لکھتے ہیں :-

ما بدا اللہ بنی شیئ کما بدالہ فی اسمٰعیل۔

" اللہ کو کبھی ایسا بدا نہیں ہوا جیسا کہ اسمٰعیل کے بارے میں ہوا"

نعوذ باللہ من ذٰلک، خدا سے جہل کے باعث غلطی ہوئی اور ایسی شدید کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس روایت سے عصمت الوہیت باطل ہوئی اور ضمناً عصمت امامت بھی خطرہ میں پڑگئی۔ حالانکہ آزاد خیال شیعہ صاحب نے امامت کے منصب کو بھی منجانب اللہ ہونا تسلیم کیا ہے اور اسی لیے عصمت لازم قرار دی ہے۔ حالانکہ یہ روایت دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ استبصار صفحہ ۲۱۷ :-

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال صلّی علیہ السلام بالناس علی غیر طہر و کانت الظہر فخرج منادیہ ان امیر المؤمنین صلی علی غیر طہر فاعیدوا الخ۔

"جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کے ساتھ ظہر کی نماز بغیر طہارت پڑھی، پھر منادی نے اعلان کیا کہ جناب امیرؑ نے چونکہ بغیر طہارت (وہ) نماز پڑھی تھی، اس لیے اُس کا اعادہ کرلیا جائے۔"

بالقصد بغیر طہارت تو نماز کی ادائیگی تسلیم نہیں کی جاسکتی، لامحالہ ماننا پڑیگا کہ غلطی ہو گئی یا سہو و نسیان (بھُول چوک) کہہ لیجئے بہرکیف عصمت الوہیت و عصمت امامت کے ابطال پر روشنی پڑتی ہے۔ عصمت نبوت سردست مختلف فیہ ہے، چونکہ حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حالات بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اس لیے میں ان کی کتابوں سے رسولؐ کے سہو و نسیان کی بابت کوئی ثبوت نہ پاسکا، ممکن ہے کہ ہو، البتہ دیگر انبیاء کی بابت حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں اس قسم کی بکثرت تصریحات ملتی ہیں، جس سے انبیاء کی غلطی و غلط فہمی اور لغزش و خطاء اجتہادی کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً یہ کہ حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور سے واپس تشریف لائے تو بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھ کر حضرت ہارون پر خفا ہوئے حتیٰ کہ غضبناک ہو کر ان کی داڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے محض اس خیال کی بناء پر کہ انھوں نے میرے حکم کی اچھی طرح تعمیل نہ کی۔ حالانکہ وہ بالکل بے قصور تھے حضرت موسیٰؑ کا یہ فعل غلطی پر مبنی ثابت ہوا یا مثلاً حضرت موسیٰؑ کو توریت کی تختیوں میں بہت سے علوم دیکھ کر یہ خیال ہوگیا کہ میرے پاس تمام علوم جمع ہو گئے حالانکہ حضرت خضرؑ کے پاس بعض ایسے علوم تھے جو حضرت موسیٰ کے پاس نہ تھے۔ یہ حضرت موسیٰ کی غلط فہمی تھی (تفسیر صافی مطبوعہ ایران) یا مثلاً حضرت موسیٰؑ علم سیکھنے کے لیے حضرت خضر کے ساتھ ہو لیے تھے، حضرت خضرؑ نے فرمایا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر کے ساتھ نہیں رہ سکتے

میرے کاموں پر تم اعتراض کر دیا کرو گے، حضرت موسیٰؑ نے عہد فرمایا تھا کہ میں صبر کے ساتھ رہوں گا، لیکن جب حضرت خضرؑ نے کشتی کے تختے توڑ ڈالے تو ان سے صبر نہ ہو سکا اور ٹوک دیا۔ کہ یہ تم بُرا کر رہے ہو، یہ واقعہ قرآن مجید میں بھی بہ اندازِ بلیغ موجود ہے۔ اس سے حضرت موسیٰؑ کی بے صبری اور عہد شکنی کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز اس واقعہ خاص کی بابت قصور فہمی بھی ظاہر ہوتی ہے، یا مثلاً حضرت یوسفؑ جب اپنے والد حضرت یعقوبؑ کے استقبال کے لیے آئے تو گھوڑے سے اُتر کر پیادہ پا نہ ہوئے، اس خیال سے کہ میں شاہانہ شان و شوکت رکھنے کے باعث حضرت یعقوبؑ سے افضل ہوں - یہ لغزش حضرت یوسفؑ سے ایسی ہوئی کہ ان سے نورِ نبوّت سلب کر لیا گیا اور کبھی ان کی اولاد میں پھر نبی نہیں پیدا ہوا۔ (حیات القلوب جلد اول) یہ تو دیگر انبیاء کے متعلق حضرات شیعہ کے مذہبی معتقدات ہیں ایک واقعہ ذاتِ خاص جناب رسول اللہؐ کا بھی سُن لیجیے :-

تفسیر صافی مطبوعہ طہران بہ ذیل تفسیر سورۂ نور تحت آیت اِفک امام باقر علیہ السلام نے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ :-

> "ماریہ قبطیہ کے پاس جریج قبطی کی آمد و رفت پر بدگمانی ہوئی، تو رسولؐ نے علیؑ کو جریج کے قتل کے لیے بھیجا اور حکم دیا کہ جا کر جریج کو قتل کر ڈالو۔ علیؑ تلوار لے کر گئے۔ جریج بھاگے اور ایک درخت پر چڑھ کر نیچے گرے جس میں اُن کا ستر کھُل گیا۔ اور یہ ظاہر ہو گیا کہ ان میں نہ علامات مردی ہیں نہ علامات نسائیت، تب علیؑ رسولؐ کے پاس آئے اور جریج کی حالت ظاہر کی۔ تو رسولؐ نے فرمایا کہ شکر ہے خدا کا جس نے ہمارے اہل بیت (یہ اہل بیت کا اطلاق حضرت ماریہ قبطیہ پر ہو رہا ہے جو بجائے خود سمجھنے کی چیز ہے) سے برائی دور کر دی۔"

اس روایت سے چند امور مستفہم ہوتے ہیں :-

۱- یہ کہ جریح کی بابت رسول اللہ کو غلط فہمی ہوئی۔

۲- جناب امام کو بھی غلط فہمی ہوئی۔

۳- اسی غلط فہمی کی بنا پر قتل جیسا خطرناک حکم صادر کر دیا گیا۔

۴- احساس غلطی کے بعد حکم واپس لے لیا گیا۔

۵- جناب امیر نے حکم رسول کو ایسا واجب نہ سمجھا کہ بہرحال جریح کو قتل کر دیتے نبی کی غلط فہمی کو محسوس کر کے ان کے حکم کی تعمیل سے باز رہے۔

یہ تو غلط فہمیاں تھیں۔ صریح خطاء اجتہادی کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

"جنگ صفین میں جناب امیر اولاً ثالثی کے تسلیم کرنے سے منکر تھے اور اپنی فوج میں اعلان کر دیا کہ ہرگز ثالثی کو قبول نہ کیا جائے۔ پھر اس کے بعد ثالثی پر راضی ہو گئے جس کے باعث خود آپ کی فوج کے آدمی خارجی ہو گئے اور جناب امیر کو برا بھلا کہنے لگے کہ تمہیں ایک رائے پر قرار نہیں معلوم نہیں تمہاری پہلی رائے درست تھی یا یہ دوسری رائے صائب ہے۔ بہرکیف تمہیں اپنی امامت پر خود شک ہے۔ یہ ناگوار حالات جب پیش آئے تو جناب امیر کو بہت صدمہ ہوا اور کف افسوس ملتے ہوئے فرمایا کہ :-

هذا اجزاء من ترك العقدة (نہج البلاغہ)

یہی سزا ہے اس کی جو مستحکم رائے کو ترک کر دے۔"

کیا اس سے زیادہ صریح مثال خطائے اجتہادی کی اور دستیاب ہو سکتی ہے؟ مضمون کی طوالت کا خوف مانع ہو رہا ہے ورنہ ممکن تھا کہ میں ایسی اور بھی کثیر تعداد میں نظائر و امثال پیش کرتا۔ بہرکیف جو کچھ پیش کر چکا اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ مذہب

شیعہ میں یہ عقیدہ تسلیم شدہ ہے کہ :۔

خدا سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔

انبیاء سے بھی غلطی و غلط فہمی کا وقوع ہوتا ہے۔

ائمہ بھی غلطی، غلط فہمی، سہو و نسیان، خطاء اجتہادی سے مبرا نہیں ہیں۔

معلوم نہیں کیونکر آزاد خیال شیعہ صاحب نے عصمتِ رسولؐ و ائمہ پر اس قدر زورِ قلم صرف فرمایا اور خود اپنے مذہبی مسلمات و معتقدات کے خلاف، جس کا انکو اعتراف کرنا پڑے گا۔

اس طویل بحث سے ہمارا دعویٰ بہت مدلل ہو گیا کہ رسول کے لیے بشریت میں عصمت ضروری نہیں ہے۔ جس کی تائید مذہبِ شیعہ سے بھی ہوتی ہے۔ البتہ اہلسنت کا یہ خیال ضرور ہے کہ انبیاء سے اس قسم کی لغزشیں بہت شاذ و نادر ہوتی ہیں، اور جب ہو جاتی ہیں تو ان کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا، بلکہ اللہ کسی صورت سے متنبہ کر دیتا ہے، اس خیال کے ثبوت میں آیات عبس و تولیٰ وغیرہ جو جناب نیاز نے نقل فرمائی ہیں وہی کافی ہیں۔ اس بحث کے بعد عصمت امامت کا مسئلہ خود بخود خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ درانحالیکہ ابطالِ عصمت ائمہ کے متعلق خود شیعی لٹریچر میں ایک بہت بڑا انبار بھی موجود ہے۔

مسئلۂ امامت

امام کے لغوی معنی پیشوا کے آتے ہیں، شرعی اصطلاح میں بھی یہ لفظ اپنے عموم معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک طرف تو حضرت ابراہیمؑ کو بھی دینی پیشوا فرمایا گیا

اِنّی جاعلک لِلنّاس اماماً (میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں)

اور دوسری طرف گمراہی کے پیشواؤں کے متعلق بھی امام ہی کا لفظ استعمال

کیا گیا ہے۔

" وجعلناھم ائمۃ یدعون الی النّار" وہ پیشوا ہیں کہ جہنّم کی طرف بلاتے ہیں۔

اہل سنّت کے یہاں امامت کے لیے کوئی خصوصیت نہیں اور نہ مسئلۂ امامت ضروریاتِ دین سے ہے۔ اس لیے کہ نہ قرآن امامت کے بارے میں کچھ کہتا ہے نہ احادیثِ رسولؐ سے کوئی خاص بات مستنبط ہوتی ہے۔

معلوم نہیں حضرات شیعہ نے کہاں سے اس مسئلہ کو اخذ کیا ہے۔ اور اس شدّت کے ساتھ کہ توحید و رسالت کے بعد اسے مدارِ ایمان قرار دیا ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرات شیعہ کے یہاں مسئلۂ امامت کے سامنے نبوّت بھی ہیچ ہے۔ ایک معتبر شیعی روایت کا حاصل ہے :-

> " کہ حضرت آدم و حوّا نے ائمہ کی قدر و عظمت پر حسد کیا اور حسد علاماتِ کفر سے ہے، لہٰذا وہ جنّت سے نکالے گئے۔"

ائمہ کے مقابلے میں ایک پیغمبر کی بابت یہ خیالات ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک امامت کا درجہ نبوّت سے کچھ بلند و بالا واقع ہوا ہے اور اسی لیے شاید اپنے کو امامیہ کہتے ہیں۔

امامت کا مسئلہ مذہبِ شیعہ میں ذیل کی خصوصیات رکھتا ہے :-

امامت ساری دنیا میں صرف قریش کے لیے مخصوص ہے۔

پھر قریش میں سے صرف بنی ہاشم کے لیے۔

بنی ہاشم میں سے صرف علیؓ اور اولادِ علیؓ کے لیے۔

اولادِ علیؓ میں صرف حسنؓ اور حسینؓ کے لیے۔

حسنؓ اور حسینؓ کی اولاد میں سے صرف حسینؓ کی اولاد کے لیے۔

اور ان میں سے بھی صرف آٹھ اماموں کے لیے مخصوص ہے۔ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ قیود خانہ ساز ہیں یا کہیں سے ماخوذ ہیں، اگر ماخوذ ہیں تو کہاں سے ؟ اس لیے کہ قرآن میں امامت کی بابت نہ اس قسم کی تصریحات ہیں نہ ایسی کوئی آیت جس سے یہ امور کسی طرح بھی مستنبط ہو سکیں احادیث صحیحہ میں بھی ایسی تفصیلات موجود نہیں، دہ آنکہ احادیث پر عقائد کی بنیاد بے معنی ہے ائمہ کی خصوصیات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں اور چونکہ نبی معصوم ہوتا ہے اس لیے لازم ہے کہ اس کا نائب بھی معصوم ہو کہ معصوم کا نائب غیر معصوم نہیں ہو سکتا۔

ائمہ کا انتخاب منجانب اللہ ہوتا ہے کیونکہ عصمت ایک باطنی شے ہے جس کی معرفت بجز خدا کے اور کسی کو نہیں ہو سکتی ہے۔ لہٰذا خدا ہی ائمہ کا انتخاب و تقرر کرتا ہے اگر بندے انتخاب کریں گے تو غیر معصوم منتخب ہو جائے گا۔ جس سے تمام امت کے گمراہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس لیے کہ غیر معصوم سے خطا کا صدور ممکن ہے اور امام کی اطاعت ہر چیز میں ضروری ہے

یہ اور اسی قسم کی دیگر خصوصیات اماموں پر "چسپاں" کی جاتی ہیں اور چونکہ بارِ ثبوت مدعی کے سر ہوتا ہے لہٰذا مجھ کو ان امور کی تردید میں اضاعتِ وقت کی ضرورت نہیں ہے تاہم مجھے یہ کہنے میں کسی قسم کا باک نہیں محسوس ہوتا کہ امامت ــــ نبوت کا نزکی بہ ترکی جواب ہے اور مسئلہ امامت ختم نبوت کے لیے موت کا حکم رکھتا ہے۔ ایک نبی مامور من اللہ ہوتا ہے معصوم ہوتا ہے، مفروض الطاعۃ ہوتا ہے۔ نبی کی یہ شان ہے کہ :۔

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا

"جو کچھ تم کو رسول حکم دے اسے اختیار کرو اور جس کام سے روک دے اسے چھوڑ دو۔"

امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں :۔

ماجاء بہ علی فاخذ بہ وما نھی عنہ فانتھی (اصول کافی ص۱۱)

"جو کچھ علی (احکام) لائے میں ان پر عمل کرتا اور جس سے منع کر دیا اس سے باز رہتا ہوں۔"

پھر نبی اور امام میں کیا فرق رہ گیا؟

وجری لھم مثل ما جری لمحمد علیہ السلام ۔۔۔ "ائمہ کو بھی وہی باتیں حاصل ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھیں"

صاحب حملہ حیدری نے اسی امر کو واضح کیا ہے :۔

ہمہ صاحب حکم بر کائنات ہمہ چوں محمد منزّہ صفات

ترازو کے ایک پلّہ میں امامت ہے اور دوسرے میں نبوّت، شیعہ مذہب تول رہا ہے اور دونوں پلّے برابر ہوتے ہیں۔

وکذالک یجری لائمۃ الھدیٰ واحد بعد واحد (اصول کافی)

" اور یہی قانون اعتقاد تمام ائمہ (دوازدہ) کے لیے یکے بعد دیگرے نافذ ہے"

اور میں تو دیکھ رہا ہوں کہ امامت کا پلّہ جھکتا جا رہا ہے، نبوّت کا وزن گھٹتا جا رہا ہے نبی سے عتاب آمیز انداز میں باز پرس ہوتی ہے :۔

یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک ۔۔۔ "اے نبی میں نے جو چیز تیرے لیے حلال کی تھی اسے تو نے کیوں حرام کر لی"

نبی اپنی ذات کے متعلق خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام کرنے کا مجاز نہیں ۔۔ لیکن اماموں کا یہ رتبۂ عالی قابل لحاظ ہے۔

فھم یحلون ما یشاءون ویحرمون ما یشاءون (اصول کافی صفحہ ۲۷۸)

"امام باقر فرماتے ہیں کہ ائمہ کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جسے چاہیں حرام"۔

امامت نبوّت سے بہت اوپر جا چکی، حتیٰ کہ اب اس کے جلوے حریر قدح میں نظر آتے ہیں۔

استقب علیہ فی شیئ من احکامہ کالمتعقب علی اللہ ورسولہ والراد علیہ فی صغیرۃ او کبیرۃ علی حد الشرک باللہ۔ (اصول کافی ص۱۱۱

"علیؑ پر اعتراض کرنے والا ان کے کسی حکم کی بابت مثل اس کے ہے جو خدا اور رسولؐ پر اعتراض کرنے والا ہو، اور علیؑ کا ردّ کرنے والا چھوٹی بات، بڑی بات میں ایسا ہی ہے، جیسا اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا۔"

اور اسی لیے شاید حضرت آدمؑ نے ائمہ پر حسد کیا تھا، العظمۃ للہ۔ مسئلۂ امامت سے نہ محض یہ کہ ختمِ نبوت کا خاتمہ ہو جاتا ہے بلکہ اس کی تابناکیوں کے آگے نبوّت کا سراجِ منیر بھی شمعِ سحری ہو کر رہ گیا ہے۔

آزاد خیال شیعہ صاحب کے نزدیک کیا یہ امور کسی طرح باور کیے جانے کے قابل ہیں؛ چونکہ تبصرہ میں اس مسئلہ کو کسی مصلحت سے بالکّل مبہم رکھا گیا ہے، اس لیے ہم بھی اس حال پر چھوڑنا مناسب سمجھتے ہیں۔

خلافت کا مفہوم

صاحبِ تبصرہ نے خلافت کی از روئے اصطلاح شرعی تعریف یوں بیان کی ہے کہ "ھی النّیابۃ فی الدّین والدّنیا" خلیفہ امورِ دینی (مذہب) وغیر دینی (دنیوی) میں نبی کا نائب ہوتا ہے۔ یہ تعریف مُبہم ہے اور کچھ غلط بھی ہے، مُبہم تو یوں کہ خلیفہ امورِ دینیہ میں نبی کا نائب تو ضرور ہوتا ہے مگر دین کے صرف ایک حصے میں، جیسا کہ میں پہلے تشریح کر چکا ہوں کہ نبی کے دینی کام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل اخذ احکامِ آلٰہیہ اور دوسرے اس کا نشر و نفاذ۔ خلیفہ کو نبی کے پہلے کام سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے کہ نبی کے بعد اخذِ احکام کا کوئی سوال ہی نہیں باقی رہتا لہٰذا خلیفہ کے لیے ہم عصمت نہیں لازم سمجھتے۔ دوسرا کام نشر و نفاذ احکامِ آلٰہیہ ہے، خلیفہ صرف اس امر میں نبی کا نائب و جانشین ہوتا ہے۔ خلافت کی مذکورہ بالا تعریف اس لیے غلط ہے کہ خلیفہ نبی کا امورِ دنیوی یعنی وظائفِ بشریہ میں نائب نہیں ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر انسان کا ماحول اور گرد و پیش کے حالات جداگانہ ہوتے ہیں، ایک

مسلمان کے لیے امرِ سعادت ہوگا کہ وہ مکہ یا مدینہ میں زندگی گزارے۔ لیکن شرعاً وہ اس پر مجبور نہیں، اور نہ خلیفہ کے لیے ایسے امور ضروری قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اسلامی سلطنت کا قیام خود رسول اللہ صلعم کی حیات ہی میں ہو چکا تھا، اور دارالسلطنت یا پایۂ تخت مدینہ منورہ تھا۔ خلفائے ثلثہ کے عہد میں مدینہ ہی دارالسلطنت رہا، لیکن خلیفۂ چہارم جناب علی مرتضیٰؓ کے عہدِ خلافت میں حالات کی نوعیت دگرگوں ہو گئی اور ان کی مصالح نے مجبور کیا کہ وہ کوفہ کو اسلامی دارالسلطنت قرار دیں، چنانچہ انھوں نے ایسا کیا اور ہرگز ان کو یہ خیال مانع نہ ہوا کہ میں خلیفہ ہوں اور بحیثیت جملہ امور میں نائبِ نبی ہونے کے میرا فرض ہے کہ مدینہ ہی کو پایۂ تخت باقی رکھوں خواہ وقت و فضا کا اقتضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ کیا ان حالات کے پیش نظر کسی طرح یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ خلیفہ کے لیے جملہ امور میں نیابت ضروری ہے؟

اصل صورت یہ ہے کہ خلافت و امامت بادشاہت کو کہتے ہیں، لیکن ایسی بادشاہت جو قیام و استحکامِ دین کے لیے بہ نیابتِ پیغمبر ہو، ورنہ وہ خلافت نہ ہوگی صرف ملوکیت یا قیصریت ہوگی۔ اسلامی خلیفہ کا سب سے بڑا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ وہ قیام و بقاءِ دین کے لیے فرائضِ جہاد کو انجام دے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیے کہ تحفظِ اسلام کے لیے جو کوششیں ملکی اور بین الاقوامی حیثیت سے کی جا سکتی ہیں انھیں کا نام اسلام کے اندر "اسلامی سیاست" ہے۔ خلیفہ اسی اسلامی سیاست کا نگران ہوتا ہے اور بس۔ خلیفہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ تعزیرات اسلامیہ کے اندر کسی دفعہ کا اضافہ کر سکے۔ البتہ اس کا یہ فرض ہے کہ اگر کہیں شعارِ اسلامیہ سے مزاحمت کی جاتی ہو تو اس کی مدافعت کرے۔ عملۂ خلافت کی حیثیت بیک وقت پولیس اور فوج کی سی ہے۔ کہ پولیس کا منصب صرف نفاذِ احکام ہے اور فوج نام ہے انھیں احکام و قوانین کی محافظ طاقت کا، لیکن پولیس اور فوج کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ اسمبلی اور کونسل سے پاس شدہ قوانین میں دست اندازی کریں۔ عملۂ خلافت کی اسی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ آج تک کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور

فوج میں صرف شاہی خاندان ہی کے افراد برسرِ کار رہیں، کسی دوسرے کو یہ حق نہیں کہ وہ اس شعبہ میں اپنی خدمات سے حکومت کو فائدہ پہنچا سکے۔ پھر حکومتِ الٰہیہ کے بارے میں کیوں ایسی مہمل شرائط بیان کی جاتی ہیں کہ خلیفہ صرف امام ہی ہوسکتا ہے اور امام صرف خاندانِ نبوت کے افراد ہو سکتے ہیں اور ان افراد میں بھی صرف اولادِ فاطمہؓ، اور ان میں صرف اولادِ حسینؓ اور ان میں بھی صرف ایک درجن افراد اور پھر ان خود ساختہ قیود کو منجانب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکر اسے کوئی عقل والا انسان باور کر سکتا ہے۔

یہاں تو یہ اہتمام نبوت کہ سارے عالم کے لیے عام کیا جا رہا ہے اور قرآن کو تا قیامِ قیامت وسعت دی جا رہی ہے، اسلام کو دنیا کا آخری اور ابدی مذہب قرار دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اسی اسلام کے بقاؤ استحکام اور اس کے احکام کے نشر و نفاذ کے لیے خدا صرف بارہ اماموں کو متعین کرتا ہے جن کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری میں ختم ہو جاتا ہے اور ایک امام صاحب کو غار میں روپوش رہنے کا حکم دیا گیا جن کا وجود و عدم برابر ہے۔ پھر اسلام کو یتیم بچہ کی طرح چھوڑ دیا گیا۔ بے بس و بےکس، نہ کوئی اس کا پرسانِ حال نہ غم خوار، کیا اسی اسلام کو سارے جہان کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تھا، میرا خیال ہے کہ اس قسم کے معتقدات اسلام کے ساتھ مذاق و استہزاء کے مترادف ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ خلافت و امامت بقاءِ دین کے لیے ضروری ہے لیکن اسلام کے اندر ایک فروعی مسئلہ کی حیثیت اس کو حاصل ہے، اصولی مسئلہ نہیں ہے کہ اس پر مدارِ ایمان و اسلام ہو جس کے انکار و ابا سے کفر لازم آئے۔ یہ تو وہ لوگ کہہ سکتے ہیں جن کے نزدیک امامت و خلافت نبوت کے ہم پلہ ہوتی ہے، اسی لیے وہ توحید و رسالت کے ساتھ مسئلۂ امامت کو بھی جزوِ ایمان نہیں بلکہ مدارِ ایمان قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک امامت و خلافت صرف دینی بادشاہت ہے اگرچہ خود خدا ہی نے کیوں نہ اس امام یا خلیفہ کا تقرر کیا ہو حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں جو نبی تھے ان سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ جہاد

کے لیے خدا کی طرف سے کسی بادشاہ کو مقرر کرا دیجیے تاکہ ہم اس کی رہنمائی میں جہاد کر سکیں، نبی کی درخواست پر خدا نے ایسے بادشاہ کا تقرر کر دیا۔

قال لھم نبیھم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا۔ "ان کے نبی نے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تم لوگوں کی بادشاہت کے لیے مبعوث کیا ہے۔"

طالوت مبعوث من اللہ ہیں، فریضۂ جہاد کی ادائیگی کے لیے نبی کی موجودگی کی حالت میں تشریف لائے ہیں گویا کہ وہ سیاسی امور میں نبی کے خلیفہ ہیں لیکن پھر بھی خدا ان کو ملک کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کا خلیفہ دینی بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے وہ نبی کی طرح مفروض الطاعۃ یا نبی کا جملہ امور میں نائب نہیں ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ میری اس مختصر سی بحث سے مفہوم خلافت کی تشریح اس قدر ہو چکی جو سمجھنے کے لیے کافی ہے اور جس پر عقلاً کسی اعتراض کی قطعاً گنجائش باقی نہیں رہ گئی۔

اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا باقی رہ گیا ہے کہ امور استحقاقِ خلافت کیا ہیں؟

امورِ استحقاقِ خلافت

جب یہ امر دلائل کی روشنی میں ثابت ہو چکا کہ خلافت دینی بادشاہ کا نام ہے (اور اسی لیے عام طور سے آج تک مسلمان بادشاہوں کو خلیفۃ المسلمین کہا جاتا ہے، پھر اس امر کے طے پا جانے میں کوئی دشواری ہی نہیں باقی رہتی کہ بادشاہت کا کون شخص مستحق ہو سکتا ہے یقیناً وہی امور جو بادشاہت کے لیے ضروری ہیں ان کی ایک شخص میں موجودگی اس کو مستحق خلافت قرار دے گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے امور ہیں جو بادشاہت کے لیے ضروری ہیں، کہ بغیر ان کے کوئی شخص بادشاہ نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ہم کو یہ نظر آتی ہے، سلطنت و حکومت کے لیے

جابرانہ قوّت اور قاہرانہ طاقت کا ہونا ضروری ہے۔ جس میں قوّت نہ ہوگی وہ کیا حکومت کرسکے گا۔ اس طاقت کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ ذاتی طور سے جسمانی قوّت کافی رکھتا ہو۔ فنونِ جنگ وسپہ گری میں اس کو مہارت تامّہ ہو۔ اور عزم وارادہ کی بھی اس کے پاس غیر معمولی طاقت ہو اور طاقت کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے عزم کا مضبوط اور ارادہ کا پکّا انسان ہو۔ اور علم وتدبر سے بھی بڑی حد تک بہرہ ور ہو، تاکہ امورِ سیاست کی گتھیوں کو آسانی سے سلجھا سکے اور ملکی نظم ونسق کو عمدہ اسلوب پر قائم کرسکے۔ اگر کسی میں یہ دو صفات موجود ہیں تو وہ بادشاہت کرسکتا ہے ورنہ ناممکن ہے۔ ملک طالوت کو جب اللہ نے مقرر فرمایا تو بنی اسرائیل کو اس کی بادشاہت پر اعتراض تھا، کہ طالوت کیونکر بادشاہ ہو سکتا ہے۔ خدا نے ان کے اعتراض کا یہی جواب دیا کہ طالوت میں بادشاہت کی استعداد و صلاحیت موجود ہے۔

> "لوگوں نے کہا طالوت کو ہم پر کیونکر بادشاہی حاصل ہوسکتی ہے، حالانکہ ہم اس کے مستحق ہیں کیونکہ طالوت کے پاس تو کوئی خزانہ (دولت) نہیں۔"
> "نبی نے کہا اللہ نے طالوت کو تم پر بزرگی بخشی ہے اور ان کو علمؔ (سیاست) وجسمؔ (طاقت) میں کشادگی بخشی ہے، اللہ اپنا ملک جس کو چاہے دے۔"
> (سورۂ بقرہ)

اس آیت سے مذکورۂ بالا بیان کی اچھی طرح تائید ہوتی ہے، اور پہلے زمانہ کی بادشاہت کے لیے یہی دو شرطیں ضروری قرار دی جاسکتی ہیں۔

خلافت کا مستحق بھی وہی شخص ہوگا جس میں مذکورۂ بالا دو شرطیں موجود ہوں، کیونکہ اس کا مشن[1] صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کا نفاذ کرے، حدود اللہ کو قائم کرے

---

[1] چنانچہ خود جناب امیر المومنینؑ کا مقولہ ہے جس میں امیر (خلیفہ) کے فرائض بیان کیے گئے ہیں:۔

لابدّ للناس من امیر برّ او فاجر یعمل فی امرتہ المومن.....

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور حفاظت و بقاء دین کیلئے اگر ضرورت پیش آجائے تو مردانہ وار جنگ سے بھی دریغ نہ کرے' ان امور کی انجام دہی کیلئے ضرورت ہے کہ وہ پختہ کار انسان ہو اس کے عزائم میں اس قدر استقلال ہو کہ دوسری طاقتیں اسے متزلزل نہ کر سکتی ہوں، پُرخطر مواقع میں اسکے پاؤں نہ ڈگمگا سکتے ہوں' وہ ایسی کمزور ذہنیت کا مالک نہ ہو کہ مخالف آراء اسے ہر موقع پر شکست دے سکیں بلکہ سنجیدہ دل و دماغ رکھنے والا انسان ہو، فہم و تدبّر اور فراست و دانائی سے کافی حصّہ پایا ہو، نڈر ہو، اور بیباک' پختہ خیال اور راسخ العزم' مشکلات کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ہمت و جرأت رکھتا ہو، لوگوں پر ان کی غیر معمولی طاقت کا اثر قائم ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے احکام دوسروں سے منوا سکتا ہو۔ ایسا شخص خلیفہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خلافت کا مستحق ہے' ان شرائط کو دیکھتے ہوئے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ اوصاف و خصائل کسی خاندان یا کسی قبیلہ یا جماعت کے لیے مخصوص نہیں ہیں جس میں بھی یہ خداداد صلاحیت ہو گی ان اوصاف و کمالات کا وہ حامل ہو گا۔ اس کو حق حاصل ہو گا کہ وہ خلافت کر سکے۔ یہی اہل سنّت کا مسلک ہے کہ وہ خلافت کو کسی گروہ میں محدود نہیں رکھتے۔۔۔ جن لوگوں نے اہل سنّت کے نظریہ کو محدود[1] سمجھا غلط سمجھا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص۳۸۹) ویجمع بہ الفیئ ویقاتل بہ العدو۔ (نہج البلاغہ مصری ص١)

"لوگوں کے لیے امیر کا ہونا ضروری ہے خواہ وہ نیک ہو یا بدکار تاکہ اس کے عہد حکومت میں مسلمان اپنے فرائض ادا کر سکیں، مال غنیمت جمع کیا جا سکے اور دشمنوں سے مقاتلہ کیا جا سکے۔"

[1] بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوا ہے، کہ وہ اہلسنت کے نزدیک خلافت کو صرف قریش کے لیے مختص سمجھتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ الائمۃ من القریش ضرور وارد ہوا ہے لیکن یہ فرمان رسول اسوقت کے حالات اور ماحول کے لحاظ سے تھا، کہ اسوقت طاقت و قوت کے اعتبار سے قریش ہی ایک ایسا قبیلہ تھا جو اور قبائل سے غیر معمولی امتیاز رکھتا تھا اسی لیے امامت و خلافت کا اسکو مستحق قرار دیا ورنہ اسکے یہ معنی ہرگز نہیں کہ قریش میں امامت و خلافت منحصر ہو۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ اس زمانہ میں ٹرکی کی بے پناہ عسکری طاقت کو دیکھتے ہوئے کہا جائے کہ خلافت کا مستحق ٹرکی ہے' اسکے یہ معنی نہ ہونگے کہ ٹرکی ابدالآباد کے لیے خلافت کا مستحق ہو گیا۔ ١٢

کیا جنابِ امیرؑ مستحقِ خلافت تھے؟

یہ ایک ضمنی سوال قائم کیا گیا ہے، جو بحثِ سابقہ کا تتمہ ہے اور جسے پوری بحث کا خلاصہ کہنا چاہیے۔ نصوصِ قطعیہ دربارۂ خلافتِ علیؑ آخری سوال ہے جس پر میں آئندہ بحث کروں گا۔ اس سے پہلے فہم و درایت کی روشنی میں بھی دیکھنا ہے کہ حضرت علیؑ میں کہاں تک خلافت کی استعداد و صلاحیت موجود تھی، کہ یہی اصل بحث ہے لیکن یہ بھی کہوں گا کہ اس بحث میں چونکہ ذاتِ گرامی جناب امیرالمومنینؑ سے بحث ہوگی اور ان کے خصائص و کمالات پر اصول کے ماتحت تنقید و تبصرہ ہوگا کسی کو ناگوار نہ ہونا چاہیئے میں بجان و دل ان کا احترام کرتا ہوں۔ میرے عقیدت و نیاز کی ایک دنیا ان کے کمالات معنوی و روحانی کے اعتراف کے لیے وقف ہے۔ میں مذہبی تعصب کی دیوانگی میں اس بلند مرتبت ہستی پر حملہ نہیں کر سکتا جس کا مقدس خون خود میری رگ و پے میں دوڑ رہا ہے لیکن یہ حق ہے حق گوئی و حق بیانی کا کہ حقیقت کے چہرہ سے بلا تکلف نقاب اُلٹ دی جائے۔ میں اس وقت شیعی نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہوں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جسمانی طاقت کا اعتراف ایک دنیا کو ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ سلطنت کے لیے جس پختگیٔ عزم جس ضبط و ثبات اور جس قوتِ فکر و مستقل مزاجی کا تذکرہ میں نے ابھی بطور شرائط کیا ہے ان کا حضرت علیؑ میں اگر فقدان نہ تھا تو کم از کم نمایاں طور سے نقصان ضرور موجود تھا۔ ان کو دوسروں سے اختلافِ رائے کی ہمت کم ہوتی تھی۔ وہ اپنے عزائم میں غیر معمولی طریقہ سے ثبات و استقلال نہیں رکھتے تھے، ان کو خود اپنی صحیح رائے پر پورا بھروسہ نہ ہوتا، وہ مخالف طاقتوں سے مرعوب ہو جاتے، ان میں وہ قاہرانہ سطوت اور آمرانہ دبدبہ نہیں تھا جس کی وجہ سے لوگ ان کی باتیں مان لیتے یا ان کے احکام پر عمل پیرا ہوتے، یہ وہ حقائق ہیں جو ان کی سوانح حیات میں روشن حیثیت رکھتے ہیں۔

اُن امور کا اعتراف مجھ کو ہی نہیں بلکہ شیعی دنیا کو بھی ہے۔ اور شیعی مورخین اس سے انکار نہیں کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ خود حضرت علیؓ کو بھی ان امور کا اعتراف تھا۔

یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت سے ان کو انکار و اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کے اظہار کی ان کو کبھی جرأت ہوئی؟ میں کہوں گا کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ خلافتِ صدیقیہ کا ظاہری طور سے اعتراف ہی کرتے رہے، اگر کبھی کہیں سے یہ آواز بلند ہوتی کہ حضرت علیؓ کو خلافت ملنی چاہیئے تھی تو فوراً حضرت علیؓ انکار کر بیٹھتے اور اپنے لیے مطالبۂ خلافت کی زور شور سے تردید فرماتے۔ حتیٰ کہ خلفائے ثلثہ کا عہد گزر جانے کے بعد بھی جب ان سے لوگوں نے درخواست کی کہ آپ منصبِ خلافت قبول فرمالیں تو انکار ہی فرماتے رہے۔

" دعونی والتمسوا غیری" (مجھ کو معاف کرو، کسی اور سے کہو)

آپ نے یہ بھی فرمایا، کہ:۔

" ان ترکتمونی کانا کاحدکم" (اگر تم مجھ کو قبولِ خلافت سے علیٰحدہ رہنے دو تو میں تمھارے ہی جیسا ایک فرد ہوں گا۔

کس قدر وضاحت کے ساتھ بتلایا جا رہا ہے کہ میں مستحقِ خلافت نہیں ہوں، اگر میں خلیفہ نہ ہُوا تو یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے حق سے محروم رہا، بلکہ جیسے تم لوگ ہو ویسے ہی مجھے سمجھو۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

ولعلی اسمعکم واطوعکم لمن ولیتموہ امرکم۔

" اور شاید کہ تم لوگوں کی نسبت اس کی بات زیادہ مانوں گا اور زیادہ اس کا فرمانبردار رہوں گا جس کو تم خلیفہ بنا لوگے۔"

بہرحال جناب امیر المومنینؑ اپنے کو مستحقِ خلافت نہیں قرار دیتے، اور اس جملہ سے تو یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انتخابِ خلیفہ کا حق پبلک کو حاصل ہے نہ کہ خدا کے ذمہ ہے

"لمن ولیتموہ" پر غور کرو۔

پھر جناب امیرؑ کا یہ ارشاد بھی قابل لحاظ ہے۔

انا لکم وزیراً خیر لکم منی امیراً (نہج البلاغہ)

"میں تم لوگوں کے لیے امیر (خلیفہ) ہونے کی نسبت بحیثیت وزیر ہونے کے زیادہ مفید ثابت ہوں گا۔"

جناب امیرؑ علم و معرفت میں بڑا درجہ رکھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ میں مستحق خلافت نہیں ہوں۔ ان کو غالباً یہ بھی علم تھا کہ ابوبکر خلیفہ ہیں، پھر عمر ہوں گے، پھر عثمان، ان کے بعد کہیں شاید یہ درجہ مجھ کو ملے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ابوبکر کی خلافت پر کیوں خاموش ہیں۔ کیا آپ کو اختلاف کرتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے؟ تو آپ فرماتے، کہ نہیں میں موت سے ڈرنا چہ معنی، میں موت سے اس قدر مانوس ہوں جس طرح شیر خوار بچہ اپنی ماں کے پستانوں سے مانوس ہوتا ہے۔ مگر میں اپنے مخصوص علم کی بناء پر خاموش ہوں۔ اگر اسے ظاہر کردوں تو تم میں اضطراب پیدا ہو جائے گا۔ یہ علم مخصوص کیا تھا؟ یہی کہ میرا نمبر تین آدمیوں کے بعد ہے اور اگر یہ مراد نہ ہو تو بھی یہ کہنا پڑے گا کہ وہ خلافتِ صدیقیہ کی بابتہ خاموش ہی رہے اور اختلاف نہ کر سکے۔

حضرت علیؑ میں خود اعتمادی کی اسپرٹ کم تھی۔ اپنی رائے پر قائم نہ رہتے۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے جنگِ صفین کا حوالہ پیش کیا تھا۔ کہ اس میں وہ اپنی سابق رائے سے منحرف ہوگئے جس کا نتیجہ انھیں کے حق میں خراب نکلا اور خود ان کو تاسف بھی ہوا کہ استقامت رائے کے ترک کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک جگہ آپ بہ عہدِ خلافت فرماتے ہیں: ۔

"میں نے تم کو اس حکومت سے منع کیا تھا۔ مگر تم نے انکار کر دیا، اس طرح جیسے کٹّر دشمن انکار کردے۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔

اور وہ کرنا پڑا جو تمہاری خواہش تھی اور تم لوگ بہت ہلکی کھوپڑی کے انسان واقع ہوئے ہو۔"

اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ اپنی رائے پر قائم نہ رہے، اپنی بات منوا نہ سکے، اور بیوقوفوں کی بات مان لی۔

حضرت علیؑ کے رعب و دبدبہ میں اس قدر کمی تھی کہ ان کی رعایا ان کا کوئی کہنا ہی نہ مانتی تھی، گھبرا کر فرماتے:۔

منیت بمن لا یطیع اذا امرت ولا یجیب اذا دعوت (نہج البلاغہ)

"میں ایسے لوگوں کی خلافت میں مبتلا کر دیا گیا ہوں جو نہ کہنا مانتے ہیں نہ پکار کا جواب دیتے ہیں۔"

اور یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ ان کی باتوں کو لوگ ذرہ برابر وقعت نہ دیتے اطاعت، فرمانبرداری تو بعد کی چیز ہے، حتیٰ کہ حضرت علیؑ شکوہ کرتے ہیں اور بد دعا فرماتے ہیں۔ کہ:۔

قاتلکم اللہ لقد ملأتم قلبی قیحا وشحنتم صدری غیظا (نہج البلاغہ)

"اللہ تم لوگوں کو ہلاک کر دے، تم نے میرے دل کو (غم کی) پیپ سے بھر دیا اور میرے سینہ کو غصہ سے۔"

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:۔

"تم لوگوں نے مجھے اپنی رائے پر مستقیم نہیں رہنے دیا۔ اس قدر نافرمانی کی۔ یہاں تک کہ اہلِ قریش کہنے لگے کہ علی بہادر تو ضرور ہیں لیکن علم حرب نہیں رکھتے۔" (نہج البلاغہ)

اور کچھ یہی نہیں کہ رسول اللہ صلعم کے بعد ابوبکر و عمر نے لوگوں کو سکھلا پڑھا دیا ہو۔ کہ علیؑ کی مخالفت کیا کرو۔ یا حضرت عثمان اپنے بعد کے لوگوں کو اس قسم کی کوئی وصیت

کر گئے ہوں بلکہ خود زمانۂ نبوت میں بھی یہی حال تھا۔ یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے، مگر لوگ ان کا کہنا نہ مانتے۔ حتیٰ کہ حضورؐ سے آکر اس کی شکایت کی۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اپنے اندر کوئی خاص قاہرانہ جلال نہیں رکھتے تھے۔ جس کی بنا پر حکومت کر سکیں مگر لوگ سمجھتے تھے کہ اگر کہنا نہ مانیں گے تو یہ ہمارا کچھ نہیں کر سکتے۔ ابوبکر و عمر کے عہد میں یہ جرأت کسی بڑے سے بڑے انسان کو بھی نہ ہو سکی۔

میں نے شیعی لٹریچر سے ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ جس سے یہ امر روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو گیا کہ حکومت کے لیے جس عظمت و جلال کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ حضرت علیؓ میں موجود نہ تھی۔ بقول شیعہ حضرات، آپ میں اس قدر کمزوری تھی کہ حضرت عمر نے گھر کو آگ لگا دی، حضرت فاطمہؓ کو گھسیٹا، اسقاط حمل ہو گیا، حضرت فاطمہؓ نے بڑی سخت سخت باتیں کہہ ڈالیں کہ تم کیسے مرد ہو، گھر میں بیٹھے رہتے ہو جیسے ماں کے رحم میں جنین، اور ہم پر یہ ستم ڈھائے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ (نعوذ باللہ) ہوا اور شیرِ خدا کی رگِ حمیت میں جنبش نہ ہوئی۔ اور اس پر یہ دعویٰ کہ انھیں کو خلافت ملنی چاہیئے تھی۔ متذکرۂ بالا حالات میں کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر وہ خلیفہ بنا دیے جاتے تو اسلام کو اسی طرح چار چاند لگ جاتے جیسا کہ ابوبکر و عمر کے زمانۂ خلافت میں لگے؟ میں کہتا ہوں کہ شیعی تاریخ نے جس نوعیت سے ان کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُس واقعۂ ارتداد پر نظر ڈالو جبکہ رسولؐ کے بعد ارتداد کی وبا پھیل گئی۔ حضرت ابوبکر نے فوج کشی کرنی چاہی، تمام صحابہ بالاتفاق حضرت ابوبکر کی رائے کے مخالف تھے اگر حضرت ابوبکر کی جگہ حضرت علی ہوتے تو یقیناً مخالف آراء کی اس بہتات کو دیکھتے ہوئے اپنی رائے سے پھر جاتے۔ مگر وہ ابوبکر تھے، ایک کوہِ عزم و ثبات، ایک آسمانِ عظمت و جلال، انھیں اپنی اصابت رائے پر کامل اعتماد و یقین تھا، حضرت عمر جیسا دبنگ انسان ان کو اپنی رائے سے باز رکھنے گیا، لیکن ایسی ڈانٹ پلائی کہ انکو خاموش

ہی ہونا پڑا۔ "عمر! تم جاہلیت میں کس قدر جبّار تھے، اور اب اسلام میں آکر بزدل ہو گئے" یہ الفاظ تھے جن سے تخاطب کیا تھا۔ خود اعتمادی کا یہ عالم کہ فرماتے، میری زندگی میں اور دین کم ہو جائے، یعنی میں اس دین کا وارث ہوں، وقت کا حاکم ہوں، زمانہ کا بادشاہ ہوں، میں فضا کی ناسازگاری کو اپنی طاقت سے ہموار کر سکتا ہوں، یہ شانِ خلافت تھی ——

میں شیعی دنیا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا حضرت علیؑ سے بھی اس بلند حوصلگی کی توقع ہو سکتی تھی

یہ وہ امور ہیں جس کی وجہ سے کہنا پڑتا ہے کہ اوّلین خلافت کا استحقاق کسی طرح بھی حضرت علیؑ کو حاصل نہ تھا، یہ اور بات ہے کہ حضرت علیؑ سے غلوئے عقیدت یا شیخین سے گہری عداوت کے باعث حضرت علیؑ ہی کو مستحق خلافت ٹھہرایا جائے۔

"ولکنّی اقول ما لکم لا تکادون تفقہون حدیثا"

نصوصِ قطعیہ دربارۂ خلافتِ علیؑ

عقل و درایت کا فیصلہ ہو چکا، اب آؤ یہ عبرتناک منظر بھی دیکھو کہ ایک غلط دعویٰ کے لیے قرآن سے استدلال کیا جاتا ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ مدعی اپنی کوشش کے اندر کامیاب ہے یا بالکل ناکام؟

صاحبِ تبصرہ نے بڑے زور و شور سے دعویٰ کیا ہے کہ خلافت جناب امیرؑ کے لیے نصوصِ قطعیہ ایک دو نہیں بہت سی موجود ہیں، اگرچہ وہ دو تین کے علاوہ اور نہ پیش کر سکے

نصوصِ قطعیہ کے پیش کرنے میں صاحبِ تبصرہ نے ایک گہری مناظرانہ چال چلی ہے وہ یہ کہ ایک آیت بیان کی، اس میں حدیث کا پیوند لگایا اور نتیجہ حسبِ دلخواہ برآمد کر لیا۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایک آزاد خیال انسان کے لیے یہ علمی فریب کاری کہاں تک روا قرار دی جا سکتی ہے۔ میں ان نصوصِ قطعیہ پر بحث کرنے سے پیشتر یہ بتلا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے نزدیک احادیث کا کیا مرتبہ ہے تاکہ آئندہ فہمِ مقصود میں دشواری نہ لاحق ہو۔

غیر متواتر احادیث کا درجہ

قرآنِ عزیز میں متعدد مقامات پر یہ ارشاد ہوا ہے کہ رسولؐ کے اقوال پر عمل کرو۔ میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے بگوشِ خویش رسولؐ کی زبان مبارک سے احکام سنے ان کو لازم تھا کہ وہ اس پر عمل کرتے رسولؐ کا قول ان کے لیے قرآن کے احکامات سے کم وزنی نہیں قرار دیا جاسکتا۔

لیکن اگر آج کہ تیرہ سو برس کا زمانہ گزر چکا مجھ سے کہا جائے کہ یہ فرمان رسولؐ ہے اس کی تعمیل تم پر واجب ہے تو میرے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نہیں کہ میں اقوال رسولؐ کو واجب العمل نہیں سمجھتا، بلکہ اس لیے کہ جو احادیث کا ذخیرہ میرے سامنے پیش کیا جا رہا ہے وہ میرے لیے کسی طرح قابلِ اعتماد نہیں اور میرے اعتبار و یقین کے لیے کوئی قطعی دلیل ایسی نہیں کہ میں اس کو قولِ رسولؐ ماننے پر مجبور کیا جاسکوں۔ یہ درست ہے کہ فنِ حدیث کے جمع و نشر میں بڑی کوشش و کاوش اور بڑی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ فنِ اسماء الرجال مسلمانوں کے پاس ایک قابلِ قدر و لائق فخر شے ہے مگر مجھے کس طرح تم مجبور کر سکتے ہو کہ میں اس کی صحت کا قرآن کی طرح یقین کر لوں۔

اگر یہ امر ثابت ہو جائے کہ یہ حدیث ایسی ہے جس کا سلسلۂ سند رسولؐ تک پہنچتا ہے، راوی سارے سچے ہوں قابلِ اعتماد ہوں، متقی اور ثقہ ہوں، ان تمام باتوں کے اذعان کے باوجود میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ممکن ہے کہ رسولؐ نے ایسا فرمایا ہو اور بس اس سے زیادہ اعتراف کی توقع از روئے عقل فضول ہے۔ غیر متواتر احادیث ظنی ہوتی ہیں ان سے اثباتِ عقائد، ان پر مدارِ ایمان، اُن سے استخراجِ اصول اس قابل نہیں، کہ تسلیم کیا جاسکے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اہل سنّت کا اس بارے میں صحیح عقیدہ کیا ہے؟ اگر یہی ہے تو عقل کے عین مطابق، اور اگر اس کے خلاف ہے تو ایسا عقیدہ مستحق ہے اس امر کا کہ اس کو بالکل رد کر دیا جائے۔ میں اپنے شیعی احباب سے بھی اسی اصول پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اب وہ نصوصِ قطعیہ ملاحظہ ہوں جنہیں صاحبِ تبصرہ نے پیش فرمایا ہے۔

(۱)

واقعہ بیعتِ عشیرہ، فرمانِ رسولؐ: "ھذا اخی ووصیی وخلیفتی فیکم"
'علیؑ میرے بھائی، میرے وصی اور تم لوگوں کے خلیفہ ہیں' مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صاحبِ تبصرہ نے یا تو یہ سمجھا ہی نہیں کہ "نصِ قطعی" کسے کہتے ہیں یا دیدہ دانستہ جُل دینے کی کوشش کی ہے، کیا یہی فرمانِ رسولؐ نصِ قطعی ہے؟ اگر انھیں نصوصاتِ قطعیہ پر مدار اثباتِ خلافتِ علیؑ ہے تو اطمینان رکھنا چاہیے کہ جنھیں حضرت علیؑ سے عقیدت ہوگی وہ بغیر ان نصوص کے بھی ان کو مستحقِ خلافت سمجھ لیں گے ... لیکن اگر نصِ قطعی کے معنی یہ ہیں کہ آیت :-

" انذر عشیرتک الاقربین واخفض جناحک من اتبعک من المؤمنین "

" اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو متنبہ کر دے اور جو ایمان والے تیرے ساتھ ہیں ان سے فروتنی کے ساتھ پیش آ۔ "

کی تفسیر بیعتِ عشیرہ کو قرار دیا گیا ہے تو دنیائے استدلال کا خدا حافظ ہے، دعویٰ تو اتنا زبردست کر دیا گیا کہ اس آیت سے "باجماعِ مفسرین" واقعہ بیعتِ عشیرہ مراد ہے لیکن اس کے ثبوت میں ایک مفسر کا بھی الٹا سیدھا قول دستیاب نہ ہو سکا۔ انسان کیوں ایسا دعویٰ کر بیٹھے جس کا ثبوت نہ لا سکے۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اس پر شیعی مفسرین کا اجماع ہے یا سنی مفسرین کا۔ پھر اس کے بعد واقعہ بیعتِ عشیرہ کا مرحلہ رہ جاتا ہے کہ اس کا تعلق روایات سے ہے جو کسی طرح قطعی باور نہیں کی جا سکتیں اور لطف یہ کہ اس روایت کی بدرجۂ ظن صحت کا بھی تو کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔ پھر کس قدر صریح ظلم ہے کہ ایک مجمل آیت کو لے کر ایک غیر معتبر حدیث کا پیوند اس میں لگا کر خلافتِ علیؑ کا جامہ تیار کیا جاتا ہے اور دعویٰ یہ کہ خلافتِ علیؑ پر یہ نصِ قطعی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں ایک اخلاقی درس دیا گیا ہے ۔ کہ اے نبی مسلمانوں کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ ۔ "خفض جناح" عربی کا محاورہ ہے جس کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ " فروتنی " کسرِ نفسی یا خاکساری کے ساتھ پیش آنے کے ہیں ۔ اس قسم کی نرمی و فروتنی اختیار کرنے کی بعض دیگر مقامات پر بھی قرآن میں تعلیم دی گئی اور نبی کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے

وَلَو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک ۔

" اگر آپ تند مزاج و سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے "

کاش ہمارے آزاد خیال شیعہ مضمون نگار کی نظر خفض جناح کے محاورہ پر ہوتی ، تو یہ غلط فہمی نہ پیش آتی ۔ کہ خفض جناح کے معنی " خلیفہ سازی " قرار دیے جائیں ۔ میں ان کو دعوت دوں گا کہ وہ ذرا وسعتِ نظر سے کام لیں ، قرآن عزیز میں والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری ، ان کے سامنے تسلیم و انقیاد ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ " واخفض لھما جناح الذّلّ " (یعنی والدین کے لیے ذلّت کے بازوؤں کو جھکا دو) پھر کیا اس کا یہ مفہوم قرار دیا جائیگا کہ ماں باپ کو اپنا خلیفہ بنا دو ؟ قرآن فہمی کا یہ کچھ اچھا ثبوت نہیں ۔

(۲)

" انّما ولیّکم اللہ ورسولہ والّذین اٰمنوا الّذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون "

اس کے لیے ملاحظہ ہوں ذیل کی روایات :۔

الخطیب فی المتفق عن ابن عباس عبد الرزاق ، عبد بن حمید بن جریر ، ابو الشیخ ، ابن مردویہ عن ابن عباس طبرانی فی الاوسط ، ابن مردویہ عن ابی طالب ابن ابی حاتم ، ابو الشیخ ابن عساکر عن سلمۃ بن کہیل ، ابن جریر عن مجاہد ، ابن جریر عن السدی عتبۃ

بن حکیم، طبرانی وابن مردویہ، ابونعیم عن ابی رافع ابن مردویہ عن
ابن عباس   (درمنثور السیوطی)

ان روایات میں یہ مذکور ہے کہ مندرجہ بالا آیت اس وقت اتری جبکہ حضرت علیؓ نے ایک سائل کو بحالتِ نماز انگشتِ شہادت سے اتار کر انگوٹھی دے دی تھی۔

صاحبِ تبصرہ نے یہ دوسری نصِ قطعی پیش فرمائی ہے اور میں جانتا ہوں کہ حضرات شیعہ کی سب سے بڑی مایۂ ناز دلیل یہی ہے، شیخ حلی نے الفین میں اس بات کا التزام کیا تھا کہ وہ خلافتِ علیؓ پر دو ہزار دلیلیں قائم کریں گے۔ شیخ حلی نے بھی اپنی سب سے پہلی دلیل اسی آیت کو قرار دیا ہے۔

لیکن جب اس دلیل کو تحلیل کر دیجیے تو بالکل لاشئے نظر آتی ہے۔ میں بتاؤں گا کہ اس آیت سے استدلال میں کس قدر فریب سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس آیت میں بھی روایت کا پیوند جوڑا گیا، دلیل کی قطعیت تو اسی حرکتِ ناشائستہ کے باعث سوخت ہوگئی کہ روایت قطعی نہیں ظنی ہوتی ہے۔ دوسری شے یہ ہے کہ روایت کی نقل میں ـــــ تہذیب مانع ہوتی ہے ورنہ میں کہتا کہ بڑی خیانت اور بد دیانتی سے کام لیا گیا ہے۔ درمنثور کا حوالہ دیا گیا ہے۔ درمنثور وہ کتاب ہے جس میں مصنف نے بغیر التزامِ صحت دنیا بھر کی صحیح و غلط، رطب و یابس روایات جمع کر دی ہیں۔ کہ جس کا بیشتر حصہ صرف "خرافات" ہے۔ اس کتاب سے آپ نے چند مصنفین کے حوالے پیش کر دیے کہ ان ان لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان لوگوں نے اس روایت کو صحیح بھی تسلیم کیا ہے۔ یا نقل کر کے رد کر دیا ہے۔ یہ بھی نہیں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس روایت کی سند کیا ہے؟ رواۃ کیسے ہیں؟ ان چیزوں سے آنکھ بند کر کے محض فریب دینے اور ناواقف کو گمراہ کرنے کے لیے دو درجن کتابوں کے نام نقل کر دیے کہ ان ان لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے

چاہے وہ روایت جعلی ہی کیوں نہ ہو، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ روایت قطعی جھوٹی اور جعلی ہے، اس کی صحت کا ثبوت قیامت تک نہیں پیش کیا جا سکتا۔

اس کی صحت کا اثبات ایسا ہی ناممکن ہے جیسے شبِ تاریک کو روزِ روشن ثابت کرنا۔ بخلاف اس کے دوسری روایات اس کے متضاد واقع ہوئی ہیں جس کا اعتراف خود صاحبِ تبصرہ کو بھی ہے۔ پھر وہ کیوں قابلِ قبول نہیں ہیں؟ اس کا جواب کچھ نہیں ہے۔

پھر کیا انھیں جھوٹی حدیثوں سے اثباتِ خلافتِ علی ممکن ہے؟

حدیث کی تو یہ حقیقت تھی آیت کی نوعیت ملاحظہ ہو۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس سے مراد حضرت علیؓ ہی کی ذات ہے تو بیش از بیش ان کا ولی ہونا قرآن سے ثابت ہوا۔ لیکن ولی سے خلیفہ ہونا مراد لینا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ولی بمعنی حاکم اور خلیفہ ہوتا ہے لیکن یہ کس قدر اندھیر ہے کہ ایک لفظ کے ایسے معنی مراد لیے جائیں جو حقیقتاً اس کے نہ ہوں۔ لغتِ عرب میں کہیں ولی کے معنی حاکم کے نہیں آتے البتہ والی کے معنی حاکم کے آتے ہیں، رضا شاہ کو والیٔ ایران تو کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے لیکن ولیٔ ایران نہیں کہا جا سکتا ہے اور نہ کہا جاتا ہے۔ والیٔ شام، والیٔ عراق وغیرہ مستعمل ہے، ولیٔ شام کہنا لغت میں ایک جدید اضافہ ہوگا۔ شیعی مسجدوں سے اشھد انّ علیا ولیّ اللّٰہ کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں، کیا حضراتِ شیعہ کے نزدیک اس ولی اللہ کے معنی والیٔ اللہ کے ہیں؟ کیا حضرت علیؓ کو اللہ کا حاکم و والی قرار دیا جا سکتا ہے؟ پھر اسی آیت میں ولی کے معنی حاکم کے ہو جائیں گے؟ میرے دوستو انصاف پر ظلم نہ کرو، لغت اٹھا کر دیکھو ولایت کا لفظ دو طرح سے مستعمل ہے۔ واؤ پر فتحہ (زبر) وَلایت اور واؤ پر کسرہ (زیر) وِلایت پہلے کے معنی حکومت کے ہیں جس سے والی بنا ہے اور دوسرے کے معنی محبت کے ہیں جس سے ولی مشتق ہے۔ اور اس کی جمع اولیاء آتی ہے۔ والی کے معنی حاکم کے ہیں، ولی کے معنی دوست کے ہیں۔ قرآن میں بکثرت ولی، اولیاء کے الفاظ وارد ہوئے ہیں

اور ہر جگہ دوست ہی کے معنی ہیں۔ "المؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض"
"مسلمان مرد عورتیں بعض بعض کے دوست ہیں۔"

ولی اردو محاورات میں بھی دوست ہی کے معنی میں مستعمل ہے، ولی اللہ، ولی کامل وغیرہ کا استعمال عام ہے۔ پھر بھی یہ غور تو کرو آیت میں الذین اٰمنوا، یقیمون، راکعون وغیرہ الفاظ جمع کے وارد ہوئے ہیں "تنہا حضرت علیؓ" کو کیونکر مراد لیا جاسکتا ہے۔ یا اگر ایسا کیا جائے تو مجاز ہوگا اور مجاز کے لیے ضرورت اور قرینۂ صارفہ کا ہونا اپنے فن کا طے شدہ مسئلہ ہے۔ یہاں نہ کوئی ضرورت ہے، نہ قرینۂ صارفہ۔

پھر کیسی شدید غلطی کا ارتکاب کیا گیا کہ **وھم راکعون** کو جو ترکیب کے اعتبار سے حال واقع ہو رہا ہے اس کو صرف یؤتون الزکوٰۃ کی ضمیر سے حال بنایا گیا ہے۔ یعنی جو زکوٰۃ دیتے ہیں بحالتِ رکوع، حالانکہ زکوٰۃ دینے کے ذکر سے پہلے یقیمون الصلوٰۃ کا جملہ بھی موجود ہے اور نحوی قاعدہ کے اعتبار سے راکعون کو اس جملہ سے بھی حال بنانا پڑے گا۔ اب معنی یہ ہو جائیں گے کہ جو نماز پڑھتے ہیں بحالتِ رکوع، زکوٰۃ دیتے ہیں بحالتِ رکوع ـــــ کس قدر مہمل جملہ ہوگیا، نماز بحالتِ رکوع کے کوئی معنی نہیں ہیں جب یہ غلط ہے تو زکوٰۃ بحالتِ رکوع بھی غلط، قصہ ختم ہوا۔ پھر ایک غلطی یہ بھی کی گئی ہے یا صاحبِ تبصرہ غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے ہیں کہ انھوں نے رکوع سے مراد نماز والے رکوع کو لیا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ رکوع کے معنی لغوی جھکنا یعنی عاجزی کرنا مراد ہے۔

پھر یہ بھی دیکھو اصطلاحِ شرعی میں زکوٰۃ ایک مخصوص صدقۂ مفروضہ کو کہتے ہیں جو صاحبِ نصاب پر سال تمام ہونے کے بعد عائد ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ صاحبِ نصاب نہ تھے۔ انھوں نے زکوٰۃ کیونکر دی، زکوٰۃ سے صدقۂ غیر مفروضہ مراد لینا بغیر قرینہ جائز نہیں پھر یہ دیکھو کہ حضرت علیؓ نے نماز میں صدقہ دیا، قرآن میں اسکی تعریف وارد ہوئی۔ اور

فریقین میں سے کوئی اس کا بھی قائل نہیں کہ آج نماز میں صدقہ مستحب ہے، سنت و واجب کا ذکر رہنے دو، اگر ایسا کیا جائے تو بوجہ فعل کثیر ہونے کے فساد نماز کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

پھر یہ بھی غور کرو کہ حضرت علیؓ کے متعلق روایتوں میں آتا ہے کہ جنگِ اُحد میں آپ نماز پڑھ رہے تھے، پاؤں میں آکر تیر لگا، خون کے فوارے جاری ہو گئے مگر آپ کو خبر نہ ہوئی، بعد نماز لوگوں نے بتایا تو خبر ہوئی۔ اس قدر غرق فی الصلوٰۃ ہو جاتے تھے، یہاں سائل کی ان کو خبر کیونکر ہو گئی اور کس طرح انگوٹھی اتار کر دے دی، پھر ان چیزوں سے قطع نظر کر لو آیت کے سیاق و سباق کو دیکھو، پہلے سے تذکرہ چلا آ رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے محبت نہ کرو، ترک محبت کا طریقہ بتایا گیا ہے، اسی ضمن میں فتنۂ ارتداد اور اس کا علاج بیان کیا گیا ہے، بعد میں بھی یہی مضمون ہے۔ اب تمہیں سوچو کہ درمیان میں حضرت علیؓ کی خلافت کے تذکرہ کا کون سا موقع و محل تھا، کیا قرآن میں یہ لغویت ہو سکتی ہے؟

پھر یہ دیکھو کہ اس آیت سے استدلال کے وقت انجام سے کیونکر آنکھیں بند کر لی گئی ہیں مان لو، کہ اس سے حضرت علیؓ کی خلافت کا ثبوت ملتا ہے لیکن۔ ع

یہ تو سوچو کہ فلک ٹوٹ پڑیگا کس پر

دیگر ائمہ کی امامت نیست و نابود ہوئی جاتی ہے۔ آیت کا پہلا لفظ انما ہے جو حصر کے لیے آتا ہے، پھر یوں ترجمہ ہوگا کہ مومنین کی ولایت و خلافت صرف اسی کے لیے ہے جس نے نماز میں انگوٹھی دی، حضرت علیؓ تو خلیفہ بن گئے لیکن اور اماموں کی امامت و خلافت کا اب کیا بندوبست ہوگا؟ —

میں تفصیل و اطناب سے گریز کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں اس استدلال کے جملہ نقائص سامنے لاتا لیکن خوف مزید تطویل مانع ہو رہا ہے اسی پر اکتفا کرتا ہوں جس سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ اس نصِ قطعی سے کسی طرح بھی حضرت علیؓ کی خلافت پر استدلال جائز نہیں اور اس نصِ قطعی میں جو ضمیمہ شامل کیا گیا تھا اسکی صحت کا ثبوت ندارد اور طرفہ ستم یہ کہ اس روایت کو

مفسرین اہل سنت کے سر منڈھا گیا ہے حالانکہ میاں جو عالم ہے اس کا بھی مختصراً نمونہ دیکھتے چلو۔

تفسیر جلالین للسیوطی میں اسی آیت کے تحت میں بیان کرتے ہیں کہ:۔
نزلت فی عبد اللہ بن سلام "یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں نازل ہوئی"
علامہ ابن تیمیہ منہاج السنۃ میں اس روایت پر جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

قد وضع لبعض الکذابین حدیثا مفتری ان ھذہ الایۃ نزلت فی علی لما تصدق بخاتمہ فی الصلوٰۃ وھذا کذب باجماع اھل العلم والنقل۔

"بعض جھوٹوں نے یہ روایت گھڑلی ہے کہ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ نماز میں انھوں نے انگوٹھی صدقہ کی حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔"
علامہ ابن حجر عسقلانی الکاف الشاف کے اندر لکھتے ہیں:۔
"کہ یہ انگشتری والی روایت ثعلبی نے بیان کی ہے لیکن اس کی سند ساقط ہے"
علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں انھیں روایتوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

لیس یصح شیئ منہا لضعف اسانیدھا وجہالۃ رجالہا۔

"اس میں سے کوئی بھی صحیح نہیں اسناد ضعیف رجال مجہول ہیں۔"
حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں:۔
وقصہ موضوعہ اعطائے انگشتری روایت کنند "شیعہ ایک گھڑا ہوا قصہ انگوٹھی کا بیان کرتے ہیں"
امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں شیعوں کے استدلال کی بابت لکھتے ہیں:۔

واما استدلالہم بان ھذہ الآیۃ نزلت فی حق علی فہو ممنوع۔

"شیعوں کا یہ استدلال کہ یہ آیت بحق علیؑ نازل ہوئی ہے بالکل لغو ہے"
ان تصریحات کو دیکھو اور پھر یہ دیدہ دلیری دیکھو کہ مفسرین اہل سنت قصۂ انگشتری کے قائل ہیں، صاحب تبصرہ کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ چند ہم مفہوم روایتوں کا ہونا اس کی صحت

ضامن نہیں، وہ اپنے یہاں کی اصول حدیث کی معتبر کتاب استبصار ملاحظہ فرمائیں۔

"یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس"

"اے رسولؐ ان باتوں کی تبلیغ کر دیجئے جو رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچائی آپ نے اسکی رسالت (پیغام) اللہ آپ کو لوگوں سے مامون رکھیگا"

آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے قطعاً مکمل، واضح اور مستقل حکم کی حامل ہے، نہ کوئی خفا ہے نہ ابہام، نہ ایجاز نہ اہمال اور اس قسم کی متعدد آیات اور بھی قرآن میں موجود ہیں جس میں تبلیغ کی شدید تاکید کی گئی ہے۔ لیکن یہ ستم ظریفی تو دیکھیئے کہ اس آیت کو خلافتِ علی پر نص قطعی قرار دیا جاتا ہے اور اس کو بڑی روشن دلیل سمجھ لیا گیا ہے، صاحبِ تبصرہ نے بھی بڑے زور و شور سے اسکو بیان کیا ہے اور اس سے پہلے شیخ حلی نے بھی "منہاج الکرامۃ" میں پیوستہ آیت کے بعد اسی کا ذکر کیا ہے۔

طرزِ استدلال یہ ہے کہ آیت میں جس چیز کی تبلیغ کا حکم ہے وہ حضرت علیؓ کی خلافت ہی کا حکم تھا، عام احکام شرعیہ کی تبلیغ کا حکم مراد نہیں ہے۔

آیت کا شانِ نزول جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ بہت دلچسپ اور سننے کے قابل چیز ہے رسول اللہؐ اپنے آخری حج سے واپس ہو رہے تھے مقام "غدیرِ خم" پر پہنچے تو جبرئیلؑ تشریف لائے۔ اور انھوں نے کہا کہ خدا کا یہ حکم ہے کہ آپ اس مجمع میں علیؓ کی خلافت کا اعلان کر دیجئے۔ رسولؐ نے عذر کیا کہ مجھے خوف ہے، اعلانِ خلافتِ علیؓ کے بعد لوگ آمادۂ قتل و قتال نہ ہو جائیں۔ جبرئیل واپس گئے، خدا سے سب ماجرا بیان کیا تب یہ آیت اتری کہ اے نبی جو حکم نازل ہوا ہے اس کی تبلیغ کر دیجئے، ورنہ آپ فرائضِ رسالت کے ادا کرنے والے قرار نہ دیے جائیں گے، مگر پھر بھی رسولؐ کو تامل تھا۔ یہاں تک کہ خدا نے حفاظت کا وعدہ کیا تو آپ نے خلافتِ علیؓ کا اعلان کیا مگر اس مبہم انداز میں کہ "من کنت

مولاہ فعلی مولاہ" میں جس کا مولا ہوں علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ اس آیت کی تاویل اس سے بہتر نہیں کی جاسکتی اور مجبوراً اپنے احباب کی ندرتِ فکر و پروازِ خیال کی داد دینی پڑتی ہے۔ استدلال اپنے جملہ زوایا کے ساتھ روشنی میں آچکا ہے، اب وقت ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ اس کے ہر ہر گوشہ اور ہر ہر پہلو پر نظر ڈالی جائے

اول تو مجھے پھر وہی کہنا پڑتا ہے کہ اگر آیت کو روایت سے علیحدہ کر دیا جائے تو استدلال کا سارا بنایا گھروندہ خاک میں مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ آیت میں تو اشارۃً کنایۃً کسی طرح خلافت کی بو تک نہیں آتی ہے، چہ جائیکہ اس کو خلافت علیؑ پر نص قطعی قرار دینا —— کہ میرے نزدیک یہ ایک غیر منصفانہ زبردستی کے سوا کچھ نہیں ہے، بیباکی کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اس حدیث کو اہل سنت کے یہاں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ حالانکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسقدر بیباکی کے ساتھ ایسے غلط دعاوی کیوں کیے جاتے ہیں اور کیوں دن کی روشنی میں اندھیر کیا جا رہا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ منہاج السنۃ میں رقمطراز ہیں:-

اما قولہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ فلیس فی الصحاح۔ ونقل عن البخاری وابراھیم الحربی وطائفۃ من اھل العلم بالحدیث انھم طعنوا فیہ وضعفوہ وقال ابومحمد بن حزم لا یصح ھذا الحدیث من طریق الثقات اصلاً۔

" لیکن یہ قول" من کنت مولاہ الخ صحیح احادیث میں سے نہیں ہے اور امام بخاری و ابراہیم و دیگر محدثین سے منقول ہے کہ ان حضرات نے اس روایت پر بڑی جرح کی ہے اور اس کو ضعیف تبلایا ہے۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ یہ حدیث بسند ثقات کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"کہ اس حدیث پر جرح کرنے والی ایک جماعت ان محدثین کی ہے جن پر جرح و

تعدیل کا دار و مدار ہے جیسے ابو داؤد سجستانی اور ابو حاتم رازی وغیرہ۔

پھر کیا یہ دعویٰ شرمندۂ معنی ہو سکتا ہے کہ اہلسنت کے یہاں بھی اس حدیث کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور میں تو کہتا ہوں اہلسنت کا ذکر کیا خود بعض شیعی روایات کی بناء پر اس روایت کی صحت خطرہ میں آجاتی ہے۔ اس لیے کہ بتایا گیا ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے موقع پر نازل ہوئی اور اس کے بموجب خلافتِ علیؓ کا اعلان ہوا۔ بلکہ غدیر خم سے نو روز پیشتر عرفہ کے دن نازل ہوئی۔ ملاحظہ ہو اصولِ کافی صفحہ ۱۷۸ مطبوعہ لکھنؤ۔

ابو الجارود کہتا ہے میں نے امام جعفر صادقؒ کو کہتے ہوئے سنا: ۔

ثم نزلت الولایۃ وانما اتاہ ذلک فی یوم الجمعۃ لعرفۃ انزل اللہ عزّوجل الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی وکان کمال الدین بولایۃ علی بن ابی طالبؑ۔

"پھر نازل ہوئی امامت علیؑ کی اور یہ حکم نبی کے پاس جمعہ کے دن عرفہ میں آیا، اللہ نے فرمایا۔ الیوم اکملت لکم۔الخ دین کا کمال علیؑ بن ابیطالب کی امامت سے ہوا۔"

آیت کے شانِ نزول میں غدیر خم کی روایت اختراع کی گئی نتیجہ یہ رہا جو سامنے ہے اور اب میں بجز اس کے کیا کہوں۔

"درکفر ہم ثابت نہ زنار را رسوا مکن"

اور اگر تسکینِ خاطر کے لیے میں تسلیم کر لوں کہ جو کچھ کہا گیا وہ درست ہے پھر بھی یہ امر قابلِ غور ہے کہ رسولؐ نے کیا چیز کہی؟ میں جس کا مولیٰ ہوں علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔ بزعم شیعہ، میں جس کا والی یا حاکم یا خلیفہ ہوں اس کے علیؑ بھی والی یا خلیفہ ہیں۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اب سنو۔

خدا نے رسولؐ کی بابت فرمایا ہے: ۔

فان اللہ ھو مولاہ وجبریل وصالح المومنین۔

شیعی نقطۂ نظر سے اس کا یہ ترجمہ ہوا کہ رسولؐ کا ـــــ خدا حاکم و والی ہے اور جبریل اور مومنین صالحین، یعنی تمام مومنین صالحین اور جبریل سب کے سب نبی کے خلیفہ ٹھہرے۔ کیا قرآن کے ساتھ یہ مذاق نہیں ہے؟ اس کے علاوہ میں کہتا ہوں ان تمام چیزوں سے قطع نظر کرلو، استدلال کی ماہیت پر غور کرو جس میں خدا اور رسول کے ساتھ کس قدر گستاخیاں ہیں اور اسلام کے ساتھ کیا کھلا ہوا تمسخر ہے۔

صورت حال تو یہ ہے کہ نبی نے ساری عمر تبلیغ کی مصیبتیں جھیلیں، تکالیف برداشت کیں، صعوبتیں اٹھائیں، مسلسل مساعی، ان تھک کوششیں، پیہم جد و جہد کی لیکن بجز چند نفوس کے ...... جنھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے کوئی سچے طریقے سے مسلمان نہ ہوا۔ یوں تو ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمان، ــــ صرف مسلمان ہی کہلانے کے لیے موجود تھے، مگر درحقیقت سب منافق بے ایمان، خدا اور رسولؐ کے دشمن اور خاندانِ رسالت کے خون کے پیاسے تھے۔ اگر ان کے مجمع میں خلافت علیؑ کا اعلان کیا جاتا تو خون سے تلواریں شرابور ہو جاتیں اور زمین رنگین ہو جاتی مگر (خاکم بدہن) خدا کی سمجھ میں یہ بات ہی نہ آئی کہ وہ ایسے وقت میں خلافت علیؑ کا اعلان کرا کے کیوں نبی اور علیؑ کی جان کو مفت میں تلف کیے جانے کا سامان کر رہا ہے۔

یا اگر اس کو یہی منظور تھا کہ علیؑ ہی خلیفہ ہوں تو کیوں نہ پہلے ہی سے ایک بڑی جماعت میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جو اس اعلان کے سننے کے بعد اسکے تسلیم و اعتراف میں لیت و لعل نہ کرتی۔

پھر (نعوذ باللہ) اللہ کے حکم سے نبی کی سرتابی تو دیکھو کہ خدا کہہ رہا ہے، خلافت علیؑ کا اعلان کرو، مگر نبیؐ انکار کر رہے ہیں، ان کو اپنی جان کا ڈر لگا ہوا ہے، پھر کسی طرح اعلان بھی کیا تو گول مول جملوں میں جسے کوئی سمجھ ہی نہ پائے کہ،۔

"مطلبِ سعدی چیست"

معاذ اللہ خدا کے یہ غیر مآل اندیشانہ احکام نبی کے یہ بزدلانہ ایکرطان کے مشن کی نامقبولیت، جملہ صحابہ کی منافقانہ پالیسی یہ سب کچھ تسلیم اور باور کر لیا جاتا ہے تاکہ کسی طرح ایک غیر متعلق آیت سے کھینچ تان کر خلافت علیؑ کا اثبات کیا جا سکے۔ العظمۃ للہ۔ اور پھر خلافت و امامت بوترابی کی یہ اہمیت کہ اگر اس کا اعلان نہ کیا گیا تو اس سے قبل کے بائیس سالہ کارنامے اسی طرح ملیامیٹ کر دیے جائیں جیسے نبیؐ نے کچھ کیا ہی نہیں۔ گویا اسلام کا سارا مدار یا اسلام کا تمام رمز بس خلافت علیؑ میں منحصر تھا، اور اسلام کا اس کے سوا کچھ مقصد ہی نہ تھا۔ نبیؐ نے اپنے اصلاحی پروگرام یا اپنی مصلحانہ اسکیم سے اور پھر اپنی مسلسل مالی و نفسانی قربانیوں سے نہ محض یہ کہ عرب میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا بلکہ میں تو کہتا ہوں زمانہ کا رُخ پلٹ کر رکھ دیا۔ پھر بھی نبی نے کچھ نہ کیا، اگر خلافت علیؑ کا اعلان نہ کیا —— یہ حضرت علیؑ کی خلافت کا اثبات نہ ہوا بلکہ اسلام و بانیؑ اسلام کے ساتھ مذاق ہوا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب خلافت کا مسئلہ اس قدر اہم تھا تو خدا نے اس کی بابت صریحی احکام کے نازل کرنے میں کیوں بخل سے کام لیا۔ اور کیوں "مسئلہ خلافت" کو صنفِ نسواں کے بعض رازہائے درون پردہ کی طرح مخفی رکھا گیا۔ حالانکہ رسولؐ کی یہ خواہش بھی تھی کہ خدا مسئلۂ امامت کو کھلے لفظوں میں بیان کر دے۔

میل رسول آں بود کہ تصریح و تفسیر ولایت در قرآں شود و اکتفا بہ سنت نہ نمود (صافی شرح کافی مصنفہ علامہ خلیل قزوینی)

"رسولؐ کی خواہش یہ تھی کہ امامت کی تشریح و تفسیر قرآن میں ہو جائے اور محض احادیث پر اکتفا نہ ہو"

مگر باوجود اسکے خدا نے قرآن کے اندر کوئی تصریحی حکم اس کی بابت نہیں نازل کیا اور نہ اشارۃً و کنایۃً ہی اس کا قرآن میں کہیں کوئی ذکر کیا بلکہ میں نے کہا کہ نہ جانے کیوں ایسے مہتم بالشان مسئلہ کو جس پہ مدارِ اسلام تھا خدا نے راز ہی بنائے رکھا۔

اصول کافی صفحہ ۴۸۷ میں امام رضا سے روایت ہے:۔

قال ابوجعفر علیہ السلام ولایۃ اللہ اسرھا الی جبرئیل واسرھا جبرئیل الی محمدؐ واسرھا محمد الی علی واسرھا علیؑ الی من شاء وانتم تذیعون ذلکؒ ۔

"امام باقرؑ نے فرمایا کہ ولایت الٰہی یعنی "مسئلۂ امامت" خدا نے بطور راز کے جبریل سے بیان کیا اور جبریلؑ نے رسولؐ سے بطور راز کے بیان کیا اور رسولؐ نے علیؑ سے بھی بطور راز کے بیان کیا اور علیؑ نے جس سے چاہا اس سے بطور راز کے بیان کیا۔ اس کے بعد امام باقرؑ نے فرمایا کہ اب تم لوگ (نالائق ہو جو) اسے مشہور کیے دیتے ہو"

اللہ اللہ جس مسئلہ کی یہ نوعیت تھی کہ وہ راز سربستہ تھا اور سینہ بہ سینہ ائمہ معصومین تک پہنچا تھا اس کی تصریح قرآن میں تلاش کی جاتی ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

اور یہ تو دیکھو کہ جب یہ مسئلہ ایک راز تھا۔ کہ خدا نے صرف جبریل سے اور جبریل نے فقط نبی سے اور نبیؐ نے محض علیؑ سے بطور راز بیان کیا تو پھر اس غدیر خم کے افسانہ کا کیا حشر ہوگا جس میں ایک لاکھ انسانوں کے سمندر میں خلافتِ علیؑ کے اعلان کیے جانے کا تذکرہ ہے۔

کیا یہ جرأت کی جاسکتی ہے کہ اصولِ کافی کی روایت کو غلط قرار دیا جائے جس کی بابت "امام غائبؑ" کا ارشاد ہے کہ ھذا کافٍ لشیعتنا۔ "یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لیے کافی ہے" یا یہ ہمت ہو سکتی ہے کہ امام باقرؑ کے قول کو غلط قرار دیدیا جائے درانحالیکہ وہ "معصوم" تھے پھر آخر اس روایت کا کیا جواب دیا جائے گا۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ "ہمارا راز برابر پوشیدہ رہا، یہاں تک کہ ان مکار لوگوں کے ہاتھ میں پہنچا اور انھوں نے اسکو گلیوں اور کوچوں میں پھر کر بیان کر دیا" (اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ)

یہی خلافت علیؑ "پر نصِ قطعی" تھی اور یہی وہ مایۂ ناز دلیل تھی جس کے بیان کرنے میں صاحب تبصرہ نے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں۔ آیت میں ایک غیر مصدقہ روایت کا پیوند لگایا مگر پیوند بھی ایسا کہ جس کے تار تار بکھرے ہوئے ہیں۔

(۴)

واتوا البیوت من ابوابھا ــــ "اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو"

یہ بھی خلافتِ علیؑ پر ایک نصِ قطعی ہے اور وہ یوں کہ رسولؐ کا ارشاد ہے کہ "انا مدینۃ العلم وعلیؓ بابھا ومن اراد البیت فلیات الباب" "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں جس کو گھر میں آنا ہو وہ دروازہ سے آئے"۔ پس خلافتِ علیؓ اس آیت سے ثابت ہو گئی، ٹھیک اسی طرح جیسے ایک "ذاکر" نے "قل ہو اللہ احد" سے شہادتِ کربلا کا واقعہ یُوں استنباط کیا تھا کہ وہ خدا ایک ہے، جس نے عرب میں ایک نبی بھیجا تھا اور اس نبی کے ایک صاحبزادی تھیں فاطمہؓ، اور اُن کے دو لڑکے تھے حسنؓ اور حسینؓ، یہی حسینؓ کربلا میں شہید ہوئے تھے ــ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کے ساتھ کیوں مذاق کیا جاتا ہے، یعنی آیت کے ساتھ روایت کا دامن باندھنے پر بھی تو خلافتِ علیؓ کا اثبات نہیں ہوتا، چہ جائیکہ صرف آیت سے اثبات کیا جا سکے۔ اور پھر درایت کی روشنی میں روایت کو دیکھیے تو ناگفتنی کمزوریاں نظر آتی ہیں، اوّل تو سند کے اعتبار سے یہ روایت پایۂ اعتبار تک نہیں پہنچتی، پھر یہ بھی قابلِ غور امر ہے کہ کسی شہر کا دروازہ صرف ایک نہیں ہوتا، بلکہ کئی ایک ہوتے ہیں اور عموماً چار دروازے ہوتے ہیں۔ تنہا علیؓ کو باب مدینۃ العلم کہنا غلط ہے۔ پھر یہ بھی طے شدہ امر نہیں کہ علیؓ کے لفظ سے ابن ابی طالب مراد ہیں یا لغوی معنی "بلند" مراد ہیں لغوی معنی مراد لینے کے بعد روایت کا مفہوم یہ ہو گا کہ میں علم کا شہر ہوں اور بلند (علی) ہے اس (شہر) کا دروازہ۔ دروازہ کی بلندی کے ذکر کرنے سے "شہرِ علم" کی اہمیت کا اظہار مقصود ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ان امور سے قطع نظر بھی کر لو، اگر صرف حضرت علیؓ کا مبلغ علم ہی ان کی اوّلین خلافت کے لیے وجہِ استحقاق ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت عثمان اسی اوّلین خلافت کے مستحق نہ قرار دیے جائیں کیونکہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:-

انک تعلم ما نعلم (نہج البلاغہ) ــ بیشک وہ آپ سب کچھ جانتے ہیں جو میں

جانتا ہوں۔

پھر کیا یہ علم کی تساوی حضرت عثمان کو اولین خلافت کی مستحق نہیں قرار دے سکتی؟

حقیقت یہ ہے کہ ایسی روایات کی صحت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی ان اصحاب کی صرف جزئی فضیلت کا ثبوت ہوتا ہے۔ اور بس ان روایاتِ فضائل کو مسئلۂ خلافت و امامت سے کیا تعلق؟ اگر صرف علم ہی دنیا میں وجہِ حکومت و فرمانروائی ہو سکتا تو شاید آج اورنگہائے حکومت پر ہٹلر و مسولینی قابض نہ ہوتے، زمامِ سلطنت اسٹالین اور مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں میں نہ ہوتی، ڈی ولیرا اور جنرل فرانکو کی قیادت نہ تسلیم کی جاتی اور معاف کیا جائے ایران کے تخت پر رضا شاہ پہلوی نہ ہوتے بلکہ کوئی "قبلہ سرکار شریعتمدار" رونق افروز ہو کر دادِ حکمرانی دیتے، مگر اس ناپاک مادی دنیا کا ازل سے کچھ عجیب وطیرہ رہا ہے کہ اس نے صرف "زہد و اتقاء" کو کبھی مایۂ حکومت نہیں سمجھا اور شاید یہی وجہ ہوئی کہ ائمہ معصومین گو منصوص من اللہ تھے مگر دنیا کی مادی طاقتیں نہ جانے کیوں اس کے خلاف تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے بھی خاموشی ہی اختیار کی۔ رسولؐ نے بھی سکوت ہی میں مصلحت سمجھی، علیؑ شیرِ خدا کی آنکھوں کے سامنے منافقوں نے تخت و تاج سنبھالا، خوب خوب دادِ جہانبانی و کشورکشائی دی مگر شیرِ خدا کا کچھ بس نہ چلا، وہی شیرِ خدا کہ جنھوں نے بڑے بڑے بہادرانِ عرب کو خاک و خون میں ملا دیا تھا اور بڑے بڑے یلانِ پیل تن کا ان کے نام سے زہرہ آب ہو جاتا تھا مگر وہ ابوبکر و عمر کے خلاف آواز نہ اٹھا سکے۔ اس لیے کہ آواز کامیاب نہ ہوتی۔ قوم ان کی قیادت پر کسی طرح تیار نہ ہوتی کہ حضرت علیؑ سے بہتر مدبر و طاقتور دماغ حکمرانی میں مصروف تھے اور حکومت کے لیے نرا علم و تقویٰ درکار نہیں۔

صاحبِ تبصرہ نے جو نصوصِ قطعیہ پیش کی تھیں ان کی حقیقت اب کچھ اس طرح نمایاں ہو گئی کہ منصف مزاجوں کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی؎

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے　　اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

صاحب تبصرہ سے میں عرض کروں گا ؎

بہ متاعِ خود چہ نازی کہ بشہر دردمنداں
دلِ غزنوی نیرزد بہ تبسّمے ایازے

* * *

دیکھنے والوں کو یہ تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں صراحتہً تو درکنار اشارۃً بھی کہیں خلافتِ علیؓ کا کوئی پتہ نشان موجود نہیں اور قرآن سے ثبوت کیونکر مل سکے کہ یہ مسئلہ تو "ابنِ سبا" کی ذہنی خلّاقی کا نتیجہ ہے۔ ملاحظہ ہو رجال کشی صفحہ ۷۱

> "بعض اہلِ علم نے بیان کیا ہے کہ عبد اللہ بن سبا پہلے یہودی تھا، اور حضرت یوشع بن نون کے بارے میں غلو کیا کرتا تھا۔ پھر مسلمان ہوا اور حضرت علیؓ سے محبت کرنے لگا، اور نبی علیہ السلام کے بعد حضرت علیؓ کے بارے میں بھی ویسا ہی غلو کرنے لگا۔ یہ ابن سبا پہلا شخص ہے جس نے امامت علیؓ کے فرض ہونے کو شہرت دی۔ اور اُن کے دشمنوں پر تبرّا کیا۔ اُن کے مخالفوں کی تکفیر کی، اسی لیے جو لوگ شیعوں کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ تشیع کی بنیاد یہودیت سے ماخوذ ہے۔"

افسوس!

نامِ زہراؓ بردن و دینِ یہودی داشتن

اسی لیے زمانۂ سابق کے شیعی علماء نے یہ راہ اختیار کی کہ قرآن کو محرّف قرار دیا اور یہ عقیدہ قائم کرلیا کہ اس قرآن سے وہ تمام آیات حذف کردی گئی ہیں جن میں خلافت و امامت کا تذکرہ تھا، یہ راہ آسان تھی، عموماً سب نے یہی راہ اختیار کی اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے میں کامل وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جمہور شیعہ تحریفِ قرآن کے قائل و معتقد ہیں۔ بہت ہی تتبع اور استقراء کے بعد صرف چار شخصوں کی بابت یہ معلوم ہوسکا کہ وہ تحریفِ قرآن

کے قائل نہیں، ورنہ ان کے علاوہ "ہمہ خانہ آفتاب" کا مصداق ہے۔

علامہ نوری طبرسی فصل الخطاب صفحہ ۳۲ میں لکھتے ہیں: ۔

الثانی عدم وقوع التغیر والنقصان فیہ وجمیع ما نزل علی رسول اللہ ھو الموجود فی ایدی الناس فیما بین الدفتین والیہ ذھب الصدوق فی عقائدہ و السید المرتضیٰ وشیخ الطائفۃ فی التبیان ولم یعرف من القدماء موافق لھم۔

"دوسرا قول قرآن کے اندر عدم تحریف کا ہے یعنی جو کچھ رسول پر نازل ہوا تھا وہ حرف بحرف بین الدفتین موجود ہے۔ اس طرف شیخ صدوق، شیخ مرتضیٰ اور ابوجعفر طوسی شیخ الطائفہ گئے ہیں، مگر متقدمین میں ان ہر سہ حضرات کے موافق کوئی بھی نہیں۔"

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۳۴ میں ہے: ۔

والی طبقۃ (ای المرتضیٰ) لم یعرف الخلاف صریحاً الا من ھذہ المشائخ الاربعۃ

یعنی شریف مرتضیٰ کے طبقہ تک تحریفِ قرآن کی صراحۃً مخالفت بجز ان چار بزرگوں کے اور کوئی نہیں (چوتھے بزرگ بوعلی طبرسی مصنف تفسیر مجمع البیان ہیں)

ظاہر ہے کہ پورے مذہب والوں میں سے صرف چار شخصوں کے انکار تحریفِ قرآن کو کیا وقعت دی جا سکتی ہے۔ جمہور شیعہ تو مانتے ہیں کہ قرآن میں قطع و برید کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے جب تم شیعوں کا مذہبی لٹریچر دیکھو گے تو تمہیں ایک روایت بھی ایسی نہ ملے گی جس کا یہ مفہوم ہو کہ موجودہ قرآن وہی ہے جو حضورؐ پر نازل ہوا تھا۔ بخلاف اس کے تحریف قرآن کی بابت روایتیں ڈھونڈو تو میں تم سے بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ ڈھائی ہزار روایتیں ملیں گی جن میں اکثر و بیشتر ائمہ معصومین سے مروی و متعلق ہیں، یہ بحث بہت طویل ہے ورنہ میں تفصیل کے ساتھ بتاتا کہ کیونکر شیعہ حضرات تحریف کے قائل ہیں، اگر کسی کو اس کا ثبوت حاصل کرنا مقصود ہو تو وہ اصولِ کافی مصنفہ یعقوب کلینی، تفسیر قمی مصنفہ علی بن ابراہیم قمی، احتجاج طبرسی مطبوعہ ایران، تفسیر صافی، تفسیر عیاشی، فصل الخطاب مصنفہ علامہ نوری

ہری، استقصار الافحام مصنفہ امام الشیعہ مولوی حامد حسینؒ کا مطالعہ کرے جس میں روایات تحریف بھری پڑی ہیں ۔

میرا خیال ہے کہ جمہور کا یہ عقیدہ ہی اس بات کے لیے سب سے بڑی دلیل ہے کہ موجودہ قرآن میں خلافتِ علیؑ کا وجود نہیں ورنہ اعتقادِ تحریف کی کوئی ضرورت ہی نہ پیش آتی ۔

ان تمام تر ابحاث کا حاصل صرف یہ ہے کہ یا تو مسئلۂ خلافت و امامتِ علیؑ کو قرآن سے متعلق نہ سمجھا جائے یا پھر قرآن ہی کو قابلِ اعتبار نہ قرار دیا جائے ۔ اس کے سوا کوئی تیسری صورت نہیں جس کو عقل و نقل کی تائید اور درایت و روایت کی حمایت حاصل ہو ۔

اب میں اس بحث کو یہیں پر سرِ دست ختم کرتا ہوں کہ میری دانست میں شیعی دلائل و براہین اپنے جملہ حواشی و روایا کے ساتھ روشنی میں آچکے، اور اس طرح ان کے حقائق روشن ہو چکے ہیں کہ کم از کم جوہرِ لطیف سے بہرہ مند اشخاص ان کی استدلالی حیثیت کو ذرہ برابر بھی وقعت نہیں دے سکتے ۔ ہٹ دھرمی اور کجروی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں، اس کا معاملہ صرف خدا پر ہے ۔

ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اب تک میری تمام تر گفتگو کا مدار سلبی پہلو سے تھا یعنی ادعائے خلافتِ علیؑ کے منصوص ہونے کا منکر تھا لیکن اس کے بعد اگر ضرورت محسوس کی جائے ۔ یعنی اہلسنّت کے معتدل مسلک کو دیکھنے کی خواہش ہو کہ کس حد تک عقل و درایت کے ساتھ چسپاں ہے تو میں اذعان و یقین کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے نہایت بلند آہنگی سے دعویٰ کرتا ہوں کہ خلفائے ثلثہ بالخصوص شیخین کی خلافت برحق تھی ۔ وہ غاصبِ خلافت نہ تھے بلکہ مستحقِ خلافت تھے ۔ میں اس مسئلہ کو درایت کے علاوہ قرآن کی تابناک روشنی میں پیش کرسکتا ہوں کہ جس سے انکار کی سرِ مو گنجائش ناممکن ہوگی ۔ اور یہ وہ صورت نہ ہوگی کہ ادعائے باطل کے اثبات کے لیے جب دلائل و حجج کی دنیا میں قدم رکھا گیا تو ہر ہر قدم پر بیکسی نے فریاد کی، اور ہر ہر گام پر بے مائگی نے مرثیہ پڑھا ۔ درایت نے دامن تھاما اور عقل نے ہاتھ پکڑا ۔ غرض

بیچارگی کی جس قدر مایوسیاں ہوسکتی ہیں وہ خود خرمنِ دلائل کے حق میں برق و شرر ثابت ہوئیں۔

⁂

آزاد خیال شیعہ صاحب کے مضمون کا یہ جواب لکھ رہا تھا اور اس کا بیشتر حصہ لکھ بھی چکا تھا، کہ ماہ جولائی کا نگار میری نظر سے گزرا جس میں میرے محترم ابوسعید بزمی صاحب کا وہ مقالہ شائع ہوا ہے جو انھیں آزاد خیال شیعہ صاحب کے جواب میں ہے۔ ہرچند کہ بزمی صاحب کا وہ مقالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت کامیاب ہے پھر بھی بحث کے چند گوشے ایسے رہ گئے تھے جنکا اس سلسلہ میں بے نقاب ہوجانا ہی بہتر تھا، بزمی صاحب کا مقالہ نظر سے گزر جانے کے بعد مجھے یہ آسانی ہوئی کہ بحث کے آخر میں جہاں کتبِ شیعہ سے احتجاج و استناد کی ضرورت پیش آئی ہے میں نے ان تمام روایتوں کو ترک کر دیا ہے جو بزمی صاحب اپنے بیان میں لا چکے تھے کہ تکرار سے بجز طوالت اور کچھ حاصل نہ تھا مجموعی حیثیت سے ان جملہ مباحث کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ صاف ظاہر ہوتا ہے:۔

> کہ خلافتِ علیؑ کے لیے ایک بھی نص قطعی موجود نہیں، نہ رسولؐ کی یہ خواہش تھی بلکہ یہ بعض مفسدین کا اختراعی مسئلہ ہے اور اس قدر مہلک و خطرناک کہ اس کی بدولت قرآن کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

میں شیعی علماء سے گذارش کروں گا کہ وہ ان معروضات پر غیر جذباتی حیثیت سے غور کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں، بات آسان ہے سمجھ میں آسکتی ہے بشرطیکہ تعصب اور تنگ نظری کی تاریک فضا سے علیحدہ ہو کر غور کیا جائے ورنہ ذاتی اغراض و مقاصد کا حجاب طبیعت کو اثر پذیریوں سے مہجور رکھتا ہے اور انسان قبولِ صداقت کی سعادت سے محروم رہ جاتا ہے۔

م، ح

مسئلہ خلافت وامامت

اسلام اور انسانیت کے نقطۂ نظر سے

ذاکر حسینؒ

مسئلۂ خلافت و امامت

{انسانیت اور اسلام کے نقطۂ نظر سے}

جولائی ۳۷ء کے نگار میں بہ عنوان مندرجہ صدر جو مضمون شائع ہوا ہے وہ گویا خلافت و امامت کے مسئلہ پر ایک فیصلہ کن بحث کی دعوت عام ہے، اور نگار کے اڈیٹر صاحب چاہتے ہیں کہ اصل موضوع پر دونوں فرقوں کی جانب سے ایسے دلائل پیش کیے جائیں کہ دنیا کسی حد تک اس قدیم اور دشوار تر گتھی کو سلجھانے کے قابل ہو سکے، فاضل مقالہ نگار نے اس مسئلہ کے تصفیہ میں پہلے انسانیت اور پھر اسلام کے نقطۂ نظر سے گفتگو کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس لیے آئیے دیکھیں کہ انسانیت و اسلام کے جو اصول انھوں نے مقرر کیے ہیں وہ کس حد تک لائق تسلیم ہیں۔ اور انسانیت انھیں گوارا بھی کرتی ہے یا نہیں ؟

وہ انسانیت کا مدار عقل عمومی پر رکھتے ہیں، ملاحظہ ہو: ـ

> عقل عمومی سے میری مراد وہ معمولی فہم و فراست ہے کہ جسے روزمرہ کے کاروبار میں ہم کام میں لاتے ہیں اور جس کے ذریعہ سے ہم بہت سی ابتدائی صداقتوں کو پہچانتے ہیں۔ ایسی صداقتیں جن پر بنی نوع انسان عمومیت کے ساتھ متفق ہوتے ہیں اور جن سے عامۃ الناس کو اعتقاداً نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوتی، مثلاً سچ بولنا اچھا ہے یہ ہماری عقل عمومی کا فیصلہ ہے۔ اسی طرح "انسان کا قتل کرنا" وحشیانہ فعل ہے یا "جھوٹ بولنا" بری بات ہے۔ اس نوع کے تمام اصول و

کلیات ایسے ہیں کہ جنہیں ہماری عقلِ عمومی تسلیم شدہ قرار دیتی ہے۔"

افسوس ہے کہ فاضل مقالہ نگار کی اس تشریح سے بھی ابہام رفع نہیں ہوتا، کیونکہ اس سلسلہ میں اس امر کی تشخیص کہ فلاں بات سچ ہے اور فلاں بات جھوٹ کس کے ذمہ قرار پائے گی، یہ ایک الجھن ہے۔

اب میں ایک اور نگاہ سے اس قول کو جانچتا ہوں۔ اس بحث میں عقلِ عمومی کو حجت قرار دیا گیا ہے۔ یعنی عقلِ عمومی جس شئے کا انکار کرے وہ ردّ کر دینے کے قابل ہے۔ اور جس شئے کو قبول کرے وہ قابلِ اخذ ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح مانا جائے اور عوام کا اقرار یا انکار حجّت ہو جائے تو کوئی اصل اپنے مقام پر ثابت نہیں رہتی۔ یہی عقلِ عوام تھی جو ایک زمانہ میں شہنشاہیت مطلقہ کے سامنے جھکی ہوئی تھی اور اب یہی عقلِ عمومی ہے جس کے لیے بقول آں محترم اشتراکیت جاذبِ نظر بنی ہوئی ہے۔

اصل یہ ہے کہ عوام ہر زمانہ میں کالانعام ہوا کرتے ہیں اور آج بھی ہیں۔ عوام ہمیشہ ایک مخصوص جماعت کے ہاتھ میں ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے عوام کا رجحان کبھی سند کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اور صاحبِ نظر عوام کی قبولیت یا عدم قبولیت کو کبھی اہمیت نہیں دیتے بلکہ نفسِ مسئلہ پر نظر رکھتے ہیں۔

میرے قولِ بالا کی دلیل خود اس مضمون میں موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "کسی مذہب کا معیارِ صداقت یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے کسی انسانی جماعت کا حق غصب نہ ہوتا ہو" یہ جزوِ اوّل ہے۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ:- "الوہی امامت سے انسانی جماعت کا حق غصب ہوتا ہے" یہ جزوِ ثانی ہے۔ ان دونوں کو ملانے سے جو نتیجہ نکلے گا وہ سامنے ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ عقلِ عمومی ہمزبان ہو جائے، لیکن یہ ہمزبانی صاحبِ فکر کو مسحور نہ کر سکے گی۔ وہ تو یہ دیکھے گا کہ اس قضیہ کے اجزاء جو قائم کیے گئے ہیں وہ کہاں تک صحت رکھتے ہیں، اب میں ان مطالب کی طرف

پڑھتا ہوں جو اس تحریر کی روح ہیں :-

۱۔ "رسولِ اکرمؐ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ان کی وفات کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں اور یہ سلسلہ شاہانِ خود مختار کی طرح نسلاً بعد نسلٍ قائم رہے۔"

۲۔ "حضرت علیؓ کی "الوہی امامت" کے سلسلہ میں جتنی روایات و احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب یا تو موضوع، جعلی اور خود ساختہ ہیں یا ان کا مفہوم وہ نہیں ہے جو الوہی امامت کی تصدیق کرتا ہو۔"

یہ دعویٰ ہے اور اس دعویٰ کو نباہنے کے لیے کچھ تنقیحات قائم کرتے ہوئے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ الوہی امامت یہ ہے کہ :-

"خداوند کریم نے یہ طے کر دیا تھا کہ رسولِ کریمؐ کے بعد اُن کے داماد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں اور ان کے بعد یہ منصب جلیل ان کی اولاد میں سے کسی کو عطا کر دیا جائے اور اس طرح یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے"

اس نتیجہ پر زور دیتے ہوئے کچھ اور بھی فرمایا گیا ہے جو قابلِ غور ہے، طوالت کے خیال سے اپنے ہی لفظوں میں ان کا خلاصہ درج کیے دیتا ہوں :-

۱۔ خلافت و امامت صرف علیؓ کی نسل کے لیے مخصوص ہے۔

۲۔ ہر خلیفہ کی جگہ اس کا بیٹا ہی مسند نشین ہوگا، مثل شاہانِ خود مختار۔

۳۔ تمام دنیا کے مسلمان حضرت علیؓ کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں، وہی اولوالامر و آقا و مولا ہیں اور ہر مسلمان ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور۔ تمام دنیا کے مسلمان خواہ کتنے ہی متقی و متورع ہوں، اس سے محروم رہتے ہیں۔

۴۔ بانیٔ اسلام کی گویا خواہش تھی کہ ان کی نسل تا قیامت مسلمانوں پر

حکومت کرے اور یہ حکومت مطلق العنان ہو۔ اس طرح خانوادۂ علیؑ کے لیے گویا نسلی امتیاز قائم ہو جاتا ہے اور آلِ علیؑ کا ہر فرد گویا ماں کے پیٹ سے یہ حق لے کر پیدا ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کے سامنے سرِ عقیدت جھکائیں۔"

اور یہ وہ باتیں ہیں جنھیں عقلِ عمومی قبول نہیں کرتی۔

قبل ازیں کہ دعویٰ اور استدلال پر توجہ کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ انصاف پسند حضرات اس پر بھی غور فرمائیں کہ آج ہم جس نسلی امتیاز سے متنفر ہیں آج جو شہنشاہیت ہماری نظروں میں کھٹکتی ہے کیا عقلِ عمومی اس سے اسی طرح متنفر و بیزار ہے، اور کیا سقیفۂ بنی ساعدہ میں بمقابلۂ انصار جو استدلال پیش کیا گیا تھا کہ "الائمۃ من القریش" کیا اس کے معنی اس کے سوا کچھ اور تھے؟ کیا اس استدلال سے نسلی امتیاز کی بو نہیں آتی؟ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر اسے عقلِ عمومی آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے پر کیوں مائل ہے؟ اور اس کے بعد بھی صدیوں تک جو صورت اسلامی حکومت کی پائی گئی کیا وہ شہنشاہیت نہ تھی؟

اب رہا نسلی امتیاز۔ کیا میں سوال کر سکتا ہوں کہ مختلف اقوام میں اور مختلف زمانوں میں اس امتیاز کا احساس رہا ہے یا نہیں؟ اور آج بھی ہے یا نہیں؟ یہ عالمگیر احساس مجھے تو کبھی کم ہوتا نظر نہ آیا، بلکہ بنی نوعِ انسان کی ایک وسیع جماعت ہمیشہ اس کی حمایت کرتی نظر آئی۔

یہ خیال کہ اسلام اس نسلی امتیاز کو مٹانے کے لیے آیا تھا کم از کم کلامِ مجید سے تو ثابت ہوتا نہیں بلکہ برخلاف اس کے اس امتیاز کی تائید ثابت ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

"ان اللہ اصطفیٰ اٰدم و نوحا و اٰل ابراھیم و اٰل عمران علی العالمین"

کیا اس سے آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کا نسلی امتیاز ثابت نہیں ہوتا؟ اس سے بھی تیز تر سنیے:۔

"ام یحسدون النّاس علی ما اٰتاھم اللہ من فضلہ فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتاب والحکمۃ واٰتیناھم ملکاً عظیماً فمنھم من اٰمن بہٖ ومنھم من صدّ عنہ وکفی بجھنّم سعیرا"

"کیا یہ لوگ ان لوگوں سے حسد رکھتے ہیں اس شے پر جو خدا نے اپنے فضل سے انھیں عطا کر دی ، بے شک ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب بھی دے دی اور حکمت بھی اور انھیں ملکِ عظیم عطا کر دیا ، اب کوئی تو اس پر ایمان لاتا ہے اور کوئی رکتا ہے اور جہنّم کے شعلے اس کے لیے بہت کافی ہیں۔"

آلِ ابراہیم پر برکتوں کی بارش اور اس شدومد سے کہ جو اس پر ایمان نہ لائے اس کے لیے جہنم کے شعلے ہیں کس امر پر دال ہے؟ اور کیا یہ اس امر کا بیّن ثبوت نہیں ہے کہ خود مشیتِ الٰہی نوعی اور نسلی امتیاز کی حامی ہے۔

بلا شک وشبہ رسول اللہؐ کا مقصود جو اسلام لے کر دنیا کے سامنے آئے دنیا و عقبیٰ میں صرف سعادتِ بشری کا حصول تھا ، اور چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا آخرت کا مقدمہ ہے اور دین وحیٔ الٰہی ہے اس لیے اس میں کسی انسانی مصلحت اندیشی کو دخل نہیں ہوسکتا۔ اور اس کی تبلیغ میں ایک پیغمبر کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے لیے یا اپنی نسل کے لیے یا اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر کسی سلطنت کی بنیاد قائم کر جائے اگرچہ دنیا یہ شبہ کرتی ہے اور بعض نے حتماً وجزماً اس کا اعلان بھی کر دیا ہے چنانچہ یزید کہتا ہے :-

لعبت ھاشم بالملک ولا   خبر جاء ولا وحی نزل

"ایک ہاشمی نے سلطنت کے لیے یہ کھیل کھیلا ، حالانکہ نہ کوئی خبر آئی نہ کوئی وحی نازل ہوئی۔"

شیعی حلقوں میں جس سلطنت اور جس حکومت کو آلِ نبیؐ کا حق سمجھا جاتا ہے

وہ دنیاوی حکومت نہیں ہے، بلکہ وہ ایسی سعادتِ کبریٰ ہے جس کا راز آنحضرتؐ کے سینے میں رکھا گیا اور جس کو بروئے کار لانا بھی آپ کے فرائض میں داخل تھا۔ مقصدِ الٰہی یہ تھا کہ اس قانون کے ماتحت حیاتِ انسانی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ سعادت کا کوئی انفرادی و اجتماعی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ لیکن یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ کوئی قانون زیرِ عمل نہیں آسکتا جب تک کہ حکومت کی باقاعدہ تشکیل نہ ہو۔ چنانچہ حضرت پیغمبرؐ اپنے وقت میں خود حاکم تھے لیکن یہ حکومت نہ شہنشاہیت تھی نہ اسے "ڈکٹیٹرشپ" سے تعلق تھا اور نہ "جمہوریت" کی ممنونِ احسان تھی بلکہ فی الحقیقت یہ حکومت نبوتِ الٰہیہ کی ایک شعاع تھی۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ نبوت کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ بارگاہِ الٰہی کے احکام اس کی مخلوق تک پہنچا دیں، اور دوسرا یہ کہ اس کے اجراء کا انتظام بھی فرمائیں۔ اس اعتبار سے جس طرح نبوت من جانب اللہ ہے اسی طرح یہ حکومت بھی ہے اور رسول اللہؐ کے بعد لامحالہ ہم کو اس کے لیے محل قابل کی تلاش کرنی پڑے گی۔

یہاں علی و عمر کی بحث نہیں ہے۔ اگر علی محل قابل ہیں تو چشمِ ما روشن اور اگر عمر اس کی قابلیت رکھتے ہیں تو دلِ ما شاد۔ مگر اس کا ذریعہ شناخت بھی صرف زبانِ وحی ہونا چاہیئے جو عقلِ عمومی سے بہت زیادہ بلند ہے۔

جائیکہ سلطان خیمہ زد غوغا نباشد عام را

ظاہر ہے کہ اس حکومت میں اکتساب کو دخل نہیں تھا، بلکہ یہ عطیۂ الٰہی تھی اور یہ جہاں بھی قائم ہو اس کی شان برقرار رہنی چاہیے۔ جہاں پائی جائے من اللہ پائی جانی چاہیئے اور "من اللّٰہیت" کے معلوم کرنے کا ذریعہ صرف رسولؐ ہے۔ اب اسے حکومتِ الٰہیہ سمجھئے، خلافتِ الٰہیہ کہیئے، امامتِ الٰہیہ فرمائیے، جو کچھ چاہے کہیئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس چیز کو رسولؐ بھی اپنے اختیار سے کسی کو عطا نہیں فرما سکتے تھے!

"ربک یخلق مایشاء ویختار ما کان لھم الخیرۃ"

یہ ہے وہ امامتِ الٰہیہ جو طبقۂ شیعہ کا مطمح نظر ہے۔ اس امامت کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ عوام بھی اس کے ساتھ رہیں اور اس کا یہ بھی فرض نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لیے پروپیگنڈا کرے۔ اس قدر بیان سے غالباً امامتِ الٰہیہ کے متعلق شیعہ نظریہ واضح ہو گیا ہو گا۔

حضرات اہل سنت جن کو خلفاء کہتے ہیں ہم بھی انھیں خلفاء کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایک جماعت کے اتفاق سے وہ خلیفہ بنے، ہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ وہ کتنے ہی اچھے سہی لیکن یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی حکومت حکومتِ الٰہیہ ہے کیونکہ اجماع و شوریٰ خود اس کے منافی ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ حضرات اہل سنت جس کو خود حاکم بنالیں اس کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اب اس کا ہر قول، ہر فعل، ہر حرکت حکمِ خدا ہے اور یہیں سے سارا جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے، ہم اس کو ضرور حاکمِ اسلامی سمجھیں گے، اس کی حکومت، حکومتِ اسلامی کہلائے گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اسے حکومتِ الٰہیہ بھی تسلیم کر لیا جائے۔

الغرض! شیعہ کے نزدیک خلفاء کی خلافت ایک دنیوی قسم کی حکومت تھی اور یہی سبب ہے کہ علی مرتضیٰؑ کو بھی اس خلافت کے لحاظ سے جو علی الظاہر انھیں اصول کے ماتحت انھیں ملی کوئی خاص فضیلت حاصل نہیں ہوئی۔ وہ اس خلافت کے باعث عالمِ تشیع سے روشناس نہیں ہوئے۔ اگر یہ چند روزہ حکومت نہ ہوتی تو بھی علیؑ بہرحال علیؑ ہی رہتے۔

فاضل مضمون نگار نے جو تنقیحات قائم فرمائی ہیں اگرچہ وہ بہت کچھ بحث طلب بلکہ اصلاح طلب ہیں لیکن ان سے اور بعد کی تشریحات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انکے نزدیک اولادِ علیؑ میں خلافت کا محصور ہونا دوسری جماعتوں کی حق تلفی ہے لیکن حق تلفی کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دو برابر کے حقداروں میں سے کسی ایک کا حق غصب کیا جائے یا کسی زیادہ مستحق شخص کے مقابلہ میں کم استحقاق رکھنے والے کو ترجیح دی جائے

لیکن چونکہ "امامتِ الٰہیہ" کا تعلق اکتسابات دنیوی سے نہیں ہے جن میں فرق و امتیاز کا پایا جانا ضروری ہے بلکہ محض منشاءِ خداوندی سے ہے، اس لیے اگر اس کے صحیح مفہوم کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا کہ :-

> "خداوندِ عالم طے کرچکا ہے کہ رسولِ کریمؐ کے بعد خلافتِ الٰہیہ علیؑ ہی کے لیے ہے اور علیؑ کے بعد اس کے گیارہ فرزندوں کے لیے"

تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ ہاں یہ خیال دماغ سے نکل جانا چاہیے کہ یہ عطیہ ان لوگوں کے لیے اولادِ رسولؐ ہونے کی حیثیت سے ملا ہے یا رسولؐ یہ چاہتے تھے کہ میری نسل مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط رہے۔ کیونکہ اگر اولادِ رسولؐ ہونے کی حیثیت ملحوظ ہوتی، تو خود علیؑ کو یہ شے کیسے ملتی؟ اور اگر اولادِ علیؑ کا لحاظ کیا جائے تو علی مرتضیٰؑ کی اولاد دوسری بیبیوں سے بھی ہے، یہ منصب وہاں کیوں نہ پہنچا اور اگر بنو فاطمہؑ کا لحاظ کیا جائے تو اولادِ امام حسنؑ اس سے کیوں محروم رہی؟ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس امر میں کسی نسبی امتیاز کا لحاظ نہیں کیا گیا۔

نوعِ انسان میں آدم سے لے کر آج تک بے شمار انسان گزرے ہیں لیکن ان لاتعداد انسانوں میں سے صرف چند منصبِ نبوّت پر سرفراز ہوئے، اس کے کیا معنی؟ یہاں بھی یہ حق تلفی نظر آتی ہے۔ نقل کا جواب اس مقام پر یہ ہے کہ غصبِ حقوق کا اطلاق وہاں ہوا کرتا ہے جہاں کوئی حق بھی پایا جائے اور جب حق کا وجود ہی نہ ہو تو غصبِ حقوق یعنی چہ؟

میں اس تحریر میں بیان کر چکا ہوں کہ اس منصبِ جلیل کو مقرر کرنے کا اختیار خود رسولؐ کو بھی نہیں تھا۔ ہاں اعلان ان کے فرائض تبلیغ میں ضرور تھا اور یہ اعلان بطریق شیعہ بذریعہ اہل بیتؑ علی التواتر ثابت ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے طعناً لکھا ہے کہ شیعہ تمام دنیا کی آبادی میں دس فیصدی بھی نہیں

ہیں۔ اگر یہ تحقیق صحیح مان لی جائے تو بھی دس فیصدی بہت ہیں کیونکہ جس فرقہ پر صدیوں تک تلوار چلی ہو اور چل رہی ہو اس کا صفحۂ عالم پر باقی رہ جانا ہی حیرتناک امر ہے۔ بہرحال وہ جتنے بھی ہیں شرفا ہیں۔ اس لیے کہ عوام الناس مصائب میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام دنیوی زحمتوں کو قبول کیوں کیا؟ کیا ان کے لیے حکومتوں میں منضم ہو جانا ممکن نہ تھا؟ یقیناً تھا، لیکن ان کی نظر مادی فوائد پر نہیں تھی۔ بلکہ وہ دینِ صحیح اور اسلامِ صحیح کے طلبگار تھے اور ان کے نزدیک اسلامِ صحیح کی حامل دوسری ہستیاں تھیں۔ لہٰذا انھوں نے حکامِ وقت کے مظالم سہے مگر ان کا دامن نہ چھوڑا۔

خوجہ اور بوہرہ حضرات کے مرشدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمام اولادِ علیؑ کو جو صاحبِ مضمون نے خلافتِ الٰہیہ کا مرکز بنایا ہے یہ محض ایجادِ بندہ ہے۔ اسی طرح آغا خاں اور ملا طاہر سیف الدین کی تعلیم جو کچھ ہو عقیدہ خلافتِ الٰہیہ اس کا ذمہ دار نہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ اسمٰعیلیہ کے ظہور کا سبب کیا ہے؟ ناظرین غور فرمائیں کہ روس میں بالشوزم کی بنیاد کیوں پڑی؟ ظاہر ہے کہ شاہانِ روس کے مظالم بالشوزم کے ظہور میں آنے کا سبب ہیں۔ اگر عوام امن و سکون کی زندگی بسر کریں، مظلوم کو ظالم کی طرف سے کھٹکا نہ ہو، عدالتِ صحیحہ کا دور دورہ ہو تو بغاوت کے جراثیم پیدا ہی نہیں ہوتے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ابنِ آدم کا یہ فطری حق ہے کہ امن و آزادی کی تدبیریں سوچے۔ اب اس وقت کی اسلامی حکومتوں پر نظر کیجیے۔ ظاہر ہے کہ وہ منصوص من اللہ تو تھیں نہیں اور ظلم و استبداد دنیا میں پھیل رہا تھا اس لیے ایک جماعت نے ان سے گلو خلاصی کی کوشش کی۔

وہ ہستیاں جو منصوص من اللہ تھیں انھوں نے تو ہمیشہ صبر و سکوت کا حکم دیا، نہ خود ان امور میں حصہ لیا اور نہ کسی کو اجازت دی، لیکن یہ صبر و حلم ہر شخص کا حصہ نہیں تھا۔ جس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا جاتا تھا وہ حکومت کے خلاف اٹھتا تھا اور اپنی جان دیتا تھا۔

علویین، سلاطین وقت کے خلاف لڑتے اس کا راز یہی ہے۔ اور اس معاملہ میں وہ قطعاً معذور تھے۔ چنانچہ زید بن علی اسی جذبہ کے ماتحت حکومت کے خلاف میدان میں آ گئے اور حضرت ابو حنیفہ گویا ان کے خاص معاونین میں سے تھے (اگرچہ انھوں نے عین وقت پر عذر کر دیا) ائمہ اہل بیتؑ جو ان حضرات کو روکتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ انکی حقیقت بین نگاہیں انجام کو جانتی تھیں۔

سب جانتے ہیں کہ جب دنیا سے حق و ناحق کا امتیاز اٹھ جاتا ہے تو ہر نوع کا انتشار و اضطراب پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہی ان موقعوں پر بھی ہوا۔ وہ لوگ جو ان سلطنتوں سے تنگ آئے ہوئے تھے ان کی نظر میں علویین اور فاطمیین کی ناکامیاں بھی تھیں، وہ ایک نئے اور کامیاب ذریعہ کی جستجو کر رہے تھے۔ پھر چونکہ ہر ناکامی انسان کے لیے سبق ہے کامیابی کا، لہٰذا انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بنو علیؑ و بنو فاطمہؑ جو ناکام رہتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ان حضرات میں سب اوصاف سہی لیکن قیادت مذہبی انھیں حاصل نہیں اور جن بزرگواروں کو صحیح مذہبی عظمت حاصل ہے وہ اس میں شرکت نہیں کرتے اور اس کی عدم شرکت کے راز سے سب آگاہ ہیں۔ اس لیے ملک کو کوئی دلچسپی ان سے نہیں رہتی۔ اور حکومت بآسانی مقابل آنے والوں کو زیر کر لیتی ہے۔

فکر کرنے والوں کے سامنے جب کوئی ایسا "سبب" آ جاتا ہے جو ان کے ارادوں میں حائل ہو تو وہ اس کے دور کرنے کی فکر کیا ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ عزم کر لیا گیا کہ ایک مذہبی مسند الگ قائم کی جائے تاکہ قائد کا وقار مذہبی حیثیت سے بھی مسلم ہو چنانچہ اسی خیال کے تحت اس تجویز کو عمل میں لایا گیا اور آخر ایسی کامیابی ہوئی کہ بڑی بڑی قہار طاقتوں کے بنائے کچھ نہ بن سکی۔ فرقۂ باطنیہ کی بنیاد قائم ہوئی جس کے ہاتھوں بڑے بڑے حکام قتل ہوئے۔ اب انھیں کوسا جاتا ہے۔ لیکن بالشویکوں نے روس کے شاہی خاندان کا چن چن کے خاتمہ کیا تو اس پر کسی نے آہ بھی نہ کی بلکہ اشتراکیت کو سراہا جا رہا ہے۔ حالانکہ

جس روح کے تحت زارِ روس تباہ ہوا اسی کی بنا پر بڑے بڑے ملا قتل ہوئے جو فی الحقیقت عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے ظالمانہ حکومتوں کے ایجنٹ تھے۔

اہلِ نظر انصاف فرمائیں کہ ایسے فرقوں کی پیدائش کا سبب ظالمانہ حکومتیں ہیں یا عقیدۂ خلافتِ الٰہیہ۔

مزید توضیح ملاحظہ ہو۔ اہلِ سنت کے پاس انعقادِ خلافت کے چار طریقے ہیں:-

۱۔ اجماع۔ یعنی ایک ہم خیال گروہ کا مل جُل کر کسی کو حاکم بنا لینا۔ ہم خیال اس لیے کہتا ہوں کہ آزاد و واقعی اجماع محقق نہیں۔

۲۔ استخلاف۔ یعنی جانے والا کسی کے لیے کہہ جائے کہ یہ میرا جانشین ہے۔

۳۔ شوریٰ۔ یعنی ایک محدود جماعت کے مشورہ سے کسی کو نامزد کر دینا۔

۴۔ قہر و غلبہ۔ یعنی جس کے ہاتھ میں بھی تلوار آ جائے اور سلطنت حاصل کر لے۔

واقعاً جامعیت اسی کا نام ہے یعنی جتنے طریقے بھی حکومت کے ہو سکتے ہیں وہ سب گھیر لیے گئے ہیں۔ کسی قسم کی بھی حکومت ہو وہ ان صورتوں سے خالی نہ ہوگی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جن جن صورتوں سے حکومتوں کا ظہور ہوا ان سب کو حق بنانے کے لیے یہ اصول تصنیف کیے گئے ہیں۔ گویا حکومتیں کسی اصول کے تحت نہیں، بلکہ اصول حکومت کے تحت ہیں۔

یہاں تک غنیمت ہے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت سمجھی جاتی ہے اور ان کی بیعت سے تقاعد کرنے والا مستوجبِ جہنم چنانچہ ایسے ہی موقعوں کے لیے یہ حدیث پیش کی گئی ہے:-

"من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ جاھلیۃ"

صاحبانِ غور و فکر سے التماس ہے کہ طرق چہارگانہ جو بیان کیے گئے وہ اصل میں تین ہی ہیں۔ اس لیے کہ اجماع وقوعی و شوریٰ کی روح ایک ہی ہے۔ اور یہ تینوں طریقے

بلاشبہ متضاد ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں اسلامی طریقہ کون سا ہے؟ اگر یہ سب کسی اسلامی حکم کے تحت ہیں تو معاف کیجیے ایک اہم اور اصولی مسئلہ میں ایسے متضاد احکام! عقلاً ایسے اسلام کو دور ہی سے سلام کرنا چاہیئے۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بحث کے آخر میں اپنی تحریر کا خلاصہ درج کردوں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱۔ اسلام بلاشک و شبہ سعادتِ بشر کے لیے آیا ہے۔

۲۔ اسی سعادت کا ایک جزو خلافتِ الٰہیہ ہے۔

۳۔ خلافتِ الٰہیہ ایک موہبت الٰہیہ ہے۔ وہ کسی نسلی امتیاز پر نہیں بلکہ جوہر ذاتی کی بنا پر ہے۔ کسی ایک نسل میں اس کا پایا جانا اس مفہوم کا حامل نہیں کہ نسلی امتیاز مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

۴۔ خلافتِ الٰہیہ سے کسی فرد یا جماعت کی حق تلفی کا ذکر ایک دھوکا ہے۔ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ فلاں شخص یا فلاں خاندان اس عطا کا مستحق تھا۔ بغیر اثبات حقوق کے غصبِ حقوق کہنا ایک بے معنی بات ہے۔

۵۔ اگر غیر مستحق مدعیانِ امامت پیدا ہوئے تو امامتِ الٰہیہ اس کی ذمہ دار نہیں۔

۶۔ عقلِ عمومی کی حجیت کا دعویٰ غلط ہے۔

⁂

یہاں تک انسانیت مفروضہ کے متعلق عرض کیا گیا۔ اب قرآن و احادیث کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

شیعہ اور سنیوں میں ایک اصولی اختلاف یہ بھی ہے کہ شیعہ ہر مسئلہ کو اسلام کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے حضرات اہل سنت کا مسلک دوسرا ہے چنانچہ اسی تحریر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محرر کے نزدیک "انسانیت" اور شے ہے اور "اسلام"

اور شے ۔

مسئلہ قرآن میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر جاتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے مطالب صاف و صریح سمجھ میں بھی آسکتے ہیں یا نہیں۔ ملاحظہ کیجیے یہ کتاب خود اپنے متعلق کیا کہتی ہے :۔

" فیہ آیات محکمات ھن ام الکتاب اُخر متشابہات "

اس میں بعض آیات محکمات ہیں اور دوسری متشابہات ہیں، اور خود قرآن یہ نہیں بتاتا کہ فلاں آیت محکم ہے اور فلاں متشابہ ۔

اس کتاب میں اجمال بھی ہے ۔ مثلاً اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ ۔ لغت کے لحاظ سے دیکھو تو صلوٰۃ کے معنی دعا اور زکوٰۃ کے معنی نمو ۔ قرآن یہ کہیں نہیں بتاتا کہ صلوٰۃ سے مراد وہ عبادت ہے جس کے اجزا تکبیر، قیام، رکوع، سجود، تشہد وغیرہ ہیں ۔ یا زکوٰۃ سے مراد وہ خیرات ہے جو مذہبی فرض کے طور پر ادا کی جاتی ہے

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :۔

ان اللہ اصطفیٰ آدم ونوحا وآل ابراھیم (خود قرآن کچھ نہیں بتاتا کہ آل ابراہیم سے مراد کل ہیں یا بعض،

دوسری جگہ فرمایا :۔

" یقول الذین کفروا لست مرسلا قل کفیٰ باللہ شہیدا بینی و بینکم ومن عندہ علم الکتاب "

" کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے، کہہ دے میرے اور تمہارے درمیان شہادت دینے کے لیے خدا کافی ہے اور وہ شخص جس کے پاس علم الکتاب ہے یہ صاحبِ علم الکتاب کون ہے؟ قرآن بظاہر خاموش ہے ۔

ایک اور آیت ملاحظہ ہو :۔

"انّہ لقراٰن کریم فی کتاب مکنون لا یمسّہ الّا المطھّرون"
یہ قرآنِ کریم ہے جو کتاب مکنون میں ہے اسے مس نہیں کریں گے مگر مطہر، وہ کتاب مکنون کیا ہے جو ظرفِ قرآن ہے؟

یہ چند مثالیں بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ ایک ایک قدم پر بھی مشکل پیش آتی ہے یہ مشکلات تو تفسیر کی حد تک ہیں، اب رہی تاویل وہ تو ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔

آیاتِ قرآنی کے سلسلہ میں اعتراضاً تحریر فرمایا گیا ہے کہ اہلِ تشیع تاویل کرنے اور اصل مفہوم کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں استاد مانے جاتے ہیں اور اسلام میں اس نوع کی تاویل کا دروازہ سب سے پہلے یہی فرقہ نے کھولا ہے اور حاشیہ پر پروفیسر نکلسن کی کتاب کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔

پہلے تو انھیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ تاویل کے معنی ہیں کسی لفظ کو اس کی حقیقت اولیہ کی طرف پلٹانا۔ چنانچہ بعض مقام پر یہی حقیقتِ اولیہ مراد لی جاتی ہے اور ظاہر لفظ کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا اور بعض مقامات پر حقیقت اولیہ بھی مدِ نظر رکھی جاتی ہے اور ظاہر معنی بھی

۱۔ مثلاً "ید اللہ فوق ایدیھم" اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر ہے۔ معلوم ہے کہ "ید" یا "ہاتھ" سے ظاہری معنی مراد نہیں ہو سکتے، اس لیے یہاں "قوت و قدرت و گرفت" کے معنی مراد لیے جائیں گے اور ظاہر معنی کا قطعاً لحاظ نہ ہوگا۔

۲۔ "اقیموا الصلوٰۃ" ہے کہ نماز کی حقیقت اولیہ رجوع الی اللہ ہے۔ اب یہ معنی بھی ملحوظ رہیں گے اور اس کے مفہومِ ظاہری کا بھی لحاظ رکھا جائے گا جو شارع علیہ السلام نے متعین فرما دیا ہے کیونکہ بعض ارکان کے خلاف کوئی دلیل عقلی یا نقلی موجود نہیں ہے، بلکہ علی التواتر یہی اصولِ عبارت تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ ہیں تاویل کے معنی جو عرض کیے گئے۔ اب اگر اس قسم کی تاویل کی دروازہ شیعوں نے کھولا ہے تو وہ اولوالالباب ہیں، صاحبِ فہم و فراست ہیں، لیکن اگر فاضل مضمون نگار اپنے خیال میں تاویل کے معنی یہ

سمجھ رہے ہیں کہ اصل مفہوم و منشا کو کھینچ تان کر کچھ سے کچھ بنا دیا تو اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔ یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ مطالبِ قرآنی ہر عامی اور ہر نامحرم کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اسی لیے اس کے معلمِ اول خود رسول اللہؐ تھے مسلمان مجبور تھے کہ وقتِ نزولِ آیت رسول اللہؐ سے اس کا مطلب دریافت کریں۔ دریافت کرتے تھے اور جواب پاتے تھے۔ انھیں جوابات کو تفسیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس تفسیر کو چھوڑ کر قرآن کو کافی سمجھنا یا خود اس کے مفہوم متعین کرنا رسولؐ کے مرتبہ معلمیت سے انکار کرنا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسئلہ کی صورت کیا ہے؟ آیا تفسیر سے ہاتھ اٹھا لیں یا اس پر عمل کریں؟ اور اگر عمل کریں تو کس کے توسط سے؟ شیعہ دوسری صورت کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور توسط کے معاملہ میں ان کی نگاہ اہلِ بیتؑ پر جمی ہوئی ہے مطالبِ قرآنی کے متعلق یہ ہے شیعی نقطۂ نگاہ۔ اب میں قائل کی قرآن فہمی پر نظر کروں گا۔ ابتدائے عنوان میں تحریر فرماتے ہیں:-

"وہ قرآنی آیات جن کی بنا پر حضرات شیعہ کی جانب سے عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے حضرت علیؑ کی الوہی خلافت پر مضبوط قرائن قائم ہوتے ہیں"

اس تحریر سے یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صرف اتنی ہی آیتیں مدارِ مذہب شیعہ ہیں۔ خیر آئیے مطلب کی طرف۔

"لیس البر بأن تأتوا البیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقی واتوا البیوت من ابوابھا"

"نیکی یہ نہیں ہے کہ گھروں میں اُن کی پُشت کی طرف سے داخل ہو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو۔"

تفسیرِ آیت یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت عرب جب حالتِ احرام میں ہوتے تھے تو دروازوں سے گھروں میں داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ پشتِ خانہ میں کھڑکی سی بنا لیتے تھے۔ اسی میں سے آتے جاتے تھے اور اسے جزوِ دین سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس آیت کے ذریعہ اس

اس رسم پرستی کی ممانعت کردی۔

یہ تو وہ حقیقی مفہوم ہوا جو الفاظ سے مترشح ہوتا ہے اور جو اس آیت کی شانِ نزول پر مبنی ہے۔ لیکن ذرا نظر کو وسعت دیجئے۔ احکامِ قرآنی کسی خاص مسئلہ سے متعلق صادر تو ضرور ہوتے ہیں لیکن ان میں اس قسم کے سارے واقعات کا احاطہ مقصود ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو قوانینِ اسلامی مختص المقام فرمان ہو کر رہ جائیں گے۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اس حکم میں سیدھا راستہ چلنے کی طرف اشارہ ہے۔ کجروی کی ممانعت کی گئی ہے۔ اب آپ خود غور کیجیے کہ آیت کی تاویل غلط ہے یا صحیح۔ تاویل یہ ہے کہ ہر فن میں، ہر علم میں، ہر مسئلہ میں اسی قاعدہ سے داخل ہونا چاہیئے جو اس کے لیے معین و مقرر ہے۔ اگر عقب سے آ گئے یعنی خلافِ قاعدہ داخل ہو گئے تو کچھ استفادہ نہ کر سکو گے۔ یہ ایک سیدھا سا عقلی اصول ہے اور اسی آیت کے تحت میں آ رہا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہر فن میں داخل ہونے کے لیے اس شخص کے پاس جانا چاہیئے جو اس فن کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اسی عقلی اصول کی بناء پر نحو کا دروازہ نحوی ہے اور راگ کا دروازہ گویا، نحو سیکھنے کے لیے نحوی کے پاس جائیے اور راگ سیکھنے کے لیے گوئیے کے پاس۔ اسی طرح خداشناسی کا ذوق ہے تو رسولؐ کے پاس جائیے کیونکہ معرفتِ الٰہی کا دروازہ رسولؐ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ علمِ رسول کا دروازہ کون ہے؟ یعنی علمِ رسولؐ کا باب تو ضرور ہونا چاہیئے۔ مگر وہ ایسا کون ہے جو ہر حیثیت سے واقفِ علمِ رسولؐ ہے۔ شیعہ یہاں تک تو صرف بحکمِ عقل آتا ہے اور جب تلاش کا قدم بڑھتا ہے تو اس کی خوش قسمتی سے ارشادِ رسولؐ اس کے لیے مشعلِ راہ بن جاتا ہے کہ "انا مدینۃ العلم و علیٌ بابھا"

اب اس شناخت کے بعد اس نظر اس ارشادِ الٰہی پر جاتی ہے:۔

"ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون انما یتذکر اولوا الالباب"

اب میں عرض کرتا ہوں کہ اس استدلال میں کیا خرابی ہے اور آپ ہی متعین کیجیے کہ آخر عالمِ علمِ رسولؐ کما حقہٗ کون ہے ؟

۳۔ "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔"

(ترجمہ) آج میں نے تمہارے دین کی تکمیل کردی اور اپنے احسان کو تم پر پورا کردیا (نعمت کا ترجمہ احسان کیا خوب) اور میں نے پسند کیا کہ تمہارا دین اسلام ہو)

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آیت میں کونسا خلا یا نقص ہے جو حدیثِ غدیر کے ضم کرنے کی ضرورت ہوئی۔"

بے شک ذرا دور کی بات ہے۔ اس مقام پر پھر کسی قدر تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ "الیوم" میں "الف" "لام" "یوم" کافی نمایاں ہے۔ یہ "الف" "لام" "یوم" کو جو نکرہ ہے معرفہ بنا رہا ہے۔ اسی لیے اس کا ترجمہ "آج" کیا گیا۔ مگر میں ترجمہ کرتا ہوں "آج کا دن" کہ اصل لفظ کی قوت اسی میں باقی رہتی ہے. الغرض الیوم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن کوئی مخصوص دن ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ وہ روزِ مخصوص کون سا ہے۔ فرض کیجیے ہمارے سامنے ایک پروگرام ہے اور جب اس پروگرام کا جزوِ اخیر انجام پا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کے دن ہم نے اس پروگرام سے فراغت پائی۔ یا آج کے دن ہم نے اس کی تکمیل کرادی۔ ہاں یہ واضح رہے کہ پروگرام کی تکمیل کے پانچ دس دن بعد بلکہ اس کے دوسرے ہی دن "الیوم" کہنا درست نہ ہوگا۔ اسی طرح سے آئندہ مذکور میں نہ صرف یومِ مخصوص بلکہ نبوت کے پروگرام کے جزوِ اخیر کی شناخت بھی ضروری ہے۔ اس کو خلا یا نقص نہیں کہتے بلکہ اسے "دعوتِ تفکر" کہتے ہیں۔

یہ ارشاد کہ "رسولِ کریمؐ نے اپنی وفات سے قبل یہ اعلان فرمایا" کچھ مفید نہیں ہے

اسی کو تعریف المجہول بالمجہول کہتے ہیں۔

لفظ مولیٰ سے جو تعرض کیا گیا ہے میں اس کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب کچھ کہا جائے تو کس کے سامنے۔

۳۔ "وانذر عشیرتک الاقربین واخفض جناحک"۔۔۔ الخ

(ترجمہ) اپنے قریب کے رشتہ داروں کو متنبہ کر دے اور جو ایمان والے تیرے ساتھ ہیں ان کے سامنے اپنے بازو نیچے رکھ (یعنی ان کے ساتھ نرمی سے پیش آ)

اب سوال یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل رسول اللہ نے کی یا نہیں؟ اگر کی تو کیا کوئی عنوانِ خاص اختیار کیا یا ویسے ہی عام طور پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ آخر تاریخی حیثیت واقعہ کی کیا ہے؟ فاضل مضمون نگار نے اس مقام پر وعدہ کیا تھا کہ بیعتِ عشیرہ کے واقعہ پر بحثِ احادیث پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مگر تمام بحثِ احادیث میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا۔ گویا پی گئے۔ اگر ڈپٹی نذیر احمد مرحوم زندہ ہوتے تو اس موقع پر ضرور لکھ دیتے کہ "معلوم ہوا پانی مرتا ہے۔"

۴۔ "انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔"

(ترجمہ) تمہارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور عجز و انکسار سے زندگی گزارتے ہیں۔" "ولی" کا ترجمہ "رفیق" کیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی کے لیے کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے اور اُسے کسی کی ولایت میں آنا پڑے تو وہاں ولی کے کیا معنی ہوں گے؟

اب دوسرے پہلو کو دیکھیے۔ "وھم راکعون" کا ترجمہ فرمایا گیا ہے "اور عجز و انکسار سے زندگی گزارتے ہیں" اب میں اس کا ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ "واؤ" کو "عاطفہ" نہیں "حالیہ" قرار دیتا ہوں اور کہتا ہوں "وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، درانحالیکہ وہ رکوع میں ہوتے ہیں" کون سا قانونِ عربیت اس ترجمہ سے روک سکتا ہے۔ اس طرح اس آیت کے دو ترجمے ہو گئے۔ ایک وہ

جو صاحبِ مضمون نے کیا ہے، دوسرا یہ جو میرے قلم سے نکلا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ایک ایسا معیار ہو جس کی طرف دونوں رجوع کرکے فیصلہ کرسکیں۔ اگر کوئی معیار نہیں ہے تو پھر معاملہ یوں ہی مبہم کا مبہم رہے گا۔

اب میں از روئے مفہوم اس آیت کو دیکھنا چاہتا ہوں مفہوم اوّلین یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے ایک گروہ تو اولیاء کا ہے جس کا سلسلہ خود ذاتِ باری ہے۔ دوسری وہ جماعت ہے جو "کم" کی مخاطب ہے جن سے کہا گیا ہے کہ اللہ و رسولؐ اور ان صفات والے لوگ تمھارے ولی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر یہ حد مقرر ہوئی ہے، ان کا یقین کیے بغیر آیت تشنۂ مفہوم ہی رہے گی۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیے کہ "اولیاء" کا طبقہ الگ ہے اور "مولیٰ علیہم" کا طبقہ الگ اور طبقۂ اوّل میں لازماً کچھ ایسی صفات ہیں جو انھیں دوسرے طبقہ سے ممتاز کر رہی ہیں۔ ورنہ ایک جماعت کو ولی قرار دینا اور دوسری کو "مولیٰ علیہم" ایک بے معنی بات ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ طبقۂ ثانی میں وہ صفات نہیں ہیں جن کا طبقۂ اولیٰ حامل ہے۔

اب بحکمِ سلیم واجب ہے کہ "وجہ امتیاز" کی تلاش کی جائے اور وہ ایسی شے ہو کہ دوسروں میں نہ پائی جاسکے۔ دیکھیے "الذین اٰمنوا" سے کچھ بھید نہیں کھلتا۔ اس لیے کہ ایمان ایک شئے مشترک ہے جو کم و بیش ہر مخاطب میں موجود ہے۔ اسی طرح "یقیمون الصلوٰۃ" بھی کوئی روشنی نہیں ڈالتا، سب ہی نماز پڑھتے ہیں علیٰ ہذا "یؤتون الزکوٰۃ" ادائے زکواۃ سے بھی کوئی خصوصیت خاصہ ظاہر نہیں ہوتی۔

اس لیے صاحبِ مضمون کے ترجمہ کی بناء پر اس آیت کا کوئی مفہوم صحیح پیدا نہیں ہوتا اور نہ کوئی وجہ امتیاز معلوم ہوتی ہے۔

بر سبیلِ تنزل زیادہ سے زیادہ اگر کوئی مفہوم پیدا کریں تو یہی ہوگا کہ جن کا ایمان اعلیٰ درجہ ہے جو انتہائی خضوع و خشوع سے ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں جو برابر زکواۃ دیتے ہیں،

جو ہمیشہ خضوع وخشوع سے زندگی گزارتے ہیں، یہ لوگ ولی ہیں، ان لوگوں کے جن کا ایمان ادنیٰ درجہ کا ہے یا صرف زبانی ہے۔ لیکن مفہوم پھر بھی مبہم کا مبہم رہ جاتا ہے۔ بتایا جائے وہ بڑے ایمان دار کون ہیں جو کمزور ایمان والوں کے رفیق ہیں؟ پھر یہ بھی ہے کہ ایمان کی کمی وبیشی ایک امر باطنی ہے اسی طرح خضوع وخشوع فی الصلوٰۃ ان امور کا کون اندازہ لگائے؟ غرض اس مفہوم کی بنا پر بھی انسان کسی صحیح نقطہ تک نہیں پہنچ سکتا اور فاضل مضمون نگار نے جو ترجمہ پیش کیا ہے اس کی بنا پر آیت گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی ہے۔

برخلاف ازیں دوسرا ترجمہ "وہ زکواۃ دیتے ہیں، درانحالیکہ رکوع میں ہوتے ہیں" ایک نہایت صاف وصریح "وجہ امتیاز" ہے اور یہ شان امتیازی جہاں پائی جائیگی وہیں ولایت متحقق ہو جائے گی۔ اس بات کی پرواہ نہیں کہ یہ "امتیاز" کہاں پایا جاتا ہے؟ ہمیں اصرار نہیں کہ علیؑ ہی اس کے حامل ہیں، نہیں، ابوبکر میں ثابت ہو جائے فبہا، عمرؓ میں ثابت کر دیجیے، قبول۔ لیکن محض اس بنا پر کہ علیؑ میں یہ "شانِ امتیاز" پائی جاتی ہے مفہوم آیت کو بدلنے کی سعی کرنا دیانت کا کام نہیں ہے۔

اب میرا سوال یہ ہے کہ "ولی" کا ترجمہ "رفیق" کس بنا پر فرمایا گیا ہے۔ آیا "ولی" اور "رفیق" مترادف الفاظ ہیں؟ یا لفظ ولایت مشترک ہے۔ اگر مشترک ہے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص کرنے کے لیے قرینہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً لفظ "عین" کہ سورج کے معنی بھی دیتا ہے اور "چشمہ" کو بھی "عین" کہتے ہیں۔ "آنکھ" کے لیے بھی مستعمل ہے پس جب تک کوئی قرینہ نہ پایا جائے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا۔ اب بتایا جائے کہ اس آیت میں کون سا قرینہ تھا جس کی بنا پر "ولی" کے معنی "رفیق" کر لیے گئے۔

۵ "یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس"

(ترجمہ) اے رسولؐ وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دے جو تیرے رب کی جانب سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام، اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔"

اس آیت کے متعلق خلاصہ ارشاد ہے کہ مفہوم آیت بجائے خود مکمل ہے شانِ نزول دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

آئیے اس کا امتحان کریں مفہوم اولین کے لحاظ سے آیت میں جو پہلو نکلتے ہیں، قابلِ لحاظ ہیں۔

۱۔ "ما انزل الیک" "جو تیری طرف نازل کیا جا چکا" اس سے یہ مفہوم نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ نازل شدہ شے ایک ہے یا کئی ہیں۔ مثلاً زید عمرو سے کہتا ہے "افعل ما قلت لک" "وہ کر جو تجھ سے کہہ چکا ہوں" ضروری ہے کہ متکلم اور مخاطب کے ذہن میں تو وہ مفہوم موجود ہو، لیکن سننے والا یہ نہیں کہہ سکتا اور نہ حتماً کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک کام ہے یا کئی کام ہیں۔ پس "ما" کا ترجمہ جو "وہ چیزیں" کیا گیا کس دلیل سے؟ یہ ہے پہلے ہی قدم پر لغزش۔

۲۔ اس آیت میں ایک ایسی تاکیدی شان ہے جو تہدید کی حد تک پہنچ رہی ہے۔

۳۔ وعدۂ حفاظت بھی بتا رہا ہے کہ اس میں لوگوں کی طرف سے خوف بھی ہے۔

۴۔ ضروری بات ہے کہ وہ شے جس کی بابت اس شد و مد سے حکم تبلیغ ملا ہے، وہ پہلے نازل ہو چکی ہو اور رسولؐ اسے جانتا ہو، جیسا کہ مثال میں اشارہ کیا گیا۔

جب تک ان پہلوؤں کو روشنی میں نہ لایا جائے، کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مفہوم بجائے خود مکمل ہے۔ ہاں مکمل ہے مگر ان عقدوں کے کھل جانے کے بعد۔ بغیر ان پہلوؤں کو روشن کیے یہ کہتے ہوئے چل دینا کہ "مفہوم بجائے خود مکمل ہے" بحث تو نہ ہوئی دامن چھڑانا ہوا۔

یہی مشکلات ہیں جو انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ شانِ نزول کی طرف رجوع کرے اور شانِ نزول کو دیکھ کر جو مطالب پیدا ہوں انھیں پیش کرے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں قرآن سے استدلال نہ ہوگا بلکہ شانِ نزول یا حدیث سے استدلال رہ جائے گا۔ کیونکہ جس طرح صرف نحو معانی بیان کی قرآن فہمی کے لیے ضرورت ہے، اسی طرح شانِ نزول تاریخ حدیث کی بھی ضرورت ہے یہ سب قرآن فہمی کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بہ لحاظ علمِ معانی و بیان قرآن سے استدلال کرے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ شخص قرآن سے نہیں بلکہ معانی و بیان سے استدلال کر رہا ہے۔

بحث آیات ختم ہو رہی ہے اور اس اختتام پر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے اس بحث میں قطعاً کامیابی حاصل نہیں کی۔ سطحی سطحی باتوں سے دل بہلانا چاہا ہے جن سے صاحبِ فکر و نظر کے سامنے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ آیات کی بحث ختم ہوگئی اور مجھے یقین ہے کہ قارئینِ کرام کو اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صاحبِ مضمون نے جس تفصیلِ آیات کو غیر واقعی تاویل سمجھا ہے وہ تاویل ہے یا حقیقت۔ اس بحث میں میری جانب سے صرف اس قدر کوشش کی گئی ہے کہ جو مغالطۂ ذہنی مضمون نگار کو ہوا ہے اور مغالطۂ منطقی انھوں نے دینا چاہا ہے اس کی اصلاح ہو جائے۔ ورنہ ان آیات کے رموز و اسرار پر ابھی بحث و گفتگو کی بہت گنجائش ہے۔

فاضل مضمون نگار کے قلم سے تحریفِ قرآن کے متعلق شیعوں پر جو الزام عائد کیا گیا ہے اب میں اس کی تحقیق پر توجہ کرتا ہوں۔

ان کا قیاس ہے کہ شیعہ حضرات جب قرآن سے عقیدۂ خلافتِ آلہیہ ثابت نہ کر سکے تو تحریفِ قرآن کی آڑ پکڑ لی۔ اور شیعی مجتہدین نے اپنے متشکک مریدوں کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ سنیوں نے وہ آیات حذف کر دیں جن میں بالتصریح امامت کے

متعلق احکام مذکور تھے۔

لیکن فاضل مضمون نگار نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ عام طور پر شیعہ تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں (شکریہ) پھر جب شیعوں کی عمومی حالت معلوم ہو گئی تو تحریف قرآن کا ذکر نہ جانے کس قسم کی منطق ہے؟

طبعاً سوال ہوتا ہے کہ شیعوں میں تو روایات تحریف کی بنا پر شکک مزید [illegible] دی گئی لیکن کتب سنیہ میں جو ان کا طومار پایا جاتا ہے اس کا سبب کیا ہے؟ کبھی اس طرف توجہ فرمائی گئی ہے؟ ہاں میں عرض کرتا ہوں۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جامعین قرآن نے اس ترتیب کو باقی نہیں رکھا جو ہونی چاہیے تھی، پھر جن جن ترکیبوں سے قرآن جمع ہوا ہے وہ ترکیبیں بھی سامنے موجود ہیں عہد ثالث میں جو قرآن جلائے گئے وہ تاریخ کے ایک معمولی متعلم سے بھی مخفی نہیں ان کے جلانے کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ قرآن کی اس ترتیب کو پسند نہ کرتے تھے اور موجودہ ترتیب کے حامی تھے، پھر میں ارباب عقل سے پوچھتا ہوں کہ ایک آیت کہیں سے اٹھا کر کہیں رکھ دی جائے اور دوسری آیت اس کے مقام میں آ جائے کیا اسے "یحرفون الکلم عن مواضعہ" "وہ کلمات کو ان کے مقام سے تحریف کرتے ہیں" نہیں کہہ سکتے؟

اب یہ اعتراض باقی ہے کہ "عقیدہ خلافت الٰہیہ قرآن میں بالتصریح مذکور [illegible] نہیں سمجھ سکا کہ صراحت سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے یہ مراد ہے کہ علی کا نام [illegible] کے ساتھ مذکور نہیں ہوا لیکن ادنیٰ غور سے یہ معمہ حل ہو سکتا ہے کہ دعوت قرآن [illegible] عقل اور صاحب تفکر کے لیے ہے۔

[illegible] عبارت کے ساتھ ہوتا تو اسی طرح ہو سکتا تھا کہ "[illegible] کے وصی [illegible] ہے" لیکن اس کی کیا ضمانت کہ لوگ اس قول پر سکوت کرتے [illegible] سال [illegible]

تھا یہ کہنا کہ "علی" نام نہیں ہے بلکہ خلیفہ کی صفت ہے یعنی اے رسولؐ تیرے بعد تیرا خلیفہ بلند مرتبہ والا ہے۔

تعجب نہ کیجیے، حدیثِ مدینہ مشہور حدیث ہے۔ محدثین اہل سنت اس حدیث کو باب فضائل علوی میں نقل کرتے ہیں۔ مگر آج اس کے معنی نکالے جاتے ہیں کہ "میں شہرِ علم ہوں جس کا دروازہ بلند ہے"

اگر اسمِ علیؑ اس حیثیت سے درج قرآن ہوتا یقیناً یہی حشر ہوتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام ائمہ کے نام کھلم کھلا درج کیے جاتے، مثلاً "ثم الحسنؑ ثم الحسینؑ" اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ یہ قرآن ہے جس کا نام حکماء کی اصطلاح میں عقلِ اجمالی ہے اور صاحبانِ عقل وہ ہیں جو اجمال میں تفصیل کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

عام فہم اور سادہ زبان میں یوں سمجھنا چاہیے کہ قرآن کی بنیاد ایجاز و اختصار پر رکھی گئی ہے اور یہی اس کا حسن ہے اگر اس طرح نام درج کیے جاتے تو اچھا خاصہ شجرہ بن جاتا۔ اس ایجاز کی مثالیں قرآن میں کافی موجود ہیں۔ مثلاً خدا نے اصطفائے آلِ ابراہیم کا ذکر کیا ہے اس میں مختلف صورتیں ہوتی ہیں:۔

۱۔ تنہا بنو اسحٰق مراد ہیں؛ اور پھر ان میں بھی کل یا البعض؟

۲۔ فقط بنو اسمٰعیل مراد ہیں؟ اور وہ بھی کُلاً یا بعضاً؟

۳۔ دونوں مراد ہیں؟ اور پھر بحیثیت کل یا بحیثیت بعض۔

پس ان سوالات کا سمجھنا اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہمارا کام ہے۔ اسی طرح قرآن نے بیان کر دیا، "اہل البیت" اب یہ معلوم کرنا ہمارا فریضہ ہے کہ اہل بیت مطہرین کون ہیں؟

الغرض تصریح و صراحت کے متعلق جو شکوک پیش کیے جاتے ہیں وہ اہلِ عقل کے لیے قابلِ توجہ نہیں ہیں آخر میں ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کو

ختم کیا جاتا ہے یہ معلوم ہے کہ حضرات اہل سنت نہایت اطمینان سے فتویٰ دیتے ہیں کہ شیعوں کے پاس خلافتِ الٰہیہ کے لیے کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ شیعوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے لیکن ان حضرات نے کبھی خلافتِ اجماعی و شوریٰ پر بھی نظر ڈالی ہے کہ یہ طریقۂ خلافت اصولِ قرآنی کے مطابق ہے یا نہیں۔

اہل سنت کے پاس اس بارے میں ایک آیت ہے جس سے وہ تمسک کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی:

"وامرھم شوریٰ بینھم"

مشورہ کے بہتر ہونے میں کسی عاقل کو کلام نہیں۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن میں انسان کو مشورہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں مشورہ سے باہمی ارتباط اور تعلقات بھی محکم ہوتے ہیں۔ رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنھم واستغفر لھم وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین۔" (آل عمران)

(ترجمہ) "اس رحمت کے سبب سے جو تیرا حصہ ہے تو ان کے ساتھ نرمی سے پیش آ، اور اگر تو بدخو اور سنگدل ہوتا تو یہ تیرے پاس سے متفرق ہو جاتے۔ پس ان سے درگزر کر ان کے لیے استغفار کر اور ان سے مشورہ کر اور جب تو عزم کر چکا تو اللہ پر توکل کر۔ بالتحقیق کہ اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ تالیفِ قلوب کے لیے دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنا ان کے لیے استغفار کرنا اور ان سے مشورہ کرنا نہایت مفید چیزیں ہیں۔ علی مرتضیٰ کا ارشاد ہے۔ "الاستشارۃ عین الھدایۃ وقد خاطر من استبد برایہ" مشورہ لینا عین ہدایت ہے اور اپنی رائے پر بھروسہ کرنے والا خطرہ میں ہے۔

ان امور کو مدِنظر رکھتے ہوئے آیت کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ جب کسی کو کوئی اہم کام درپیش ہو تو دوسروں سے مشورہ کرے کہ عین فلاح یہی ہے۔ میں اس مقام پر صاحبانِ عقلِ سلیم سے پوچھتا ہوں کہ اس آیت سے کیونکر یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ چند انسان اغراضِ خاص کے ماتحت ایک جگہ مل کر بیٹھیں اور باہر آ کر کہہ دیں کہ ہم نے فلاں شخص کو تمہارا حاکم بنا دیا۔

اس تمام بحث کے علاوہ لفظ "امرہم" واقع ہوا ہے یعنی "ان کا امر" اور پہلی بحث تو یہی ہے کہ خلافتِ الٰہیہ "امر باللہ" ہے یا "امر الناس"۔ اس بحث کو طے کرنے کے بعد اس مسئلہ کو آیت کے زیرِ سایہ لانے کی کوشش ہو سکتی ہے ورنہ بیکار ہے۔

خیالات کی نیرنگیاں ہر رنگ میں حیرت افزا ہیں۔ خلافتِ ثانیہ میں تو مشورہ کو دخل نہیں دیا گیا۔ صرف جانے والے کا حکم تھا دوسرے لفظوں میں ولی عہدی۔ پھر یہاں کیا ہوگا۔ الغرض آیۂ شوریٰ حضرات اہلِ سنت کے مان لیے ہوئے معنی کو محیط نہیں ہے اور نہ خلافت کی تنصیب کے لیے اسے استدلالاً پیش کیا جا سکتا ہے۔

خلفائے راشدین

یہ وہ بحث ہے جسے لکھ کر بخیالِ خود دنیائے تشیع پر وہ بار رکھ دیا گیا ہے کہ گویا قیامت تک سبکدوشی نہیں ہو سکتی۔ مگر پہلا سوال اس مسئلہ میں یہ ہے کہ "خلفاء" کے ساتھ "راشدین" کی نسبت کہاں سے آئی؟ خدا سے؟ رسولؐ سے؟ یا خود ساختہ؟

اس لفظ پر ایراد کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ خلافت کے متعلق اسلام میں دو ہی نظریے پائے جاتے ہیں۔ یعنی (۱) خلافت من اللہ اور (۲) خلافت من الناس۔ ان میں پہلا عقیدہ تو گویا ہے ہی نہیں۔ لامحالہ دوسرا نظریہ پسندیدہ قرار پائے گا۔ اب اگر کوئی شخص پہلے عقیدہ کو چھوڑ دے جو بخیال حضرات موہوم ہے تو دوسرے موہوم میں تو مبتلا نہیں ہوگا۔ وہ صریحاً دیکھے گا کہ جتنے سلاطین مع خلفاء اسلام میں گزرے ہیں۔ وہ

سب انھیں اصول کے تحت میں ہیں جو تمام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا کسی کو خلیفہ کہنا اور کسی کو سلطان انتراق بے معنی ہے۔ بہر طرہ یہ کہ کچھ لوگوں کو **راشدین** سے ملقب کرنا اور کچھ لوگوں کو غیر راشدین قرار دینا بالکل بے **ربط** ہے۔ اگر خلفاء کہنے میں کوئی خاص بات ہے تو سب کو خلیفہ کہیے اور راشدین کہنے کو جی چاہتا ہے تو سب کو راشدین کہیے "ایک بام دو ہوا" ایک قسم کا تمسخر ہے

اب رہا یہ امر کہ کسی کی نیکیاں زیادہ ہیں کسی کی کم ہیں۔ ہوا کریں ہمیں کیا؟ اپنی اپنی گور اور اپنا اپنا عمل۔

میں اس کی مزید توضیح کیے دیتا ہوں کہ عنوان کے تحت ہیں جن حضرات کی سیرت نگاری کی جاتی ہے مطلب صرف یہی ہے نا؟ کہ اس تجلی سے اعتقاد آبائی کی آنکھیں میں چکا چوند پیدا کی جائے اسے آزادی خیال نہیں کہتے۔ استدلال کا ایک جھونکا اس ساری تعمیر کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک سکتا ہے۔ ان حضرات کے محاسن لاکھ گنوائے جائیں بہرحال وہ منصوص من اللہ تو نہیں ہیں انسان ہی کے مقرر کردہ ہیں اس لیے لوگوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس مقام میں ایک شیعہ کے نزدیک علیؑ کی بھی کوئی خصوصیت نہیں۔ اس لیے کہ شیعہ جو حضرت علیؑ کو مان رہے ہیں وہ صرف اس لیے کہ منصوص من اللہ ہیں اور جب یہ عقیدہ ہی اڑ گیا تو پھر علیؑ بھی یکے از دیگراں ہیں۔ وہ کسی جماعت میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ یہ ان کا ایک ذاتی فعل ہوگا جو قطعاً کسی کے لیے حجت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ "راشدین" کا ضمیمہ لفظ "خلفاء" کے ساتھ محض ایک خوش اعتقادی ہے۔

اب میں اس طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ حضرات خلفاء کے ساتھ علی مرتضیٰ کا سلوک ایک شیعہ کی نگاہ میں کیا معنی رکھتا ہے۔

واضح ہو کہ شیعہ خلافتِ آلیہ کے جس عقیدہ کو دل میں جگہ دیے ہوئے ہیں۔ اس

عقیدہ کی رو سے صرف حضرت علیؑ ہی امام نہیں ہیں بلکہ دوسرے حضرات ائمہ بھی ہیں اور اس عقیدہ کی بنا پر ان میں اور حضرت علی میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ ایک دوسرے کے قول و فعل کے شارح ہیں۔ ان دوسرے بزرگواروں نے اپنے زمانہ کی حکومتوں کے مقابل صلح و آشتی ہی کو اپنا طریقہ قرار دیا۔ لیکن ان بزرگواروں کے اس صلح و آشتی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان حکومتوں کو شیعوں نے کبھی حکومتِ حقہ تسلیم نہیں کیا۔ اور نہ خود ان بزرگواروں کا کوئی ایسا ارشاد یا ہدایت ہے بلکہ اس کے خلاف ان کے اقوال موجود ہیں۔ ائمہ اہل بیت کا یہ عمل ہمارے نزدیک علی مرتضیٰؑ کے فعل اور عمل کا شارح ہے جس طرح وقتی مصلحتوں کی بنا پر علی مرتضیٰؑ نے حکومتِ وقت کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ گزاری اسی طرح دیگر ائمہ نے بھی۔ پس جس طرح ائمہ کا یہ فعل حکومتِ وقت کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے اسی طرح علی مرتضیٰؑ کی مصالحت سے عند الشیعہ حقانیتِ حکومتِ وقت پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

شیعہ اگر خلافت الٰہیہ کے نظریہ کا حامی ہے تو اس کا یہی اصولی جواب ہے جو عرض کیا گیا۔ پھر کیا حق ہے دنیا کو کسی کے معتقدات کو نہ سمجھتے ہوئے اس پر وہ بار رکھے جس کا وہ اصولاً منکر ہے اور اگر شیعہ اس عقیدہ سے دست بردار ہو کر اس دائرہ سے نکل رہا ہے تو پھر اس کی آزادیٔ خیال کے سامنے امتیازات کی کوئی دیوار حائل نہ ہونی چاہیے۔ کس کے راشدین اور کس کے غیر راشدین۔ ع

خوش نباشد جامہ نیمے اطلس و نیمے پلاس !

اس بحث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ”اگر میں شیعہ حضرات کی مستند احادیث سے اپنے قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو غالباً میں اپنی ذمہ داری سے باحسن الوجوہ عہدہ برآ ہو جاؤں گا۔“

خواب نہایت اچھا ہے۔ تعبیر ناظرین کے سامنے آجائے گی۔ میرے کہنے کی ضرورت نہیں اور یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ کسی سطحی مناظر کی تصنیف پر اعتماد کر کے حوالے اور عبارتیں

لکھ دی گئی ہیں۔ اصل کتاب کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی۔ کتابوں کے نام تک صحیح نہیں ہیں۔ مثلاً لکھا گیا ہے، شیعوں کی مشہور کتاب "حدیث کلینی" میں عرض کروں گا کہ شیعوں کے ہاں اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ البتہ ایک کتاب حدیث "کافی" ہے اس کے مصنف کا نام ہے محمد بن یعقوب کلینی (کلین کے رہنے والے) ایسی دلچسپیاں بہت ہیں، ناظرین عنقریب ملاحظہ کریں گے۔

ہاں اس عنوان "خلفائے راشدین کے متعلق میں مجملاً کہہ آیا ہوں لیکن ناانصافی ہوگی اگر مندرجہ ذیل خیال کے متعلق معروضہ نہ کیا جائے"۔

> "اگر خلفائے ثلثہ کا زمانہ واقعی غاصبانہ دورِ خلافت ہوتا تو حضرت علیؑ جیسا جلیل القدر مسلمان اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں بسر نہ کرتا، اور پوری طاقت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کر کے خدا و رسول کے منشا کو پورا کرنے کی کوشش کرتا جس کے بعد یا تو وہ اعلائے کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر مسندِ خلافت پر متمکن ہو جاتے اور یا حسینؑ کی طرح میدانِ کارزار میں تڑپتے نظر آتے۔"

صلح و آشتی کی پالیسی کے متعلق تو میں کہہ چکا ہوں اور اس کے متعلق شیعی نمائندہ کا جواب جو درج کیا گیا ہے معقولیت پر مبنی ہے۔ ہاں یہ آخری سطور پر رائے زنی باقی ہے۔

یہ خیال جو آخر میں ظاہر کیا گیا ہے کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ بالفاظِ مختلفہ اسے ہمیشہ دہرایا گیا ہے اور غالباً جب تک دنیا باقی ہے دہرایا ہی جائیگا۔

بہت خوب! علیؑ قتل ہو جاتے، قتل ہو جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، مگر نتیجہ؟ شہادت حسینؑ سے جو نتیجہ مترتب ہوا وہ علیؑ کے قتل پر ہرگز نہیں ہو سکتا تھا، ہر فعل کی تاثیر میں زمانہ کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قتلِ علیؑ کے معنی یہ تھے کہ حسینؑ بھی قتل ہو جاتے بلکہ تمام عمائدِ بنی ہاشم موت کے گھاٹ اترتے۔ نتیجہ کیا ہوتا؟ صاف ظاہر ہے

کہ حکومت بے کھٹکے اغیار کے ہاتھوں میں کھیلتی اور بہی خواہانِ حکومت کی طرف سے بیرونی دنیا کے لیے جو تاریخی مواد پیش کیا جاتا ظاہر ہے وہ کیسا ہوتا۔

"تاریخی واقعہ ہے کہ مالک بن نویرہ نے زکواۃ بھیجنے میں عذر کیا کہ رسول اللہؐ نے حکومتِ وقت کے لیے کوئی وصیت نہیں کی بلکہ وصیت کسی اور کے لیے ہے۔ فوراً فوج بھیجی گئی۔ اس قبیلہ پر کامل بربریت کے ساتھ حملہ کیا گیا۔ بالآخر اس قبیلہ کا نام "مرتدین" کی فہرست میں لکھ دیا گیا۔ کیا قتل ہو جانے کے بعد علیؑ اور دیگر بنو ہاشم کا نام اس فہرست میں نہ آتا؟ اور کیوں نہ آتا؟ البتہ موقع علیؑ نے نہیں دیا۔

علاوہ ازیں علیؑ کے قتل ہو جانے پر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ بنو تیم اور بنو عدی اس حکومت پر رہ سکیں۔ بنو امیہ موقع کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوسفیان زندہ تھا۔ بنو ہاشم ہی تھے جن کو وہ اپنی ٹکر کا سمجھتا تھا۔ ان کے بعد میدان صاف تھا۔ باقی بنو تیم اور بنو عدی اس کی ایک دھمکی سے خانہ نشین ہو جاتے ابتدا سے ہی بنو امیہ سر پر سلطنت پر آتے اور وہیں سے

ولعبت هاشم بالملک فلا   خبر جاء ولا وحی نزل

کے ترانے بلند ہو جاتے۔

"تاریخ بتاتی ہے کہ جس وقت حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو ابوسفیان نے علیؑ سے آ کر کہا کہ اٹھو۔ مدینہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا۔ اگر علیؑ اس کے دم میں آ جاتے تو عین میدانِ کارزار میں مخالفین سے مل کر بنو ہاشم کا خاتمہ کرا دیتے اور ان کے بعد پھر دوسرے نمبر ہی کیا۔ لیکن علیؑ اس راز سے واقف تھے، اس نے جو نقشہ ڈالا تھا اسے سمجھتے تھے۔ لہٰذا جھڑک دیا اور صاف کہا کہ تو منافق ہے۔

یہ ہیں وہ اندرونی ریشہ دوانیاں جن پر نظر کرتے ہوئے اہلِ بصیرت نے ہمیشہ سے کہا ہے کہ اس وقت مدینہ میں جنگ داخلی کا واقع ہو جانا نفسِ اسلام کے

لیے مُضر تھا، اور ایسا مُضر کہ ابتدائے بعثت میں جو نتیجہ حضرت پیغمبرؐ کی شہادت سے نکلتا وہی ابتدائے خلافت میں حضرت علیؑ کے قتل ہو جانے سے برآمد ہوتا۔

اب اس کے علاوہ فتحیاب ہو کر تختِ سلطنت پر متمکن ہو جانے میں علیؑ کی حیثیت بادی النظر میں اسی بادشاہ کی سی ہوتی جو اپنے مخالفین کو تہ تیغ کر کے سریرِ سلطنت پر قدم رکھا کرتا ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا ہے "فصبرت علیٰ طول المدۃ وشدۃ المحنۃ" اس طویل مدت اور رنج والم کی شدت پر میں نے صبر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اغراضِ ذاتی کا قدم اگر درمیان میں ہوتا تو شاید علیؑ بھی یہی کر گزرتے لیکن وہ اس سطح سے بلند ہیں۔

ایں زمیں را آسمانے دیگر است

اب میں ان منقولات پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو فاضل مضمون نگار کو خدا جانے کتنی زحمت سے دستیاب ہوئے ہیں:۔

۱۔ ایک خط کا مضمون رقم کیا گیا جو حضرت علیؑ نے حاکمِ شام کو جنگِ صفین کے دوران میں لکھا ہے۔ اس میں حضرات شیخین کی تمجید کی گئی ہے۔

"کتاب الفتوح" "ابن عاصم کوفی" اور "شرح نہج البلاغہ" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس مقام پر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ "ابن عاصم" میرے خیال میں صحیح نہیں بلکہ صحیح لفظ "ابن اعثم" ہے۔ لیکن وہ "ابن عاصم" ہو یا "ابن اعثم" اس کو شیعہ ظاہر کرنا ایک دلچسپ تحقیق کی ابتدا کرنا ہے۔

"شرح نہج البلاغہ کا حوالہ بھی مشکوک ہے۔ نہج البلاغہ کی شرحیں کئی ہیں فارسی بھی عربی بھی، علیٰ ہذا شارح شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی۔ اگر بالفرض شیعہ کی شرح ہو تو بھی اس پر حجت قائم نہیں ہو سکتی۔

حضرت امیرؑ کا وہ خط جسے "محاسن کتب" سے تعبیر کرتے ہیں خود نہج البلاغہ میں

موجود ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کی تحریر کا کیا مضمون ہوگا۔ اس کے چند فقرات درج کر دیتا ہوں:۔

"وزعمت ان افضل الناس فی الاسلام فلان وفلان امرٌ ان تم اعتزلک کلہ وان نقص لم یلحقک ثلمۃ"

ارباب نظر جانتے ہیں کہ امیر شام نے اپنے دعوے کی بنیاد خون عثمان پر رکھی تھی، اور یہاں عرب اور خصوصاً شام میں اس دعویٰ کی حقانیت کے لیے کافی پروپگنڈا کیا گیا تھا یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عثمان حضرات شیخین ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ علیؑ کے ہاتھ کی ہی لکھی ہوئی ایسی تحریر مل جائے جسے مخالفت شیخین پر محمول کیا جا سکے اور دنیا کو بتایا جا سکے کہ علیؑ اس خلافت کے ابتدا ہی سے مخالف ہیں اور وہ شیخین کو اپنے مکتوبات میں برا کہہ رہے ہیں ان کے وقت میں وہ کچھ نہ کر سکے لیکن عثمان کے وقت میں انھیں موقع مل گیا اور چونکہ عثمان شیخین کے قائم مقام تھے اور سیرت شیخین پر عمل کرنا ان کا شعار تھا لہٰذا انھیں قتل کیا اور وہ اس خون میں قطعاً شریک ہیں۔ مگر علیؑ کی طرف سے جو جواب ملتا تھا وہ ایسا ہوتا تھا کہ سوائے مایوسی کچھ اس کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ چنانچہ اس خط میں فرماتے ہیں:۔

"وزعمت انی لکل الخلفاء حسدت وعلی کلھم بغیت ان یکن ذلک کذلک فلیس الجنایۃ علیک فیکون العذر الیک"

"تیرا یہ گمان ہے کہ میں نے تمام خلفاء سے حسد کیا اور سب پر بغاوت کی۔ اگر یہ معاملہ ایسا ہی ہے تو تیری تو کوئی خطا نہیں کی گئی کہ تیرے سامنے اس کا عذر کرنے کی ضرورت ہو (تجھے کوئی حق مداخلت حاصل نہیں)"

اس کے بعد ایک طعن اور بھی تیز ہے اور اس کا جواب بھی مرقوم ہے۔ اسی سے علیؑ کی روحانی عظمت ان کے مخالفین کی ذہنی پستی معلوم ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"تو نے کہا ہے کہ میں بیعت کے لیے اس طرح لایا گیا جیسے اونٹ کو نکیل سے کھینچتے ہوئے لاتے ہیں یہاں تک کہ میں بیعت کروں، خدا کی قسم تو نے میری مذمت کا ارادہ کیا، مگر میری مدح کر گیا، تو نے مجھے فضیحت کرنا چاہا مگر خود رسوا ہو گیا، اس لیے کہ مظلوم ہونے میں مسلم کا کوئی نقصان نہیں جب تک وہ اپنے دین میں شک کرنے والا اور اپنے یقین کو شک سے نہ بدلنے والا ہو۔"

اس خطبہ کے الفاظ سے حقیقت امر واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ علیؑ کی بیعت کس طرح حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ معاویہ اس پر طعن کرتا ہے علیؑ اس واقعہ کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کی وہ توجیہ کرتے ہیں جو علیؑ ہی سے مخصوص ہے۔ اب غیر جانبدارانہ فیصلہ اہل انصاف کے ہاتھ ہے۔

۲۔ انواق الحمایة۔ یحییٰ بن حمزہ شیعہ زیدی کی تصانیف سے بتائی گئی ہے اور اس کی روایت سے جس کے راوی سوید بن غفلہ ہیں اور جس سے شیخین کی کامل مدح ظاہر ہوتی ہے استدلال کیا گیا ہے۔ یہ انواق الحمایة مجھے مجاج السالکین کی بہن معلوم ہوتی ہے۔ اگر بالفرض یہ کتاب وجود خارجی بھی رکھتی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں لیکن جب تک صحیح عبارت نہ دیکھ لی جائے اس پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے خود زید بن علیؑ کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ جب اموی فوجوں سے مقابلہ ہوا تو عین کارزار میں ایک شخص نے سوال کیا کہ شیخین کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ اس سوال کا مطلب ظاہر ہے کہ اس موقع پر اس کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے۔ چنانچہ جناب زید نے ٹال دیا۔ اور کہا کہ اس کا جواب پھر دیا جائے گا۔ لڑائی شروع ہوئی عین جنگ میں ایک تیر زید کی پیشانی پر لگا وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ کچھ لوگ گرد جمع ہو گئے پوچھا وہ سائل کہاں ہے، وہ بھی آ گیا۔ اس سے کہا کہ دیکھ انھیں کے سبب سے مجھے یہ حالت دیکھنی پڑی۔

غرض علیؑ یا بنو علیؑ سے یہ توقع رکھنا کہ شیخین کی کوئی خاص عظمت ان کے دل میں ہو ایک غلط توقع ہے۔

۳- تفسیر قمی کے حوالے سے سورہ توبہ کی آیۃ "ثانی اثنین" کی تفسیر میں حضرت صادق سے ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ روایت موجود ہے لیکن اس سے فائدہ کیا ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکر کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور انھوں نے جعفر اور ان کے اصحاب کو سمندر میں دیکھ لیا اور عرض کی یا رسول اللہؐ آپ صدیق ہیں۔

اب کوئی بتائے کہ اس میں شیعوں کے خلاف کیا بات نکلی۔ یہ معجزہ اگر ہے تو رسول اللہ کا ہے شیعہ کب اس امر سے منکر ہیں کہ رسول اللہؐ کے ہمراہ حضرت ابوبکر غار میں نہ تھے یقیناً تھے مگر محزون و ملول تھے۔ ممکن ہے حضرت نے اس طرح ان کو سکون دینا چاہا ہو۔

دوسری روایت اسی واقعہ کے متعلق جو تفاسیر شیعہ میں مروی ہے میں اسے نقل نہیں کرتا۔ اس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے اس واقعہ سے کیا اثر لیا۔

اہل انصاف صرف اتنا دیکھ لیں کہ اگر ایسی ہی کوئی روایت علیؑ کا استحقاق جتلانے کے لیے شیعوں کی طرف سے پیش ہوتی تو ان کو "سفیہ" بنانے کے لیے کوئی لغت باقی نہ رکھا جاتا۔

۴- سورۂ نور کی آیت "انّ الارض یرثھا عبادی الصالحین" کے متعلق ایک مضمون تفسیر خلاصۃ المنہج سے نقل ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ وعدہ خلفاء کے عہد میں پورا ہوا۔

اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ نور میں نہیں بلکہ سورۂ انبیاء میں ہے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ "صالحین" نہیں ہے بلکہ "صالحون" ہے۔ یہ صفت ہے عباد کی اور عباد از روئے قانون عربیت مقام رفع میں ہے۔

ان غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اور بغیر اصل کتاب کی طرف رجوع کیے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ تفسیرِ عامہ میں یہ مضمون موجود ہے اور حسب عادت اہلِ علم مفسر نے اس قول کو بھی نقل کیا ہوگا۔ باقی تفسیرِ خاصہ میں اس آیت کے متعلق جو کچھ ائمہ سے نقل ہوا ہے اس سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔

۵-۶ ۔ ان دو نمبروں میں کشف الغمہ کے حوالہ سے دو عجیب و غریب روایتیں نقل ہوئی ہیں۔

۱۔ علیؑ کا قول ہے کہ جو ابوبکر کو صدیق نہ کہے خدا اس کی عاقبت خراب کرے۔

۲۔ حضرت ابوبکر کی وفات پر حضرت علیؑ بہت روئے اور کہا "آج نبوت کی خلافت منقطع ہوگئی۔"

اہلِ علم سے گذارش ہے کہ کتاب "کشف الغمہ" موجود ہے شیعی عالم کی تالیف ہے کتاب کا پورا نام ہے "کشف الغمہ فی مناقب الائمہ" نام ہی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ موضوعِ کتاب کیا ہے؛ حضرت رسول اللہؐ سے لے کر امام دوازدہم تک کے مناقب و فضائل بیان ہوئے ہیں۔ التزام یہ کیا ہے کہ ہر دو فریق کی روایات پر بہ سلسلۂ مناقب و **فضائل درج کی جائیں۔**

اہلِ عقل خود انصاف فرمائیں کہ مؤلف کتاب ہر دو روایات مندرجہ بالا کو درج کتاب کر کے اپنے موضوع کو کون سی قوت پہنچا سکتا تھا مگر پھر بھی میں نے حالات حضرت امیرؑ غور سے پڑھے اور افسوس ہے کہ مجھے ان دونوں روایتوں کا کہیں اشارہ بھی نہ ملا۔ اس کے برعکس مؤلف کتاب کسی اور شے کو درج کر رہا ہے۔ جو قابلِ ملاحظہ ہے:-

"فی ذکر الصدیقین، من مناقب ابن المغازلی عن ابن عباس"

اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ تحت آیت "السابقون السابقون" ابن عباس سے مروی ہے کہ یوشع بن نون نے موسیٰ کی طرف سبقت کی اور صاحب "آل یٰسین" نے عیسیٰ کی طرف اور علی بن ابی طالبؑ نے محمد بن عبداللہ کی طرف اور وہ ان سے افضل ہے۔

دوسری روایت مسند امام احمد بن حنبل سے نقل کی ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے خود علیؑ کی زبان سے سنا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس کے رسولؐ کا بھائی ہوں اور میں صدیقِ اکبر ہوں اور میرے سوا جو کوئی بھی اس کا قائل ہو وہ مفتری و کاذب ہے۔ میں نے تمام لوگوں سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔

یہی مضمون صدلقیت ابولیلی سے نقل ہوا ہے۔ اس کے بعد کتاب شیعہ بصائر الدرجات سے ایک حدیث اس بارے میں نقل ہوئی ہے اور یہ مضمون دیگر کتبِ شیعہ میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ خود مؤلف کتاب نے بحث القاب میں حضرت علیؑ کا لقب صدیقِ اکبر تحریر کیا ہے۔ اب بتایا جائے وہ حدیث کس گوشہ میں چھپی ہوئی ہے جس سے استدلال فرمایا گیا ہے اور یہ حدیث ختم خلافت نبوت تو اور بھی مزیدار ہے

۷ "فصول امامیہ" سے ایک حدیث حضرت باقرؑ سے درج کی گئی ہے۔ روایت کا سلسلہ کیا ہے؟ خدا ہی جانے۔

لیکن اس نام کی کوئی کتاب شیعی تصنیفات میں نہیں ہے مجھے حیرت تھی کہ یہ فصول امامیہ کون سی کتاب ہے اور کس فن میں ہے۔ کم از کم میرے علم میں تو نہیں لیکن ظاہر ہے کہ میرا محدود علم حجت نہیں ہے۔ لہٰذا ایک عراقی بزرگوار سے رجوع کی گئی جو ایک وسیع نظر کے مالک ہیں۔ انھوں نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھے۔ آخر سوچتے سوچتے خیال ہوا کہ عجب نہیں "فصول المہمہ" مراد ہو جو ابن صباغ المالکی کی تالیف ہے اور چونکہ یہ کتاب مناقب ائمہ اہل بیتؑ میں ہے، اس کے مؤلف کو شیعہ ظاہر کر دینے کے لیے بہت کافی ہے۔ اسی شبہ پر "فصول المہمہ فی معرفۃ الائمہ" کو دیکھا گیا حضرت باقرؑ کے حالات میں تلاش کی گئی کہ یہ حدیث یا روایت جو کچھ بھی ہے وہیں ملنی چاہیے۔ کئی گھنٹے خراب کیے اور نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اس قسم کے غلط حوالوں کا مطلب کیا ہے؟ تحقیقِ حق؟ یا مخاطب کو پریشان کرنا، مذہب کی حمایت جب ایسے حیلہ حوالوں پر منحصر رہ جائے تو یہ وقت اس

مذہب کے لیے نہایت بیکسی کا وقت ہوتا ہے۔

یہ تو حوالہ کی حالت ہے، اب رہی حدیث، اس کے متعلق چند الفاظ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

فاضل مضمون نگار نے احادیث کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی ہے:-

"احادیث میں اتنا اختلاف ہے کہ سعی و کوشش کے تمام مراحل طے کرنے کے باوجود کسی شخص کو اس ذریعہ سے مطمئن کر دینا محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے۔"

یہ گویا عذر فرمایا گیا ہے اس امر کا کہ شیعہ متکلمین جو احادیث کتب اہل سنت سے پیش کرتے ہیں وہ قابلِ استناد نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہی حق شیعوں کو بھی حاصل ہے یا نہیں اور نہیں تو کیوں؟ اگر شیعہ استدلال کریں تو ہر مشہور کتاب، ہر معقول راوی ناقابلِ اعتبار۔ اور اگر حضرات اہل سنت استدلال کریں تو شیعوں کا فرض ہے کہ مجہول روایت اور ہر نامعلوم کتاب کو مستند تسلیم کر لیں۔ ایں چہ بوالعجبی است۔

اب میں دیکھتا ہوں نفس مضمونِ حدیث کو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے ثلثہ کے بارے میں ان لوگوں کو خوض کرنے سے منع کیا گیا۔

معلوم ہے کہ حضرت باقر ؑ کا زمانہ بنو امیہ کے شباب کا زمانہ ہے۔ اور بنو امیہ کی نگاہیں اہل بیت کی طرف کیسی تھیں۔ اس کا جواب تاریخ دے سکتی ہے اور آپ خود بھی واقف ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بنو امیہ کی خلافت کی بنیادیں خلافتِ شیخین پر قائم ہوئی تھیں۔ اور حضرات ثلثہ یا ان کی حکومتوں پر تنقید کرنا، حکومتِ وقت کو برا کہنا تھا، ایسے وقت میں ان عوام کو جو گذرگاہ پر بیٹھ کر یہ تذکرے کرتے تھے اگر حضرت نے سختی کے ساتھ روکا تو اس میں تعجب کیا ہے؟

حضرت باقر علیہ السلام کی محتاط زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ جابر ابن

یزید کو ایک کتاب دی جاتی ہے کہ اسے حفظ کرو، لیکن جب تک بنو امیہ کی حکومت ہے اس کتاب کا ایک لفظ ظاہر نہ کرو۔[1]

اگر جناب باقرؑ کے ان اشاروں پر جو بہ نظر مصلحت تھے آپ استدلال کر رہے ہیں تو حضرتؑ کے دوسرے ارشادات پر بھی آپ کو نظر فرمانی چاہیئے۔

۸۔ ہاں نہج البلاغہ میں یہ خطبہ مذکور ہے۔ حضرت امیرؑ نے جناب خلیفۂ دوئم کو میدان میں جانے سے روکا ہے۔ بہتر ہو کہ مناظرین اہل سنت، اس خطبہ کو درمیان میں لانے سے اجتناب فرمائیں۔ کیونکہ اس صورت میں سب سے پہلے حضرت خلیفۂ دوئم کی مہارت جنگ پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی یہاں صرف اس قدر وضاحت کافی ہے کہ علیؑ کے زمانہ میں جتنی لڑائیاں ہوئیں علیؑ بہ نفس نفیس ان میں شریک تھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ غزوات میں خود رسول اللہؐ شریک ہوتے تھے۔ گویا غزوات میں خود شریک ہونا سنت پیغمبرؐ ہے۔ پھر حضرت خلیفۂ دوئم کو اس سنت رسولؐ سے کیوں روکا گیا؟ بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ کا یا علی مرتضیٰؑ کا لشکر کے ساتھ ہونا ہر جہت سے مفید تھا، اور حضرت ممدوح کی ہمراہی جنگی نقطۂ نگاہ سے لشکر کے لیے مضر تھی اور علیؑ جانتے تھے کہ اس حضرت کا اثر اسلام کی عمومی حالت پر اچھا نہ پڑے گا۔ لہٰذا تالیف قلب کے ساتھ روک دیا۔

۹۔ "جلاء العیون" کے باب وصایا سے حضرت علیؑ کی وصیت نقل کی گئی ہے:۔

---

[1] شیعہ مسئلہ تقیہ کو مانتے ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے طنزاً حاشیہ پر اشارہ بھی کیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ "دل میں بُت، زبان پر خدا" اسے نفاق کہتے ہیں، اور "دل میں خدا، زبان پر بُت" تقیہ ہے وہ بھی عندالضرورت۔ پڑھیے سورۂ نحل کی یہ آیت من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان۔

"اصحابِ رسولؐ کی رعایت کرو کہ انھوں نے خدا کے دین میں کوئی نئی بات جاری نہیں کی اور نہ بدعتی کو اپنے پاس آنے دیا۔"

یہ حوالہ صحیح ہے مگر بغیر کتاب دیکھے ہوئے نقل ہوا ہے۔ میں عین عبارت نقل کرتا ہوں :۔

"از خدا بترسید درباب اصحاب پیغمبرؐ خود و رعایت نمائید آنہارا کہ دین خدا بدعتے نہ کردہ اند و صاحب بدعتے را پناہ نہ دادہ اند بدرستیکہ حضرت پیغمبر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم وصیت فرمودہ درحق ایں گردہ از صحابہ خود و لعنت کرد بر کسے کہ بدعتے کند از صحابہ و غیر صحابہ کسے را کہ صاحب بدعتی را پناہ دہد و یاری کند"

ترجمہ۔ "اپنے پیغمبرؐ کے ان اصحاب کے بارے میں خدا سے ڈرو کہ جنھوں نے دینِ خدا میں کوئی بدعت نہیں کی اور صاحبِ بدعت کو پناہ نہیں دی۔ بدرستیکہ حضرت رسولؐ نے اپنے اصحاب کے اس گردہ کے بارے میں وصیت کی ہے اور لعنت کی ہے اس شخص پر جو بدعت کرے وہ صحابہ سے ہو یا غیر صحابہ سے اور اس پر جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اسکی مدد کرے۔"

شکر ہے کہ ابھی ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ وہ دیکھیں کہ عبارت کتاب کیا کہتی ہے اور مفہوم کیا لیا گیا ہے۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ تحریف معنوی کی اتنی دلچسپ مثالیں وقت ہی سے دستیاب ہوتی ہیں۔

روایت کا آخری ٹکڑا بتا رہا ہے کہ وصیت ان اصحاب کے بارے میں کی گئی ہے کہ جو بدعتی نہ ہوں اور بدعتی کو پناہ دینے والے نہ ہوں اور جو بدعتی ہوں خواہ وہ صحابی ہوں یا غیر صحابی ان پر لعنت کی گئی ہے۔ مترجم نے پہلی سطر کو دیکھ کر دھوکا کھایا ہے۔ "آنہارا" کو پہلے جملہ سے متعلق کر کے جملہ ختم کر دیا ہے اور اس طرح عبارت اپنے

آخر جز دے نامربوط ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کو مفید سمجھا ہے اور اس پر اکتفا کی گئی ہے۔

الوہی خلافت

اب تک جس قدر توضیح کی گئی ہے اس کے لحاظ سے اہلِ نظر غالباً شیعی عقیدۂ خلافت کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ جو کچھ کہتے اور سمجھتے ہیں اس کی صحیح ترجمانی نہیں کی جاتی۔

اب اس عنوان کے تحت فاضل مضمون نگار کے اعتراضوں کا جواب بھی پیش کیا جاتا ہے اگرچہ اس میں بیشتر وہی امور ہیں جن کی تفصیل کی جا چکی ہے۔

تحریفِ قرآن کے متعلق حیات القلوب کی عبارت "ثلث قرآن در فضائل اہلبیت وثلثے در مثالب دشمنانِ ایشاں است" کے سمجھنے میں اشتباہ ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی قرآن جو اس وقت موجود ہے اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کی مسلم الثبوت کتاب ہے اس کا ثلث حصہ مناقب اہل بیتؑ پر اور ثلث مثالب دشمنانِ اہل بیت پر مشتمل ہے اس کا وہ مفہوم ہرگز نہیں جسے فاضل مقالہ نگار ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح وہ روایتیں جو کتبِ شیعہ سے پیش کی گئی ہیں اور جو عدمِ نص امامتِ علوی پر (بخیال مضمون نگار) دلالت کرتی ہیں۔ لائقِ غور ہیں۔

۱۔ اہلِ تشیع کے مشہور مجتہد بحرانی نے شرح نہج البلاغہ (مطبوعہ طہران) میں یہ روایت نقل کی ہے۔ خلاصہ روایت یہ ہے کہ "حضرت رسول اللہ نے حضرت حفصہ کو خبر دی کہ میرے بعد ابوبکر خلیفہ ہوگا اور اس کے بعد تیرا باپ۔ حضرت حفصہ نے یہ راز حضرت عائشہ سے کہہ دیا" الخ

یہ مضمون دوسری روایات میں بھی موجود ہے اور یہ چیزیں ہمیشہ سے شیعوں کے پیش نظر رہی ہیں۔ شیعہ نظریہ ان روایات کے متعلق ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اگر کوئی پیشنگوئی

کسی واقعہ کی حقانیت یا عدم حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ فرض کیجیے آج یہودی فلسطین یا اس کے کسی حصہ پر قابض ہیں اور اس کے متعلق کوئی پیشینگوئی کسی کتاب سماوی میں پائی جائے تو کیا اس سے یہود کی حقانیت پر دلیل لائی جا سکتی ہے؟

حضرت رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو وصیتیں کرتے ہوئے خبر دی ہے کہ میرے بعد یہ امور ظہور میں آئیں گے جس پر علیؑ نے پوچھا کہ میرا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ فرمایا "صبر" یہی وہ راز باطنی ہے جس پر اہلِ دل حیرت کرتے ہیں اور اہلِ دنیا کوئی طعنہ اٹھا نہیں رکھتے الغرض یہ پیشین گوئی حضرات خلفاء کی حقیقت کو ثابت نہیں کرتی۔

۲ ۔ "جلاء العیون میں لکھا ہے کہ حضرت رسولؐ پر جب مرض کا غلبہ شدید ہوا تو آپ نے چاہا کہ اپنی میراث و جانشینی اپنے چچا حضرت عباس کے سپرد کر دیں حضرت عباس نے کہا یہ کام مجھ سے نہ ہو گا میری بجائے حضرت علیؑ کے سپرد کر دیا جائے۔"
نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ رسول کریمؐ اپنی وفات کے بعد صرف حضرت علیؑ ہی کو خلافت کا حقدار تصور نہ کرتے تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل عبارت نقل کر دوں تاکہ مبصر کو مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

> "اے عم پیغمبر قبول کن وصیت مرا در اہل من و در زنان من و بگیر میراث مرا و ادا کن دین مرا و وعدہ ہائے مرا بعمل بیاور و ذمہ من بری بگرداں عباس گفت، یا رسول اللہ من مرد پیر عیال دارم و تو از ابر بہاری بخشندہ تری و مال من وفا نمی کند بوعدہ ہائے تو و بخششہائے تو ایں را از من بگرداں بسوئے کسے کہ طاقتش از من بیشتر باشد و حضرت صد مرتبہ ایں سخن را باو اعادہ کرد و در ہر مرتبہ ہمچنیں جواب گفت پس حضرت فرمود کہ میراث خود را بکسے دہم کہ قبول کند آں را کہ حق قبول کردنی است و سزاوار آں باشد و چنانچہ

تو گفتی، جواب نہ گوید، پس با حضرت امیرالمومنین خطاب کرد و فرمود یا علیؑ تو بگیر میراث مرا کہ مخصوص تست و کسے را با تو نزاعے نیست و قبول کن وصیت مرا و بعمل بیاور وعدہ ہائے مرا و ادا کن قرضہائے مرا یا علی خلیفہ من باش در اہل من و تبلیغ رسالت من بعد از من بمردم بکن۔"

ترجمہ۔ "اے چچا میرے اہل کے بارے میں اور میری عورتوں کے بارے میں میری وصیت کو قبول کرو اور میری میراث لے لو۔ میرا قرض ادا کرو اور میرے وعدوں کو عمل میں لاؤ۔ اور مجھے بری الذمہ کر دو۔ عباس نے کہا یا رسول اللہؐ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ عیالدار ہوں، آپ ابر بہاری سے بڑھ کر بخشش کرنے والے، میرا مال آپ کے وعدوں اور آپ کی بخششوں کے لیے وفا نہیں کر سکتا۔ اس وصیت و میراث کو اس کی طرف پلٹائیے جس کی طاقت مجھ سے بیشتر ہو۔ حضرت نے تین مرتبہ اسی ارشاد کو دہرایا اور ہر مرتبہ عباس نے یہی جواب دیا، پس حضرت نے فرمایا کہ اپنی میراث لینے کو دوں گا کہ جو اسے اسی طرح قبول کرے جو قبول کرنے کا حق ہوتا ہے اور وہ اس کے لیے سزاوار ہو اور جس طرح تو نے کہا اس طرح جواب نہ دے۔ پس حضرت امیرالمومنینؑ سے خطاب کیا، اور فرمایا یا علیؑ تو میری میراث لے کہ تجھ ہی سے مخصوص ہے اور کسی کو تجھ سے نزاع کا حق نہیں، میری وصیت قبول کر، میرے وعدوں کو عمل میں لا، میرے قرضوں کو ادا کر اور اے علی میرے اہل میں میرا خلیفہ ہو اور لوگوں پر میرے پیغاموں کی تبلیغ کر۔"

یہ ہے عین عبارت اور اس کا ترجمہ۔ میں اس روایت پر از روئے درایت کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ صرف نفس مضمون کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ اس روایت میں میراث کا تذکرہ ہے۔ حضرت رسولؐ اپنے چچا سے فرماتے ہیں کہ اگر

میری میراث لینی چاہتے ہو تو ان شرائط کے تحت لے سکتے ہو۔ عباس اپنے افلاس کا عذر کرتے ہیں۔ تین مرتبہ یہی بات دہرائی جاتی ہے۔ تاکہ عباس کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور آخر یہ شے علی مرتضیٰؑ کو تفویض ہوتی ہے۔ نزاکتِ کلام یہ بھی ہے کہ عباس سے فرماتے ہیں "قبول کن وصیت من در اہل من و در زنانِ من" اور علیؑ سے فرماتے ہیں "علیؑ خلیفہ من باش در اہل من و تبلیغ رسالت من بعد از من مبردم کن" رسول اللہؐ کے اس ارشاد اور وصیت کا مطلب کیا تھا وہ اس جواب سے ظاہر ہے "یا رسول اللہؐ من مرد پیر و عیال دارم" ظاہر ہے کہ کچھ خرچ کا معاملہ تھا اور اہلِ رسولؐ و زنانِ رسولؐ کی خبرگیری کا بار پڑتا تھا۔ اس لیے انکار کر دیا۔

میں نہ سمجھ سکا کہ خلافت و امامت سے اسے ربط کون سا ہے، واقعاً عباس کے خیال میں بھی یہ بات نہ گزری تھی جو معترض نے پیدا کی اور علیؑ کو بھی اس مقام میں خلافت دی گئی ہے وہ خلافت خاصہ ہے یعنی اہل رسولؐ و زنانِ رسولؐ کے مثل رسول محافظ و نگراں رہیں اور ان کا حکم مثل رسولؐ ان پر جاری ہو غرض معترض کے پیش کردہ نتیجہ سے اس روایت کو کوئی تعلق نہیں۔

۳۔ ملّا باقر مجتہد نے حضرت امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ ایک بار نبی کریمؐ نے بارگاہِ ایزدی سے ہزار حاجتیں طلب کیں۔ خدا تعالیٰ نے سب روا کر دیں۔ آخر شب میں حضرت علیؑ بھی مسجد میں تشریف لائے۔ رسولِ خداؐ نے فرمایا اے علیؑ تمہاری خلافت و امامت کے واسطے ہم نے جو دعا کی وہ بارگاہِ خداوندی سے منظور نہیں ہوئی (حیات القلوب جلد ۲)

فاضل مقالہ نگار نے اس مقام پر یہ فخریہ عبارت بھی تحریر فرمائی ہے کہ اگر میں حدیث گھڑنے پر آتا تب بھی اس سے زیادہ صاف واضح اور غیر مبہم حدیث گھڑنے میں شاید بمشکل کامیاب ہو سکتا۔

اب ذرا اصل عبارت ملاحظہ ہو:۔

"حضرت رسولؐ شبے در مسجد ماند چوں نزدیک صبح شد حضرت امیرالمومنین داخل مسجد شد پس حضرت رسول او را ندا کرد کہ یا علیؑ گفت لبیک، فرمود کہ بیا بسوئے من چوں نزدیک شد حضرت فرمود تمام ایں شب را دیدی درینجا بسر آوردم و ہزار حاجت خود را از خدا سوال کردم وہمہ را برآورد و مثل آنہا را نیز برائے تو سوال کردم و باز ہمہ عطا کرد و سوال کردم از برائے تو کہ امت را مجتمع گرداند برائے تو کہ ہمہ اقرار کنند بخلافت تو، قبول نہ کرد و ایں آیات را فرستاد "الم احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین"

ترجمہ: "ایک شب رسولؐ نے مسجد میں قیام فرمایا جب صبح نزدیک ہوئی تو حضرت امیرالمومنینؑ داخل مسجد ہوئے پس حضرت رسولؐ نے آواز دی یا علیؑ! عرض کی لبیک۔ فرمایا میرے پاس آؤ۔ جب نزدیک آ گئے فرمایا، تم نے دیکھا کہ یہ رات میں نے یہیں بسر کی ہے۔ اپنی ہزار حاجتیں خدا سے طلب کیں۔ خدا نے انھیں پورا کیا اور انھیں کی مانند (ہزار حاجتیں) تیرے لیے بھی سوال کیا، وہ تمام سوال بھی پورے کیے۔ اور میں نے سوال کیا کہ امت کو تیرے واسطے جمع کر دے کہ سب تیری خلافت کا اقرار کریں۔ اور سب تیرے تابع ہوں۔ یہ سوال قبول نہ ہوا اور یہ آیات بھیجی گئیں۔ الٓمٓ۔ کیا لوگوں نے گمان کر لیا ہے کہ اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی اور البتہ ہم نے ان کو بھی آزما لیا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے اور البتہ خدا

جانتا ہے جو سچے ہیں اور البتہ خدا خوب جانتا ہے انھیں جو جھوٹے ہیں۔”

اہل بصیرت جانتے ہیں کہ منزلِ وحی نے حقائق کو نہایت سادہ زبان میں بیان فرمایا ہے۔ علیؑ کو بتایا جا رہا ہے کہ مشیت الٰہی کسی کو کسی فعل پر مجبور نہیں کرتی لہذا ایسا نہیں ہوگا کہ تمام لوگوں کو خداوندِ عالم مجبور کرکے تیری خلافت پر مجتمع کرے، اور جبر سے کام لے کر انھیں تیرا تابع بنائے بلکہ ایک شانِ اختیاری کے ساتھ انھیں معرض امتحان میں رکھا گیا ہے اور تو ان کے لیے وجہ امتحان ہے اور یہ آیات سورۂ عنکبوت اس مسئلہ پر روشنی ڈال رہی ہیں۔

یہ ہے وہ مطلب جو اہل عقل اس حدیث سے اخذ کرتے ہیں۔ اب کیا اہل انصاف میری طرف سے دریافت کر سکتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار نے یہ مفہوم کہاں سے پیدا کیا ہے۔ اور ”اے علیؑ ہم نے تمھاری ولایت و خلافت کے واسطے دعا مانگی، وہ نامنظور ہوئی۔ یہ کون سی عبارت کا ترجمہ ہے؟

۴ - ایک روایت عیون الاخبار سے نقل فرمائی گئی ہے کہ حضرت خضرؑ نے علی مرتضیٰؑ کو رابع الخلفا کہہ کر سلام کیا۔

فاضل مناظر نے عیون الاخبار تو نہیں دیکھی اس کا تو یقین ہے لیکن خیر اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ یہ مضمون شیعوں میں مشہور ہے اور معمولی معمولی اہل منبر بھی اسے بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک اصطلاحی جملہ ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ خلفائے اربعہ شیعوں کے نزدیک حسب ذیل ہیں:-

(۱) حضرت آدمؑ (۲) حضرت داؤدؑ (۳) حضرت ہارونؑ (۴) حضرت علیؑ۔ کہا جائیگا کہ یہ تاویل ہے اور خدا جانے کیا ہے، میں عرض کروں گا کہ جس قوم کی اصطلاح ہو وہی اس کی تشریح کی حقدار ہوتی ہے، عقلا کبھی اس پر ایراد نہیں کرتے، تمام علوم و فنون میں یہ قاعدہ جاری ہے۔

۵ - نہج البلاغہ کے حوالہ سے یہ عبارت نقل ہوئی ہے :-

" ان امیر المؤمنین قال الناس جماعۃ وید اللہ علیھم غضب اللہ علی من خالف الجماعۃ انا واللہ اھل السنۃ والجماعۃ "

امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ لوگ جماعت ہیں اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو شخص جماعت کی مخالفت کرتا ہے، خدا اس پر غضبناک ہوتا ہے خدا کی قسم میں اہل سنت والجماعت ہوں۔ (یعنی سنتِ رسولؐ کا پابند ہوں اور مسلمانوں کی مجموعی جماعت کا فرد ہوں)

آخر کلام میں افتخاراً ارشاد ہوا ہے کہ " ان روایات کو پیش کر دینے کے بعد غالباً مجھے کوئی توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی "

اہل علم جانتے ہیں کہ عبارتوں سے جو مطالب وضع کیے جاتے ہیں ان کی حجت پر یقین کرنے کی ایک میزان ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مفہوم صحیح ہے یا غلط اسی معیار پر پیش کردہ عبارت کے مفہوم کو جانچنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:-

(۱) لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے (نتیجہ) پس لوگوں پر اللہ کا ہاتھ (مفہوم اوّل)

(۲) لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت کی شان یہ ہے کہ اس کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (نتیجہ) پس لوگوں کی مخالفت سے اللہ غضب ناک ہوتا ہے (مفہوم ثانی) ماشاء اللہ کیا خوب عبارت اور کیا خوب مفہوم۔

" انا واللہ اھل السنۃ والجماعۃ "، یہ تو معلوم ہے کہ اصطلاحی معنوں میں تو یہ کلمہ " اہل السنۃ والجماعۃ " استعمال نہیں ہوا کیونکہ یہ اصطلاح مولد ہے اور بعد کو وضع کی گئی ہے۔ اسی لیے ترجمہ میں بھی اس کی توجیہہ فرمائی گئی اب معلوم نہیں ہوتا کہ

اس جملہ سے کیا فائدہ اٹھانے کی توقع کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ یہ دریافت کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ نہج البلاغہ کے کس خطبہ میں یہ عبارت مرقوم ہے۔ آیا خطبات میں ہے؟ فرامین میں ہے۔ کلمات مختصرہ میں ہے؟ کہاں ہے؟

ارباب علم ہرگز تعجب نہ فرمائیں۔ مذہب عمومی کی بنیاد انھیں دلچسپ صداقتوں پر اٹھائی جاتی ہے اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے ہمیشہ سے یہی نسخہ استعمال ہوتا ہے۔

سیاسی اختلاف

اس عنوان کے ماتحت اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مذہب شیعہ کی ابتدا عبداللہ بن سبا ایک نومسلم یہودی سے ہوئی۔

میں پہلے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ عبداللہ بن سبا کو طنزاً نومسلم کہنا درست نہیں اس لیے کہ اس وقت جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مشرکین قریش ہوں یا غیر قریش یہودی ہوں یا نصرانی۔ سب کے سب نومسلم تھے۔ سوائے ایک مخصوص خانوادہ کے مخصوص افراد کے کہ ملت ابراہیمی جن کے سینوں میں بطور امانت چلی آ رہی تھی اس کے بعد فاضل استرآبادی کی تحریر سے استدلال کیا گیا ہے اور یہ تحریر پیش کی گئی ہے:۔

وکان (عبداللہ بن سبا) اول من شرع القول بفرض امامۃ علی۔

"عبداللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ بات نکالی کہ حضرت علیؑ کی امامت مذہبی فریضہ ہے"

اب ارباب نظر انصاف کی آنکھوں سے اس دعویٰ کو ملاحظہ فرمائیں، میں فاضل مضمون نگار کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی بدولت کتب رجال کی ورق گردانی کا موقع ملا۔ فاضل استرآبادی کا پورا نام ہے "مرزا محمد بن علی بن ابراہیم استرآبادی" کتاب

ہے تھا، تو اس سے ذاتِ علیؑ یا دیگر اصحابِ علیؑ یا تشیع پر کیا الزام؟ بات دور جاتی ہے اور میں اس عنوان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

اب میں اس ایراد کی طرف توجہ کرتا ہوں جسے طرح طرح کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ شیعہ مسلک کی بنیاد دوسروں سے نفرت پر قائم ہوئی ہے۔

قارئینِ کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ مذہب شیعہ کے اصول یہ ہیں:۔

(۱) خدا کو واحد و یکتا ماننا (۲) خدا کو عادل ماننا (۳) نبوت خاتم النبیین پر ایمان لانا اور انبیاء کو معصوم جاننا (۴) **خلافت** و امامت کو من اللہ قبول کرنا (۵) روز جزا پر اسی حیثیت سے ایمان لانا جس حیثیت سے پیغمبر نے تعلیم دی ہے۔

ان اجزاء پر نظر کرتے ہوئے مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ کس دلیل کی بناء پر مذکورۂ بالا الزام درست ہو سکتا ہے۔

ہاں خلافت کے معاملہ میں وہ لوگ جو دنیوی حیثیت سے مسلمانوں کے حاکم بنے شیعوں کے نزدیک انھیں مذہباً کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور ایسے چند اشخاص کے خلاف، جو مبعوث یا منصوص من اللہ نہیں وہ اپنے نقطۂ نظر سے مخالفانہ اظہارِ خیال پر مجبور رہیں۔

یہ ایک فطرتِ انسانی ہے کہ انسان جس شے کو اچھا نہیں سمجھتا، اس سے اظہارِ بریت کر ہی دیتا ہے۔ اگر انبیاء کا فعل قابلِ اقتدار ہے تو سورۂ توبہ کی اس آیت کو پڑھیے:۔

" وَمَا كان استغفار ابراهيم لابيه الا عن موعدة وعدها اياه فلما تبين له انه عدو لله تبرّأ منه ان ابراهيم لاواه حليم "

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص اپنے دوست کا دشمن ہو اس سے اظہار برأت کرنا حلم کے خلاف نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی نظری حیثیت اتنی ہی ہے۔ اب رہا دوسروں کے جذبات کا احترام۔ البتہ یہ ضروری شے ہے، لیکن مثل مشہور ہے کہ "اکرم تکرم" اکرام کرو تمہارا بھی اکرام کیا جائے گا۔" تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر کوئی طبقہ اپنی کثرت کے اعتبار پر خود جس طرح چاہے عمل کرے اور قلت سے اپنے جذبات کے احترام کا متمنی رہے تو یہ نباہ کی باتیں نہیں ہیں۔

ذاکر حسین

مسئلہ خلافت و امامت

سید احتشام حسین صاحب
ایم۔ اے

مسئلہ خلافت و امامت

مدیر نگار کے نام ایک خط

مخدومی نیاز صاحب تسلیم۔ ایک مدت کے بعد پھر آپ کا کچھ وقت لینا چاہتا ہوں۔

مسئلہ خلافت و امامت کے متعلق مجھے بھی چند سطریں لکھ کر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی اجازت دیجیے۔ اس کا محرک بزمی صاحب کا وہ مضمون ہے جو آپ کے یہاں جولائی میں شائع ہوا ہے۔ اس خط میں بزمی صاحب کے مضمون کا جواب نہیں پیش کر رہا ہوں بلکہ آپ سے تبادلۂ خیال چاہتا ہوں۔ کیا عقل عمومی اسی کا نام ہے جسے بزمی صاحب نے پیش کیا ہے؟ کیا قرآن اور تاریخ اسی طرح پڑھنا چاہیئے جیسے بزمی صاحب نے پڑھا ہے؟

ایک صاحب سے آپ کے اعلان کی خبر مل چکی تھی کہ کوئی "علوم مشرقی و مغربی" کا عالم اس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہے۔ اس لیے کچھ انتظار بھی تھا۔ اس مسئلہ پر ایک سنجیدہ نقطۂ نظر کی بڑی ضرورت ہے اس لیے بڑی امیدوں سے اُسے پڑھا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بڑی مایوسی ہوئی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنی قسم کے بہت سے مضامین کی طرح ایک مضمون ہے۔ بلکہ اس لیے کہ "شور" کے لحاظ سے "دل" کو ایک "قطرۂ خون" پا کر جو مایوسی ہو سکتی ہے وہی ہوئی۔

میں "علوم مشرقی و مغربی" کا عالم تو نہیں۔ ہاں ایک طالبعلم ضرور ہوں

میں اپنی قابلیت اور معلومات کے حدود سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ اس لیے چاہتا تھا کہ اس مباحثہ میں شریک نہ ہوتا۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ عقلِ عمومی کے بھیس میں کچھ اور پیش کیا جا رہا ہے تو مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ جب درایت اور عقل کا غلط استعمال دیکھتا ہوں تو مجھے بھی کچھ کہنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ تاریخ اور نفسیات کے ایک متعلّم کا نقطۂ نظر ہے۔ چاہے وہ شیعوں کے لیے مفید مطلب ہو یا اہل سنّت والجماعت کے لیے۔ چاہے اس کے جواب میں دونوں طرف کی گالیاں ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کر سکتا کہ بزمی صاحب کی طرح قسمیں کھا کھا کر اپنی بے تعصبی اور غیر جانبداری کا یقین پڑھنے والوں کو دلا دوں۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ تعصب اور جنبہ داری کا تعلق بعض اوقات شعور کی اس منزل سے ہوتا ہے جس سے ہم خود اچھی طرح واقف نہیں ہوتے۔ میں نے دیکھا اور غالباً آپ نے محسوس کیا ہوگا۔ کہ کبھی کبھی بزمی صاحب کی لہجہ کی تلخی اور طنز، شعوری یا غیر شعوری طور پر شیعہ جذبات نفرت کا پہلو بہت زیادہ نمایاں ہو کر ان کے دعوئ خلوص کی غمازی کرنے لگتا ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اب سے دو برس پہلے جب مسئلہ خلافت و امامت پر ہرنام صاحب کا مضمون شائع ہوا تو اس جولائی ہی کے مہینہ میں بزمی صاحب کا ایک مقالہ بھی اس کے جواب میں نکلا تھا۔ میں نے اسے پڑھا تھا۔ اس میں منصبِ رسالت اور کارِ نبوّت کی جی کھول کر توہین کی گئی تھی۔ شیعوں کے لیے کہا گیا تھا کہ سیاست کو مذہب سے علیحدہ جانتے ہیں۔ امام حسنؑ ظالم تھے کیونکہ انھوں نے ایک قاتل کو سزا دی اور پھر مضمون ان تاریخی الفاظ پر ختم کیا گیا تھا (اور میں اسے کبھی نہ بھولوں گا) کہ شیعیت اسلام کا

کوئی فرق نہیں۔ جولائی ۳۵ء کی آخری تاریخیں تھیں۔ جب وہ مضمون میں نے دیکھا۔ آخری جملہ پر میں نے کچھ لکھا۔ پہلے تو یہی خیال تھا کہ نگار میں بھیجوں گا۔ مگر پھر دیر میں شائع ہونے کے خوف سے میں نے ایک دوسرے اخبار میں بھیج دیا۔ (اخبار اسد لکھنؤ ۲/ اگست ۳۵ء) معلوم نہیں وہ آپ کی یا بزمی صاحب کی نظر سے گزرا بھی یا نہیں۔ اس میں میرا لہجہ جذباتی ضرور تھا لیکن شاید غیر معقول نہ تھا۔ بعض مصروفیتوں کی وجہ سے (جس میں کاہلی سب پر بالا ہے) میں پھر اس سلسلہ کا مطالعہ باقاعدہ نہ کرسکا۔ اور صرف دلچسپی لینے والوں سے خبریں ملتی رہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک دن ایک دوست کے یہاں آپ کے محاکمہ کے بعض اجزاء عجلت میں دیکھے لیکن وہ بادل کے سایہ کی طرح دماغ میں رہے۔ جنوری ۳۷ء کے نگار میں کسی آزاد خیال شیعہ کے قلم سے کوئی مضمون شائع ہوا۔ اس کی بڑی تعریفیں سنیں مگر بدقسمتی سے آج تک پڑھنے پر قادر نہ ہوسکا۔

یہ سب اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر اس خط میں کوئی ایسی بات لکھ جاؤں جو زیر بحث آکر ختم ہوچکی ہو تو اس تکرار پر آپ یا کوئی اور صاحب خفا نہ ہوں مگر جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں اس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اس طرح اب تک اس مسئلہ پر روشنی نہ ڈالی گئی ہوگی۔ ورنہ بحث کی زیادہ گنجائش ہی نہ ہوتی۔ میں خود نقل سے زیادہ عقل اور معتقدات سے زیادہ استدلال کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن نقل کو صرف نقل ہونے کی وجہ سے غلط نہیں سمجھتا۔ روایت اور تاریخ کو محض اس لیے نہیں جھٹلا سکتا کہ وہ روایت کیوں ہے اور ہر روایت کو بے اعتبار سمجھنے کی کوئی وجہ بھی نہیں دیکھتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو ماضی ہمارے لیے بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ یہ اور بات

ہے کہ ہم بعض موجودہ فلسفیوں کی طرح ماضی کی ضرورت ہی سے انکار کر دیں اور گذشتہ زمانہ کی باتوں کا تذکرہ ہی فضول سمجھیں۔ پھر اس حالت میں تو میری اور آپ کی، ہرنام صاحب اور برزمی صاحب کی ساری کوششیں مسئلہ خلافت کے سلجھانے میں بیکار محض ہوں گی لیکن چونکہ اس بحث میں آپ لوگ حصہ لے رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کے مسائل پر تاریخ اور تنقید کی روشنی میں کچھ گفتگو کرنا بے وقت کی راگنی نہیں ہے۔ اسی لیے میں بھی اظہارِ خیال کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ تو واقف ہی ہوں گے۔ لیکن میں دوسروں کے لیے کیوں نہ بتاتا چلوں کہ سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد فن تاریخ نویسی میں ایک اہم انقلاب ہوا۔ کارل مارکس (Karl Marks) اور اس کے شریکِ کار (Eengels) نے فلسفۂ تاریخ کا ایک نیا نظریہ پیش کیا جس کا نام تاریخی واقعات کی مادی یا اقتصادی ترجمانی (Materialistic of Ecmomic Intespretation of History) رکھا اور یہ بتایا کہ کوئی واقعہ اور کوئی تاریخی انقلاب جب کبھی ہوتا ہے اس میں سرداری اور مزدوری کی کشمکش، امارت اور افلاس، دولت کی غلط تقسیم اور طبقہ کی جنگ کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ ہم اسے دیکھ نہ سکیں مگر اس کا وجود ضروری ہے اس کے علاوہ اور اسباب بھی ہو سکتے ہیں لیکن اقتصادی اور معاشی سبب ریڑھ کی ہڈی کی طرح، تاریخ چند بکھرے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں، تاریخ ایک وسیع معنی میں انسانوں کی مادی کشمکش کا مرقع ہے۔ تاریخ چند بڑے آدمیوں کی سوانح حیات بھی نہیں بلکہ انسانیت مجموعی طور پر کہیں عوام و خواص کی جنگ کی شکل میں، کہیں سرمایہ دار اور مزدور کے حقوق کے تعین کی صورت میں متحرک اور لرزاں رہتی ہے۔ چند

حوصلہ مند انسانوں کی انفرادی خواہشات بعض اوقات بڑی بڑی تبدیلیوں کا سبب بن سکتی ہیں۔ لیکن ایک مکمل تبدیلی کی تہ میں کوئی اہم معاشی یا اقتصادی مسئلہ کروٹیں لیتا ہوا موجود ہوتا ہے۔ سرمایہ دار کی ذہنیت اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک اس کے خون میں ذرا بھی حرارت باقی ہے جب تک کہ اسے بالکل یقین نہ ہو جائے کہ اب وہ دَور ہی ختم ہو گیا اور اب کوئی امید پنپنے کی نہیں۔ عوام جو ہر طرح پریشان رہتے ہیں وہ اور زیادہ دیر میں اپنی حالت کا اندازہ کرتے اور تبدیلی چاہتے ہیں۔ لیکن جب چاہتے ہیں تو وہی انقلاب کے علمبردار بن جاتے ہیں۔

فلسفہ تاریخ کا یہ نیا نظریہ بہت سے لوگوں کو عجیب معلوم ہوگا لیکن جب واقعات اس پر منطبق کر کے دیکھے جائیں گے تو اس کی صحت اور جامعیت کا یقین ہو جائے گا۔ میں نے اس پر ذرا آپ کا زیادہ وقت لے لیا۔ مگر میں آگے جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہ ضروری بھی تھا۔

شاید بھول جاؤں، اس لیے ایک اصولی بات اور کہتا چلوں، قرآن مجید کو اگر ہم الہامی کتاب مانیں تو کوئی بات ہی نہیں رہتی۔ اگر ہم محمد صلعم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سمجھیں تو بھی حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آیت کے صرف اتنے ہی معنی نہیں ہیں جو اردو ترجمہ میں مولوی نذیر احمد صاحب یا مولوی مقبول احمد صاحب نے لکھ دیے ہیں۔ میں بزمی صاحب کی طرح الفاظ کے ترجمہ ہی کو کافی نہیں سمجھتا۔ کبھی کبھی تشریح اور تفسیر بھی چاہتا ہوں جب یہ پڑھتا ہوں کہ قرآن میں نماز پڑھنے کا حکم ہے تو میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کس طرح پڑھوں اور یہ مجھے قرآن میں نہیں ملتا۔ میں جب یہ پڑھتا ہوں کہ رسولؐ نے ایک ساتھی کے ساتھ ہجرت کی تو واقعہ کی تفصیل اور ساتھی کا نام بھی جاننا چاہتا ہوں۔ اور وہ قرآن میں موجود نہیں۔ میں جب یہ دیکھتا ہوں کہ رسولؐ کی کسی فتح کے لیے "فتح مبین" کے الفاظ استعمال کیے گئے تو ایک تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کی

حیثیت سے میں وہ موقع جاننا چاہتا ہوں۔ بزمی صاحب نہ جانے کیوں اس پر مُصر ہیں کہ الفاظِ قرآن میں علیؑ کی خلافت کا ذکر نہیں آیا ہے۔ انھیں اختیار ہے کہ آیتوں کو مانیں یا نہ مانیں۔ کیونکہ ان میں علیؑ کا نام نہیں آتا۔ وہ ماننے پر بھی مجبور نہیں کیے جاسکتے لیکن یہ آپ پوچھیے کہ وہ تاریخی واقعات سے کیوں انکار کرتے ہیں جبکہ وہ شیعوں کی گھڑی ہوئی روایتیں نہیں بلکہ علمائے اہلِ سنّت کی تحریروں میں موجود ہیں۔

بہرحال ان مبادیات کی روشنی میں ہمیں اس مسئلہ کو دیکھنا ہے۔ میں پھر پہلے حصّہ کی جانب آجاتا ہوں کہ فلسفۂ تاریخ سے کام لے کر ہمیں اسلام کی ابتدا اور اشاعت پر غور کرنا چاہیے۔ اسلام کی موجودہ شکل رسول مقبولؐ نے دنیا کے سامنے پیش کی اور سب سے پہلے عرب میں وہ اصطلاح میں تو مذہب تھا لیکن عالمِ انسانیت کے نام آزادی اور امن و امان کا ایک چارٹر تھا، سیاست، معاشرت اور روحانیت کا یہ نظام تیرہ سو سال قبل ایک عجیب وغریب چیز معلوم ہوتا ہے۔ اسے ہم ایک طرح کی اشتراکیت کہہ سکتے ہیں جو موجودہ اجتماعیت اور اشتراکیت کی طرح بہت زیادہ انتہا پسند تو نہیں لیکن اس سے مماثل ضرور ہے۔ حرّیت، مساوات اور آزادی کا یہ پیام دنیا کے سامنے بالکل نیا تھا۔ افلاطون تخیل کے زور پر دنیا کو ایک حسین نظام ضرور دے چکا تھا لیکن رسولؐ اپنے عمل اور کردار سے، اپنے فلسفۂ حیات اور طریقِ معاشرت سے دنیا کو بالکل نئی چیز دے رہے تھے اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو رسولؐ کو صرف ۲۳ برس کی مدت ملی۔ جس میں انھیں عرب کے بہت سے بتوں کو نیست ونابود کرنا تھا۔ پتھر کے بُت جو طاقِ کعبہ میں تھے وہ تو آسانی سے گر سکتے تھے لیکن جو دل میں گھر بنا چکے تھے ان کا ڈھا دینا بھی رسولؐ کا فرض تھا۔ عربوں کو ایک مشترک دشمن کے مقابلہ میں جا کر کھڑا کر دینا آسان تھا، لیکن ان کے دلوں سے قبیلہ پرستی اور شخصی امتیازات کا مٹانا کھیل نہ تھا۔ رسولؐ نے ان میں یگانگت اور یکجہتی کی روح پھونکی قبیلہ پرستی پر کاری ضرب لگائی، نسلی امتیازات کی بنیاد اکھاڑ دی

وہ امیر اور غریب سب کو ایک سطح پر لا کر انسانیت کو بلند کرنا چاہتے تھے وہ ایک ایسی دنیا چاہتے تھے جہاں کوئی مخصوص طبقہ نہ ہو۔ بلکہ صرف کارآمد اور مفید انسان ہوں مختصر یہ کہ وہ ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے تھے اور اسے خدا کی جانب سے اپنے اوپر ایک فرض سمجھتے تھے۔ رسولؐ کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی گردنیں جھک گئیں۔ قبیلہ اور نسل کا تفوق مٹنے لگا۔ اور بزرگی کی علامت یہ رہ گئی کہ جو خدا سے جتنا زیادہ ڈرتا ہے اتنا ہی شریف ہے۔ تاریخ ایسے کم انسان پیش کر سکتی ہے۔ جو اتنی مدت میں اس قدر کامیاب رہے ہوں۔ عرب کی وحشت و بربریت صدیوں کی خود دارانہ ذہنیت کا اندازہ لگائیے اور محمد عربیؐ کے کام پر نظر ڈالیے تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ اسلام کو صرف اپنی زندگی تک کے لیے نہیں بلکہ آنے والی دنیا کے لیے ایک برکت و بہبود کی چیز سمجھ کر چھوڑنا چاہتے تھے۔ وہ خود تو کامیاب رہے مگر ساتھ ہی اس کامیابی کو مستقل شکل دینے کے لیے یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے بعد ان کا نظام قائم رہے بالکل اسی طرح لوگ نسلی امتیاز شخصی جاہ و نمود، سرمایہ داری اور امیرانہ تفوق سے نفرت کریں۔ کوئی ایسی بات نہ ہو کہ پھر یہی چیزیں عرب میں پیدا ہو جائیں جس طرح رسولؐ کا اس دنیا سے اٹھ جانا ضروری تھا۔ (چاہے کسی کو یقین ہو یا نہ ہو) اسی طرح اسلام کا اصلی شکل میں باقی رہنا اور دنیا کے لیے ایک پیامِ ربانی کی حیثیت سے باقی رہنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے رسولؐ کے پیش نظر اپنی یا کسی کی زندگی سے زیادہ خدا کا پیام عزیز تھا۔ اسلام سے زیادہ انھیں کسی سے محبت نہ تھی۔ رسولؐ کسی شخص کی کامیابی اور خلافت سے زیادہ اپنے مقصد کی کامیابی چاہتے تھے۔ اور اس کے مستقبل کے لیے انھیں انتظام کرنا تھا۔

اس وقت یہ بحث چھیڑنا بیکار ہے کہ رسولؐ عالم الغیب تھے یا نہیں۔ ان سے غلطی ہو سکتی تھی یا نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ معمولی معمولی تاریخ کے جاننے والے اور

واقعات کی رفتار سے دلچسپی لینے والے بہت آگے کے واقعات صحیح صحیح بتا دیتے ہیں رسولِ عربؐ نے اپنی زندگی ہی عربوں کے مطالعہ میں صرف کر دی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ انھیں کس طرح سدھارا جا سکتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ عربی ذہنیت میں کس طرح انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہی ہوں گے کہ بہت سے لوگ کس طرح محض ضرورتِ وقت کے لحاظ سے اسلام قبول کر رہے ہیں، وہ حقیقتاً مارِ آستین ہیں، وہ موقع ملنے پر رسولؐ کے سارے نظام کو الٹ دینے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں گے وہ ان لوگوں سے ناواقف نہ تھے جو اسلام کی حقیقت سے بے خبر ہو کر کسی مصلحت سے اس جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے تھے۔ وہ ان سے بھی واقف تھے جن میں روحِ اسلام پوری طرح سرایت کیے ہوئے تھی۔ وہ اپنے اعتماد کی قدر و قیمت جانتے تھے اور اپنے سچے ساتھی تلاش کرنے میں کوئی اہم غلطی نہ کر سکتے تھے۔ جب کوئی انقلاب شروع ہوتا ہے تو قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ روس میں صرف اشتراکیوں کو اہم جگہ پر رکھا جاتا ہے۔ جرمنی میں نازی ہی سب سے قابل اور لائق ہیں۔ کیونکہ وہی ہٹلر کے مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔ اٹلی میں فاسستوں کے علاوہ کسی اور پر بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ فاسستی نظام کے بقاء کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ذہنیت بنانے کے لیے ایک اچھی مدت درکار ہے۔ الہ دین کا چراغ اس سلسلہ میں کام نہیں آ سکتا۔ رسولؐ بھی اسی پر عمل کر رہے تھے اور غالباً ہر ذی ہوش یہی کرے گا۔ عرب میں پریس اور پروپیگنڈے کی آسانیاں نہ تھیں اور رسولؐ کو مساوات، اخوت اور آزادی کا بیج بوئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا اس لیے اسی پالیسی کے تسلسل (Continuity) کی ضرورت تھی۔ ابھی عوام کی ذہنیت اپنے پرانے رنگ پر فریفتہ تھی۔ ابھی وہ اپنے سرداروں کے ہاتھ میں تھے۔ ابھی ان کی آنکھیں اپنے قبیلوں کے رہنماؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ کم لوگ ایسے تھے جنھوں نے اسلام کی سچی روح کو سمجھا تھا۔ رسولؐ کو کام جاری رکھنے کے لیے ایک اپنے جیسے انسان کی تلاش تھی۔

میں برّنی صاحب سے اس معاملہ میں متفق نہیں کہ رسولؐ نے کبھی علی کی خلافت کا ذکر ہی نہیں کیا۔ بلکہ میں آپ کی تحقیق کی تائید کرتا ہوں۔ ایک سے زیادہ مواقع ایسے آتے ہیں جہاں رسولؐ کا منشا صاف صاف علیؑ کو خلیفہ بنانے کے متعلق ظاہر ہوا۔ غالباً برّنی صاحب آزاد خیال ہونے کی وجہ سے اسے برا سمجھتے ہیں کہ رسولؐ ہی کے خاندان کا کوئی شخص رسولؐ کا خلیفہ ہو۔ لیکن اس کی کوئی وجہ معقول نظر نہیں آتی کہ کیوں نہ ہو۔ علیؑ کو اپنا جانشین بنانے میں نسلی امتیاز اور کنبہ پروری کا جذبہ کارفرما نہ تھا۔ یہ داماد کی محبت بھی نہ تھی (کیونکہ بقول حضرات اہل سنت حضرت عثمان بھی تو داماد تھے اور پھر دوہرے! ان سے محبت کے اظہار میں یہی سلوک کیا ہوتا!) یہ بھائی کا خیال نہ تھا، یہ بنی ہاشم کو بڑھانے کی ہوس نہ تھی، جن چیزوں سے ڈر کر برّنی صاحب تمام تاریخی حقائق سے انکار کیے دیتے ہیں، ان میں سے کوئی نہ تھا۔ انھیں یہ خیال ہے کہ اگر ہم علیؑ کو خلیفہ مان لیتے ہیں تو نبیؐ پر کنبہ پروری کا الزام آجائے گا۔ یہ رسولؐ سے اظہارِ محبت کا بہت غلط طریقہ ہے کیونکہ غیر جانبدار تاریخ پڑھنے والے اور یورپین مورخ یہ تو مانتے ہی ہیں کہ رسولؐ علیؑ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے رہا یہ اس کے بعد وہ یہ بھی لکھ دیں کہ علیؑ میں خلافت کی اہلیت نہ تھی۔ ان کی تحقیقات کا پہلا حصہ تاریخی حقیقت ہونے کی وجہ سے ماننا چاہیے اور دوسرا ٹکڑا محض رائے ہونے کی وجہ سے قابلِ بحث و نظر ہے۔ اس وقت انکی قابلیت کا سوال بھی ابھی نہیں ہے۔ پہلے تو یہ طے کرنا ہے کہ رسولؐ علیؑ کو خلیفہ بنانا چاہتے بھی تھے یا نہیں۔ تو مجھے یہ نظر آتا ہے کہ مسلمان مورخوں کی زیادہ تر کتابیں اور غیر مسلم مورخین کی کم و بیش تمام کتابیں اس اعتراف سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ برّنی صاحب اس سے کیوں انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ نے اور ہرنام صاحب نے اس کے کافی ثبوت بہم پہنچا دیے ہیں۔ اگر اس موقع پر برّنی صاحب کے خیالات کی نفسیاتی تحلیل کر دی جائے تو زیادہ غیر موزوں نہ ہوگا۔ ان

کو یقین ہے کہ رسولؐ نے علیؓ کے خلیفہ بنانے کی خواہش ظاہر کی مگر وہ اسے یوں سوچتے ہیں "اسے مان لیا جائے یا اس سے انکار کیا جائے۔" پہلی صورت وہ صحیح مان ہی نہیں سکتے کیونکہ شیعہ بھی یہی کہتے ہیں اور وہ اس غیر مسلم فرقے کے ہمنوا نہیں ہو سکتے (ملاحظہ ہو اُن کا مضمون جولائی ۵۵ء) لہٰذا انکار ہی پر سارا زورِ استدلال صرف کر دینا چاہیے۔ شیعوں سے دامن بچانے کے لیے انھوں نے تاریخی حقائق بھی پسِ پشت ڈال دیے۔ اس کے لیے انھیں نسلی امتیاز اور مطلق العنان حکومت کے نظریے قائم کرنے پڑے۔ انھوں نے یہ نہ سوچا کہ علیؓ کا خلیفہ ہونا صرف شیعوں کا عقیدہ نہیں بلکہ رسولؐ کی خواہش کی تکمیل ہے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بزمی صاحب تمام دنیا کے مورخین کے خلاف اب تیرہ سو برس بعد ایک نئی بات کہہ کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ رہا علیؓ کی اہلیت کا سوال۔ میں اس کی طرف اشارے کرتا جاؤں گا۔ میرا مستقل مضمون سرفراز لکھنؤ تیرہ رجب ۱۳۵۵ھ میں موجود ہے وہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر مجھے معاف کیجیے تو میں یہ کہوں گا کہ فاضل مضمون نگار فلسفۂ تاریخ اور سیاسیات کے مبادیات سے بھی چشم پوشی کرنا چاہتے ہیں۔ علیؓ کے خلیفہ ہونے میں اسلام کا کوئی اصول نہیں مٹتا۔ کہ وہ رسولؐ کے منشا ہی پر پردہ ڈال رہے ہیں۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ علیؓ اور اولادِ علیؓ کے خلیفہ ہوتے میں اسلام سے کوئی انحراف نہیں ہوتا۔ وہ تو علومِ شرقی و مغربی کے عالم ہیں۔ انھیں شرق کی تاریخ کو مغرب کے فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ تاریخی حقائق جھٹلانے سے اسلام کی برتری ثابت نہیں ہو سکتی۔ نئی تاویلات قائم کر کے عقلِ عمومی کو پیش کرنا کمال نہیں بلکہ واقعات کی صحت اور غلطی پر حکم لگا کر بزرگوں کی غلطی (اگر کوئی ہوئی ہو) کا مان لینا ہی اسلام کی صداقت کو روشن کر سکتا ہے۔ رسولؐ کے منشا کو منشا نہ سمجھنے سے بہتر یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے جذبات و خواہشات عقائد کو کسوٹی پر رکھ لیے جائیں کہ انھوں نے ایسا کیوں نہ ہونے دیا۔

میں کہتا ہوں کہ رسولؐ اپنے بعد علیؑ کو مسلمانوں کا رہبر دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے معقول وجوہات تھیں۔ مذہبی سیاسی اور نفسیاتی۔ علیؑ ہی کے خلیفہ بننے میں اسلام کی بہتری تھی۔ اسی طرح رسولؐ کی حکمت عملی کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا۔ اسی طرح عوام کی داخلی اصلاح ہو سکتی تھی۔ کچھ دنوں تک اس کی ضرورت تھی۔ سیریا ایران اور یروشلم کچھ دن بعد فتح ہو سکتے تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کا پیغام پہنچنا ضروری تھا تو اس کے دوسرے ذرائع ہو سکتے تھے۔ پہلے جتنے لوگ اپنے پاس تھے انھیں حقیقی اسلام سے باخبر کرکے اس عظیم الشان جمہوریت کا ممبر بنانا تھا جو آزادی اور مساوات کی پیامبر تھی پھر بعد میں دوسری جگہ کے لوگ بھی اس سے اچھی طرح واقف ہوتے (اس موقع پر اسٹالن اور ٹراٹسکی کے سیاسی عقائد کے اختلافات بھی ملاحظہ فرمائیے گا) عملی شکل میں دنیا کے سامنے وہ شخص پیش کیا جاتا تھا جس سے اسلام سے غداری کا امکان نہ تھا۔ علیؑ میں کوئی خرابی نہ تھی۔ ان کی ساری عمر انقلاب پیدا کرنے والے کے ساتھ گزری تھی۔ اور کہیں بھی رسولؐ نے ان کی وفاداری پر شک نہیں کیا۔ جہاں اعتماد کی سب سے بڑی ضرورت تھی (ہجرت کی رات کو بستر پر تلواروں میں سونا) وہاں انھیں پر بھروسہ کیا۔ علیؑ سب سے زیادہ لڑائیوں میں شریک رہ کر اسلام کی حفاظت کرتے رہے۔ ہاں جب رسولؐ کے بعد کی لڑائیاں دفاع سے ہٹ کر جارحانہ بن گئیں تو علیؑ تعاون نہ کر سکے۔ اور اس فاتح اعظم کی تلوار مدت تک زنگ آلود ہوتی رہی۔ انھوں نے رسولؐ کی جانب سے صلحنامے لکھے۔ انھوں نے مختلف ممالک کو وفد بھیجتے ہوئے رسولؐ کی طرف سے خط لکھے۔ انھوں نے یمن جا کر اسلام کا پیغام اور آیات قرآنی پہنچائیں۔ انھوں نے رسولؐ کے افعال اور کردار کی پیروی اس طرح کی جیسے اونٹ کا بچہ اپنی ماں کی پیروی کرتا ہے (بقول علیؑ) رسولؐ کے بعد ان سے غداری نہ ہوئی کیونکہ یہ ان کی فطرت ہی میں نہ تھی۔ وہ اصول اسلام سے اختلاف نہ کر سکتے تھے۔

چاہے انھیں مسلمانوں سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ ہو جانے پر جب ابوسفیان علیؑ کی طرفداری میں مدینہ کی گلیاں سواروں اور پیادوں سے بھر دینے کا وعدہ کر رہے تھے تو علیؑ نے صاف انکار کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ابوسفیان اسلام کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اس نئے انقلاب میں جسے ہم اور آپ اسلام کہتے ہیں رسولؐ کے بعد علیؑ کا ہاتھ سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ وہ اس کے معمولی سے معمولی اجزا سے واقف تھے۔ پھر اگر ان کے لیے کچھ کہا تو کیا برا کیا؟

اسے دوسری طرح بھی دیکھیے، رسولؐ کس کے خلیفہ ہونے میں عالم اسلام اور انسانیت کا بھلا دیکھ سکتے تھے۔ گنتی کے نام ہیں۔ ہم انھیں دو منٹ میں دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت ابوبکر بوڑھے تھے، اور رسولؐ کے ہم عمر، ہجرت میں رسولؐ کے ساتھ ہونے کے علاوہ ان کا کوئی ایسا زبردست کارنامہ نہیں جس سے ان کی علمی، سیاسی یا عملی قابلیت کا پتہ چل سکے۔ حضرت عمر اپنے انتہائی انہماک اور جوش کی وجہ سے مقاصدِ اسلام کی ترویج کے لیے وہ ذرائع اور حکمتیں اختیار نہ کر سکتے تھے جو رسولؐ کا منشا تھا۔ وہ مسلمان تو بہت بنا سکتے تھے لیکن روشنیِ اسلام دھندلی ہوتی جاتی تھی مسلمانوں کی یہ زیادتی غیر منہضم غذا کی طرح تھی۔ مفتوح ممالک کے زیادہ تر لوگ یوں ہی مسلمان ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے سامنے فلسفۂ اسلام کی خوبیاں نہ تھیں۔ رسولؐ کی تمام لڑائیاں دفاعی تھیں اور حضرت عمر کی لڑائیاں ملک گیری کے جذبات سے معمور تھیں۔ رسولؐ ایک نفسیات کے جاننے والے کی طرح حضرت عمر کی یہ صلاحیتیں چار چھ سال پہلے دیکھ سکتے تھے۔ حضرت علیؑ عمر میں کم ہونے کے علاوہ مجموعی حیثیت سے سب سے زیادہ رسولؐ کے مشابہ تھے۔ رسولؐ انھیں پر زیادہ بھروسہ رکھتے تھے۔ ترمی صاحب نہ مانیں گے ورنہ بہت سی حدیثیں پیش کرتا جو رسولؐ کی زبان فیض ترجمان سے علیؑ کے لیے نکلیں اور جنھیں بنی امیہ کے ستر ہزار منبروں اور مسجدوں کے پروپیگنڈے بھی

نہ مٹا سکے۔ رسولؐ غلط یا صحیح علیؑ کو سب سے زیادہ اہل جانتے تھے۔ اور انھیں کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ اہلِ عرب کو اسلام کی تعلیمات سے اچھی طرح باخبر بنا سکیں، اخوت اور مساوات سے سرشار کر دیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ابھی رسولؐ کی پالیسی کے جاری رہنے کی بڑی ضرورت تھی۔ معمولی سی تبدیلی بھی عوام کو اصل مسئلہ سے ہٹا کر دوسری طرف لگانے کے لیے کافی تھی۔ مثال کے طور پر لیجیے۔ رسولؐ کے زمانہ میں باقاعدہ فوج نہ تھی۔ ہر مسلمان (ہر وہ شخص جو اس انقلاب کا حامی تھا) اپنی عمر کے لحاظ سے فوج کا سپاہی تھا۔ اور ضرورت کے وقت کہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ (آج کل بھی روس وغیرہ میں ہر شخص سپاہی ہے) حضرت عمر نے اسلام کو ایک عسکری نظام دیا۔ اور اسے مولانا شبلی مرحوم نے بہت خاص طور پر پیش کیا ہے۔ میں اس تبدیلی کو نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ اب گویا اسلامی جماعت، باقاعدہ ایک سرمایہ دار اور استعماریت پسند حکومت بن گئی تھی جو اہلِ عالم پر عرصۂ زندگی تنگ کر سکتی تھی۔ رسولؐ ہی کی پالیسی کو جاری رہنا چاہیے تھا۔ اور علیؑ سے زیادہ کوئی اہل نہ تھا۔ رسولؐ کے اس منشا کو عرب کے لوگ نہ سمجھ سکے اور غالباً اس ابتدائی حالت میں سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ مگر مجھے تو رونا اس کا ہے کہ ہم آج بھی جبکہ دنیا نے ترقی کی بڑی منزلیں طے کر لی ہیں اس اعتراف سے گھبراتے ہیں۔ عرب کے عوام رسولؐ کی اس مصلحت سے بے خبر تھے، وہ عرب کے سربرآوردہ حضرات کو سرداری پر دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں اہلیت کا سوال نہ تھا بلکہ رسولؐ کے اٹھتے ہی ان کی نگاہیں بڑے بڑے قبیلوں کے بوڑھے سرداروں کی طرف اُٹھ گئیں اور جس بے لوث اور پُرجوش طریقہ پر رسولؐ نے قبیلہ پرستی پر تیشہ زنی کی تھی اور اسے اپنی سیاسی پالیسی بنا رکھا تھا وہ مکمل طریقہ پر ذہن نشین نہ ہو سکا۔ مسلمانوں کو یہ دھوکا ہرگز نہ کھانا چاہیے کہ اسلامی جمہوریت کے لیے اس وقت انتخاب ضروری تھا۔ اگر انتخاب انتخاب کی طرح ہوتا تو کوئی رونا نہ تھا، عوام پر یہ مسئلہ رسولؐ نے چھوڑ دیا ہوتا تو کوئی بات

نہ تھی۔ مگر ہاں تو تھوڑے سے لوگ عوام کی باگ ہاتھ میں رکھتے تھے جب ان سرداروں نے ایک رائے قائم کرلی تو عام افراد نے بھی اسی کو منظور کرلیا۔ ان کی نہ تو انفرادی رائے تھی اور نہ وہ رائے کے قابل سمجھے گئے۔ ہمارے سامنے تاریخ وہ چند نام پیش کر دیتی ہے جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب میں حصہ لیا۔ اس کے بعد عوام ساتھ ہوگئے۔ یہ انتخاب کوئی جمہوری نظام قائم کرنے کے لیے نہیں کیا جارہا تھا۔ بلکہ رسولؐ کا منشا بدلنے اور فیصلہ مسترد کرنے کے لیے پہلے ہی روز انصار و مہاجرین کی تفریق پیدا ہوگئی اور مقصدِ رسولؐ کی ترویج کرنے والے اسلام کی روح سے لوگوں کو آشنا بنانے والے کی تلاش نہ ہوئی۔ کامل ابن اثیر اور طبری دونوں میں مل جائے گا کہ انصار و مہاجر کے اس جھگڑے میں حضرت ابوبکر نے اٹھ کر کہا کہ قریش پر قریش کے علاوہ کوئی حکومت نہیں کر سکتا۔ اگر یہ نسلی امتیاز اور ذاتی تفوق نہ تھا تو اور کیا تھا؛ حضرت ابوبکر کے پدر بزرگوار نے اس انتخاب کی خبر سن کر پہلا سوال یہی کیا تھا "کیا بنی عبد مناف اور بنی مغیرہ اسے مان جائیں گے؟" دیکھیے عام افراد کے ذہن کتنی تیزی سے قبیلوں کی طرف اب بھی جاتے تھے۔ بنی عبد مناف اور بنی مغیرہ دونوں مسلمان تھے۔ لیکن جناب ابوقحافہ کو اندیشہ تھا (سیوطی) اور پھر اگر یہ انتخاب کا سلسلہ بھی باقی رہتا تو ایک بات ہوتی۔ مگر حضرت ابوبکر کے بعد پھر وہی نامزدگی ہوئی جس سے جمہوری دماغ گھبراتے ہیں۔ افسوس ہے کہ علیؑ کی نامزدگی کو تو آپ رسولؐ کا ایک ووٹ کہہ کر ختم کر دیں اور حضرت عمر کی نامزدگی پر ایک لفظ نہ کہیں! کیا حضرت عمر کا نامزد ہونا مطلق العنانی کے سوا کچھ اور تھا؟

آپ نے کسی جگہ پر خود دو وجہیں لکھ دی ہیں جو علیؑ کی دشمنی کا سبب بن گئیں میں دو ایک کا اور اضافہ کرتا مگر وہی کیا کم ہیں جو آپ نے لکھ دیں۔ میں آپ سے متفق ہوں ہوں۔ شاید میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رسولؐ علیؑ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے مگر وہ نہ ہو سکا

رسولؐ کا اپنے مشن کی کامیابی کے لیے کسی اور کا نام لینا ممکن نہ تھا اور یہ نام لینا جذباتی نہ تھا۔ بلکہ اس کے سیاسی وجود بھی تھے۔ اس انقلاب کی تکمیل اسی طرح ہوسکتی تھی۔ اگر رسولؐ علیؑ کے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچتے یا بالکل نام ہی نہ لیتے تو ہم یہ سمجھتے کہ رسولؐ نے اسلام کے استحکام اور اپنے سیاسی اور مذہبی، روحانی اور معاشرتی نظام کی بقا کے لیے کچھ نہ کیا۔ اگر اسلام سچا مذہب تھا اور اس کی اشاعت محمد عربیؐ اپنا فرض سمجھتے تھے، تو اسے پھیلنا چاہیے تھا۔ چاہے اس پر جمہوریت کے چند ادنیٰ اصول قربان ہی ہو جائیں کیونکہ وہ تو روزانہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں اور مقصدوں کی کامیابی کے لیے ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ میرے اس جملہ کی صدائے بازگشت آپ کو لینن اور ٹراٹسکی کی تحریروں میں سنائی دے گی۔ اور ایک عملی مثال حضرت عمر کی نامزدگی میں ملے گی۔

ہٹلر نازیت کی ترقی کے لیے صرف گوئرنگ اور گوئبلس پر بھروسہ کرسکتا ہے۔ عوام کی ذہنیت سے اسے خطرہ ہے اس لیے ان پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔ رسول عوام کی لاعلمی سے ناواقف نہ تھے۔ وہ اتنا بڑا کام غیر تعلیم یافتہ طبقہ اور اسلام کی حقیقت سے بے خبر عوام پر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ اپنی انگلی سے اس شخص کی جانب اشارہ کرتے جائیں جو سب سے زیادہ موزوں ہوسکتا تھا۔ اور انھوں نے یہی کیا بھی۔

رسولؐ کا یہ تعین خلافت اور نامزدگی نتائج کے لحاظ سے بہت بڑی باتیں ہیں کیا آپ پر منشائے رسولؐ سے اس انحراف کا اثر واضح نہیں؟ حضرت ابوبکر کا زمانہ رسولؐ سے بہت قریب ہونے کی وجہ سے کسی قدر خاموش تھا۔ اگرچہ سوا دو برس کی مدت میں بغاوتیں بھی ہوئیں اور اسلام کی خدمت بھی۔ معاویہ ابن ابی سفیان نے قدم بھی جما دیے اور علیؑ اور فاطمہؑ کی توہین بھی کی گئی۔ اس کے بعد حضرت عمر نے اسلام کی خدمت پر کمر باندھی لیکن ملک گیری شروع ہوگئی۔ بدو عربوں میں اسلام کے مقاصد کے خلاف سرمایہ داری اور شہنشاہیت کا شوق پیدا ہوگیا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ بنی امیہ نے اپنا پودا سرزمینِ اسلام پر مضبوط طور پر لگایا۔ ممکن ہے آپ یا بزمی صاحب بنی امیہ کے اس دخل کو نظر انداز کر جائیں لیکن نتائج پر نظر کر کے میں اسے بہت اہم سمجھتا ہوں۔ بنی امیہ کی نسلی ذہنیت کو اپنے تصور میں رکھ کر تاریخ اسلام کا مطالعہ کیجیے۔ رسولؐ کو ان لوگوں سے نسلی یا ذاتی دشمنی نہ تھی۔ وہ صرف ظاہرداریوں پر نہ جاتے تھے۔ ان کی تیز نگاہ باطن کو بھی دیکھ لیتی تھی۔ وہ بنی امیہ میں اپنے سیاسی اور معاشرتی نظام سے اختلاف کرنے کی پوری قوت دیکھ رہے تھے۔ اس لیے ہمیشہ ان سے بچنے کی تاکید کرتے تھے۔ مگر سُنے کون؟ اوپر عمارت بنتی جا رہی تھی مگر بنیادوں میں دیمک اپنا کام کر رہے تھے۔ حضرت عثمان کی خلافت کا پوچھنا ہی کیا! زمین اور آسمان سب کچھ بنی امیہ کا تھا۔ اور جب میں بنی امیہ کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میرے ذہن میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اسلام کو اسلام ہی کے خلاف آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ جنھیں حصولِ جاہ کے سامنے اسلام کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اور یہ بنی امیہ ہی ہیں۔ اگر آپ کو میری بات ماننے میں تامل ہو تو ڈوزی یا پروفیسر براؤن میور یا کسی اور یورپین صاحبِ قلم کی تصنیف دیکھ لیجیے۔ وہ سب مجھ سے متفق ہیں کہ اسلام کی باگ کا بنی امیہ کے ہاتھ میں آنا حقیقتاً اسلام کی شکست اور پرانے عربی طرزِ معاشرت کی فتح تھی۔ رسولِ اسلامؐ کو اسی چیز سے بچانا چاہتے تھے۔ علیؓ کے سوا اسے کسی نے نہ سمجھا تھا۔ مسلمانوں کا جھنڈا ایران اور شام میں لہرائے یا اسپین اور مصر میں، مگر رسولؐ کے حقیقی مقصد سے بےخبری قدم قدم پر ظاہر ہو رہی تھی۔ روپیہ تھا، دولت تھی قیصر و کسریٰ کی شان و شکوہ تھی، فوجیں تھیں، لیکن اسلام نہ تھا۔ صرف ایک ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا روح مردہ ہو چکی تھی۔ مساوات اور اخوت کی کمی کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی

سادہ زندگی نے پورا نہ کیا۔ رسولؐ ان چیزوں کو کچھ دن پہلے سے دیکھ رہے تھے۔ اور اس کے لیے کسی الہام کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ دقتِ نظر کافی تھی۔ ان تبدیلیوں سے بچانے کے لیے رسولؐ نے علیؑ اور آلِ علیؑ کو اپنا جانشین بنانا چاہا تھا۔ اسی لیے وہ اپنا اعتماد ان لوگوں کو سونپنا چاہتے تھے۔

معلوم نہیں زرمی صاحب عقلِ عمومی کو بیچ میں لاکر کیوں بدنام کر رہے ہیں وہ کیوں اسے نسلی امتیاز سمجھتے ہیں۔ وہ اسے اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتے کہ جو رسولؐ کے مقاصد کو سب سی اچھی طرح اجاگر کر سکے وہ خلیفہ ہو۔ رسولؐ کی سمجھ میں یہی آیا تھا کہ ان کے خاندان والے اس کے سب سے زیادہ موزوں ہوں گے۔ انھوں نے کہہ دیا اور دنیا اسے جھٹلا نہ سکی۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ان کے خاندان کے لوگ کم سے کم بارہ پشت تک دنیائے اسلام کے سب سے بڑے عالم تھے۔ جس وقت وہ تھے ان کے مقابل میں کوئی دوسرا نہ آسکتا تھا یہ اور بات ہے کہ انھیں موقع نہ ملا اور ان کی عمریں قیدخانوں کی تاریکیوں میں ختم ہوگئیں۔ یہ تو کنبہ پروری اور نسلی تفوق نہ ہوا بلکہ ایک بہت بڑی بات ہوئی اور وہ یہ کہ جو سب سے زیادہ اہل ہو وہی میرا جانشین ہو۔ انھوں نے دوسری طرح کہا کہ میرے خاندان کے لوگ میرے جانشین ہوں گے۔ کیونکہ وہی اس کے اہل ہیں۔ صرف کسی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دشمنی کا پیدا ہوجانا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسولؐ ایک مدت مقرر کرنا چاہتے تھے۔ جس میں ان کا خیال تھا کہ اسلام کی روح اور حقیقت عوام کی سمجھ میں آجائے گی۔ اور وہ ان کے مطالعۂ وقت کے حساب سے بارہ پشتوں تک جاتی تھی۔ غالباً یہ مدت ایک انقلاب کی کامیابی کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس لیے انھوں نے بارہ خلافتوں کا تذکرہ بھی کردیا۔ زرمی صاحب اسے غور سے نہیں دیکھتے اور اگر دیکھتے ہیں تو کہنا نہیں چاہتے۔ بلکہ چند

پیش پا افتادہ الفاظ سے کام لے کر جن سے آج نفرت کی جاتی ہے۔ رسولؐ کے اس اہم فیصلہ کی وقعت پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں۔ نسلی امتیاز اور خاندانی تفوق شخصیت پرستی اور قبیلہ پرستی کا اسلام دشمن تھا، لیکن قابلیت اور عمل کا نہیں، اہلیت اور علم کا نہیں، رسولؐ اسپرٹ کو دیکھتے تھے الفاظ کو نہیں، بزمی صاحب الفاظ کو دیکھتے ہیں، وہ اس پر ماتم کرتے ہیں کہ رسولؐ کے خاندان کے لوگ خلیفہ کہے جاتے ہیں اس پر نہیں روتے کہ رسولؐ کے مرتے ہی پھر قبیلہ پرستی یعنی بھیانک شکل میں آگئی، وہ اس پر افسوس کرتے ہیں کہ رسولؐ نے اپنے خاندان کے قابل افراد کا نام کیوں لے دیا۔ انھیں اس کا رنج نہیں کہ تختِ خلافت پر کیسے کیسے لوگ جلوہ افروز ہوئے، اور اسلام کی کیا شکل ہوگئی۔ کسی خاص نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حقوق کا سلب ہو جانا عصرِ حاضر میں سمجھ میں آنے کی بات نہیں، میں پھر عرض کرتا ہوں کہ رسولؐ کا منشا علیؑ کو اپنا جانشین بنانے میں اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ اپنی پالیسی کا تسلسل چاہتے تھے عرب کے لوگوں نے علیؑ کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ وہ دوسری طرف جانا چاہتے تھے۔ اور خلفائے اسلام انھیں اسی طرف لے گئے۔ رسولؐ عوام پر بھروسہ نہ کر سکتے تھے کیونکہ ان میں ذہنی بیداری اور سیاسی عقل نام کو نہ تھی۔

رسولؐ کے اس منشاء کو الوہی خلافت سمجھا جائے۔ اس پر میں کچھ زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ میرے پیش نظر قرآن کی وہ آیت ہے جس میں صاف لکھا ہے کہ رسولؐ کا ہر کام خدا کے حکم کے بعد ہوتا ہے۔ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ اگر ہم قرآن کو الہامی کتاب مانتے ہیں تو رسولؐ کا الٰہی پیامبر ہونا بھی ممکن ہے اور علیؑ کا الوہی خلیفہ بھی۔ ورنہ یہ بحث ہی باقی نہیں رہتی۔ جب قرآن خدا کا کلام ہی نہیں تو پھر نہ کوئی خدا کا رسولؐ ہے اور نہ الٰہی خلیفہ۔

— بزمی صاحب نے ایک دلچسپ مگر غیر ضروری بحث اور چھیڑ دی ہے۔ انھوں

نے ڈکٹیٹر "Dictator" یعنی آمر اور آٹوکریٹ رولر "Autocrat Ruler" یعنی مطلق العنان بادشاہ کا جو امتیاز پیش کیا ہے وہ ان کے وسعتِ مطالعہ کا پتہ دیتا ہے اور میں اس سے متفق ہوں۔ لیکن انھیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ سیدھے سادے مسلمانی کو ان چیزوں سے مرعوب کرنا کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ اسلام کے خلفاء کو نہ تو ڈکٹیٹر بننا تھا اور نہ آٹوکریٹ رولر۔ وہ جو کچھ بن جائیں یہ دوسری بات ہے۔ لیکن جہاں تک اسلامی سیاست کا تعلق ہے وہ ڈکٹیٹر نہ ہو سکتے تھے کیونکہ وہ عوام کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے، بلکہ اپنی قوتِ عمل اور علم سے عوام کو اس سطح پر لانے پر مامور تھے، جہاں اسلام ہر فرد بشر کو لے آنا چاہتا ہے۔ وہ آٹوکریٹ رولر بھی نہ تھے کیونکہ ان کے لب و دہن سے نکلے ہوئے الفاظ قانون نہ بن سکتے تھے۔ ان کو قانون (قرآن) اور احادیث رسولؐ کا پابند ہونا بھی ضروری تھا۔

اس طرح آپ نے دیکھا کہ علیؓ اور آلِ علیؑ بارہ پشتوں تک کے لیے رسولؐ کے حکم کے مطابق ایک انقلاب کے حامی اور کارکن بن کر مطلق العنان بادشاہ نہ بن سکتے تھے، اور نہ رسولؐ ابدالآباد تک نسلی امتیاز قائم کر گئے تھے۔ اسلام ترقیوں اور تبدیلیوں سے نہیں روکتا۔ لیکن اسلام اسلام کو مٹانے سے ضرور روکتا ہے۔ بزمی صاحب نے اور بہت سی باتیں ضمناً کہی ہیں جو جواب چاہتی تھیں۔ لیکن میں اُنکے مضمون کا جواب نہیں بلکہ آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ یہ تو ان کا مضمون پڑھ کر بعض خیالات کے پیدا ہونے پر جی چاہا کہ آپ ہی سے گفتگو کر لوں۔ اور اگر آپ بہت زیادہ غیر مناسب نہ سمجھیں تو "نگار" کے پڑھنے والوں کو بھی شریک کر سکتے ہیں۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ جو نقطۂ نظر میں نے پیش کیا ہے وہ عقل اور اسلام کے مطابق ہے۔

خدا کرے اس مسئلہ پر کچھ بے لوث سوچنے والے مل جائیں، کیونکہ یہ محض۔

ایک تاریخی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت اس طرح اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ ہم ایک نظریۂ انقلاب کو (جو رسول ؐ نے پیش کیا تھا) قبول کر کے چلانا بھی چاہتے ہیں یا نہیں اگر واقعی رسول مقبول ؐ کوئی اچھی چیز دے رہے تھے تو ان کے منشار کے مطابق اس کی اشاعت کے ذرائع پر عمل بھی ضروری تھا۔ ورنہ یوں تو جو کچھ ہو گیا اس کی بحث ہی بیکار ہے۔ بزمی صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ یہ تمام مضمون نگاری علماء اور عوام پر ذرا بھی اثر نہیں ڈال سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہم اپنے بزرگوں کی غلطیوں کا اعتراف کرنے میں جھجکتے ہیں۔

میں نے آپ کا بڑا وقت لیا، اور اگر آپ نے اسے "نگار" کے حوالہ کر دیا تو "نگار" کے کئی صفحے بھی لے گا۔ مگر کیا کروں چپ بھی نہ رہا گیا۔ میرے پاس علاوہ بزمی صاحب کے مضمون کے کوئی کتاب نہ تھی۔ زیادہ تر یادداشت پر بھروسہ کر کے لکھا ہے خدا کرے آپ کو پسند آئے۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام

نیاز مند:۔

احتشام رضوی ماہلی ایم۔ اے

مسئلہ خلافت و امامت

آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

مسئلۂ خلافت و امامت

"نگار" کی بساطِ بحث پر اس مسئلہ کو آئے ہوئے ڈھائی برس کا طویل عرصہ گذر چکا ہے سب سے آخر میں گذشتہ جنوری کے پرچہ میں میرا مبسوط مقالہ اس موضوع پر شائع ہوا تھا جس کے بعد "نگار" کی طرف سے علمائے اہلسنّت کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ اس سلسلہ میں دو مضمون شائع ہوئے۔ ایک جناب ابوسعید بزمی ایم۔ اے کا جو اس موضوع پر اس سے پہلے بھی "ہرنام" کے ابتدائی مضمون کے جواب میں خامہ فرسائی فرما چکے تھے، اور دوسرا مضمون "م، ح" کا ہے جو نسبتاً طولانی ہے اور بعد کو شائع ہوا ہے۔

جس شخص نے نگار میں اس بحث کا شروع سے مطالعہ کیا ہو اور ہرنام صاحب کے ابتدائی مضامین نگار کا محاکمہ اور ادارتی تبصرے اور آزاد خیال شیعہ کا شائع شدہ مضمون پڑھا ہو اور اس کے بعد ان دونوں آخری مضمونوں کو دیکھے وہ اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس بحث کا جو معیار آزاد خیال شیعہ کے مضمون تک قائم رہا ہے وہ ان آخری مضامین سے مختلف ہے۔ جناب بزمی صاحب کا مضمون تو مغز استدلال کے اعتبار ہی سے اس قدر ہلکا ہے کہ اُسے نگار کے معیار پر منطبق نہ ہونا چاہیئے تھا! لیکن "م، ح" کا مضمون تو مناظرانہ تعریضات غیر متعلق الزامات اور فریق مخالف کے خلاف بیجا نکتہ چینیوں اور تشنیعات نیز درشت و ناگوار تعبیرات سے اس درجہ مملو ہے کہ وہ نگار کے بجائے "النجم" کے صفحات پر ظاہر ہوا ہوتا تو بجا اور مناسب تھا۔

سابقہ مقالات کا متین پہلو اس درجہ وزن رکھتا ہے کہ اس کا اقرار و اعتراف

جناب "م ح" کو بھی حسب ذیل الفاظ میں کرنا پڑتا ہے :۔

"سب سے پہلی بار اس مشہور مختلف فیہ مسئلہ میں سنجیدگی کے ساتھ نگار ہی کے صفحات پر بحث جاری ہوئی ہے اور جس نے بھی اس میں حصہ لیا متانت نگاری سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔"

لیکن خود موصوف نے اپنے اس مضمون میں اس اصول کی کہاں تک پابندی کی ہے اس کے لیے حسب ذیل اقتباسات کافی ہیں :۔

"حکومتِ الٰہیہ کے بارے میں کیوں ایسی مہمل شرائط بیان کی جاتی ہیں کہ خلیفہ صرف امام ہی ہو سکتا ہے، اور امام صرف خاندانِ نبوت کے افراد ہو سکتے ہیں ———— کیونکر اسے کوئی عقل والا انسان باور کر سکتا ہے۔"

"ایک امام صاحب کو غار میں رہنے کا حکم دیا گیا جن کا وجود و عدم برابر ہے ———— اس قسم کے معتقدات اسلام کے ساتھ مذاق و استہزار کے مرادف ہیں۔"

"ولکنی اقول لکم لا تکادون تفقهون حدیثا"

"میں نہیں سمجھتا کہ ایک آزاد خیال انسان کے لیے یہ علمی فریبکاری کہاں تک روا قرار دی جاسکتی ہے" ———— "صاحبِ تبصرہ نے یا تو یہ سمجھا ہی نہیں کہ "نص قطعی" کسے کہتے ہیں یا دیدہ و دانستہ جُل دینے کی کوشش کی ہے۔" ———— "میں بتاؤں گا کہ اس آیت سے استدلال میں کس قدر فریب سے کام لیا گیا ہے" ————
"دلیل کی قطعیت تو اسی حرکتِ ناشائستہ کے باعث سوخت ہو گئی"
"تہذیب مانع ہوتی ہے ورنہ میں کہتا کہ بڑی ہی خیانت و بددیانتی ہے

کام لیا گیا ہے "تہذیب مانع ہوتی ہے" کا فقرہ خود احساس بدتہذیبی کا آئینہ دار ہے جس سے معلوم نہیں جرم سنگین ہوتا ہے یا سبک) — "محض فریب دینے اور ناواقف کو گمراہ کرنے کے لیے دو درجن کتابوں کے نام نقل کر دیے کہ ان لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے، چاہے وہ جعلی ہی کیوں نہ ہو۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ روایت قطعی جھوٹی اور جعلی ہے۔ اس کی صحت کا ثبوت قیامت تک پیش نہیں کیا جا سکتا" —— (ان فقرات میں انتہائی غیظ و غضب اور غصہ صاف ظاہر ہے۔ یہ چیز سنجیدگی بحث کے لیے سم قاتل ہے)

—— "کیا قرآن میں یہ لغویت ہو سکتی ہے" —— "مان لو کہ اس سے حضرت علیؓ کی خلافت کا ثبوت ملتا ہے لیکن (ع) یہ تو سوچو کہ فلک ٹوٹ پڑے گا کس پر" —— "آیت کے شان نزول میں غدیر خم کی روایت کی اختراع کی گئی۔ نتیجہ یہ رہا جو سامنے ہے اور میں بجز اس کے کیا لکھوں (ع) در کفرہم ثابت نہ زنار را رسوا مکن" —— "استدلال کی ماہیت پر غور کرو جس میں خدا اور رسولؐ کے ساتھ کس قدر گستاخیاں ہیں اور اسلام کے ساتھ کیسا کھلا ہوا تمسخر ہے" —— "افسوس "نام زہر آبردن و دین یہودی داشتن"" —— "جوہر لطیف سے بہرہ مند اشخاص ان کی استدلالی حیثیت کو ذرہ برابر بھی وقعت نہیں دے سکتے، ہٹ دھرمی اور کجروی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں اس کا معاملہ صرف خدا پر ہے" —— "ادعائے باطل کے اثبات کے لیے جب دلائل و حجج کی دنیا میں قدم رکھا گیا تو ہر ہر قدم پر بے کسی نے فریاد کی۔ اور ہر ہر گام پر تہی مائگی نے مرثیہ پڑھا، درایت نے دامن

تھا اور عقل نے ہاتھ پکڑ لیا۔ غرض بے چارگی کی جس قدر مایوسیاں ہو سکتی ہیں وہ خود خرمنِ دلائل کے حق میں برق و شرر ثابت ہوئیں۔" ———

"خلافتِ علیؓ ——— بعض مفسدین کا اختراعی مسئلہ ہے۔ اور اس قدر مہلک و خطرناک کہ اس کی بدولت قرآن کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے"

یہ اقتباسات سنجیدہ طبقہ کے غور و سکون کے لمحوں کے لیے سامنے ہیں۔ یہ اس بحث کا حسرت خیز انجام ہے جس میں متانت نگاری کو سنگِ اساسی قرار دیا گیا تھا۔

ان اقتباسات کے متوازی الفاظ و تعبیرات اس کے پہلے کے مضامین میں ڈھونڈنے سے بھی دستیاب نہیں ہو سکتے۔ موجودہ اقتباسات کی سپرٹ کا جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے گفتگو کم از کم "آپ" سے "تم" کے درجہ تک پہنچ گئی ہے اور "تو" کا درجہ بہت قریب ہے۔ عام افراد کی افتادِ طبع کے مطابق اور عام اصولِ مناظرہ کے موافق جہاں "کلوخ" و "سنگ" کا تبادلہ آئینی حیثیت سے "منصفانہ" قرار دیا گیا ہے اور "البادی اظلم" کا عام سارٹیفکیٹ اس کی صفائی میں دے دیا گیا ہے۔ اگر میں بھی اس مضمون کا حقیقتاً جواب لکھوں تو پھر صدا! حضرت نیاز کو بھی نہ فریاد کا حق ہوگا اور نہ مضمون کے ایسے اجزا پر قلمِ نسخ پھیرنے کا۔ مگر میں خود اس طریقۂ تحریر کو نہ پسند کرتا ہوں اور نہ اثباتِ مطلب کے سلسلہ میں مفید اور حقیقتاً ذاتی طور سے اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں جسے مدیر نگار نے اپنے ایک نوٹ میں بایں الفاظ روشن کیا ہے کہ "گالی کا جواب گالی سے دینا برا نہیں لیکن اسی وقت جب ہم پہلے یہ تسلیم کر لیں کہ سب سے پہلے جس نے گالی دی اس نے کوئی اچھا کام کیا تھا۔"

اس لیے مجھ سے اس امر کی توقع نہ کرنا چاہیے کہ میں اپنے زیرِ تحریر مقالہ میں کسی ایسی بات کا جواب دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس طرح کی ضرورت ہی پیش

آسکتی تھی جب میرا استدلالی پہلو کسی طرح کمزور ہوتا، لیکن جبکہ مجھے اپنی حقانیت پر اعتماد ہے اور استدلال کی طاقت پر پورا بھروسہ تو اس طرح کا اندازِ تحریر اختیار کرنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

غرض یہ ہے اس مضمون کی پہلی کمزوری جو بہت نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

دوسری بات غیر متعلقہ مباحث کا چھیڑنا۔ یہ بھی عام فنِ مناظرہ کا دلچسپ کرتب ہے۔ اس سے مقصود یہ ہوا کرتا ہے کہ مخاطب کو ان اجنبی مباحث میں الجھا کر اصل بحث میں گفتگو سے باز رکھا جائے۔ اس کا ارتکاب بھی زیادہ تر اس وقت کیا جاتا ہے جب اصل موضوع میں اپنی وسعتِ بیان اور طاقتِ استدلال پر اعتماد نہ ہو۔ یہ جوہر اس مضمون میں کافی درخشاں ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ سوائے چند مسلکوں کے تمام وہ الزامات جو فرقۂ شیعہ کے اوپر مختلف مسائل میں عائد کیے جاتا کرتے ہیں اس مقالہ میں مندرج ہیں۔ مثلاً "بداء" انکارِ ختمِ نبوت، افسانۂ ابنِ سبا، تحریفِ قرآن۔ غور کیا جائے تو بھی انی گنی چند باتیں ہیں جن کے الفاظ بدل بدل کر رٹ لگانے میں "النجم" کی ساری عمر ختم ہوئی۔ ایک تو فرقۂ شیعہ پر ان میں سے اکثر الزامات کا عائد کرنا ہی بالکل غلط ہے کیونکہ بداء کے مسئلہ میں احادیث اور علمائے شیعہ کے اقوال دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ وہ اسے بمعنی لغوی "ظهر له ما لم يظهر" حضرت احدیت کے لیے غیر ممکن سمجھتے ہیں۔ جس چیز کو بداء کے نام سے تعبیر کرتے ہیں وہ اہلِ سنت کے متفقہ احادیث و روایات میں بھی موجود ہے اور قرآن میں بھی مندرج ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اہلِ سنت اس کو بداء نہ کہیں کسی اور لفظ سے اس کو یاد کریں۔ پھر ایسے تعبیری اختلاف کی بنیاد پر یہ حق کہاں پیدا ہوتا ہے کہ شیعوں کی نسبت اس خلافِ واقعہ اظہار سے کام لیا جائے کہ وہ "بداء" بمعنی لغوی کے قائل ہیں۔ اسی طرح ختمِ نبوت کے مسئلہ

میں بھی شیعہ [illegible] کو صحیح [illegible] سمجھتے [illegible]

سے بالکل مساوی تھے۔ پھر اس چیز کو پیش کرنے اور اس پر زورِ قلم صرف کرنے سے حاصل۔

ابنِ سبا، یہودی کے عقائد سے شیعیت کا ماخوذ ہونا۔ یہ بھی ایک ایسی بے بنیاد روایت ہے جس کا درایت سے کوئی لگاؤ ہی نہیں ہے۔ قاعدہ ہے کہ کسی مذہب کے افراد اس اپنے پیشرو کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں جو اُن کے عقائد کا اصلی بانی ہو۔ یہی علامت ہوتی ہے جس سے کسی فرقہ کے لوگ اپنے پیش رو کی کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ لیکن ابنِ سبا کو ہمیشہ شیعہ کافر، ملعون، مطرود و مردود لکھا کیے اور کہتے رہے۔ پھر اس کے کیا معنی کہ شیعی عقائد کا بانی ابن سبا کو قرار دیا جائے۔

اس کے برخلاف عبداللہ ابن سلام اور کعب الاحبار نو مسلم یہودیوں کے روایات کو اہلِ سنت سر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور عہدِ فاروقی میں دربارِ خلافت کے اندر ان کو وہ عزت حاصل تھی کہ بہت سے صحابۂ کبار کو شائد وہ عزت حاصل نہ تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں جہاں تک قصص کا تعلق ہے ان لوگوں کے بیان کردہ روایات (اسرائیلیات) کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ اسلام کے پاکیزہ روایات یہودیوں کے مزعومہ خرافات میں مل کر گم ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا اثر شرعی احکام پر بھی پڑا۔ چنانچہ روزِ عاشورہ کے روزہ کی تشریع یہودیت ہی کے زیر اثر پایۂ تکمیل کو پہنچی، اور عقائد پر بھی۔ چنانچہ یہود کا عقیدہ ہے کہ یداللہ مغلولۃ یعنی خدا جو کچھ قضا و قدر کرنا تھا کر چکا، اور اب اس کے ہاتھ بالکل بندھے ہیں۔ کسی طرح کی کارگذاری کا موقع باقی نہیں ہے —— اہلِ سنت کے اندازِ انکارِ "بدا" کی صورت سے ظاہر ہوا۔

مؤرخانہ تحقیق و تفتیش اور واقعات کی فلسفیانہ تحلیل اس کا سبب یہ بتلاتی ہے کہ خود حضرت عمر کو مدینہ میں آنے کے بعد یہودیوں کے مقدس روایات کے ساتھ خاص شغف ہو گیا تھا، جس کا مظاہرہ رسالتمآبؐ کے سامنے تک ہوا اور حضرت

کو تنبیہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت سے اجازت مانگی کہ میں یہود کے احادیث کو لکھا کروں، کیونکہ میں سنتا ہوں تو وہ مجھے بہت پسند آتی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کیا تم لوگ اسی طرح گمراہ ہونا چاہتے ہو جس طرح یہود و نصاریٰ گمراہ ہوئے[۱]۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ آنحضرت صلعم کے پاس ایک کتاب لائے جسے آپ نے بعض اہل کتاب سے حاصل کیا تھا تو حضرت غضبناک ہوئے اور فرمایا تم لوگ ضرور اسی طرح گمراہ ہو گے جس طرح یہود و نصاریٰ گمراہ ہوئے[۲]۔ تیسری روایت میں یہاں تک ہے کہ آپ حضرتؐ کے پاس توریت کا ایک نسخہ لے کر آئے اور بڑے ذوق و شوق سے کہا، کہ "یہ توریت کا نسخہ ہے" حضرتؐ نے سکوت فرمایا آپ نے پڑھنا شروع کر دیا اور رسالتمآبؐ کا چہرہ متغیر ہونے لگا لیکن آپ کو کوئی توجہ نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا "ارے خدا تجھے غارت کرے تو دیکھتا نہیں کہ رسالتمآبؐ کے چہرہ کا کیا عالم ہے[۳]"

ممکن ہے کہ رسول اللہؐ کی تنبیہ کا اس وقت آپ پر حقیقی اثر ہوا ہو مگر واقعات بتلاتے ہیں کہ آپ کی دلچسپی یہود کے لٹریچر کے ساتھ برابر قائم رہی۔ جس کا پورا مظاہرہ آپ کے دورِ حکومت میں ہوا اور کعب الاحبار کے روایات کو آپ کی بدولت وہ اہمیت حاصل ہو گئی کہ وہ احادیث کی ہم پلہ سمجھی گئیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ "فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون[۴]" کی شرح میں اسلامی تفاسیر علمائے اہل کتاب کی طرف رجوع کا فتویٰ دے رہے ہیں[۵] جس کی رد شیعوں کے امام محمد باقرؑ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "اگر یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کریں تو وہ اپنے مذہب کی

---

[۱] مشکوٰۃ مطبوعہ اصح المطابع ص۳۰ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ [۲] کنز العمال مطبوعہ حیدرآباد جلد ۱ ص۵۱۔ [۳] مشکوٰۃ مطبوعہ اصح المطابع ص۳۲ [۴] سورۃ انبیاء پ۱۷

[۵] لباب التاویل خازن جلد ۳ ص۲۳۴ معالم التنزیل بغوی برحاشیہ تفسیر خازن صفحہ مذکورہ

دعوت دیں گے مسلمانوں کو صحیح راستہ کب بتلائیں گے" ——— ان حقائق کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک بجا ہے کہ شیعیت یہود سے ماخوذ ہے۔ اور سنیت اس طرح نہیں ہے۔ کیا اس کے لیے رجال کشی کا ایک مجہول الاسم نقل قول اور مخالفین شیعہ کی طرف منسوب شدہ مزعومہ ثبوت کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ جبکہ خود کشی کے متعلق یہ معلوم ہے کہ "مروی عن الضعفا کثیرا" انھوں نے ضعیف اشخاص سے بہت روایات نقل کیے ہیں اور ان کی کتاب رجال کی نسبت معلوم ہے "انّ فیہ اغلاطا کثیرا" یہ کہ اس میں بہت سی غلطیاں ہیں[1]

اسی طرح تحریف قرآن کے متعلق جمہور شیعہ کا یہ عقیدہ بارہا روشنی میں آچکا ہے کہ وہ اس میں کمی زیادتی کے قائل نہیں ہیں اور قائلین تحریف بعض اخباری علماء ہیں جو شیعوں میں اہل حدیث کی حیثیت رکھتے ہیں اور محققین کے زمرہ میں نہیں شامل ہیں۔

جمہور شیعہ کی طرف تحریف قرآن کی نسبت یہ ایک ایسا غلط تخیل ہے جس کی غلطی کا احساس بعض انصاف شیوہ محقق علمائے اہلسنّت نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ علامہ مہاجر شیخ رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب اظہار الحق میں اس سلسلہ میں متقدمین و متاخرین علمائے شیعہ کے اقوال نقل کرنے کے بعد صاف تحریر کیا ہے کہ: "فظہر ان المذہب المحقق عند علماء الفرقۃ الامامیۃ الاثنیٰ عشریۃ انّ القرآن الذی انزل اللہ علیٰ نبیہ ھو ما بین الدفتین وھو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذٰلک" "گذشتہ تصریحات سے ظاہر ہوا کہ تحقیقی مسلک علمائے فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کا یہی ہے کہ قرآن جسے خدا نے اپنے نبیؐ پر نازل کیا ہے وہ یہی ہے۔ جو دونوں دفتیوں کے درمیان موجود ہے اور وہ وہی ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اور وہ اصل میں اس سے زیادہ نہیں ہے۔"

پھر لکھا ہے: "والشرذمۃ القلیلۃ منہم التی قالت بوقوع التغیر فقولہم مردود عندہم ولا اعتداد بہ فیما بینہم"۔ "ایک بہت چھوٹی جماعت ان میں سے

---

[1] مستدرک الوسائل جلد ۳ ص ۵۲۹

جو تغیر واقع ہونے کی قائل ہے ان کا قول علمائے شیعہ کے نزدیک ناقابلِ قبول ہے اور لائق اعتبار نہیں ہے[1]

عصرِ حاضر کے مشہور امیر البیان کاتب الشرق امیر شکیب ارسلان نے بھی لکھا ہے: —

"انّ لبعض الغلاة من الشیعة لا جمهورهم یزعمون ان القرآن الکریم ایضاً حذف منه واضیف الیه" "بعض اشخاص غلاۃ شیعہ ہیں نہ جمہور اس کے قائل ہیں کہ قرآنِ کریم میں بھی کمی و زیادتی ہوئی ہے[2]"

جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ کا رسالہ "تحریف قرآن کی حقیقت" جو امامیہ مشن لکھنؤ سے شائع ہوا ہے اس باب میں سندِ قطعی ہے اور شاید اسی رسالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناب خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ: "تمام جمہور شیعہ موجودہ قرآن مجید کو کامل و اکمل اور صحیح مانتے ہیں۔ چنانچہ میں نے لکھنؤ کے ایک مجتہد صاحب کی ایک واضح کتاب موجودہ ترتیب کی تائید میں پڑھی ہے جو اردو زبان میں ہے اور اس کے مصنف بھی موجود ہیں اور وہ کتاب بھی موجود ہے[3]"

اس حقیقت کی موجودگی میں اس مسئلہ کو اٹھانا اور فصل الخطاب کی عبارت کو جس کے مصنف خود اہل حدیث میں سے تھے اور مجتہد نہیں تھے اپنا مستند قرار دینا یا بعض روایات سے جن کی سند و دلالت شیعوں کے نزدیک تسلیم نہیں ہے تمسک کرنا صرف مناظرانہ سخن پروری ہے۔ حالانکہ خود اہلِ سنّت کے روایات سے قرآن رسالتمآب کے زمانہ میں جمع نہیں ہوا تھا۔ اور وہ مجموعی طور پر اس وقت کسی کو یاد بھی نہیں تھا۔ اور اس میں ایسی آیتیں بھی موجود ہیں جو متواتر نہیں ہیں بلکہ صرف کسی ایک صحابی کے پاس تھیں اور اسکے اعتماد پر لکھی گئی ہیں[4]

---

[1] اظہار الحق جلد ۲ ص ۸۹ [2] مقدمہ کتاب النقد التحلیلی لکتاب الادب الجاہلی الاستاذ محمد احمد الغمراوی مطبوعہ قاہرہ ص ۳۱۔ [3] "منادی" دہلی ۲۷ اگست سن ۱۹۳۷ء

[4] صحیح بخاری مطبوعہ کرزن گزٹ پریس دہلی ص ۷۴۵۔

اور بہت آیتیں شاہدین عادلین کی گواہی سے درج کی گئیں[1] اور کسی ایک صحابی کی بیان کی ہوئی آیت اس وقت تک درج نہ کی جاتی تھی جب تک کوئی دوسری گواہی نہ مل جائے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان تمام صحابہ میں سے ہر ایک کے بیان کردہ آیات قرآن میں درج نہیں ہیں اس لیے ان صحابہ کی ذاتی رائے میں یہ قرآن ناقص ہی قرار پاتا ہوگا[2] صحابہ کرام نے رسالتمآبؐ کے بعد اپنی اپنی یادداشت پر قرآن کی ترتیب دی لیکن ان صحابہ کے جمع کردہ مصاحف ترتیب کے لحاظ سے بالکل مختلف[3] تھے۔ قرآنی آیات میں بعض صحابہ ایسے اضافہ کرتے تھے جو موجودہ قرآن میں موجود نہیں ہیں[4] اور اکثر کلمات میں صحابہ آپس میں اختلاف رکھتے تھے یعنی کوئی کچھ پڑھتا تھا اور کوئی اس کے خلاف کچھ اور۔[5]

حضرت عثمان نے ان تمام مختلف مصاحف اور قرآتوں کو جمع کرکے ان میں ایک کو اختیار کرکے باقی سب قرآنوں اور صحفوں کو جلوا دیا اور باوجودیکہ پہلی مرتبہ جمع قرآن میں پوری کاوش ہو چکی تھی لیکن اس موقع پر پھر جمع قرآن کے وقت بعض آیتوں کی کمی کا پتہ چلا جو ایک صحابی کے اعتماد پر لکھی گئیں[6] اس کے علاوہ الفاظ میں بعض غلطیاں تھیں جنھیں درست کیا گیا۔[7] بعض جگہ کی آیتوں کے متعلق معلوم ہوتا تھا کہ کسی خاص شخص کے پاس ہیں اور وہ شہر میں موجود نہیں ہے تو ان آیتوں کی جگہ چھوڑ دی جاتی تھی کہ جب وہ شخص واپس آئے تو اس سے پوچھ کر لکھی جائیں۔[8] نسخہ اصل اجزائے قرآنی کا جو ام المومنین حفصہ کے پاس موجود تھا حضرت عثمان نے منگوا کر پانی سے دھو ڈالا۔[9] ام المومنین عائشہ کے نزدیک اس قرآن میں کتابت کی غلطیاں ہیں۔[10]

---

[1] اتقان جلد ۱ ص۶۰ مطبوعہ مصر [2] اتقان جلد ۱ ص۵۹ [3] اتقان جلد ۱ ص۶۶
[4] صحیح بخاری (مناقب ابن مسعود) مطبوعہ کرزن گزٹ پریس دہلی ص۵۳۲ (باب من القی لہ الوسادہ ص۹۱۹
[5] بخاری کرزن گزٹ پریس ص۷۴۶ وتفسیر جامع البیان طبری مطبوعہ مصر جلد ۱ ص۲۰۔ [6] بخاری ص۷۴۶
[7] اعجاز القرآن رافعی مطبوعہ مصر ص۴۶ [8] جامع البیان طبری جلد ۱ ص۲۱ [9] جامع البیان ص۲۱

نیز اس کے الفاظ میں تحریف ہوئی ہے۔ ابن عباس اور سعید بن جبیر بھی اس کے قائل تھے[1]
نیز یہ کہ اس میں حضرت عثمان کے ہاتھوں تغیّر و تبدّل ہوا ہے[2] اور قرآن کا کثیر حصّہ حضرت
عثمان کو نہ مل سکا[3]۔ اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہمیں سب قرآن مل گیا کیونکہ اس کا کثیر حصہ تلف
ہو چکا ہے[4]۔

اب ان روایات کی موجودگی میں کیا یہ کہنے میں کسی طرح کی شرمندگی نہ ہونا چاہئے۔ کہ شیعہ تحریفِ قرآن کے قائل ہیں اور اہلسنت نہیں ہیں۔ اگر صرف روایات ہی کا موجود ہونا عقیدۂ تحریف کی دلیل ہے تو اہلِ سنت بھی تحریف کے معتقد ہیں اور اگر اعتقاد پر مبنی ہے تو شیعہ بھی تحریفِ قرآن کے عقیدہ سے بالکل بری ہیں اور ان کے جمہور کی طرف اس اعتقاد کی نسبت ہرگز درست نہیں ہے۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر ان تمام الزامات کو فرقۂ شیعہ کے بارہ میں صحیح مان لیا جائے تو بھی اس کا نفسِ مسئلہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ بحث خلافتِ امیر المومنینؑ سے ہے۔ فرض کر لیجیے کہ شیعوں کا عقیدہ بداء کے بارے میں غلط ہے۔ ائمہ کو مساوی رسولؐ سمجھنے میں باطل۔ تحریفِ قرآن کے بارے میں ناقابلِ قبول۔ لیکن پھر بھی اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ امیر المومنینؑ رسولؐ کے خلیفۂ بلافصل ہونے کے مستحق نہیں تھے، اور عقیدۂ امامت غلط ہے جبکہ نگار کے بحث کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک ہندو "ہر نام" نے اس حقیقت پر تبصرہ کیا اور ایک وسیع الخیال انسان مدیر نگار نے اس پر محاکمہ لکھا اور ایک ایسے آزاد خیال شیعہ نے اس پر اظہارِ خیال کیا جو خلافتِ امیر المومنینؑ کے مسئلہ میں باقی گیارہ اماموں کی امامت کو بھی معرضِ بحث میں لانے پر آمادہ نہیں ہے۔ اور غیبتِ مہدیٔ موعود ایسے مسئلہ کی تصدیق کی ذمہ داری تک اپنے سر نہیں لیتا تو بتایئے

---

[1] اتقان جلد ۱ صفحہ ۱۸۴۔ [2] اتقان جلد ۲ ص ۲۵ [3] اتقان جلد ۲ ص ۲۵
[4] اتقان صفحہ مذکورہ۔

اس جگہ شیعوں کے دیگر صحیح یا غلط عقائد کو جو مختلف فیہ ہیں، محل بحث میں لانے سے فائدہ، بہت ممکن ہے کہ وہ شیعی تبصرہ نگار یا ہندو محقق ان تمام شیعی عقائد کو واقعی غلط سمجھتا ہو، لیکن پھر بھی اس حقیقت کو مانتا ہوں کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو اپنے بعد کے لیے خلافت کے واسطے نامزد کیا۔

مسئلہ خلافت و امامت کی بحث میں جو ایک مخصوص موضوع ہے ان مباحث کا چھیڑنا ہرگز ہرگز اپنے موضوع بحث کی کوئی صحیح خدمت نہیں قرار پاسکتی بلکہ یہ شبہ پیدا کرنے کا موجب ہے کہ اصل موضوع میں اپنی استدلالی بے مائگی کا احساس تھا اس بنا پر ان غیر متعلقہ مباحث کو بیچ میں لایا گیا۔

تیسری کمزوری مناظرانہ تعریضات پر مشتمل ہونا۔ یہ بھی اس مضمون میں موجود ہے چنانچہ عصمت کی بحث کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

> چونکہ حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات بہت کم پائے جاتے ہیں اس لیے میں ان کی کتابوں سے رسولؐ کے سہو و نسیان کی بابت کوئی ثبوت نہ پا سکا۔"

مجھے اس تعریض کے سلسلہ میں افسوس کے ساتھ یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ شیعوں کی کتابوں میں رسول اللہؐ کی نسبت ایسے حالات ہرگز نہیں پائے جاتے کہ:۔

> "رسول اللہؐ قبلِ بعثت خود بھی اصنام کی قربانی کے ذبیحہ کو کھاتے تھے اور اپنے مہمانوں کو پیش کرتے تھے۔ جس پر بعض مہمانوں نے (جو موحد تھے) عذر کیا کہ ہم اصنام کے ذبائح کا استعمال نہیں کر سکتے" (بخاری مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ جلد ۳ صفحہ ۲۰۶ و ۲۰۷) "آنحضرتؐ کے پاس بعثت کے موقع پر فرشتہ آیا تو آپ ڈر گئے اور بدحواسی کی باتیں کرنے لگے اور کسی طرح یہ نہ سمجھے کہ آپ مبعوث برسالت کیے گئے ہیں، یہاں تک کہ آپ نے ام

زوجہ حضرت خدیجہؓ سے آکر فرمایا۔ اب مجھے اپنی جان کی خیر معلوم نہیں ہوتی۔" (بخاری جلد ۱ صفحہ ۳) "رسول اللہؐ نے مشرکین کے خوش کرنے کے لیے اس بات کی تمنا کی کہ کچھ آیات ان کی مرضی کے مطابق بھی نازل ہو جائیں، اور شیطان نے اس سلسلہ میں بتوں کی تعریف کی آیتیں آپ کی زبان پر جاری کر دیں جنہیں آپ نے قرآنی آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا۔ اور سب نے سُنا (تفسیر طبری مطبوعہ مصر جلد ۱۷ صفحہ ۱۳۱–۱۳۴، جلالین مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ صفحہ ۲۸۲، کشاف مطبوعہ مطبع شرقیہ مصر ۱۳۰۷ھ جلد ۲ صفحہ ۶۵) "رسول اللہؐ نے عرب کی ایک عورت کے حسن و جمال کا تذکرہ سن کر اسے مدینہ سے باہر ایک جگہ بلوا بھیجا اور اس سے اپنے مطلب کا اظہار کیا تو وہ خدا کی دہائی دینے لگی" (صحیح بخاری مطبوعہ مطبع حسینیہ مصریہ ۱۳۲۸ھ ج ۳ ص ۴۸) "آپ نے جونیہ کو مدینہ کے باہر ایک باغ میں بلوایا جہاں وہ اپنی دایہ کے ساتھ آئی۔ آپ نے اس سے خواہش کی کہ وہ اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دے تو اس نے کہا کہ ایک شاہزادی کی شان یہ نہیں ہے کہ ایک بازاری آدمی کو اپنا نفس ہبہ کر دے۔ آپ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو وہ دہائی دینے لگی۔" (صحیح بخاری مطبوعہ مطبع حسینیہ مصریہ ۱۳۲۸ھ جلد ۳ صفحہ ۱۷۹) "آپ نے کعبہ کی تعمیر کے موقع پر اپنی لنگی کھول کر اپنے کاندھوں پر رکھ لی اور برہنہ ہو گئے تو غش کھا کر گر پڑے، اس کے بعد آپ کبھی برہنہ نہیں ہوئے" (بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۳) "آنحضرتؐ بہت سی آیتوں کو بھول گئے جو بعض صحابہ کے پڑھنے سے آپ کو یاد آئیں" (صحیح بخاری مطبوعہ مطبع حسینیہ مصریہ ج ۴ ص ۱۵۵) "حضرت نے منافق کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ جب حضرت عمر نے آپ کا دامن پکڑ کر

کھینچا کہ آپ نماز نہ پڑھائیے مگر رسول اللہؐ نے سماعت نہ کی آخر قرآن کی آیت حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق نازل ہوئی" (بخاری مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۲۹۲)

"آپ اپنی بیوی حضرت عائشہ کو اپنے پیچھے کھڑا کر کے حبشیوں کا ناچ دکھلاتے تھے۔" (بخاری جلد ۱ ص ۶۳)

"رسول اللہؐ روزہ کی حالت میں حضرت عائشہ کے بوسے لیتے تھے" (بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۲۹) وغیرہ وغیرہ اور ایسے بہت سے حالات جن سے "رنگیلا رسول" ایسی رسوائے عالم کتاب تیار ہو گئی جس کا جواب مسلمانوں کی جانب سے اس کے مصنف کو سزائے موت دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بیشک شیعوں کی کتابیں رسول اللہؐ کے اس طرح کے حالات سے خالی ہیں۔

چوتھی کمزوری یہ ہے کہ اس مضمون کو ان تنقیحات کا پابند بنا کر نہیں لکھا گیا ہے، جو جناب مدیر نگار نے سوالات کی صورت سے قائم کیے تھے اور جن کی پابندی کے ساتھ "آزاد خیال شیعہ" نے جواب تحریر کیا تھا معاملہ فہمی اور تحقیق پسندی کا تقاضا یہ ہونا چاہیئے تھا کہ انھیں تنقیحات کی بنا پر بحث کی جاتی لیکن یہ صورت بحث کو محدود بنانی تھی۔ اس لیے بزمی صاحب نے بھی سہولت اسی میں سمجھی کہ خود مستقل تنقیحات قائم کر کے ان پر گفتگو کریں۔ اور "م۔ح" صاحب نے بھی فلاح و نجاح کا رمز اسی میں مضمر خیال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے مقالہ کے اکثر اجزاء بالکل نظر انداز کر دیے گئے اور ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا مجھے چونکہ بزمی صاحب اور "م۔ح" دونوں بزرگواروں کے ارشادات پر نظر ڈالنا ہے اس لیے میں ان دونوں مقالوں سے باعتبار مجموعی جو مباحث پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں تنقیحات کی صورت سے درج کرتا ہوں۔ اور پھر ان پر ترتیب وار تبصرہ کروں گا۔

⁂

تنقیحات

(۱) "عصمتِ انبیاءؑ" زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہونا چاہیے یا اس میں تفریق کی گنجائش ہے (۲) نظامِ خلافت کے متعلق "عقلِ عمومی" یا "حاسۂ اجتماعیہ" کا تقاضہ کیا ہے اور کیا شیعی اصول اس کے خلاف اور سنی اصول اس کے مطابق ہے۔ (۳) استحقاقِ خلافت کے شرائط کیا ہیں اور کیا وہ خلفائے ثلٰثہ میں مجتمع تھے اور حضرت علیؑ میں مفقود (۴) آیات سے استدلال کا معیار اور اخبار و احادیث کا درجہ (۵) حضرت علیؑ کی رائے خلفائے ثلٰثہ کے بارہ میں (۶) سنی شیعہ اختلافات میں سیاسی اغراض کی کارفرمائی (۷) کیا نفرت و عناد کی اسپرٹ شیعی مذہب کی وہ خصوصیت ہے جو اس کے اصلاحی یا الہامی ہونے کے خلاف ہے۔

* * *

تنقیح اوّل

عصمتِ انبیاءؑ میں تعمیم و تخصیص

نیازؔ صاحب نے اپنے محاکمہ میں اس کا اقرار کرتے ہوئے کہ "رسول اللہؐ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب امیرؑ خلیفہ قرار پائیں۔" یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ رسولؐ سے اس بارہ میں خطائے اجتہادی ممکن ہے۔ انھوں نے عصمت کے مفہوم کو گناہوں سے محفوظ ہونے میں محدود قرار دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ انسانی کمزوری سے جو بھول چوک اور اجتہادی غلطی ہوا کرتی ہے اس سے رسولؐ بھی مستثنٰی نہیں ہیں۔

میں نے اپنے تبصرہ میں جو اس محاکمہ سے متعلق تھا بالکل عقلی حیثیت سے یہ ثابت کیا تھا کہ رسولؐ کا جس طرح گناہوں سے معصوم ہونا ضروری ہے اسی طرح انھیں اس طرح کی

غلطیوں سے بھی محفوظ ہونا چاہئے۔

میں نے واضح کیا تھا کہ دنیا کے ہر شعبہ میں جس طرح کی عصمت ڈھونڈھی جاتی ہے وہی عصمت ہے اور اس طرح اسی کو رسولؐ میں مکمل طور پر ہونا چاہیے آخر میں میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جو لوگ رسولؐ سے خطائے اجتہادی کو ممکن قرار دیتے ہیں وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ خدا رسولؐ کو اس غلطی پر برقرار نہیں رہنے دیتا بلکہ اصلاح کر دیتا ہے۔ اس لیے اگر خلافت علیؑ بن ابیطالب کے متعلق رسول کی ذاتی رائے بھی تھی تو خدا کو اس کی اصلاح کرنا چاہیے تھی نہ کہ رسولؐ کی اس خطائے اجتہادی کی اپنی جانب سے اور تقویت کی جائے۔

بزمی صاحب نے تقریباً میری اس بحث سے بالکل اتفاق کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے مدیر نگار کی رائے کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"ممکن ہے یہ دلیل صحیح ہو لیکن اسے موجودہ بحث سے متعلق کرنا میرے نزدیک صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انبیاء سے بھول چوک ہو سکتی ہے تب بھی اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ کسی ایسے اہم مسئلہ میں بھی انبیاء سے مسلسل غلطی ممکن ہے جس کا تعلق مذہب کی اساس سے ہو اور جس غلطی کی وجہ سے ملت کا شیرازہ منتشر ہو جائے۔ تلواریں نیام سے کھنچ جائیں اور ابد الآباد تک کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا افتراق و انتشار کھڑا ہو جائے۔"

جناب "م۔ ح" کا بھی شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس مسئلہ میں میری بحث کی کامیابی کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک پہلو افتراق کا نکال کر خود اظہارِ خیال فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں:—

> "اخفاءِ حقیقت ہوگا اگر میں اس کا اعتراف نہ کروں کہ اس مسئلہ پر صاحبِ تبصرہ نے معقولیت کے ساتھ بحث کرنے میں بہت کامیاب کوشش کی ہے اگرچہ ذاتی طور سے مجھے ان خیالات سے چنداں اتفاق نہیں ہے اور

میں اس مسئلہ میں ایک حد تک نیاز صاحب کے نظریہ کی تائید کروں گا۔"

"درحقیقت اس مسئلہ میں الفاظ کی نزاکت کے باعث التباس پیدا ہوگیا ہے۔ صرف دو چیزیں ہیں۔ گناہ اور خطائے اجتہادی، بھول چوک کو بھی اسی خطا میں داخل سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک علیحدہ امر ہے۔ گناہ کی بابت محاکمہ اور تبصرہ دونوں میں بالاتفاق اعتراف کیا گیا ہے کہ انبیاء گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک بھی یہ درست ہے۔ خطائے اجتہادی اور بھول چوک میں اختلاف ہے ـــ نیاز صاحب کے نزدیک انبیاء سے خطاء اجتہادی کا وقوع و مدور ممکن ہے۔ اور بھول چوک بھی منافی عصمت نہیں۔ صاحب تبصرہ کو اس سے اختلاف ہے، وہ خطاء اجتہادی کو بھی ناممکن الوقوع سمجھتے ہیں (میں ناممکن کا اسی معنی میں استعمال کر رہا ہوں جو صاحب تبصرہ نے بیان کیے ہیں) ان کے پاس اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر نبی سے امکان خطاء و نسیان اور اس کا وقوع تسلیم کر لیا جائے تو سارا دین مشکوک ہو جاتا ہے۔ شریعت سے اطمینان و اعتبار ساقط ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ سارا بنا بنایا گھروندہ دم کے دم میں ڈھیر نظر آئے گا۔ حالانکہ یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔

رسولؐ کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو خالق سے وابستگی کی صورت میں ہوتی ہے اور دوسری وہ جو بحیثیت اس کے بندہ ہونے کے بندوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے خالق سے اس کے تعلقات کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ وہ احکام الہیٰ کو صحیح طریقہ سے حاصل کر کے باحسن وجوہ اس کو بندوں تک پہنچا دے۔ اسی حیثیت کا اصطلاحی نام رسالت ہے۔ لیکن اس رسالت کے مسئلہ میں اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیئے، کہ رسولؐ کے لیے دو امر ضروری ہیں۔ اوّل اخذ صحیح دوسرے نشر صحیح۔ یعنی احکام الہیہ کو اچھی طرح سمجھ کر لینا اور پھر اس کی صحیح طریقہ پر نشر و اشاعت کرنا۔

دوسری حیثیت نبی کی وہ ہے کہ دیگر انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان اور جملہ

[illegible]

امر کے واضح ہونے کے بعد یہ امر غور طلب ہے کہ عصمت نبی کی کس حیثیت کے لیے ضروری ہے۔ آیا رسالت اور بشریت دونوں کے لیے یا صرف رسالت کے لیے۔

"میرے خیال میں رسالت کے لیے عصمت ضروری ہے اور اس کا اعتراف سب کو ہے۔ وہ گناہ نہیں کر سکتا۔ وہ خدا سے غلط احکام نہیں حاصل کر سکتا اور نہ اس کو غلط طریقہ سے وہ دوسروں تک پہنچانے کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ البتہ بشریت کے لیے میرے نزدیک عصمت ضروری نہیں ہے۔ یعنی نبی کے وہ ذاتی امور کہ جو اسی حیات دنیویہ یا صرف ضروریات بشریہ سے تعلق رکھتے ہیں اس میں کبھی لغزش ہو جائے تو اس کا کوئی مضر اثر عصمت رسالت پر نہیں مرتب ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ صاحب تبصرہ نے قابل وکیل اور حاذق طبیب کی تمثیل پیش کی ہے۔ بے شک ماہر قانون داں وہی سمجھا جائے گا جو پیروی مقدمات کے بارہ میں غلطی کرتا ہی نہ ہو یا غلطی ہو جاتی ہو۔ لیکن کم از کم طبیب حاذق کے لیے ضروری ہے کہ وہ تشخیص امراض و تجویز علاج میں خطا نہ کرتا ہو یا بہت کم کرتا ہو یقیناً "کم" کی قید ہم اپنی انسانی کوتاہی کے باعث لگاتے ہیں۔ اگر خدا کسی طبیب حاذق کو معین کرے تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ایسا طبیب "کم از کم" بھی غلطی نہیں کر سکتا۔ تشخیص امراض میں نہ تجویز علاج میں۔ لیکن ایسے طبیب کے لیے یہ تو ضروری نہیں قرار دیا جائے گا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں غلط روی سے معصوم ہو۔ جہاں تک اس کی حذاقت طبابت کا تعلق ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا کوئی قدم جادۂ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا، باوجود اس کے وہ زندگی کے کسی دوسرے شعبہ میں اگر لغزش کر جائے تو اس سے اسکی حذاقت طبابت پر کوئی حرف نہیں آسکتا ہے۔ اس تقریر پر میرا صرف یہ مقصد ہے کہ انسان کے لیے کسی امر واحد میں کمال اسکو مستلزم نہیں کہ وہ جملہ کمالات کا حامل ہو ٹھیک اسی طرح رسالت کا مسئلہ ہے۔ رسول خدا سے احکام حاصل کرتا ہے اور دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس کے لیے عصمت لازم و مسلّم ہے اور اس عصمت پر

کوئی دھبہ نہ آئے گا۔ اگر وہ اپنے دنیادی امور بشریت میں کوئی لغزش کر جائے۔ بشریت کی بار بار قید کا بار بار اضافہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ کہیں کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ نبی اخلاقی غلطی مثلاً کذب و سرقہ وغیرہ کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ واضح رہے کہ میرا یہ مقصد نہیں ہے، اخلاقی غلطی تو گناہ کے حدود میں داخل ہے اور یہ پہلے ہی سے طے شدہ امر ہے کہ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے نبی معصوم رہتا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک مسئلۂ عصمت میں رسالت و بشریت کی حیثیات کی وہ تفریق موجود ہے جس کی عقل مقتضی ہے جس کو میں اوپر پیش کر چکا۔"

ان خیالات کا جائزہ لینے میں مجھے اندیشہ ہے کہ بعض ان مطالب کے اعادہ کی ضرورت پڑے جو گذشتہ مقالہ میں توضیح کے ساتھ لکھے جا چکے۔ اس لیے ناظرین سے پُرزور استدعا کرتا ہوں کہ وہ ایک مرتبہ اس مقالہ کے اس حصہ کو غور سے ملاحظہ فرمائیں شاید بعض ایسے نکات کی طرف خود ان کا ذہن منتقل ہو جائے جو اس بحث میں مفید نتیجہ برآمد کر سکتے ہیں۔

حقیقتاً لائق مضمون نگار نے مدیر نگار کے نظریہ کی تائید نہیں کی ہے بلکہ ایک بَین بَین راستہ اختیار کرنا چاہا ہے جو مدیر نگار اور آزاد خیال شیعہ دونوں کے مسلک سے علیحدہ ہے۔

مدیر نگار گناہ اور خطائے اجتہادی میں تفریق کرتے تھے، پہلی صورت کو نبی کے لیے غیر ممکن اور دوسری صورت کو قابل وقوع قرار دیتے تھے۔ انھوں نے خطاء اجتہادی یا بھول چوک کو خود لوازم انسانیت بتایا تھا اسی لیے وہ نبی کی انسانی حیثیت کو جواز وقوع خطا و نسیان کی سند بتا رہے تھے۔

آزاد خیال شیعہ نے جو کچھ لکھا تھا وہ ان کے مقابلہ میں اس امر کو ثابت کر دینے کے لیے کافی تھا کہ جس طرح ایک نبی کو گناہ سے محفوظ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح خطاء اجتہادی سے بھی، اور یہ دکھلایا تھا کہ خطاء اجتہادی کا عدم وقوع یا غیر ممکن ہونا رسولؐ کی انسانی حیثیت میں کسی نقص کا باعث نہیں ہے، بلکہ اسی انسانی حیثیت کے کمال

کا نتیجہ ہے۔ جناب "م-ح" خطائے اجتہادی کے بارہ میں زندگی کے مختلف شعبوں کے اعتبار سے تفریق کر رہے ہیں، وہ مسائل شرعیہ اور احکام مذہبیہ میں جو رسالت کی حیثیت سے متعلق ہیں خطاء اجتہادی کو غیر ممکن بتلاتے۔ لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو رسول کی انسانی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اس کو ممکن قرار دے رہے ہیں، یہ مسلک ممکن ہے ظاہری حیثیت سے خوش آیند یا دل کو لگتا ہوا معلوم ہوتا ہو لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ استدلالی و عقلی حیثیت سے وہ اس سے زیادہ کمزور ہے جتنا کہ نفی مطلق یعنی خطائے اجتہادی کو کلیتہً رسول کے لیے ممکن قرار دینے کا مسلک۔

رسالت اور انسانیت بیشک دو مختلف حیثیتیں ہیں لیکن چونکہ ان دونوں کا اجتماع ایک شخص میں ہوتا ہے جسے کہتے ہیں رسولؐ اس لیے اس شخص کی انسانیت کا معیار وہ قائم ہونا چاہیے۔ جو اس کی رسالت کے درجہ کے منافی نہ ہو۔ چونکہ ایک پست انسان جو بہت سے ان نقائص و عیوب میں مبتلا ہو جنھیں کمال انسانیت کی صورت میں نہ ہونا چاہیے تھا، ہرگز یہ استحقاق نہیں رکھتا کہ اسے رسالت کا ایسا ذمہ دارانہ منصب عطا کر دیا جائے، اس لیے رسول کی انسانیت اس درجہ کی ماننا پڑے گی جو ان نقائص سے بلند ہو۔ جبکہ خطاء اور غلطی ایک انسان کے نقائص میں ضرور داخل ہے اور اسی لیے ایک رسول کے لیے مدیر نگار کو بھی اسے "بہت کم" قرار دینے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کی کمی اسی انسانیت کے درجہ کے کمال کا نتیجہ ہے۔ جو رسول کے لیے ہر انسان ماننے پر مجبور ہے اور یہ بات مضمون نگار نے تسلیم کی ہے کہ "کم" کی قید ہم انسانی کوتاہی کے باعث لگاتے ہیں۔ اگر خدا کسی کو عہدہ عطا کرے تو یقیناً وہ عہدہ دار "کم سے کم" بھی غلطی نہیں کر سکتا۔ ان دونوں باتوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسولؐ کو "کم از کم" غلطی بھی نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ یہ اس کے درجۂ انسانی کا نقص ہوگا جو اس کی رسالت کے شایان نہیں ہے — پھر یہ دیکھا جائے کہ رسولؐ کی ذات میں "مفہوم منطقی"

کے لحاظ سے اگرچہ رسالت اور انسانیت دو مختلف حیثیتیں ہیں۔ لیکن رسالت کے مفہوم کو "مرسل الیہم" کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ ان کے انسانی زندگی ہی کے شعبوں سے متعلق ہے کیونکہ ان میں علاوہ انسانیت کے اور کوئی حیثیت نہیں ہے یعنی رسالت کا مفاد ان تمام انسانوں کی انسانیت ہی کی اصلاح ہے۔ اس لیے رسولؐ کی انسانی زندگی ہی کے حالات اقوال و افعال ان تمام اشخاص کے لیے نمونہ بن سکتے ہیں۔

اب اگر رسولؐ اپنی عام زندگی کے حالات میں عام اشخاص ہی کے مانند ہوتے اور انھیں کوئی بلندی حاصل نہ ہوتی تو اگرچہ وہ رسالت کی حیثیت سے کوئی مخصوص بات رکھتے بھی ہوں تو اسے عام اشخاص پر حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ تو انسانی ہی زندگی کے حامل ہیں اور رسولؐ کی پیروی انسانی ہی زندگی کے شعبوں میں کر سکتے ہیں۔ جبکہ ان شعبوں میں رسولؐ سے غلطیاں ممکن ہوئیں اور بے راہ روی کا احتمال پیدا ہوا تو مفادِ رسالت رخصت ہو گیا اور رسولؐ کی ذات انسانی زندگی کے شعبوں میں رہنمائی سے قاصر رہی۔

اس بات میں قابل وکیل اور حاذق طبیب کی تمثیل درست نہیں ہے۔ اس بنا پر کہ قابل وکیل اور حاذق طبیب کا کام صرف کسی ایک شعبہ سے متعلق ہے۔ اور رسالت زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہوتی ہے۔

بے شک چونکہ قابل وکیل اور حاذق طبیب کی نسبت مضمون نگار نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اگر اسے خدا مقرر کرے گا تو وہ اس شعبہ میں "کم سے کم" بھی غلطی نہیں کر سکتا اور اس کا کوئی قدم جادۂ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا۔ لہٰذا اس تمثیل کا نتیجہ یہ برآمد کرنا چاہیے کہ چونکہ رسالت زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہے اور وہ خدا کی جانب سے ہوتی ہے اس لیے رسول سے کسی شعبۂ زندگی میں غلطی نہیں ہو سکتی اور اس

کا کوئی قدم جادۂ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ رسول کے لیے دو امر ضروری ہیں۔ اوّل اخذِ صحیح دوسرے نشرِ صحیح" لیکن یہ امر نظر انداز ہو گیا کہ نشر کے دو طریقے ہیں۔ ایک قول دوسرے عمل اور رسول کی تمام زندگی منقسم ہے۔ ان ہی ابواب پر جب ان میں صحت ضروری ہوئی تو اب آخر غلطی قدم کہاں رکھے گی۔

اس صورت میں کہ جب مذہب اور شریعت میں فرق قرار دیا جائے یعنی مذہب نام ان عقیدتمندانہ مظاہرات کا ہو جو بندہ کو اپنے خدا سے وابستہ کرتے ہیں اور شریعت قوانینِ اجتماعی اور معاشرتی کا جنھیں مدیر نگار ایسے بہت سے روشن خیال افرادِ اسلام کے قابلِ تبدیلی احکام میں داخل سمجھتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک شعبہ منضم کیا جائے سیاسیات کا، جو جمعیتِ اسلامیہ کے داخلی و خارجی انتظامات و تعلقات سے متعلق ہے جس کے ایک مستقل چیز ہونے کا ترشح بھی جناب نیاز کے مختلف تحریرات اور نیز موجودہ بعض مضامین کے رجحانات سے ہوتا ہے۔

اس صورت میں بے شک رسول کے لیے متعدد حیثیتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ وہ عقائد اصولِ مذہب کے پہنچانے کی حیثیت سے ایک مبلغ ہیں۔ قوانینِ اجتماعی و معاشرتی کے اعتبار سے ایک مقنن اور سیاسیات کے اعتبار سے ایک حاکم و ناظم۔

لیکن بہرحال یہ حیثیتیں تمام ان کی رسالت ہی کے اندر مضمر ہیں یعنی منجانب اللہ ہی ہیں۔ اس لیے اگرچہ دوسری دونوں قسموں کے قوانین و احکام کو رسولؐ کے بعد آنے والے اوقات و حالات میں کبھی قابلِ تبدیلی بھی خیال کیا جائے۔ لیکن اس کا شاید کوئی بھی قائل نہیں ہے کہ اگر رسول کی حیات میں کوئی دوسرا شخص کوئی قانون نافذ کرے تو وہ رسول کے حکم کے مقابلہ میں قابلِ عمل ہوگا یا کوئی دوسرا شخص رسول کو مقہور و مغلوب بنا کر مسلمانوں پر تسلط حاصل کرنا چاہے تو اس کا یہ فعل صحیح و جائز ہوگا۔

تیسری حیثیت رسول کی کم از کم وہ ہے جیسے طالوت کو خدا نے بادشاہ مقرر کیا جس کا تذکرہ قرآن میں ہے :- (قال نبیھم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا) اور جس کو مضمون نگار نے بھی اپنے اسی مقالہ میں درج کیا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ طالوت کو صرف وہی حیثیت حاصل تھی اور رسول کو اس کے ساتھ دو حیثیتیں اور بھی حاصل ہیں۔ ایک تبلیغ عقائد کی اور دوسرے اجرائے احکام کی۔

اب چونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خدا جس عہدہ پر کسی کو مقرر کریگا وہ کم از کم اپنے شعبہ میں غلطیوں سے ضرور بری ہو گا۔ لہٰذا جب رسول خدا کی طرف سے مبلّغ عقائد ہیں تو عقائد کے بارہ میں غلطی کے مرتکب نہیں ہو سکتے اور جب احکام شرعیہ کے مقنّن ہیں تو شرعی احکام میں غلطی نہیں کر سکتے۔ اور جب خدا ہی کی طرف سے ایک سیاسی فرمانروا یعنی بادشاہ ہیں تو سیاسیات میں بھی ان کا کوئی قدم جادۂ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا۔

اس طرح اگر خلافت کے مسئلہ کو سیاسی چیز بھی مانا جاتے تب بھی اس میں غلطی کا امکان رسول سے نہیں ہے اور یہی اس بحث کی اصلی بنیاد ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر شعبوں کی تفریق خطاء اجتہادی اور غلطی میں فائدہ بخش ہو سکتی ہے تو گناہ کے لیے کیوں یہ کہا جاتا ہے کہ رسول گناہ بالکل نہیں کر سکتا۔

بالکل اسی طرح جیسے وہاں مثال پیش کی گئی ہے بیشک ایک حاذق طبیب کا علاج اس وقت نہ کرنا چاہیے جب وہ جان بوجھ کر نسخہ غلط لکھتا ہو یا تشخیص مرض میں کوتاہی کرتا ہو اور ایک قابل وکیل کی طرف اس وقت رجوع نہ کیجئے جب وہ پیروی میں عمداً خرابی کرتا ہو اور موکل کو نقصان پہنچا دیتا ہو لیکن اگر ایسا نہیں ہے وہ پیروی مقدمات میں کوئی خرابی کرتا نہ تشخیص امراض و تجویز علاج میں کسی کوتاہی یا ضرر رسانی کا ارتکاب نہ کرتا ہو لیکن اپنی زندگی کے دوسرے شعبوں میں وہ ایک گناہگار انسان ہو۔ وہ بہت سے اخلاقی معاصی کا مرتکب ہو تو اس سے اس کی وکالت یا طبابت پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ اسی طرح جبکہ ایک نبی کے لیے بس ضروری ہے اخذ صحیح اور

نشر صحیح تو اس کی صداقت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ وہ اخذ و نشر میں تقصیر و کوتاہی و غلط بیانی سے کام نہ لیتا ہو۔ لیکن اپنے ذاتی امور میں جو اسی حیاتِ دنیویہ یا صرف ضروریات بشریہ سے تعلق رکھتے ہیں اس میں اگر کبھی گناہ ہو جائے تو اس کا کوئی مضر اثر عصمتِ رسالت پر مرتب نہیں ہونا چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ گناہ چونکہ ارادی و اختیاری چیز ہے۔ اس لیے اس میں تو یہ تفریق ممکن بھی ہے کہ کوئی انسان ایک شعبہ میں گناہ کا مرتکب ہو اور دوسرے میں نہ ہو لیکن خطاء اجتہادی یا سہو و نسیان میں اس تفریق کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

بھول چوک اور غلطی کوئی ارادی فعل نہیں ہے جس کا ارتکاب و عدم ارتکاب اور اس کے دائرہ کا تعین کسی کے اختیار سے متعلق ہو۔ بلکہ وہ تو حقیقتاً بعض انسانی طاقتوں کے کمال کا ایک سلبی نتیجہ ہے جو اس طاقت کی کمی اور زیادتی کی صورت میں اسی اعتبار سے مرتب ہوتا ہے۔

انسان کا ایک جوہر ہے اصابت رائے اس کا نتیجہ ہے خطاء اجتہادی کا نہ ہونا۔ ایک صفت ہے تحفظ و تذکر اس کا نتیجہ ہے نسیان و سہو سے محفوظ رہنا۔ اب اگر اصابت رائے کی طاقت انسان میں مفقود ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوگا اور ہر بات میں خطائے اجتہادی کرے گا۔ اور اگر یہ طاقت موجود ہے تو جس درجہ پر وہ مکمل ہوگی اتنی ہی خطائے اجتہادی کم ہوگی۔ اور بالکل کامل ہونے کی صورت میں خطا بالکل نہ ہوگی۔

اسی طرح تحفظ و تذکر جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی سہو و نسیان کم ہوگا اور جب یہ طاقت مکمل ہوگی تو سہو و نسیان معدوم ہو جائے گا۔ اب اگر ایک شخص ایسا ہے کہ اس کی اصابت رائے یا تحفظ کی طاقت ایک متوسط درجہ پر نقص و کمال کے درمیانی حدود میں ہے اور اس کا وقوع ہر شعبہ میں ہو سکتا ہے۔ اس میں یہ گارنٹی ہرگز لی ہی نہیں جا سکتی کہ وہ اس شعبہ میں خطا اور بھول میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن اس شعبہ میں نہیں —— زیادہ

سے زیادہ یہ کہ وہ اس خطا اور غلطی میں معذور ہوگا۔ کیونکہ اختیاری طور پر نہیں ہے۔ لیکن اسے پابند بنانے کے کوئی معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ جیسے مجتہد، چونکہ وہ غیر معصوم ہے اس لیے احکام شرعیہ کے سمجھنے میں بھی اس سے غلطی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ صواب و خطا دونوں صورتوں میں معذور ہو۔ اگر رسول کی بھی یہی صورت ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ دنیاوی امور میں تو خطا و نسیان میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ لیکن امور رسالت میں نہیں۔

یہ تو صرف الفاظ کا ایک سرابی منظر ہے جس میں عقلی اعتبار سے حقیقت ہرگز نہیں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول مبعوث ہوتا ہے، رسالت کے ساتھ اپنی عمر کی ایک کافی مدت اسی قوم میں گزارنے کے بعد رسول پر وثوق و اطمینان پیدا ہوتا ہے اس کے ان حالات کی بناء پر جو رسالت کے قبل دیکھے جا چکے ہیں۔ یہی رمز ہے ہر قوم کی طرف رسول خود اسی قوم میں سے مبعوث کرنے کا۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ جب چالیس سال اپنی عمر کے ختم کر چکے یعنی شباب کا دور جو عام طور پر لاابالیوں اور بے اعتنائیوں کا ہوتا ہے۔ اپنی قوم کی آنکھوں کے سامنے صرف کر کے کہولت کے دور میں قدم رکھ چکے تو مبعوث بہ رسالت ہوئے۔ اس دور میں آپ نے اپنی سچائی اور امانداری کا وہ سکہ دلوں پر قائم کیا کہ "صادق و امین" کے لقب سے ملقب ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے قبل کے حالات رسولؐ کے صرف انسانی ہی زندگی سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ دوسری حیثیت یعنی رسالت تو ابھی حاصل ہی نہیں ہوئی ہے اب اگر رسول کے ذاتی حالات اپنی انفرادی زندگی میں اس کے قبل یہ بتلاتے ہیں کہ وہ سادہ لوح ہے یعنی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جسے خطاء اجتہادی کہتے ہیں اور تحفظ و تذکر کی طاقت بھی اس میں ناقص ہے جس کی بناء پر سہو و نسیان سے دوچار ہو جاتا

ہے تو بھلا اس کے ادعائے رسالت کے ساتھ اس پر یہ وثوق و اطمینان اور بھروسا کیونکر پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ امور رسالت یعنی اخذ و نشر احکام میں غلطی اور سہو و نسیان میں ہرگز مبتلا نہ ہوگا ۔۔۔ یہ تو اسی وقت اعتماد پیدا ہو سکتا ہے جب اس کی زندگی کے عام حالات یہ بتلاتے ہوں کہ اس میں اصابت رائے اور تحفظ کے جوہر مکمل طور پر موجود ہیں۔ اس لیے اس کے اقوال و افعال میں اس قسم کا احتمال نہیں پایا جاتا۔

یہ ہے اس بحث کی تحقیقی حیثیت جو بغیر کسی مناظرانہ آویزش کے واقعہ و حقیقت کی آئینہ بردار ہے لیکن افسوس ہے کہ (م-ح) مضمون نگار نے اسی موقع پر مناظرانہ انداز اختیار کر کے حسب ذیل تراوش شروع فرما دی:-

> "تعجب ہے کہ آزاد خیال شیعہ صاحب نے اپنے مذہب سے اغماض کرتے ہوئے عصمت انبیاء کے مسئلہ میں اس قدر غلو سے کام لیا ہے حالانکہ اگر مجھے معاف کیا جائے تو میں عرض کروں نہ [illegible] میں تو عصمت نہ الوہیت کے لیے ضروری ہے نہ رسالت [illegible] لازم نہ امامت کے لیے واجب۔"

اس کے بعد روایات نقل کیے گئے ہیں جنھیں اس ادعا کے شواہد میں پیش کرنے کے قابل خیال کیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی مذہب کی طرف کسی عقیدہ کو منسوب کرنے کی سند اُسی مذہب کے معتقدین کے تصریحات و بیانات ہو سکتے ہیں۔ نہ کوئی ایسی روایت جو خود نکالی گئی ہو۔ اور اسے اس عقیدہ کی سند قرار دے لیا جائے کیونکہ ممکن ہے اس مذہب کے معتقدین اس روایت پر عامل نہ ہوں اور وہ اس کی کچھ تاویل کرتے ہوں۔

بے شک وہ روایت اس مذہب کے معتقدین کے خلاف بطور دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ تمہارا عقیدہ مثلاً اس روایت کے خلاف [illegible] صورت میں جو کچھ

وہ معتقدین جواب دیں اس کے سننے کا انتظار کرنا چاہیئے جو ممکن ہے صحیح ہو اور ممکن ہے غلط۔ لیکن اس روایت کے مفاد کو اس مذہب والوں کی جانب لطور عقیدہ منسوب کرنے کا حق کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر یہ ہے کہ شیعہ ہمیشہ خلافت حضرت علیؑ کے دلائل سنی احادیث و روایات سے پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس بحث میں ہر نام صاحب کی جانب سے ایسا کیا گیا اور ہم نے بھی اپنے گذشتہ مقالہ میں اس طرح کے استنادات کیے۔ لیکن کیا ہم یہاں پر یہ صورت بھی اختیار کر سکتے تھے کہ ہم مذہب سنی کی طرف یہ امر منسوب کر دیں کہ وہ حضرت علیؑ کو خلیفۂ بلا فصل مانتے ہیں۔ اور حضرات خلفائے ثلثہ کو خلیفۂ ناحق قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے یہاں حسب ذیل روایات موجود ہیں۔

اگر ہم ایسا کرتے تو یقیناً ایک کھلے ہوئے بہتان، افترا، اور صریح جھوٹ کے مرتکب تھے۔ جس کے لیے اگر ہم فریق مخالف سے "معاف کیا جائے" کے الفاظ میں معافی کی درخواست بھی کرتے تو حق و انصاف کی بارگاہ سے وہ قابلِ معافی جرم نہ تھا۔

خدا سے غلطی کے وقوع کے لیے بداء کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے اور خود ہی اس کے معنی لکھے ہیں "ظہر لہ ما لم یظہر" (یعنی جو بات معلوم نہ تھی وہ معلوم ہو جائے) لیکن اس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ شیعہ اس معنی سے بداء کو خدا کی ذات کے لیے ہرگز جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں بعض تصریحات:۔

شیخ صدوق محمد بن بابویہ قمی کتاب التوحید میں لکھتے ہیں:۔

لیس البداء کما یظنہ جہال	بداء اس طرح نہیں ہے جس طرح
الناس بانہ بداء ندامۃ تعالی	ناواقف افراد خیال کرتے ہیں کہ وہ پشیمانی
اللہ عن ذالک علواً کبیراً	کا نتیجہ ہو خدا کی ذات اس سے بہت

بلند و برتر ہے۔

اور شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی نے کتاب الغیبہ میں بداء کی روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے :۔

والوجه فی هذه الاخبار ما قد منا ذکره من تغیر المصلحة فیه واقتضاءها تاخیر الامر الی وقت آخر علی ما بیّناه دون ظهور الامر له تعالی فانا لا نقول به ولا نجوزه تعالی من ذلک علوا کبیرا ۰

ان احادیث کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں کہ مصلحت کے بدلنے کے ساتھ احکام میں تبدیلی ہوتی ہے، نہ یہ کہ خدا کو جو بات معلوم نہ تھی وہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے نہ ہم قائل ہیں نہ جائز سمجھتے ہیں۔ خدا کی ذات اس سے بہت بزرگ و برتر ہے۔

ہندوستان میں مذہب شیعہ کے سب سے بڑے مجتہد مولانا السید دلدار علیؒ طاب ثراہ غفران مآب تھے۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب "عماد الاسلام" میں اس کو نہایت وضاحت سے لکھا ہے :۔

البداء ممدودا فی اللغة بمعنی ظهور رای لم یکن یقال بدا له فی هذا الامر بداء ای نشاء له فیه رای کما ذکره الجوهری فلذا یشکل القول بذلک فی جناب الحق تعالی لشیئ بعد جهله وهذا محال ولهذا شنّع کثیر عن المخالفین علی الامامیة فی ذلک نظراً الی

بداء الف ممدودہ کے ساتھ لغت میں اس کے معنی ہیں۔ ایک ایسی رائے کا ظاہر ہونا جو پہلے ظاہر نہ تھی۔ یہ معنی بداء کے صحاح جوہری میں مذکور ہیں اور یہ وہ معنی ہیں جن کے لحاظ سے بداء کی نسبت، خداوند عالم کی طرف دشوار ہے۔ کیونکہ اس کا لازمہ یہ ہے کہ خدا کا علم حادث ہوا اور وہ اس سے پہلے ناواقف ہو

ظاهر اللفظ من غير تحقيق مرامهم فنقول في الجواب وبالله التوفيق ان تشنيعات المخالفين علينا اما باعتبار المعنى الظاهر اللفظ البداء كما هو الظاهر واما باعتبار ان لفظ البداء لم يطلق في الشرع على علمه او فعله تعالى واما باعتبار عدم صحة المعنى المجازي بالنسبة اليه تعالى اما تشنيع بالاعتبار الاول فهو مدفوع فان احدا من علماء الامامية لم يذهب اليه كيف وقد نطقت اخبار الائمة عليهم السلام واقوال قدماء الامامية على خلافه ۔

اسی بنار پر اکثر مخالفین نے اس سے فرقۂ امامیہ کے خلاف طعن و تشنیع سے کام لیا ہے ۔ اس لیے کہ انھوں نے صرف اس لفظ کے ظاہری معنی کا لحاظ کیا اور اصلی مقصود کی تحقیق نہیں کی ۔ جواب ان کا یہ ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض ہم پر یا تو لفظ بدار کے ظاہری معنی کے اعتبار سے ہے اور بظاہر حقیقت یہی ہے اور یا اس اعتبار سے ہے کہ شرع میں لفظ بدار کا (چاہے وہ کسی دوسرے معنی سے ہو) خدا کے علم یا اس کے فعل کے بارے میں اطلاق نہیں ہوا ہے اور یا اس لحاظ سے ہے کہ اس لفظ کے مجازی معنی بھی خدا کے حق میں درست نہیں ہیں ۔ اگر پہلی صورت کے لحاظ سے اعتراض ہے تو وہ بالکل غلط ہے کیونکہ کوئی شخص علمائے امامیہ میں سے اس کا قائل نہیں ہے اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے احادیث اور متقدمین علمار شیعہ کے اقوال اس کے خلاف ظاہر کر رہے ہیں ۔

ان تصریحات کے باوجود کیا [illegible] الشیخ صدوق کی عبارت ک

جو بداء کے ثبوت میں ہے تشریح کی جاتی ہے ان الفاظ میں کہ:۔
"نعوذ باللہ من ذٰلک خدا سے جہل کے باعث غلطی ہوئی" اور اس سے نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ "اس سے عصمتِ الوہیت باطل ہوئی"

شیعی فرقہ کی معتبر احادیث یہ ہیں۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:۔

من زعم ان اللہ عز وجل یبدو لہ فی شیئ لم یعلمہ امس فابرء منہ۔	جو شخص گمان کرے کہ خدا کی رائے میں تبدیلی ہوتی ہے اس طرح سے کہ اسے کسی شئے کا علم حاصل ہو جاتا ہے جو پہلے حاصل نہ تھا، اس سے میں برأت کرتا ہوں

دوسری حدیث میں آپ ہی کا ارشاد ہے:۔

کل امر یرید اللہ فھو فی علمہ قبل ان یصنعہ ولیس شیئ یبدو لہ الا وقد کان فی علمہ ان اللہ لا یبدو لہ من جھل۔	جس امر کا خدا ارادہ کرتا ہے وہ اس کے علم میں ہوتا ہے، اس کام کے کرنے سے پہلے اور کوئی تغیر وہ کائنات میں نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ اس کے علم میں پہلے سے ہوتا ہے۔ بیشک خدا کو بداء جہالت کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا۔

تیسری حدیث:۔

ما بداء اللہ فی شیئ الا کان فی علمہ قبل ان یبدو لہ	خدا کے مقرر کردہ نظام میں کسی شئے کی نسبت تغیر نہیں ہوتا۔ مگر وہ اس کے علم میں ہوتا ہے، اس تغیر کرنے سے پہلے۔

چوتھی حدیث امام رضاؑ کی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:۔

من قال بان اللہ تعالیٰ لا یعلم الشیئ الا بعد کونہ فقد کفر۔

جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ خدا کو کسی شئے کا علم نہیں ہوتا جب تک کہ وہ شے موجود نہ ہو جائے وہ کافر ہے۔

اس قسم کے روایات مسانید احادیث واخبار میں بہت ہیں۔

اب کیا یہ حقیقت پرورانہ شیوہ ہے کہ ان تمام اقوال علماء اور ان متعدد احادیث کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے کسی ایک ایسی مجہول السند روایت کے مضمون کو فرقۂ شیعہ کا عقیدہ بنا دیا جائے جو فرقۂ شیعہ میں ہرگز درخورِ قبول نہیں ہے — تاہم نے صرف ایک حقیقت کی پردہ کشائی کے لیے ضروری سمجھا، ورنہ موضوع بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ بعقیدۂ اہل سنت خدا فاعل مطلق ہے۔" لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون" کی بنا پر اس کے افعال میں وہ پابندیاں عائد نہیں ہیں جو بندوں پر عائد کی جا سکتی ہیں۔ اس لیے بندوں کے لیے ظلم، فعلِ قبیح، کذب وغیرہ ناجائز ہے۔ لیکن خدا کے لیے یہ تمام باتیں جائز الوقوع ہیں، اور عدالت، انصاف، سچائی، راست کرداری وغیرہ کچھ ضروری نہیں ہے۔ حالانکہ ترک فرائض اور اس قسم کے قبائح سے انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔ پھر جبکہ قبائح اور اختیاری بدکرداریوں سے انبیاء کے معصوم ہونے کے باوجود خدا کی عصمت ضروری نہیں ہے تو اگر نادانی کی غلطی سے خدا کی عصمت (نعوذ باللہ) باطل بھی ہو جائے تو اس کا اثر عصمتِ رسالت پر کیا پڑ سکا، جو محلِ کلام ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرقۂ شیعہ وہ ہے جو خدا کو ان قبائح کے صحت وجواز سے بھی بری سمجھتا ہے اور جہالت وغفلت وغیرہ کے نقائص سے بھی اس کی ذات کو بالاتر قرار دیتا ہے۔ اب رہا انبیاء کی عصمت کا مسئلہ، تو اس کے لیے بھی علمائے شیعہ کے اقوال ملاحظہ فرمائیے:۔

شیخ صدوق اپنے اعتقاد میں لکھتے ہیں: ۔

ان اعتقادنا فی الانبیاء والرسل والائمة والملائکة صلوات اللہ علیھم انھم معصومون مطھرون عن کل دنس وانھم لا یذنبون ذنباً صغیراً ولا کبیراً ولا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یومرون ومن نفی عنھم العصمة فی شیئ من احوالھم فقد جھلھم واعتقادنا فیھم انھم موصوفون بالکمال والتمام والعلم من اوائل امورھم الی اواخرھا لا یوصفون فی شیئ من احوالھم بنقص ولا جھل ۔

ہمارا اعتقاد انبیاء، مرسلین، ائمہ اور ملائکہ کے بارے میں یہ ہے کہ وہ ہر طرح کی اخلاقی پستی سے معصوم اور پاک ہیں اور یہ کہ وہ گناہ صغیرہ و کبیرہ نہیں کرتے اور کسی حکم خدا کی مخالفت ان سے نہیں ہوتی اور جو اُن کے فرائض منصبی ہوتے ہیں انھیں بجا لاتے ہیں اور جو اُن سے کسی حالت میں بھی عصمت کی نفی کرے وہ ان کے مرتبہ سے حقیقتاً واقف نہیں ہے اور ہمارا اعتقاد ان کے بارے میں یہ ہے کہ وہ تمام کمالات سے متصف ہوتے ہیں، اپنے ابتدائے امر سے آخر تک کسی وقت کسی نقص اور جہالت سے متصف نہیں ہوتے ۔

علامہ حلیؒ کشف الحق میں تحریر فرماتے ہیں: ۔

ذھب الامامیة کافة الی ان الانبیاء معصومون عن الصغائر والکبائر منزھون عن المعاصی قبل النبوة وبعدھا علی سبیل العمد والنسیان عن کل رذیلة ومنقصة

فرقۂ امامیہ تمام و کمال اس بات کا قائل ہوا ہے کہ انبیاء صغائر و کبائر سب گناہوں سے معصوم ہیں اور معاصی سے بری ہیں، نبوت کے قبل بھی اور بعد بھی، عمداً اور سہواً۔ اور بری ہیں ہر پست

ما تدل علی الخسة والضعة

اخلاقی اور نقص سے اور ان چیزوں سے جو نفس کی سبکی اور حقارت کا پتہ دیتی ہیں

علامہ مجلسیؒ نے بحار میں لکھا ہے :-

ان العمدة فیما اختارہ اصحابنا من تنزیہ الانبیاء والائمة علیہم السلام عن کل ذنب ودناءة ومنقصة قبل النبوة و بعدھا قول ائمتنا سلام اللہ علیہم بذالک المعلوم لنا قطعاً باجماع اصحابنا رضوان اللہ علیہم معتضداً بالنصوص المتظافرة حتی صار ذلک من قبیل الضروریات فی مذھب الامامیة -

سب سے بڑا مستند اس مسلک کا جو ہمارے فرقہ کے علماء نے اختیار کیا ہے کہ انبیاء و ائمہ ہر گناہ و نقص سے بری ہوتے ہیں قبل نبوت بھی اور بعد نبوت بھی، ہمارے ائمہ علیہم السلام کے اقوال ہیں جو ہمیں اپنے علماء کے متفقہ بیانات سے معلوم ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ نصوص جو کثرت کے ساتھ موجود ہیں یہاں تک کہ فرقۂ امامیہ کے ضروریات مذہب میں داخل ہو گیا ہے۔

جناب غفران مآب مولانا سید دیدار علی طاب ثراہ نے عماد الاسلام میں اس کی تشریح اس طرح بیان فرمائی ہے کہ وہ معاصی و نقائص جن سے عصمت محل گفتگو قرار پاسکتی ہے بیس۲۰ قسم کے ہو سکتے ہیں :-

(۱) وہ معصیت جو منافی تبلیغ ہے۔ یعنی غلط بیانی کرنا امور تبلیغ میں عمداً بعد بعثت (۲) ایسی ہی صورت مگر عمداً نہیں سہواً (۳) پہلی صورت، قبل بعثت۔ (۴) دوسری صورت قبل بعثت (۵) کفر بعد بعثت عمداً (۶) کفر بعد بعثت سہواً (۷) کفر قبل بعثت عمداً (۸) کفر قبل بعثت سہواً (۹) گناہ کبیرہ بعد بعثت عمداً (۱۰) سہواً (۱۱) گناہ کبیرہ قبل بعثت عمداً (۱۲) سہواً (۱۳) گناہ صغیرہ جو [illegible]

سبکی کا باعث ہو بعد بعثت عمداً (۱۴) سہواً (۱۵) ایسا گناہ قبل تبلیغ عمداً (۱۶) سہواً (۱۷) گناہ صغیرہ (جو عمومی سبکی کا باعث نہیں ہے) بعد بعثت عمداً (۱۸) سہواً (۱۹) ایسا گناہ قبل تبلیغ عمداً (۲۰) سہواً۔

ان اقسام کے درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ۔

فذهب معاشر الامامیة	فرقۂ امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ انبیاء و
ان العصمة فی الانبیاء والاوصیاء	اوصیاء کا ان تمام صورتوں سے معصوم
تجب بکل من تلک الاحتمالات۔	ہونا ضروری ہے۔

ان تصریحات کی موجودگی میں یہ کہنے کا حق اپنے لیے قرار دیا گیا ہے کہ فرقۂ شیعہ میں انبیاء و مرسلین کے لیے عصمت ضروری نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ "حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں اس قسم کی بکثرت تصریحات ملتی ہیں جن سے انبیاء کی غلطی و غلط فہمی اور لغزش و خطاء اجتہادی کا ثبوت ملتا ہے۔"

لطف یہ ہے کہ اس کے لیے جو شواہد ذکر کیے گئے ہیں ان میں — حضرت موسیٰؑ کا قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھ کر حضرت ہارونؑ پر خفا ہونا اور سختی کے ساتھ پیش آنا، حضرت خضرؑ و موسیٰؑ کا واقعہ اور موسیٰؑ کی بے صبری وغیرہ وغیرہ، بیان کیے جاتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر قرآن مجید کو بھی مخصوص حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں داخل سمجھا گیا ہے۔ اور آخر میں لکھا ہے کہ — "یہ دیگر انبیاء کے متعلق حضرات شیعہ کے مذہبی معتقدات ہیں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کا اعتقاد شیعوں سے مخصوص ہے اور

[illegible]

کیا جائے گا کہ شیعہ قرآن کو محرف مانتے ہیں اور اس پر ایمان نہیں رکھتے۔

یہ "یک بام و دو ہوا" کا مضمون کیا صرف مناظرانہ ہنر آفرینی نہیں ہے۔ اور اس کو کیا حقیقت پروری سے کوئی دور کا بھی تعلق ہے؟

حقیقت امر یہ ہے کہ اگر عقلی حیثیت سے انبیاء کے لیے عصمت ضروری ثابت ہو گئی تو جتنے آیات و احادیث کچھ ایسے مضامین پر مشتمل ہوں جن سے ظاہری طور پر انبیاء کی عصمت کو دھچکا لگتا ہو ان کی تاویل کے لیے اہل سنت بھی مجبور ہیں (اگر وہ عصمت کو کوئی ضروری چیز سمجھتے ہوں۔ جیسا کہ م۔ ح صاحب مدعی ہیں) اور شیعہ بھی جیسے خدا کے جسم و جسمانیات سے منزہ ہونے کے عقیدہ کی بنا پر الرحمٰن علی العرش استوی — جاء ربک والملک صفا صفا — یداہ مبسوطتان — ان السمٰوات والارض مطویات بیمینہ — الی ربہا ناظرۃ وغیرہ وغیرہ آیات کی تاویل لازم ہے۔

پھر جس طرح ان آیات کی بناء پر مسلمانوں کی جانب عموماً اس عقیدہ کا انتساب صحیح نہیں ہے کہ وہ خدا کو اعضاء و جوارح سے مرکب اور مجسم مانتے ہیں، اسی طرح ان آیات قرآنی یا احادیث سے شیعوں کی طرف اس عقیدہ کی نسبت درست نہیں ہے کہ وہ انبیاء کو معصوم نہیں بلکہ خطاکار سمجھتے ہیں۔

روایات جو اس سلسلہ میں وارد ہوں وہ اگر بحیثیت سند غیر معتبر ہوں تو قصہ پاک ہے اور اگر معتبر ہوں تو ان کی صورت بھی وہی ہے جو آیات قرآن کی۔

ماریہ قبطیہ والی روایت درصورت صحت سند حقیقۃً "علم غیب" کے مسئلہ سے مربوط ہے، چونکہ شریعت کے احکام اسباب ظاہری پر مبنی ہیں اس لیے ان قرائن و شہادات کی بنا پر جو اس قبطی کے خلاف جمع ہو گئے تھے رسولؐ کا حکم قتل دینا، بالکل درست تھا اور حقیقت امر کے ظاہری طور پر منکشف ہونے کے بعد قتل سے

باز رہنا بھی بالکل صحیح ـــ علم غیب کے معتقد یہ کہتے ہیں کہ رسولؐ کو بھی اس حقیقت کا علم تھا۔ لیکن دوسرے لوگوں پر واقعہ کے انکشاف اور انکی نکتہ چینیوں اور غلط بدگمانیوں کے رفع کرنے کے لیے اس قسم کا حکم ضروری تھا، جس کا نتیجہ وہی ہوا جس کا رسولؐ کو پہلے سے علم تھا اور اسی لیے آپ نے شکرِ خدا ادا کیا۔

جناب امیرؑ نے اپنی رائے میں خود تبدیلی کبھی نہیں فرمائی۔ لیکن وہ لوگ جو آپ کی ہدایت سے منحرف تھے ان کو بجبر اپنی رائے کا پابند بنانے کی مصلحت نہ تھی اور داخلی جنگ کا اندیشہ تھا۔ اس لیے آپ نے اپنی رائے کے تسلیم کرانے پر اصرار نہیں کیا۔ اور "ھذا جزاء من ترک العقدہ" کا فقرہ ان ہی سے متعلق تھا۔ چنانچہ انہی سے مخاطب ہو کر آپ نے یہ شعر بھی پڑھا تھا۔

امرتکم امری بمنعرج اللوی   فلم تستبینوا النصح الا ضحی الغد

یہ آپ کی اصابت رائے کا ایک مکمل ثبوت تھا جسے غلطی سے خطاء اجتہادی کے ثبوت میں پیش کیا جا رہا ہے ـــ تعجب ہے کہ م۔ ح صاحب نے اپنے یہاں کے روایات و اقوال سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ "اہل سنت کے نزدیک مسئلہ عصمت میں رسالت و بشریت کے حیثیات کی وہ تفریق موجود ہے جس کی عقل مقتضی ہے۔"

لیکن ذرا ملاحظہ ہو۔ شرحِ مسلم الثبوت اصل اول باب النسخ مطبوعہ نولکشور صفحہ ۳۵۹ میں ہے:۔

ولا تصنع الی قول من یقول ان	اس شخص کی بات ہرگز نہ سنو جو یہ
الانبیآء کیف یخطئون فی احکام	کہتا ہو کہ انبیاء احکامِ خدا میں غلطی
اللہ تعالیٰ فان ھٰذا القول صدر	نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ قول ظاہر ہوا
من شیاطین اھل البدعۃ کالروافض	ہے شیاطین اہل بدعت، رافضی، وغیرہ

وغیرھم الم تر اھل الحق من السنۃ والجماعۃ القامعین البدعۃ کثرھم اللہ تعالیٰ یجوزون علی الانبیاء الخطاء کما ظھر فی اساریٰ بدر من سید العالم صلوات اللہ علیہ و سلامہ۔

فرقوں سے ہے، اور اہلِ حق یعنی اہلِ سنتؔ جماعت جو بدعت کے اکھاڑنے والے ہیں (خدا ان کی تعداد کو زیادہ کرے، وہ انبیاء سے غلطی کو جائز سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں سرورِ کائنات صلوات اللہؐ علیہ وسلامہ سے غلطی واقع ہوئی۔

اب دیکھیے کہ بیچارے شیعوں پر گالیاں پڑ رہی ہیں۔ کس لیے؟ کہ وہ انبیاء کو غلطی سے محفوظ جانتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں اہلِ سنت و جماعت کا مذہب کیا بتایا جا رہا ہے؟ یہ کہ احکامِ خدا میں بھی انبیاء سے غلطی ہوسکتی ہے۔

کیا اس کے بعد بھی کسی کو شرم دامنگیر نہ ہونا چاہیے۔ یہ کہتے ہوئے کہ شیعہ انبیاء کو معصوم نہیں سمجھتے۔ اور اہلِ سنت احکامِ خدا میں انبیاء کو معصوم سمجھتے ہیں؟ —— کیا رسالت کی حیثیت میں قرآن کی تبلیغ داخل نہیں ہے۔ اور کیا اسلام میں شرک اور ستائش اصنام سے بڑھ کر کوئی غلطی ہوسکتی ہے؟ لیکن مذکورۂ سابق حوالوں کے ساتھ اہلِ سنت کی وہ روایت دیکھو جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب رسول اللہؐ نے جان لیا کہ قریش مجھ سے بگڑے ہوئے ہیں تو آپ کو آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی قرآن کی آیت ایسی اترے جس کی وجہ سے یہ لوگ مجھ سے راضی ہو جائیں اس بر وقت تصور کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک دن قریش کے مجمع میں سورۂ "والنجم" نازل ہوئی آپ اس کو پڑھنے لگے اور اس آیت تک پہنچے کہ (افرأیتم اللّات والعزیٰ و المناۃ الثالثۃ الاخریٰ) تو یکایک شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیے کہ (تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ) یعنی یہ

بزرگان بلند مرتبہ میں سے ہیں، ان کی شفاعت کی یقیناً امید رکھنا چاہیے) یہ سن کر تمام مشرکین سجدہ میں گر گئے اور خوش ہوئے کہ محمدؐ اب ہمارے دین پر آگئے۔

کیا اس کے بعد یہ حق ہے کہ کسی غیر مستند روایت کی بنا پر شیعوں کی جانب یہ عقیدہ منسوب کیا جائے کہ وہ انبیاء و مرسلین کے لیے خطاء اجتہادی یا سہو و نسیان کو جائز سمجھتے ہیں اور انھیں معصوم نہیں سمجھتے۔ لیکن اہل سنت انبیاء کو معصوم قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کے روایات اہل سنت کے یہاں انتہائی کثرت سے ہیں۔

سہو کے بارے میں خود رسول اللہؐ کا نماز کی رکعتوں میں غلطی کرنا اور ذوالشمالین یا ذوالیدین کا ٹوکنا بخاری میں موجود ہے۔ اور خطاء اجتہادی کی بھی بہت سی روایتیں ہیں جن میں احکام شرعیہ کی مثال بھی موجود ہے۔ لیکن اس سب کے نقل کرنے سے ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ مضمون نگار کے اس غلط طریقۂ استدلال کو روشن کر دیں جو انھوں نے شیعوں کے خلاف اختیار کیا ہے۔ پھر بھی ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ مذہب اہل سنّت عموماً انبیاء کو معصوم نہیں سمجھتا کیونکہ بہت ممکن ہے ان میں سے بعض محققین ان تمام روایات کو سند کے اعتبار سے نا قابل قبول قرار دیتے ہوں یا اس کی کوئی تاویل کرتے ہوں۔

بحث کے آخر میں پھر پھیر کر مضمون نگار اسی نقطہ پر آگئے ہیں۔ جو ہم نے اپنے تبصرہ میں اس بحث کے آخر میں درج کیا تھا کہ اہل سنّت کا یہ خیال ہے کہ انبیاء سے اس قسم کی لغزشیں ہو جاتی ہیں تو ان کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا بلکہ اللہ کسی صورت سے متنبہ کر دیتا ہے۔

نتیجہ کیا ہوا۔ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" وہی جو ہم نے اپنے تبصرہ میں لکھا تھا کہ خلافت کے بارے میں یہ خیال صحیح نہیں ہو سکتا کہ حضرت رسولؐ نے خطاء اجتہادی کی۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کو اس غلطی پر باقی نہ رہنے دیا جاتا۔ بلکہ اس غلطی پر متنبہ کر دیا

جاتا۔ اور جب ایسا نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ رسولؐ نے جو کچھ چاہا تھا وہ بالکل صحیح تھا اور خدا کی مرضی کے مطابق۔

پھر جب نتیجہ یہی رہا۔ تو مضمون نگار کو اس حصہ پر زورِ قلم صرف کرنے سے کیا "تہجینِ مذہب شیعہ" کے شوق پورا ہونے کے سوا کوئی علمی و تحقیقی فائدہ بھی ہوا؟

دوسری تنقیح

نظامِ خلافت کے متعلق "عقلِ عمومی" یا "حاسۂ اجتماعیہ" کا تقاضا کیا ہے؟ اور کیا شیعی اصول اُسکے خلاف اور سنّی اُصول اسکے مطابق ہے؟

اس تنقیح کی تمال و کمال نشو و نما بزمی صاحب کے مضمون سے ہے جس میں یہ دعویٰ یا "محاکمہ" کیا گیا ہے۔

۱۔ رسولِ اکرمؐ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ان کی وفات کے بعد حضرت علیؑ خلیفہ ہوں۔ اور پھر یہ سلسلہ شاہانِ خود مختار کی طرح نسلاً بعد نسلٍ قائم رہے۔

۲۔ حضرت علیؑ کی "الوہی امامت" کے سلسلہ میں جتنی روایات و احادیث پیش کی جاتی ہیں، وہ سب یا تو موضوع یا جعلی یا خود ساختہ ہیں یا اس کا مفہوم حقیقتاً وہ نہیں ہے جو "الوہی امامت" کی تائید کرتا ہو اور جس کے ماتحت خلافت کے حقدار صرف علیؑ اور آلِ علیؑ قرار پائیں۔

اسی دعوے کی تائید میں ایک مبسوط بحث کی گئی ہے۔ جس سے مندرجہ

بالا تنقیح [illegible]

چونکہ بزمی صاحب کے مضمون کے جواب میں اخبار "اسد" کی متعدد اشاعتوں میں ایک غیر مکمل مضمون "ایک شیعہ صاحب قلم کے قلم سے" شائع ہوا ہے اور اس مضمون میں اس حصۂ بحث کے متعلق بہت سی سوچنے اور سمجھنے کی باتیں مندرج ہیں اس لیے ناظرینِ نگار کی اطلاع کے لیے اتنا جزو اس مضمون کا یہاں نقل کیا جاتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ مجھ کو کہنا ہے وہ میں کہوں گا۔

بزمی صاحب نے اپنے دعویٰ یا "محاکمہ" کی تائید کرتے ہوئے پہلے چار تنقیحیں قائم فرمائی ہیں اور ان کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کے نتائج مرتب فرمائے ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے: ۔

۱۔ تمام مذاہبِ عالم اور بالخصوص اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ تمام روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کی دینی اور اخروی صلاح و فلاح کا پیغام لے کر آیا ہے اور ایک ایسا پروگرام خدا کی طرف سے لے کر آیا ہے۔ جس پر عمل پیرا ہونے سے انسان دنیوی و اخروی ہر اعتبار سے نشو و ارتقا کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتا ہے۔

۲۔ کسی مذہب کی حقانیت کا پہلا اور آخری ثبوت یہ ہے کہ وہ انسان کے انفرادی معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت کرتا ہے اور کسی مذہب کا معیارِ صداقت یہی ہے کہ اس سے کسی انسانی جماعت کا کوئی حق غصب نہ ہوتا ہو۔

۳۔ کوئی ایسا مذہب الہامی نہیں ہو سکتا جو معمورۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے یکساں مفید اور قابلِ عمل نہ ہو اور جس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ اور خواہش پر ضرب لگتی ہو۔

۴۔ کوئی ایسا مذہب الہامی ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا جس کا کوئی اہم ترین بنیادی فیصلہ دنیا کے عقائد عمومی کے خلاف ہو اور دنیا کے بسنے والوں [illegible] کے کسی جماعت سے

محروم کرنا چاہتا ہو۔

مذکورہ تنقیحات اور ان کی تشریح میں چار صفحے نگار کے پُر کیے گئے ہیں۔ حالانکہ غور کیا جائے تو صرف دو جملے ہیں جنھیں مکرر سہ کرر الفاظ بدل کر تنقیحات کی صورت سے دوہرایا گیا ہے۔

۱۔ یہ کہ مذہب کو تمام افراد انسانی کے صلاح و فلاح کا ذمہ دار ہونا چاہیے اور کسی کی حق تلفی اس سے نہ ہوتی ہو۔

۲۔ مذہب کا کوئی فیصلہ دنیا کی عقل عمومی کے خلاف نہ ہو۔

عقلِ عمومی سے وہ معمولی فہم و فراست مراد لی گئی ہے جس سے انسان روزمرہ کے کاروبار میں کام لیتا ہے اور جس کے ذریعہ سے بہت سی صداقتوں کو پہچانتا ہے۔ ایسی صداقتیں جن پر بنی نوع انسان عمومیت کے ساتھ متفق ہوتے ہیں۔ مثلاً سچ بولنا اچھا ہے۔ انسان کا قتل کرنا وحشیانہ فعل ہے۔ جھوٹ بولنا بُری بات ہے وغیرہ وغیرہ

جہاں تک اس بحث کا مفہومی پہلو ہے اس میں کسی کو اختلاف کی کہاں گنجائش ہے۔ لیکن اس کا وقوعی پہلو انتہائی تاریک اور مایوس کُن ہے۔

مذہب ہر انسان کی دنیوی اور اخروی صلاح و فلاح کا پیغام لے کر آیا ہے لیکن یہ صلاح و فلاح کس کے نقطۂ نظر سے؟ کیا خود عام انسانوں کے نقطۂ نظر سے؟ مگر دشواری تو یہ ہے کہ منادِ عامہ اور صلاح خلق کی تعیین میں خود انسانی نظریے بدلتے رہتے ہیں اور بوقتِ واحد بھی سب کبھی ایک نقطہ پر مجتمع نہیں ہوتے۔

"کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ اور خواہش پر ضرب نہ لگتی ہو۔"

بہت ٹھیک، مگر اس صحیح اور جائز کی تشخیص کون کرے گا؟ خود جذبات کی ہوا میں اٹھنے والے افراد جن میں سے ہر ایک اپنے مطالبہ اور خواہش کو صحیح اور جائز

ہی تبلاتا ہے چاہے وہ کتنی ہی ناجائز اور غیر صحیح کیوں نہ ہو۔

" دنیا کے بسنے والوں کو ماں کے کسی جائز حق سے محروم نہ کرنا چاہتا ہو۔"

ضرور۔ مگر جائز حق کی حدبندی کس طرح ہو؟

" برہنہ کلب" کا ہر ممبر عریاں حالت میں بازاروں، شاہراہوں اور عام تفریحگاہوں میں پھرنے کو اپنا جائز حق تبلاتا ہے۔ صنف نازک کا کتنا بڑا طبقہ مردوں کی طرح طلاق کے معاملہ میں صاحب اختیار ہونے کو اپنا جائز حق تبلاتا ہے۔ ایک فریق جو سرمایہ دار ہے اپنے روپے کی منفعت یعنی سود لینے کو اپنا جائز حق تصور کر رہا ہے۔ مانی اور مزدک کے پیرو اموال کے ساتھ صنف اناث میں تمام افراد کو مشترک قرار دیتے ہوئے ان سے بہرہ ور ہونے کا حق ہر شخص کو عطا کرتے ہیں۔ اشتراکی جماعت ملکیت و میراث کے تمام احکام کو معمورۂ ارض پر بسنے والے انسانوں کے لیے غیر مفید اور عوام کے حقوق پر ضرب کاری سمجھتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے نقطۂ نظر کو "عقلِ عمومی" یا بقول "مدیرِ نگار" "حاسۂ اجتماعیہ" کے مطابق قرار دیتا ہے۔ عریاں پسند طبقہ عریانی کو عقلی حیثیت سے مفید اور ضروری قرار دیتا ہے۔ اشتراکیت پرور گروہ اپنے معتقدات کو عقل عمومی کے عین مطابق دکھلاتا ہے۔ اب اگر دنیا کی ہر جماعت اور ہر خیال کے مطابق اس کے جائز مطالبہ کے حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اور حقوق عطا کیے جائیں۔ تو دنیا میں کسی قانون اور نظام کا نفاذ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور مذہب کی تو اینٹ سے اینٹ بج جائے گی — "صحیح اور جائز کی تشخیص اگر عام افراد انسانی کے جذبات ہی پر چھوڑ دی جائے تو مذہب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ مذہب تو درحقیقت انسانی افراد اور اقوام کے مطالبات اور توقعات میں جائز اور صحیح" کی حدبندی کے لیے آیا ہے۔ اس کی حدبندیاں خود انسانی طبائع پر ایک بار گراں ہیں اور اس لیے ان کو حق آزادی اور مطالبۂ حریت پر ضرب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

عقلِ عمومی" یا "حاسۂ اجتماعیہ" کی مطابقت کا دعویٰ بہت آسان ہے۔ لیکن اسکی واقعی تشخیص بہت مشکل ہے۔ سوشلزم، نیشنلزم، کمیونزم وغیرہ وغیرہ تمام نظریے عقلِ عمومی ہی کی بنیاد پر اختیار کیے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا حامی اپنے ہی مسلک کو "حاسۂ اجتماعیہ" کے مطابق سمجھتا ہے اور بتلاتا ہے۔ یورپ میں تعددِ ازواج جس بُری نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ ایک عیسائی سے پوچھیے تو وہ متعدد شادیاں کرنے کو بالکل عقلِ عمومی کے خلاف بتلائے گا جبکہ ایک مسلمان پورے طور پر اس کی حمایت کرتے ہوئے عقلی حیثیت سے اس کو ضروری قرار دیگا۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ یہ تمام مختلف راستے سب ہی صحیح نہیں ہیں۔ دنیا میں اکثریت کے ساتھ کسی خاص ہوا کا چلنا کبھی "عقلِ عمومی" کا معیار نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس کو لطیف پیرایہ میں اس طرح ظاہر کر دیا ہے کہ "لو اتبعت اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللّٰہ"

یعنی اہلِ زمین کی اکثریت کی اگر پیروی کرو تو تمہیں خدا کے راستے سے گمراہ کر دے گی۔

انسانی طبائع و حالات میں جزر و مد ہوتا ہے ایک وقت میں جو مسلک اکثر افراد یا جمہورِ خلق کا ہے، دوسرے وقت وہی اقلیت کا ہو جاتا ہے اور اس کے خلاف مسلک اکثریت کی تائید حاصل کر لیتا ہے۔ پھر اگر اکثریت ہی کو معیارِ حقانیت سمجھا جائے تو چاہیئے کہ یہ دونوں متضاد مسلک برحق ہوں۔ کیونکہ ہر ایک کو بجائے خود اکثریت کی تائید حاصل ہے یا یہ کہا جائے کہ خود واقعہ حقیقت اختلافِ نظریات سے بدلتا رہتا ہے۔ یعنی جب اکثریت اس مسلک کے موافق نہ ہو تو بالکل غلط ہے۔ حق ایک ہے اور وہ بدلتا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس سے پہلے دنیا میں شہنشاہیت کا دور دورہ تھا عام ہوا یہی چل رہی تھی اور دنیا اسی راستے کی سالک تھی۔ لہٰذا یہ سمجھنا چاہیے کہ "عقلِ عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" اسی کو صحیح سمجھ رہے تھے۔ اس کے بعد انقلاب ہوا اور دنیا کا نقطۂ نظر بدلا جس کے بعد مختلف نظریات پیدا ہو گئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جس مسلک کا غلبہ دنیا میں آج ہے یہ سو برس کے بعد بھی اسی صورت سے رہیگا۔

ہسپانیہ میں اشتراکیت کے خلاف جدوجہد جاری ہے جس کا نتیجہ کامیابی سے قریب معلوم ہوتا ہے۔ روس میں خود اہل ملک کے اندر اس نظام کے خلاف سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور اسٹالین کی زندگی اسی طرح ہر لمحہ خطرہ میں ہے۔ جس طرح مسولینی اور ہٹلر کی۔ وہاں بہت سے وہ قدم پیچھے ہٹائے جا چکے ہیں جو اس کے پہلے آگے بڑھائے گئے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی نظام زندگی کی پالیسی اس اجتماعی نظام سے بچی نہیں ہے۔ پھر یہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ جس رنگ پر دنیا آج جاری ہے یہی "عقل عمومی" کا اصلی تقاضا اور "حاسۂ اجتماعیہ" کا حقیقی مطالبہ ہے ــــ اس وقت تو خود مذہب کے خلاف جو عام ہوا چل رہی ہے اس کی بنا پر خود مذہب ہی کو "عقل عمومی" کے خلاف سمجھا جا رہا ہے ــــ خدا کو ایک ذی شعور ارادہ، قادر و فاعل مختار ہستی کی حیثیت سے ماننے میں دنیا کو عذر ہے۔ وہ اس کی طرف سے وحی اور بعثت انبیاء کے کوئی معنی نہیں سمجھتی تو منصب من اللہ ہونے کا کیا مفہوم اس کے ذہن میں آ سکتا ہے ــــ اگر اسی طرح کے "عقل عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" کی بنیاد پر گفتگو کرنا منظور ہے۔ تو امامت کے مسئلہ تک نوبت ہی نہ پہنچے گی۔ مذہب اور اس کا عقیدۂ الوہیت اور نبوت سب ہی غائب ہو جائے گا۔ اور اسی لیے شاید "آزاد خیال شیعہ" نے اپنے مقالہ میں مدیر نگار کو مخاطب کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "اب اس بحث نے ــــــــــــ جو صورت اختیار کر لی ہے وہ مذہبی و اعتقادی ہے جس کے دلائل و اصول کا بہت کچھ تعلق مابعد الطبیعیاتی مسائل کے ساتھ ہے۔ لہٰذا اس بحث کا جو فیصلہ کیا جائے وہ ان ہی اصول کو پیش نظر رکھ کر جو عام مسلمانوں میں متفقہ حیثیت رکھتے ہیں۔"

اپنی طول طویل تمہید یا چار تنقیحات کی تشریح کے بعد بزمی صاحب نے جو سنگ بنیاد اپنی آئندہ بحث کا رکھا ہے وہ انہی کے لفظوں میں یہ ہے کہ "اب آپ حضرت علیؑ کی "الٰہی خلافت" کے عقیدہ پر غور کیجیے۔ دیکھیے "الٰہی خلافت" کا مطلب یہ ہے کہ

”خداوندِ کریم نے یہ طے کر دیا تھا کہ رسولِ کریمؐ کے بعد ان کے داماد حضرت علیؑ خلیفہ ہوں۔ اور علیؓ کے بعد ان کی اولاد میں سے کسی کو یہ منصبِ جلیل تفویض کیا جائے اور اس طرح یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے۔ (برقی صاحب فرماتے ہیں) اب اگر آپ اسلام کے اس بنیادی عقیدہ کا تجزیہ کریں تو اس سے مندرجہ ذیل ضمنی عقائد مستنبط ہوتے ہیں:-

(۱) خلافت و امامت علیؓ کی نسل کے لیے مخصوص ہے۔ (۲) خلیفہ (یا امام) کی وفات پر اس کی جانشینی کے لیے پیش رو کا بیٹا یا بیٹے کی عدم موجودگی میں پیش رو کا کوئی قریب ترین عزیز ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح شاہانِ خود مختار کے یہاں ولیعہدی کے لیے (۳) اگر روئے زمین کے تمام باشندے مسلمان ہو جائیں تب بھی ان میں سے کوئی خلافت کی مسند کا مستحق قرار نہیں پا سکتا۔ (۴) دنیا کے تمام مسلمان حضرت علیؓ کی نسل کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں۔ (۵) چونکہ رسولؐ کے بعد علیؓ اور ان کی اولاد ہی خلافت و امامت کی حقدار ہے اور وہی ”اولوالامر“ آقا اور مولا ہیں اس لیے روئے زمین پر بسنے والے ہر مسلمان کے لیے یہ فرض ہے کہ وہ ابدالآباد تک آلِ علیؓ کے ہر اشارہ پر بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کرتا رہے۔ (۶) اگر دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع، متقی، باخدا، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو تب بھی جانشینی کے وقت اس کو زیرِ بحث نہیں لایا جائے گا۔ بلکہ علیؓ کی اولاد میں سے ولیعہدی کے مروجہ اصول کے بموجب کسی حقدار کو مسندِ خلافت و امامت پر متمکن کر دیا جائے۔

یہ ہے وہ استنباط اور امامت کے بارے میں عقیدۂ اہلِ تشیع کی تحلیل و تشریح جو برقی صاحب کے نکتہ رس نگاہ کی مرہونِ منت ہے۔ لیکن کیا وہ حقیقتِ واقعہ کے بھی مطابق ہے! سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ذی علم انسان کو اپنے مسلک و خیال کی حمایت میں اس کی جرأت کس لیے ہوتی ہے کہ وہ اپنی عبارت آرائی سے دوسرے فریق کے عقائد کو بھی غلط صورت میں پیش کرے۔ اور توڑ مروڑ کر ایسا نظریہ اسکی طرف منسوب

کرے جس کا مصنف وہ خود ہے اور پھر اس کی رد میں صفحے کے صفحے سیاہ کرکے غلط اندیش افراد کو یہ رائے قائم کرنے کی دعوت کہ فریق مخالف کا جواب ہوگیا اور اس کے عقیدہ کی عمارت مسمار ہوگئی۔ "معیارِ امامت" کو جو کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے "تعیینِ اشخاص" کے ساتھ جو خصوصی دلائل کا جزئی نتیجہ ہے مخلوط کردینا ایک ایسی مناظرانہ تدلیس اور فریب کاری ہے۔ جو سنجیدگی اور انصاف کی طرف سے انتہائی نفرت و ملامت کی مستحق ہے۔" الوہی خلافت" کا مطلب ہرگز "شخصیت پروری" نہیں ہے جس میں اوصاف سے کوئی بحث نہ ہو۔ خلیفہ یا امام کے لیے اصولی حیثیت سے ہرگز یہ ضروری نہیں قرار دیا گیا ہے کہ وہ پیش رو کا بیٹا یا بیٹے کی عدم موجودگی میں ان کا کوئی قریب ترین عزیز ہو۔ امامت کے بنیادی شرائط میں ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ آلِ علیؑ میں سے کسی کے لیے عام مسلمانوں کی جانب سے قرار دی جائے اور نہ بحیثیت "علیؑ" کی اولاد ہونے کے کسی کو بھی سادات میں سے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ امامت و خلافت کا حقدار بنے اور اولوالامر آقا اور مولا ہونے کا دعویٰ کرے۔ اور ہرگز یہ درست نہیں ہے کہ دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع، متقی، باخدا، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو اور پھر بھی وہ جانشینی کا مستحق نہیں ہے اور علیؑ کی اولاد میں سے ولیعہدی کے مروجہ اصول کے موافق کسی کو مسندِ خلافت پر متمکن کیا جائے گا۔

ان میں سے کوئی ایک بات بھی ذرہ بھر اصلیت نہیں رکھتی اور نہ اسے شیعی عقیدہ "خلافتِ الٰہیہ" سے کوئی واسطہ ہے۔ شیعوں کا اساسی عقیدہ خلافت و امامت کے بارے میں صاف طور پر حسب ذیل ہے :۔

۱۔ امام و جانشین رسولؐ ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے جس سے رسولؐ کی وفات کے بعد حفاظتِ شریعت اور اصلاحِ خلائق کا مقصد پورے طور سے حاصل ہو سکے اور خود اس کی غلط اندیشی، غلط بیانی یا غلط کاری سے فسادِ خلق کا اندیشہ

نہ ہو اور یہ اسی وقت ہوگا کہ جب وہ معصوم ہو۔

۲۔ امام وہی ہوگا جو اپنے زمانہ کے تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ متورع متقی، باخدا، اور سب سے زیادہ عالم علوم حقیقیہ، خلاصہ یہ کہ علم و عمل میں افضل و اکمل ہو۔

۳۔ ایک ایسی ہستی کی تشخیص جو معصوم ہونے کے ساتھ تمام افراد مسلمین سے افضل و اکمل ہو۔ عام افرادِ انسانی کے دسترس سے باہر ہو، نیز عام افراد کا فیصلہ پورے طور پر دور رعایت اور جانبداری سے الگ بھی نہیں ہوا کرتا اور اس میں خودغرضی مطلب برآری کے لحاظ کا موقع ہے۔ اس لیے امام یعنی جانشینِ رسولؐ کا انتخاب براہِ راست خدا سے متعلق ہونا چاہیے۔ اور امام وہی ہوگا جس کو خدا مقرر کرے۔

۴۔ چونکہ خداوندی منشا کے معلوم ہونے کا ذریعہ عام انسانوں کو سوائے غیر الٰہی یعنی پیغمبرؐ کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے امام یعنی جانشینِ رسولؐ کی تعیین نصِ رسولؐ ہی سے ہوسکتی ہے۔ اور اس امام کے بعد دوسرے امام کی تعیین بھی یا اسی رسولؐ کے نص سے ہوگی یا اس امام کے بیان سے جو رسولؐ کی جانب سے نامزد تھا۔ کیونکہ یہ نص بھی بواسطۂ رسولؐ خدا تک منتہی ہوتی ہے۔

اب دیکھیے کہ اس معیار اور اصولِ اساسی میں کہیں کسی خاندان، کسی جماعت، کسی قوم و قبیلہ کی تخصیص ہے؟ حقیقت پروری کا واقعی تقاضا یہ ہے کہ عقلی و اصولی بنیاد پر صرف اسی معیار اور اصول کی صحت کو جانچا جائے اور دیکھا جائے کہ کیا یہ اصول درست ہے یا اس کے خلاف جماعت کا بنیادی عقیدہ جس کا تجزیہ کرنے پر مندرجہ ذیل ضمنی عقائد مستنبط ہوتے ہیں:۔

۱۔ خلافت و امامت یعنی جانشینی رسولؐ کے مسئلہ کا خدا و رسولؐ سے کوئی

تعلق نہیں۔ بلکہ یہ عام افراد کے اختیارات امتیازی سے متعلق ہے کہ وہ جس کو چاہیں خلیفہ و جانشینِ رسولؐ منتخب کرلیں۔

۲ ۔ خلیفہ کا انتخاب اجماع سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندے مجتمع ہوں اور کوئی آل ورلڈ مسلم کانفرنس ہو، اور اس میں یہ مسئلہ طے پائے۔ بلکہ اگر کسی ایک اسلامی مرکز کے لوگوں نے مجتمع ہو کر کسی کو اپنا خلیفہ منتخب کرلیا اور اس کی بیعت ہوگئی تو وہ خلیفہ سمجھ لیا جائے گا، اور تمام دنیا کے مسلمانوں کی قسمت اس سے وابستہ ہوجائے گی۔

۳ ۔ دوسری صورت یہ بھی ہے کہ ایک منتخبہ کمیٹی چند آدمیوں کی جو کسی جلسۂ عام میں منتخب بھی نہ ہوئی ہو بلکہ کسی ایک شخص نے بنالی ہو وہ مجتمع ہو کر کثرت آراء سے کسی ایک کو خلیفہ بنا دے تو بھی تمام مسلمانوں کا خلیفہ ہوجائے گا۔

۴ ۔ تیسری صورت یہ بھی ہے کہ سابق خلیفہ (جو معصوم بھی نہیں ہے) وہ کسی کو نامزدگی کے ذریعہ سے معین کرجائے تو وہ بھی خلیفۃ الرسولؐ بن جائے گا اور تمام مسلمانوں کو اس کی اطاعت لازمی ہوگی۔

۵ ۔ چوتھی شکل یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہوئی ہو لیکن ایک شخص کسی طرح اقتدار حاصل کرلے اور بزورِ شمشیر دوسروں سے سرِ تسلیم خم کرائے تو وہ بھی خلیفۂ رسولؐ قرار پا جائے گا۔

۶ ۔ خلیفۂ رسولؐ کے لیے معصوم ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اگر ایک زانی اور شرابخور بھی قہر و غلبہ حاصل کرلے تو وہ پیغمبر خداؐ کا جانشین سمجھا جائے گا اور اس کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہوگی۔

اب اس کا فیصلہ اربابِ عقل کے ہاتھ ہے کہ کیا یہی عقائد "عقلِ عمومی" کے بنیادی اور اصولی مسلمات کے موافق ہیں؟ کیا ان ہی عقائد کو مان لینے سے تمام معمورۂ ارض

بسنے والے تمام انسانوں کے انفرادی، معاشرتی اور ملی، تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت ہو سکے گی؟ کیا اسی طرح مفادِ اسلامی حاصل ہوگا اور جانشینیٔ رسولؐ کا اصلی مقصد پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ کیا اسی طرح شریعتِ اسلام کی حفاظت ہوگی اور مسلمانوں میں روحِ اسلامیت کی صحیح تربیت ہو سکے گی؟

یہ ہے پورا وہ تبصرہ جو فاضل "صاحبِ قلم شیعہ" نے اس بحث کے متعلق کیا ہے۔ اور اس حقیقت کا اعتراف ناگزیر ہے کہ بہت سے نکات اس تبصرہ میں اس طرح تشریح کے ساتھ درج ہو گئے ہیں کہ نہ اس سے زیادہ کچھ کہنا ممکن ہے، اور نہ حرف باقی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیعی مذہب کے عقیدۂ امامت کی تشریح میں بزمی صاحب نے بے اعتدالی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ اس پر نقد و ایراد کے سلسلہ میں مذکورۂ بالا تبصرہ کے الفاظ ذرا تیز ہو گئے ہیں جو کم از کم میرے مذاقِ طبیعت کے خلاف ہیں۔ لیکن پھر بھی جو کچھ جواب میں لکھا ہے وہ بالکل درست ہے۔ شیعوں کی طرف یہ امر منسوب کرنا کہ وہ اس میں مخصوص خاندان کی شرط لگاتے ہیں، ویسا ہی ہے جیسے مسلمانوں پر یہ ایراد عائد کیا جائے کہ وہ ختمِ نبوت کو قوم عرب اور اس میں مخصوص اہلِ مکہ اور ان میں خاص قبیلۂ قریش اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ بنی ہاشم اور پھر وہ بھی فرزند عبداللہ کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں۔ اور تمام دنیا کے لوگوں کو شرق و غرب عالم میں اس نعمت سے محروم کرتے ہیں۔ جو تمام اہلِ عالم کے حقوق پر ایک کاری ضرب ہے اور اس لیے "عقلِ عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" کے بالکل خلاف ہے۔ شیعی اور سنی مسلک میں خطِ فاصل یہ ہے کہ شیعہ تعیین امام کا صرف ایک طریقہ قرار دیتے ہیں اور وہ نص یعنی استخلاف ہے۔ بزمی صاحب کے لیے اہلِ سنت کی جانب سے اس مسلک کی پوری نکتہ چینی اور ابطال کی کوشش اور اس امر کے اثبات کی جدوجہد کہ یہ مسلک "عقلِ عمومی" کے خلاف ہے، اس وقت جائز

سمجھی جا سکتی تھی جب اہلِ سنّت اس طریقہ کو غلط سمجھتے ہوتے اور معتبر نہ جانتے۔ لیکن جب کہ یہ طریقہ باتفاق اہلِ سنّت بھی ایک ذریعہ تعیینِ امام کا ہے جس کے بعد عام مسلمانوں کو کوئی اختیار انتخاب واظہار رائے کا باقی نہیں رہ جاتا تو پھر اس مسلک کے خلاف اتنی عرق ریزی اور اس امر کی کاوش کہ وہ کسی طرح "عقلِ عمومی" کے خلاف ثابت ہو جائے اثباتِ حقیقت کے لحاظ سے کون سی "سعیٔ مشکور" سمجھی جا سکتی ہے سوائے اس کے کہ مذہب اہلِ سنّت کی جانب سے اس کی ہمت افزائی یہ کہہ کر کی جائے:۔

اقتلونی و مالکا واقتلوا مالکا معی

اور شکریہ اس طرح ادا کیا جائے:۔

شکرست بارقیباں دامن کشاں گذشتی گو مشتِ خاکِ ما ہم بر باد گشتہ باشد

ملاحظہ ہو علماء اہلسنت کے تصریحات جو اس مسئلہ سے متعلق ہیں۔ (۱) شرح مواقف مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ص ۷۳۲

(۱) مقصد ثالث فیما یثبت بہ الامامۃ فان الشخص بمجرد صلوحہ للامامۃ وجمعہ شرائطھا لا یصیر اماما بل لابدّ فی ذلک من امر آخر وانّما تثبت بالنّص من الرسول ومن الامام السابق بالاجماع و تثبت ایضا ببیعۃ اھل الحل و العقد عند اھل السنّۃ والجماعۃ والمعتزلۃ الصالحیۃ من الزیدیۃ خلافا للشیعۃ ای اکثرھم قالوا لا طریق الا النّص۔

تیسرا مقصد (بحثِ امامت) کا اُن طریقوں کے بیان میں جن سے امامت ثابت ہوتی ہے کیونکہ امامت کی لیاقت اور شرائط امامت کے اجتماع سے کوئی امام ہو نہیں جائے گا۔ بلکہ اس کے لیے کچھ اور بھی ضروری ہے۔ اس کا ایک طریقہ رسول اور سابق امام کی نص ہے۔ یہ طریقہ باجماع درست ہے اور دوسری صورت اہل حل وعقد کا بیعت کرنا۔ یہ اہلسنت وجماعت اور معتزلہ اور فرقۂ زیدیہ کی جماعت صالحیہ کا مسلک ہے

لیکن شیعوں کی اکثریت اس کے مخالف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سوائے نص کے کوئی طریقہ نہیں ہے۔

۲۔ صواعق محرقہ ابنِ حجر مکی۔ مطبوعہ مصر ص۵۔

الامامۃ تثبت اما بنص من الامام علی استخلاف واحد من اھلھا واما بعقدھا من اھل الحلّ والعقد لمن عقدت لہ من اھلھا واما بغیر ذلک کما ھو مبین فی محلہ۔

امامت ثابت ہوتی ہے یا تو امام وقت کے نص سے کسی قابل شخص کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کرنے کے ساتھ اور یا اہل حل و عقد کے مقرر کرنے سے کسی لائق شخص کو اور یا دوسرے طریقوں سے جو اپنے محل پر بیان ہوئے ہیں۔

۳۔ معالم اصول الدین۔ امام فخرالدین رازی جو مصر میں محصّل امام رازی کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے۔ اس میں (الباب العاشر فی الامامۃ) کا "مسئلہ رابعہ" حسب ذیل ہے۔ (ص۱۵۸)

اجمعت الامۃ علی انہ یجوز اثبات الامامۃ بالنص وھل یجوز بالاختیار ام لا قال اھل السنۃ والمعتزلۃ یجوز وقالت الاثناعشریۃ لا یجوز الّا بالنص۔

تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ امامت نص کے ذریعہ سے ثابت ہوتی ہے۔ لیکن عام افراد کے انتخاب کے ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے یا نہیں، اہل سنت اور معتزلہ قائل ہیں کہ ہو سکتی ہے اور فرقۂ اثنا عشریہ قائل ہے کہ بغیر نص کے نہیں ہو سکتی۔

۴۔ ابطال الباطل میں لکھا ہے :-

انما یثبت بالنص من الرسول و	امامت، رسول اور گذشتہ امام کے
من الامام السابق بالاجماع و	نص سے اجماعاً ثابت ہوتی ہے اور اہلِ
یثبت ایضا ببیعۃ اهل الحلّ و	حل وعقد کی بیعت سے بھی اہل سنت و
العقد عند اهل السنة والجماعة	جماعت اور معتزلہ اور زیدیہ صالحیہ کے
والمعتزلة والصالحیۃ من الزیدیۃ	نزدیک ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن فرقۂ
خلافا للامامیہ من الشیعۃ	شیعہ امامیہ اس کا مخالف ہے۔ وہ لوگ
فانّھم قالوا لاطریق الا النص۔	کہتے ہیں کہ سوائے نص کے کوئی طریقہ
	نہیں ہے۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ شیعوں کا مقررہ طریقہ (نص) سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ دوسرے طریقوں میں ہے۔ پھر اب اس بات کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے کہ شیعوں کے مقررہ طریقہ کو "عقل عمومی" یا "حاسۂ اجتماعیہ" کے خلاف قرار دیا جائے۔ شیعوں کا مقررہ طریقہ تو اس درجہ "عقل عمومی" کے مطابق اور دل کو لگتا ہوا ہے کہ جو لوگ حضرت ابوبکر کی خلافت کے قائل ہیں وہ بھی دل سے متمنی ہیں کہ ان کی خلافت اس طریقہ پر درست ثابت ہو جائے اور اسکی کوشش بھی کرتے ہیں چاہے وہ ناکام ہو۔

تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلی کی کتاب "منہاج السنۃ" (مطبوعہ بولاق مصر ۱۳۲۱ھ) جلد ۱ صفحہ ۱۳۴۔

ذھبت طوائف من اهل السنة	اہل سنت کی بہت سی جماعتیں اس کی
الی انّ امامۃ ابی بکر ثبتت بالنص	قائل ہیں کہ حضرت ابوبکر کی امامت بذریعہ
والنزاع فی ذالک معروف فی مذهب	نص ثابت ہوئی ہے۔ اور اس مسئلہ میں امام
احمد وغیرہ من الائمۃ، وقد ذکر	احمد اور دوسرے علماء کے درمیان اختلاف

القاضی ابوالعلی وغیرہ فی ذلک روایتین عن الامام احمد احداھا انھا ثبتت بالاختیار قال وبھذا قال جماعۃ من اھل الحدیث والمعتزلۃ والاشعریۃ وھذا اختیار القاضی ابی العلی وغیرہ والثانیۃ انھا اثبتت بالنص الخفی والاشارۃ قال وبھذا قال حسن البصری وجماعۃ من اھل الحدیث وبکر بن بنت عبد الواحد والبیھسیۃ من الخوارج وقال الشیخ ابو عبد اللہ بن حامد فاما الدلیل علی استحقاق ابی بکر الخلافۃ دون غیرہ من اھل البیت والصحابۃ فمن کتاب اللہ وسنۃ نبیہ قال وقد اختلف اصحابنا فی الخلافۃ ھل اخذت من حیث النص والاستدلال فذھب طائفۃ من اصحابنا الی ان ذلک بالنص وانہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم ذکر ذلک نصا وقطع البیان [illegible]

مشہور ہے اور قاضی ابوالعلی وغیرہ نے اس بارے میں دو روایتیں امام احمد سے نقل کی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی امامت عامۂ ناس کے انتخاب سے ثابت ہوئی ہے اور اس کی قائل ہوئی ہے، ایک جماعت اہل حدیث میں سے، اور معتزلہ اور اشاعرہ اور یہی مسلک ہے قاضی ابوالعلی وغیرہ کا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ نص خفی اور اشارہ سے ثابت ہوئی ہے اور اس کے قائل ہوئے ہیں حسن بصری اور ایک جماعت اہلحدیث میں سے اور بکر ابن بنت عبدالواحد اور فرقۂ خوارج میں بیہسیہ اس کے قائل ہیں۔ اور شیخ ابوعبداللہ بن حامد نے کہا ہے کہ اس امر کی دلیل کہ خلافت کے مستحق ابوبکر تھے۔ اور دوسرے اہل بیت اور صحابہ نہیں تھے۔ قرآن اور سنت دونوں سے ہے انھوں نے کہا کہ ہمارے علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ خلافت نص سے ثابت ہے یا استدلال سے۔ ایک جماعت ہمارے اصحاب میں سے اس کی قائل ہے کہ [illegible]

ان ذلک بالاستدلال الجلی ۔

حضرت نے اس کو بطور نص بیان فرمایا۔ اور مخصوص حضرت ابوبکر کی قطعی طور پر تعیین فرمائی اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ استدلال کے ذریعہ سے ثابت ہوا ہے۔

اس کے بعد مختلف روایات اپنے طرق سے اور اس طرح کے استدلالات ذکر کیے ہیں جن سے کسی نہ کسی طرح ثابت ہو جائے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت نص رسولؐ سے تعلق رکھتی تھی۔ جن میں سب سے زیادہ اس محل پر قابلِ لحاظ یہ استدلال ہے کہ خلیفہ کا اطلاق اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک پیش رو شخص نے خود جانشین بنایا نہ ہو اور چونکہ تمام صحابہ نے باجماع حضرت ابوبکر کو خلیفۂ رسولؐ کے نام سے یاد کیا اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ کی جانب سے ان کے متعلق نص ہو چکی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ "عقل عمومی" اسی طریقہ کو صحیح سمجھتی ہے جو شیعوں نے خلافت کے لیے مقرر کیا ہے۔ اور جس کی بنیاد پر وہ حضرت علیؑ کی خلافت کے مدعی ہیں شیعہ فرقہ کا عقیدہ اس بناء پر کہ اس میں خاندان پرستی کی بو پائی جاتی ہے "عقلِ عمومی" کے خلاف بتلایا جا رہا ہے۔ حالانکہ وہ حقیقتاً نصِ رسولؐ پر مبنی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں بحیثیت اصول اساسی قرابت کا کوئی پہلو ملحوظ نہیں ہے۔ یعنی اگر رسولؐ کا نص و استخلاف کسی اجنبی شخص کے متعلق مستند طریقہ سے ثابت ہو جائے، تو شیعہ عقیدہ کے لحاظ سے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے موجود ہیں۔ اور اس کا لحاظ ہرگز نہیں کریں گے کہ وہ اجنبی شخص ہے۔ اور غیر متعلق ہے۔ لیکن اہل سنت جو نص کے پابند نہیں ہیں اور عام افراد کو خلیفہ کے انتخاب کا حق دیتے ہیں انھوں نے جس صورت سے قوم و قبیلہ کی پابندی عائد کی ہے اسے سوائے "خاندان پرستی" کے اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اہل سنت خلافت کے لیے قطعاً "قریش"

میں سے ہونے کی شرط قرار دیتے ہیں۔ چونکہ "م۔ح" صاحب نے اس کمزوری کو محسوس فرمایا ہے اس لیے انھوں نے یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ "اہلِ سنّت خلافت کو کسی گروہ میں محدود نہیں رکھتے" یہ دفع دخل کیا ہے کہ "جن لوگوں نے اہل سنّت کے نظریہ کو محدود سمجھا غلط سمجھا ہے"

اور فٹ نوٹ میں تحریر فرمایا ہے کہ :۔

> بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ وہ اہل سنّت کے نزدیک خلافت کو صرف قریش کے لیے مختص سمجھتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ "الائمۃ من القریش" ضرور وارد ہوا ہے لیکن یہ فرمانِ رسول اس وقت کے حالات اور ماحول کے لحاظ سے تھا کہ اس وقت طاقت و قوت کے اعتبار سے قریش ہی کا ایک ایسا قبیلہ تھا جو اور قبائل سے غیر معمولی امتیاز رکھتا تھا۔ اسی لیے امامت و خلافت کا اس کو مستحق قرار دیا ورنہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ قریش میں امامت و خلافت منحصر ہے ۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ اس زمانہ میں ٹرکی کی بے پناہ عسکری طاقت کو دیکھتے ہوئے کہا جائے کہ خلافت کا مستحق ٹرکی ہے ۔ اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ ٹرکی ابدالآباد کیلئے خلافت کا مستحق ہو گیا ۔"

ممکن تھا کہ "م۔ح" صاحب اس رائے کو اپنے ذاتی اجتہاد کے طور پر درج فرماتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا ہے ۔ وہ اپنے ذاتی خیال کو جمہور اہل سنّت کے سر عائد کرنا چاہتے ہیں۔ جانے دیجیے اس کو کہ ان کا ذاتی اجتہاد درست ہے یا نہیں۔ اور انھوں نے جو تاویل فرمائی ہے وہ " الائمۃ من القریش" کے الفاظ کے ساتھ کہ (جس میں "ائمہ" جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد ہے نہ "الامام" جس کے معنی یہ کیے جا سکتے کہ میرے بعد والا امام قریش ہی سے ہونا چاہیے) سازگار ہے یا نہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے اہل سنّت کی طرف اس عقیدہ کی نسبت جو دی ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ اس کے لیے

ملاحظہ ہوں علماء اہل سنت کے تصریحات:۔

۱۔ علامہ ابن حزم نے کتاب الفصل فی الملل والنحل میں لکھا ہے:۔

اختلف القائلون بان الامامۃ لا تکون الا فی صبیۃ قریش فقالت طائفۃ ھی جائزۃ فی جمیع ولد فہر بن مالک بن النضر وھٰذا قول اھل السنۃ وجمھور المرجئۃ وبعض المعتزلۃ وقالت طائفۃ لا تجوز الخلافۃ الا فی ولد العباس بن عبد المطلب وھم الراوندیہ وقالت طائفۃ لا تجوز الخلافۃ الا فی ولد علی بن ابی طالب۔

وہ جماعتیں جو امامت کو نسل قریش میں منحصر سمجھتی ہیں انہیں اختلاف ہوا ہے۔ ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ وہ فہر بن مالک بن نضر کی تمام اولاد میں جائز ہے۔ یہ قول ہے اہل سنت اور تمام مرجیہ اور بعض معتزلہ کا، اور ایک جماعت کہتی ہے کہ خلافت عباس بن عبد المطلب کی اولاد میں منحصر ہے یہ راوندیہ ہیں۔ اور تیسری جماعت اس کی قائل ہے کہ خلافت اولادِ علیؑ بن ابی طالب میں منحصر ہے۔

۲۔ شرح مواقف (مطبوعہ نولکشور) صفحہ ۷۲۲ میں شرائط امامت میں لکھا ہے:۔

ان یکون قرشیا اشترطہ الاشاعرۃ والجبائیان ومنعہ الخوارج وبعض المعتزلۃ

امام کو قرشی ہونا چاہیے۔ اس شرط کو معتبر قرار دیا ہے اشاعرہ نے اور فرقہ معتزلہ میں سے جبائیان نے اور خوارج اور بعض معتزلہ اس کے خلاف ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اہل سنت تمام تر اشاعرہ ہی ہیں۔ جن کا یہ مذہب ذکر کیا گیا ہے۔

۳۔ ابطال الباطل میں لکھا ہے:۔

شروط الامام الذی ھو اھل الامامۃ مستحقا ان یکون

شرائط امام کے جو امامت کا اہل اور مستحق ہوتا ہے یہ ہیں کہ وہ اصول اور فروع دونوں میں

مجتهدا فی الاصول والفروع لیقوم بامر الدین ذا رأی وبصارة بتدبیر الحرب وترتیب الجیوش شجاعا قوی القلب لیقوی علی الذب من الحوزة عدلا لئلا یجوز فان الفاسق ربما یصرف الاموال فی اغراض نفسه والعدل عندنا من لم یباشر الکبائر ولم یصر علی الصغائر عاقلا لیصلح للتصرفات الشرعیة بالغا لقصور عقل الصبی ذکرا اذ النساء ناقصات العقل والدین حرا قرشیا فمن جمع هذه الصفات فهو اهل للامامة والزعامة الکبریٰ ۔

میں اجتہاد کا درجہ رکھتا ہو تاکہ دینی امور کا انصرام کر سکے۔ جنگ کے تدابیر اور افواج کی ترتیب میں صائب الرائے اور باخبر ہو۔ بہادر، قوی دل ہو تاکہ مرکزِ اسلام سے مدافعت پر قادر رہو۔ عادل ہو تاکہ جور و ظلم نہ کرے اس لیے کہ اگر فاسق ہوگا تو ممکن ہے کہ مسلمانوں کے مال کو اپنے نفسانی اغراض میں صرف کر دے اور عادل ہمارے نزدیک وہ ہے جس نے کبائر کا ارتکاب نہ کیا ہو اور صغائر پہ اصرار نہ کرتا ہو۔ عاقل ہو، تاکہ تصرفات شرعیہ کے قابل ہو سکے۔ بالغ ہو کیونکہ بچہ کی عقل ناقص ہوتی ہے۔ مرد ہو۔ کیونکہ عورتیں عقل اور دین دونوں میں ناقص درجہ رکھتی ہیں آزاد ہو، قرشی ہو۔ جس شخص میں یہ تمام صفتیں جمع ہوں وہ امامت اور ریاستِ عامہ کا مستحق ہے۔

۴۔ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ منہاج السنۃ (ج ۱ صفحہ ۱۴۰) میں لکھتے ہیں۔

اما کون الخلافة فی قریش فلما کان هذا من شرعه و دینه کانت النصوص بذلک معروفة منقولة ماثورة ۔

خلافت کا قریش میں منحصر ہونا چونکہ رسول اللہ کی شریعت اور دین کا ایک جزو تھا اس لیے نصوص کے بارے میں مشہور و معروف اور سب کے زباں زد تھے۔

۵۔ [illegible]

يكون من قريش ولا يجوز من غيرهم ولا يختص بنی هاشم واولاد علی کرم الله وجهه۔

امام قریش میں سے ہوگا۔ اور کسی دوسرے قبیلہ سے امام کا ہونا جائز نہیں ہے۔ اور بنی ہاشم یا اولاد علیؑ بن ابی طالب سے مخصوص نہیں ہے۔

۶۔ شرح عقائد نسفی میں ہے:۔

يشترط ان يكون الامام قرشيا بقوله الائمة من قريش هذا وان كان خبراً واحدا لكن لما رواه ابو بكر محتجا به على الانصار ولم ينكره احد فصار مجمعا عليه لم يخالف فيه الا الخوارج وبعض المعتزلة

شرط ہے کہ امام قرشی ہو کیونکہ آنحضرت نے فرمایا ائمہ قریش ہی سے ہوں گے اور یہ اگرچہ خبر واحد ہے لیکن چونکہ اسے حضرت ابوبکرؓ نے انصار کے مقابلہ میں استدلال میں پیش کیا اور کسی نے انکار نہیں کیا اس لحاظ سے اجماعی حیثیت حاصل کر لی اور کوئی اس کا مخالف نہیں ہے۔ سوائے خوارج اور بعض معتزلہ کے۔

معلوم ہوا کہ اہل سنت اس امر پر متفق ہیں کہ امامت قبیلہ قریش سے ہونا ضروری ہے۔ اور اس کو رسول اللہ ہی کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ کہ آپ نے ہمیشہ کے لیے امامت کو اس قبیلہ میں جس سے آپ خود تھے منحصر قرار دیا ہے۔ اب دیکھئے کہ شیعی نقطۂ نظر میں اور اس مسلک میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔ شیعہ رسول اللہؐ کی جانب سے مخصوص اشخاص کو منصوص سمجھتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ چونکہ امامت کا معیار عصمت کے ساتھ وابستہ ہے اور عصمت امر باطنی ہے۔ لہٰذا جن حضرات کے متعلق رسولؐ تنصیص کریں معلوم ہوگا کہ عصمت کی صفت ان ہی میں موجود تھی اور کسی میں نہیں اب اگر رسول اللہؐ نے اپنی اولاد میں سے ایسے افراد کو نامزد کیا تو اتنا رسولؐ پر الزام

لانے کی بناء پر کم ازکم حسن ظن سے کام لیا جائے۔ کہ آپ نے صرف اپنی اولاد ہونے کی بنیاد پر اُن لوگوں کا نام نہیں لیا ہے۔ بلکہ ان میں آپ کو بوحیٔ الٰہی ایسے اوصاف کی موجودگی کا علم ہے جو اُن کو خلافت کا مستحق بنانے کا سبب ہیں۔ لیکن جب کہ رسول اللہؐ کی جانب سے کچھ اشخاص نامزد نہ ہوں بلکہ افراد کا انتخاب ہمیشہ امت والوں کی جانب سے ہو، لیکن پھر بھی رسول اللہؐ کی جانب سے یہ پابندی عائد ہو جائے کہ امام ہمیشہ اسی قبیلہ سے منتخب کرنا جس سے میں خود ہوں' اسے سوائے نسلی امتیاز اور قبلیہ پروری کے کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اب جناب بزمی صاحب کی "عقل عمومی" اور نیاز صاحب کے "حاسۂ اجتماعیہ" سے انصاف و صداقت کا واسطہ دے کر یہ سوال ہے۔ کہ کیا یہ صورت کسی طرح روح جمہوریت کے مطابق ہے؟ اور کیا اس سے اسلام کے اصولِ مساوات پر کوئی ضرب نہیں لگتی۔ جناب بزمی صاحب کے لب ولہجہ اور انداز میں اہل سنت کے اس عقیدہ پر غور کیجیے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسولِ کریمؐ نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ آپ کے بعد آپ ہی کے قبیلۂ قریش میں سے کوئی خلیفہ منتخب کیا جائے۔ اور اس کے بعد بھی ان ہی سے کسی کو یہ منصبِ جلیل تفویض کیا جائے اور اسی طرح یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے۔ اب اگر آپ اس عقیدہ کا تجزیہ کریں تو اس سے مندرجہ ذیل ضمنی عقائد مستنبط کر سکتے ہیں :-

۱- خلافت و امامت صرف قریش کے قبیلہ کے لیے مخصوص ہے۔
۲- خلیفہ یا امام کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کے لیے بھی قریش ہی کا کوئی آدمی ڈھونڈا جائے گا۔
۳- اگر روئے زمین کے تمام باشندے مسلمان ہو جائیں تب بھی ان میں سے کوئی خلافت کی مسند کا مستحق قرار نہیں پا سکتا۔
۴- دنیا کے تمام مسلمان قبیلۂ قریش کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں۔

۵۔ اگر دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع، متقی، باخدا، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو تب بھی جانشینی کے وقت اس کو زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔ بلکہ قبیلۂ قریش میں سے کسی "حقدار" کو مسندِ خلافت و امامت پر متمکن کر دیا جائے گا۔

اب دیکھیے کہ یہ عقائد "عقلِ عمومی" کے بنیادی اور اصولی مسلمات کے مخالف ہیں یا نہیں۔ اور اس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ و خواہش پر ضرب پہنچتی ہے یا نہیں۔ اور یہ عقیدہ دنیا کے بسنے والوں کو ان کے کسی حق سے محروم کرنے کا موجب تو نہیں ہے۔ ان عقائد کا منشا، یہ ہے کہ بانئ اسلام کی خواہش یہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد مسلمانانِ عالم پر ان کا قبیلہ تا قیامِ قیامت سلطانِ وقت کی حیثیت سے حکمرانی کرے اور ان کے قبیلہ کے افراد کے ہوتے ہوئے روئے زمین کا کوئی مسلمان مسندِ خلافت کا امیدوار نہ ہو سکے۔

اب برقی صاحب کے غور کرنے کی چیز ہے کہ مذکورہ بالا استحقاق کو صحیح تسلیم کرنے کے بعد کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اسلام دنیا میں غیر مسئول مطلق العنانی اور ناجائز نسلی امتیاز کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ دیسا نہ ہوگا جیسے آج ہر ہٹلر یہ طے کر دے کہ مجھے خدا کی طرف سے یہ پیغام ملا ہے کہ میں اور میرے بعد میرا قبیلہ ابدالآباد تک جرمن قوم پر فرمانروائی کرے۔

برقی صاحب کا خیال ہے کہ اگر کوئی ڈکٹیٹر اس طرح کا اعلان کرے تو ابھی "نگار" کا دوسرا پرچہ شائع بھی نہ ہونے پائے گا کہ اخبارات میں موٹے موٹے حروف سے لکھی ہوئی یہ سرخی پڑھ لیں گے۔ "یورپ کے ایک مخبوط الحواس ڈکٹیٹر کی لاش دریائے رائن کے سپرد کر دی گئی۔"
اب برقی صاحب کو اقرار کرنا چاہیئے کہ اہلِ سنت بھی خلافت کے عقیدہ کو جس نوع سے مانتے ہیں وہ نہ صرف انسانیت کے نقطۂ نظر سے ناقابلِ قبول ہے بلکہ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو انسان کے قوائے عمل کی صحیح نشو و نما ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

کردار و گفتار کی آزادی ابدالآباد تک کے لیے معدوم ہو جائے۔ انسانوں کے مابین امتیاز و افتراق کی ابدی خلیجیں حائل ہو جائیں۔ ذہنی استعداد اور معاشرتی تفوق و برتری کی وہ مکروہ فضا پیدا ہو جائے جو انسانیت کو رفتہ رفتہ ہندوؤں جیسی ذات پات کے تصور سے قریب تر کردے۔ انسانی عقل و فکر پر پہرے بیٹھ جائیں اور دنیا کے بسنے والے خدائے واحد کے علاوہ بہت سے ایسے بُتوں کی پرستش کرنے لگیں جن کو پاش پاش کرنے کی کوشش آج دنیا کے ہر گوشہ میں کی جارہی ہے۔ چونکہ برقی صاحب کا بانگ دہل یہ اعلان ہے کہ "میں ایمان و ضمیر کی پوری صداقت و پاکبازی کے ساتھ ربِ جلیل کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ میں نے ان نتائج تک پہنچنے میں فرقہ وارانہ عصبیت و تنگ نظری سے کنارہ کش ہو کر غور کرنے کی کوشش کی ہے حتیٰ کہ مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی شیعہ کے گھرانے میں پیدا ہوتا تب بھی غور کرنے کے بعد میرا عقیدہ یہی ہوتا جو پیش کیا گیا" خیر سے موصوف کسی شیعہ کے گھر میں پیدا نہیں ہوئے لیکن اہلِ تسنن کے خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں اہل سنت کے عقیدہ خلافت کی اس بھیانک تصویر سے جو اُنہی کے الفاظ کے آئینہ میں دکھلائی گئی ہے اس کا کافی موقع حاصل ہے کہ وہ مذہب اہل سنت سے کنارہ کشی اختیار کریں اور کسی ایسے مذہب کو اختیار کریں جو اس طرح کی باتوں سے پاک و صاف ہو۔

ممکن ہے آج کل کے روشن خیال اصحاب جو طبقہ علماء سے کافی بدظن ہیں یہ خیال کریں کہ یہ بعد کے علماء کی کارستانی تھی کہ انھوں نے مذہب اہل سنت میں اس طرح کی چیز داخل کر دی، لیکن شروع شروع جب اہلسنت کی معتقدہ خلافت کی بنیاد پڑی تو وہ بالکل جمہوریت کے اصول کے مطابق تھی۔ اس لیے ذرا چلیے تاریخ کے اوراق الٹ کر وفات نبیؐ کے بعد کا دور سامنے لائیں۔ اور سقیفۂ بنی ساعدہ میں خلافت کی داغ بیل ڈالے جانے کے منظر کی سیر کریں۔ شیخ المہاجرین حضرت ابوبکرؓ اور جناب عمر بن الخطاب کی

پُرزور تقریروں کا مطالعہ کریں۔ دیکھیں کہ ان دونوں بزرگواروں نے جو اس خلافت کا سنگِ بنیاد رکھنے والے تھے۔ خلافت کو کن اصولوں پر مبنی کیا تھا۔ میرے سامنے ہے تاریخ طبری (ج ۳ صفحہ ۲۰۷، ۲۰۹)

رسول اللہ صلعم کی وفات ہوتی ہے، انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہوتے ہیں یہ قرارداد ہوتی ہے کہ سعد بن عبادہ خلافت کے لیے مقرر کیے جائیں۔ حضرت عمر کو خبر پہنچتی ہے جو ابھی وفاتِ نبیؐ کے غم میں اتنے بدحواس اور از خود رفتہ تھے کہ مسجد میں تلوار کھینچے ہوئے ٹہل رہے تھے کہ جو شخص کہے گا رسول اللہؐ نے انتقال کیا اس کا سر اڑا دوں گا۔ وہ اس خبر کو سنتے ہی آتے ہیں کاشانۂ رسالت کی جانب، جہاں رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین کا سامان ہو رہا ہے۔ حضرت ابوبکر کو بلوا بھیجتے ہیں۔ وہ عذر کرتے ہیں کہ میں یہاں مصروف ہوں تو کہلوایا جاتا ہے کہ یہاں ایک بڑا غضب ہو گیا، آپ کا آنا ضروری ہے۔ حضرت ابوبکر باہر آتے ہیں۔ جناب عمر کہتے ہیں کہ آپ کو نہیں خبر، انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنا دیں۔ حضرت ابوبکر اس خبر کو سن کر اتنے پریشان ہوتے ہیں کہ یہ خیال بھی نہیں کرتے کہ اندر جا کر علیؑ بن ابی طالب کو اطلاع تو کر دیں۔ جیسا دنیا کا قاعدہ ہے کہ کسی میت کی تجہیز و تکفین سے بضرورت کوئی شخص علیحدہ ہونا چاہے تو اس کے ورثا سے جا کر اپنا عذر بیان کرتا ہے اور رخصت ہوتا ہے۔ ممکن تھا کہ جناب علیؑ بن ابی طالب سے اس کا تذکرہ کیا جاتا تو وہ بھی اپنی کوئی رائے اس اہم مسئلہ کے متعلق ظاہر کر دیتے۔ جبکہ ان حضرات کو آپ کی اصابت رائے پر اعتماد تھا، کہ اپنی خلافت کے دور میں بڑے بڑے اہم معاملات میں آپ سے مشورہ لیتے تھے اور آپ کے ہدایات پر کاربند ہوتے تھے۔ مگر اس وقت اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی یا کسی حیثیت سے صرفِ خیال کیا گیا۔ بہرحال حضرت ابوبکر بھی سیدھے حضرت عمر کے ساتھ ہو لیے راستہ میں ابوعبیدہ جراح مل گئے انھیں بھی اپنے ہمراہ لیا اور تینوں بزرگوار

سقیفۂ بنی ساعدہ پہنچے۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ میں نے دل ہی دل میں ایک تقریر مرتب کر لی تھی۔ اور کچھ پوائنٹس سوچ لیے تھے۔ مگر حضرت ابوبکر نے مجھے تقریر سے روک دیا اور کہا کہ مجھے تقریر کر لینے دو۔ پھر تم بولنا۔ آپ نے جو تقریر فرمائی تو جتنے پوائنٹس میرے دل میں تھے وہ سب اور کچھ اضافہ کے ساتھ آپ نے پیش فرمائے۔ صورتِ حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کے لیے پہلے سے نہ کوئی اصول مقرر تھا نہ خاص اسکیم سوچی گئی تھی پس جو کچھ تقریروں سے ظاہر ہوا اور جس بات پر اس جلسہ کی کارروائی کا اختتام ہوا وہی خلافت کا دستور العمل ہے اور وہی نظام۔

دل تو چاہتا ہے کہ اس تقریر میں کچھ اسلام کی جمہوریت پسندی کا بیان ہو۔ اس کے اصولِ مساوات کو روشن کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ مسئلہ تمام مسلمانوں کے مفاد سے متعلق ہے کسی جماعتی استبداد سے کام نہ لو اور اتنی جلد بازی نہ کرو بلکہ اس کا انتظار کرو کہ رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین ہو جائے، پھر تمام مسلمانوں کو اطلاع دو۔ اس کے بعد ہم تم مل کر متفقہ مشورہ سے کوئی متحدہ فیصلہ کر لیں گے۔ اور کسی خاص شخص کو جو اس منصب کا اہل ہے معین کریں گے۔ اور ابھی تو بنی ہاشم جو خاص رسول اللہؐ کے دل و جگر ہیں وہ رسولؐ کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہیں۔ کتنا ظلم ہے کہ ان کو شریکِ مشورہ بھی نہ کیا جائے اور ہم لوگ خود غرضی سے کام لے کر بطورِ خود اس مسئلہ کا فیصلہ کر دیں۔

یقیناً اس طرح کی تقریر ایسی نہ ہوتی جو اس مجمع پر اثر انداز نہ ہو جبکہ خود ان میں کسی حد تک قبائلی اختلافات دلوں میں کارفرما تھا یعنی قبیلۂ اوس کے لوگوں کو یہ ناگوار تھا کہ سعد بن عبادہ جو رئیس قبیلۂ خزرج ہیں وہ خلافت کے لیے مقرر ہو جائیں۔ یہی وہ چیز تھی جو بالآخر انصار کے خلاف کامیابی کا باعث ہوئی۔ اور یہی اس وقت بھی رونما ہوتی۔ یعنی قبیلۂ اوس کے افراد اس کی تائید کرتے خصوصاً جبکہ وہ ایک بات بالکل "عقلِ عام" اور "مفادِ اجتماعی" کے موافق تھی۔

لیکن حضرت ابوبکر نے جو اس موقع پر تقریر فرمائی وہ ملاحظہ ہو۔ آپ نے بعد حمد و صلوٰۃ کے کہا: —

ان اللّٰه بعث محمد رسولا الی خلقه وشهیدا علی امته لیعبدوا اللّٰه ویوحدوه وهم لعیدون من دونه الٰهة شتی ویزعمون انها لهم عنده شافعة ولهم نافعة وانما هی من حجر منحوت وخشب منجور ثم قرأ اویعبدون من دون اللّٰه ما لا یضرهم ولا ینفعهم ویقولون هؤلاء شفعاؤنا عند اللّٰه وقالوا ما نعبدهم الا یتصربونا الی اللّٰه زلفی، نعظم علی العرب ان یترکوا دین آبائهم فخص اللّٰه المهاجرین الاولین من قومه بتصدیقه والایمان به والمؤاساة له والصبر معه علی شدة اذی قومهم لهم وتکذیبهم ایاهم و کل الناس لهم مخالف

اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا حضرت محمد مصطفےٰؐ کو رسول بنا کر اپنے خلق کی طرف اور گواہ بنا کر اپنی امت پر تاکہ وہ خدا کی عبادت کریں اور اس کی توحید اختیار کریں اور یہ لوگ اس کے پہلے مختلف خداؤں کی عبادت کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ وہ اصنام ان کی شفاعت کریں گے اور ان کو فائدہ پہنچائیں گے۔ حالانکہ وہ تراشے ہوئے پتھروں اور لکڑیوں کے بنے ہوئے تھے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی (یہ لوگ عبادت کرتے ہیں خدا کو چھوڑ کر ان چیزوں کی جو انھیں نہ نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ فائدہ، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شفاعت کرنے والے ہیں اللہ کے یہاں، اور کہتے ہیں کہ ہم ان کی طرف اس لیے عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے یہاں تقرب کا باعث ہوں)، رسولؐ کی بعثت کے بعد عرب پر بہت گراں گزرا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے دین کو ترک کریں تو خدا نے

زار عليهم فلم يستوحشوا لقلة عددهم وشنف الناس لهم واجماع قومهم عليهم فهم اول من عبد الله في الارض وآمن بالله وبالرسول وهم اولياؤه وعشيرته واحق الناس بهذا الامر من بعده ولا ينازعهم ذلك الا ظالم وانتم يا معاشر الانصار من لا ينكر فضلهم في الدين ولا سابقتهم العظيمة في الاسلام رضيكم الله انصارا لدينه ورسوله وجعل اليكم هجرته وفيكم جلة ازواجه واصحابه فليس بعد المهاجرين الاولين عندنا بمنزلتكم فنحن الامرآء وانتم الوزراء لا نفتات بمشورة ولا نقضي دونكم الامور

مخصوص کیا مہاجرین اوّلین کو جو رسولؐ کی قوم سے تھے، آپ کی تصدیق اور ایمان اور غمخواری اور صبر کے ساتھ ان تکلیفوں پر جو خود ان کی قوم والے ان کو پہنچاتے تھے اور تمام لوگ ان کے مخالف تھے اور ان کی ذلّت کے درپے تھے، لیکن یہ لوگ گھبرائے نہیں اپنی تعداد کے کم ہونے سے اور لوگوں کی مخالفت سے اور متفق ہو جانے سے ان کے خلاف، یہی لوگ سب سے پہلے عبادت کرنے والے ہیں خدا کی زمین پر اور سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں خدا اور رسولؐ پر اور یہ رسولؐ کے عزیز ہیں اور ان کے قبیلہ کے ہیں اور تمام لوگوں سے زیادہ ان کے بعد اس منصب کے اہل ہیں۔ جو ان سے اس بارے میں نزاع کرے گا وہ ظالم ہوگا اور تم لوگ اے جماعتِ انصار وہ ہو کہ تمہاری دینی فضیلت اور اسلام میں تمہارے بہترین خدمات کا انکار نہیں ہو سکتا۔ تم کو خدا نے منتخب کیا اپنے دین میں اور رسولؐ کی نصرت کے لیے اور تمہاری

طرف ان کی ہجرت قرار دی اور تم میں سے اکثر ان کے ازواج اور اصحاب ہیں۔ لہٰذا مہاجرین اوّلین کے بعد ہمارے نزدیک کوئی تمہارے مرتبہ کا نہیں ہے۔ لہٰذا ہم لوگ حاکم ہوں اور تم لوگ وزیر۔ بغیر تمہارے مشورہ کے کوئی کام نہ ہوگا اور ہم معاملات کو بغیر تمہارے طے نہیں کرینگے۔

تقریر ختم ہوئی۔ حضرت ابوبکر بیٹھ گئے۔ خباب بن منذر انصاری نے کھڑے ہوکر کہا۔

یا معشر الانصار املکو علیکم امرکم فان الناس فیئکم وظلکم ولن یجترئ مجتری علی خلافکم ولن یصدر الناس الا عن رائکم انتم اهل العزة والثروة واولوا العدد المنعة والتجربة ذووا الباس والنجدة وانما ینظر الناس الی ما تصنعون ولا تختلفوا فیفسد علیکم رائکم وینتقض علیکم امرکم ابی هؤلاءِ الا ما سمعتم فمنا امیر ومنهم امیر۔

اے گروہِ انصار تم اپنی حکومت کو اپنے قبضہ میں لاؤ۔ کیونکہ یہ لوگ تو تمہارے زیرِ سایہ ہیں۔ تمہاری مخالفت کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی اور بغیر تمہاری رائے کے کوئی بات طے نہیں پا سکتی۔ تم لوگ اہلِ عزت و ثروت ہو، تم کثرتِ تعداد اور شان و شوکت کے مالک اور آزمودہ کار ہو۔ تم شجاعت و جرأت کا جوہر رکھتے ہو۔ لوگ سب تمہارے طرزِ عمل کے نگران ہوں گے۔ بیشک تم میں آپس میں اختلاف نہ ہونے پائے ورنہ تمہارا کام بگڑ جائے گا۔ اور بات خراب ہو جائیگی یہ لوگ اس بات پر مصر رہیں جیسے تم نے سن لیا۔ لہٰذا ایک خلیفہ ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔

حضرت عمر نے اس تقریر کو سن کر فرمایا:۔

هیهات لا یجتمع اثنان فی قرن واللّٰه لا ترضی العرب ان

افوہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ایک وقت میں دو خلیفہ ہوں۔ خدا کی قسم عرب اس

يؤمّركم ونبيّها من غيركم ولكن العرب لا تمتنع ان تولّى امرها من كانت النبوّة فيهم وولى امورهم منهم ولنا بذالك على من ابىٰ من العرب الحجّة الظاهرة والسلطان المبين من ذا ينازعنا سلطان محمد وامارته ونحن اولياءه وعشيرته الا مدل بباطل او متجانف لاثم او متورط في هلكة۔

اس بات پر راضی نہیں ہوں گے کہ وہ تمہیں اپنا حاکم تسلیم کریں جبکہ پیغمبران کا دوسری قوم و قبیلہ سے ہو۔ لیکن عرب اس بات سے انکار نہیں کریں گے کہ اس قوم و قبیلہ کی امارت تسلیم کریں جس میں کہ نبوت رہ چکی ہے۔ کون شخص ہے ہم سے محمدؐ کی سلطنت اور ان کی امارت میں نزاع کر سکتا ہے۔ درحالیکہ ہم ان کے عزیز ہیں اور ان کے قوم و قبیلہ کے ہیں۔ مگر یہ کہ کوئی ناحق کوشش ہو یا گناہ کا مرتکب یا ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والا۔

حباب المنذر کو غصہ آگیا اور سخت لہجہ میں تقریر شروع کی:۔

یا معشر الانصار امکوا علی ایدیکم ولا تسمعوا مقالة هذا واصحابه فیذهبوا بنصیبکم من هذا الامر فان ابوا علیکم ما سألتموه فاجلوهم عن هذه البلاد وتولوا علیهم هذه الامور فانتم والله احق بهذا الامر منهم فانه باسیافکم دان لهذا الدين من لم

اے گروہ انصار اپنی طاقتوں کو اپنے ہاتھ میں لاؤ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو جس سے تمہارے حقوق اس منصب میں تلف ہوں۔ اگر یہ لوگ نہ مانیں تو انھیں اس ملک سے باہر نکال دو اور خود اطمینان سے حکومت کرو۔ کیونکہ تم بخدا اس امر کے ان سے زیادہ مستحق ہو۔ کیونکہ تمہاری تلواروں سے [illegible]

يكن يـد بن ان جذيلها المحلك
عـذيقها المرجب اما والله لئن
شئتم سعيد بهاجدعة

اسس کا مرد میدان اور تم کہو تو ابھی
ابھی" یہیں گود ہمیں میدان "

لیجیے مسلم لیگ کے موجودہ زمانہ کے جلسوں کا منظر سامنے آگیا۔ حضرت عمر نے کہا۔ "اس صورت میں خدا تجھے غارت کرے گا۔" حباب نے بڑھ کر کہا۔ مجھے کیوں تجھے غارت کرے گا۔ ابوعبیدہ نے بیچ بچاؤ کی۔ "ہاں ہاں اے انصار تم نے سب سے پہلے نصرت کی۔ اب تمھیں سب سے پہلے رسولؐ کی تعلیم سے منحرف نہ ہو۔" بشیر بن سعد جو قبیلۂ اوس سے تھے اور سعد بن عبادہ کی خلافت کے منصوبہ سے دل میں مخالف، وہ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: ۔

يا معشر الانصار انا والله لئن
كنا اولى فضيلة فى جهاد المشركين
وسابقة فى هذا الدين ما
اردنا به الا رضى ربنا وطاعة
نبيتنا والكدح لانفسنا فما
ينبغى لنا ان نستطيل على الناس
بذلك ولا نبتغى به من
الدنيا عرضا فان الله ولى
المنة علينا بذلك الا ان
محمدا صلى الله عليه وآله وسلم
من قريش وقومه احق به واولى
وايم الله لا يرانى الله انازعهم

اے گروہِ انصار خدا کی قسم اگرچہ ہمیں
فضیلت حاصل ہے مشرکین سے جہاد اور
دینی خدمات کی مگر ہمارا مقصود اس سے صرف
خدا کی خوشنودی اور رسولؐ کی اطاعت اور
اپنے نفس کی اصلاح تھی۔ اب ہمارے لیے
ہرگز مناسب نہیں ہے کہ اس کے سبب سے
لوگوں پر تفوق کی کوشش کریں اور اپنے خدمات
کا دنیاوی فائدہ حاصل کریں۔ آگاہ ہو کہ
حضرت محمد مصطفےٰ قریش سے تھے اور ان ہی
کی قوم و قبیلہ کے افراد ان کی خلافت کے
زیادہ حقدار ہیں۔ خدا کی قسم میں تو اس امر میں
ان سے نزاع ہرگز نہیں کروں گا۔ تم لوگ

ھذا الامر ابدا ان تتقوا اللہ ولا تخالفوھم ولا تنازعوھم۔	خدا کا خوف کرو اور ان کی مخالفت اور منازعت سے باز آؤ۔

لیجیے معاملہ درست ہو گیا۔ حضرت ابوبکر نے عمر اور ابوعبیدہ کا نام پیش کیا کہ ان میں سے کسی ایک کی بیعت کر لی جائے۔ ان دونوں بزرگوں نے حضرت ابوبکر کی سفارش کی۔ بشیر بن سعد نے بڑھ کر آپ کی بیعت کی اور عمر و ابوعبیدہ نے بھی فوراً بیعت کر لی۔ جلسہ میں برہمی پیدا ہو گئی (رحما بینھم) کا معکوس منظر سامنے آ گیا۔ بعض انصار بشیر بن سعد کو گالیاں دینے لگے۔ ادھر کے لوگ غصہ میں ادھر بڑھے۔ سعد بن عبادہ لت روندن میں آ گئے۔ کسی نے کہا سعد کا خیال کرو پامال نہ کرو۔ حضرت عمر نے کہا اسے قتل کر دو، خدا اسے قتل کرے اور سرہانے کھڑے ہو کر کہا کہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ تجھ کو اپنے پیروں سے اس طرح کچلوں کہ تیری ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ سعد حضرت عمر کی داڑھی پکڑ لیتے ہیں حضرت ابوبکر بڑھ کر چھڑا دیتے ہیں اور حضرت عمر کو سمجھا کر الگ لے جاتے ہیں۔ رسول اللہؐ کی خلافت پایۂ تکمیل پر پہنچتی ہے اور وہ پوری اسکیم اس ہنگامی صورت سے مرتب ہو جاتی ہے جو آج تک شیعہ سنی اختلافات کی بنیاد ہے۔

ابھی حضرت عمر کو پورے طور سے اطمینان حاصل نہیں تھا کہ جو کارروائی ہم نے کی ہے اس میں ہم آخر تک کامیاب بھی رہیں گے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ عام خلقت بھیڑیا دھسان ہوتی ہے قبیلۂ اسلم کے اعراب کو جو اطراف مدینہ میں مقیم تھے یہ خبر پہنچتی ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات ہو گئی اور ہزاروں آدمیوں کی تعداد میں مدینہ آ جاتے ہیں۔ اس طرح کہ ان سے گلی راستے مدینہ کے پُر ہو جاتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ خلیفۂ رسولؐ کون ہے اور کوئی کہہ دیتا ہے کہ حضرت ابوبکر خلیفہ منتخب ہو گئے اور وہ ایک دم سے حضرت ابوبکر کی بیعت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عمر کی مسرت کی انتہا نہیں رہتی۔ خود [illegible] ھو الا ان رأیت اسلم فایقنت بالنصر'' قبیلۂ اسلم

کو میرا دیکھنا تھا کہ میں سمجھا کہ فتح وظفر ہمیں حاصل ہو گئی۔

آپ کا یہ سمجھنا بالکل بامحل تھا۔ کیونکہ ان ہزاروں آدمیوں کی بیعت کرنے کے بعد اب کتنی ہی معقول دلائل کے ساتھ کوئی مخالفت کرتا لیکن اسے باغی کہہ کر مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ اور اس کے ساتھ وہی سلوک ہوتا جو عرب کے ان قبائل کا جنھوں نے حاکم موجودہ کی اطاعت سے انکار کیا اور "مرتدین" کے نام سے ان کے ساتھ جہاد ایک اسلامی فریضہ بنا کر ضروری سمجھا گیا۔

⁂

بہر حال گذشتہ تقریروں اور ان کے نتیجہ سے صاف ظاہر ہے کہ خلافت کو کس اصول پر مبنی قرار دے کر کامیابی حاصل کر لی گئی۔ انصار کے منہ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ رسولؐ جس قبیلہ سے تھے اسی قبیلہ میں خلافت بھی ہونی چاہیے۔ اور اس کے اوپر اصرار کے سلسلہ میں گالم گلوچ اور ہاتھا پائی سب کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور اس زورا زوری اور وقتی دھاندلی سے جو خلافت حاصل ہوئی اس کے ماننے والے آج کہہ رہے ہیں کہ نسلی امتیاز کو معیارِ خلافت قرار دینا "عقلِ عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" کے خلاف ہے۔ اور وہ اسلام کی روحِ جمہوریت و مساوات کے منافی ہے۔ انصار کے مقابلہ میں جو دلائل پیش کیے گئے ان کی کامیابی کے لیے ضرورت اسی بات کی تھی کہ بنی ہاشم کا کوئی نمائندہ اور خصوصًا حضرت علیؑ بن ابی طالب اس مجمع میں نہ ہوں۔ ورنہ جتنے دلائل استحقاقِ خلافت میں پیش کیے گئے سب کا نتیجہ معکوس ہو جاتا۔ پہلی دلیل ہے سبقت الی الاسلام والعبادۃ (فھم اول من عبد اللہ فی الارض وآمن باللہ وبالرسول) حالانکہ اب کہا جاتا ہے کہ دیکھیے نیاز صاحب کا محاکمہ، اور جلیل الرحمٰن صاحب اعظمی کا مضمون اور اس کا تبصرہ کہ سبقت الی الاسلام کو خلافت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہرحال اگر علیؑ بن ابی طالب موجود ہوتے تو

وہ اسے شخصی حیثیت سے اپنے اوپر منطبق کرتے۔ جیسا کہ بعد میں انھوں نے کہا (امنت قبل ان یومن ابوبکر واسلمت قبل ان یسلم ابوبکر) یعنی میں ایمان لایا قبل اس کے کہ ابوبکر ایمان لائیں اور اسلام آیا قبل اس کے کہ وہ مسلمان ہوں۔" دوسری دلیل قرابت اور ہم قومی۔ اس کے لیے ظاہر ہے کہ جس طرح قریش کو انصار کے مقابلہ میں ترجیح حاصل تھی اسی طرح بنی ہاشم کو تمام قبائل قریش کے مقابلہ میں۔ اور ذریت رسولؐ کو تمام بنی ہاشم سے۔ اسی لیے جب حضرت علیؑ کو سقیفہ کے حالات معلوم ہوتے اور یہ سنا کہ قریش نے یہ استدلال پیش کیا کہ ہم شجرۃ الرسولؐ ہیں اس لیے خلافت کا حق ہم کو حاصل ہے تو آپ نے فرمایا "تعلقوا بالشجرۃ واضاعوا الثمرۃ" "درخت کا تو خیال کیا اور میوہ کو ضائع کر دیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کی روح جمہوریت و مساوات کا خیال مدنظر تھا تو خلافت کے لیے انصار کے ساتھ کوئی مزاحمت نہ کی جاتی۔ بلکہ سب سے پہلے یہ مثال قائم ہوتی کہ رسولؐ سے بالکل اجنبیت رکھنے والے غیر قوم و قبیلہ کے شخص کو خلافت کے لیے منتخب کیا جاتا اور خود مہاجرین اپنی پوری طاقت اس کی تائید و حمایت و اتباع و اطاعت میں مبذول کر کے اقوام عالم کو دکھلا دیتے کہ اسلامی خلافت کس جمہوریت و مساوات کے اصول پر مبنی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ میں تو کہتا ہوں کہ خلافت اگر کسی "نص" پر مبنی نہیں ہے اور شیعوں کا نقطۂ نظر خلافت کے بارے میں صرف قرابت کے اصول پر مبنی ہے تو اس کا سنگ بنیاد حقیقتہً سقیفہ میں پڑا ہے۔ اور حضرت ابوبکر و عمر اس نظریے کے سب سے پہلے قائم کرنے والے ہیں۔ جسے آج تمام مسلمانوں کے حقوق پر ضرب کاری کہا جا رہا ہے۔ اسلامی خلافت جمہوری اصول پر مبنی ہونا چاہیے۔ مگر ذرا دیکھیے تو کہ رسول اللہ کی زندگی میں اسلامی حلقہ کتنا وسیع ہو چکا تھا۔ لیکن اس تمام حلقہ کی کسی طرح کی نمائندگی کا خیال نہیں کیا گیا۔ خاص مدینہ میں اور وہ بھی چند آدمیوں کی جانب سے اس مسئلہ

طے کیا گیا جس کی بنا پر یہ اصول قائم ہو گیا کہ اگر دو چار آدمی اہلِ حل و عقد سے جمع ہو کر کسی کو خلافت کے لیے نامزد کریں تو وہ خلیفۂ رسول مقرر ہو جائے گا جس کے بعد کسی کو اختلاف کا حق نہ ہو گا۔ اور کوئی اختلاف کرے تو قابلِ گردن زدنی ہو گا۔

(ملاحظہ ہو شرح مواقف (مطبوعہ نول کشور صـ۴۳۳)

جبکہ ثابت ہو چکا کہ امامت عامۂ ناس کے انتخاب اور بعیت سے ثابت ہوتی ہے تو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ تمام ارباب بست وکشاد متفق ہوں۔ کیونکہ اس پر کوئی عقلی و نقلی دلیل نہیں ہے۔ ایک یا دو اہلِ حل و عقد کا بعیت کرنا کافی ہے اس امر کے لیے کہ امامت ثابت ہو جائے اور اس امام کا اتباع تمام اہلِ اسلام پر واجب ہو جائے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ صحابہ نے باوجود مذہبی امور میں سخت ہونے کے اور شرعی احکام کے پورے طور پر پابند ہونے کے امامت کے منعقد ہونے میں اسی ایک یا دو کی قرارداد کو کافی سمجھا۔ جیسے حضرت عمر کا رائے دینا حضرت ابوبکر کے لیے اور عبدالرحمٰن بن عوف کا [illegible]

اذا ثبت حصول الامامۃ بالاختیار والبیعۃ فاعلم ان ذلک الحصول لا یفتقر الی الاجماع من جمیع اھل الحل والعقد اذ لم یقم علیہ ای علی ھذا الافتقار دلیل من العقل والسمع بل الواحد والاثنان من اھل الحل والعقد کاف فی ثبوت الامامۃ و وجوب الاتباع علی اھل الاسلام وذلک لعلمنا ان الصحابۃ مع صلابتھم فی الدین وشدۃ محافظتھم علی امور الشرع کما ھو حقھا اکتفوا فی عقد الامامۃ بذلک من الواحد والاثنین کعقد عمر لابی بکر وعقد عبد الرحمٰن بن عوف لعثمان [illegible]

اجتماع من فی المدینۃ من اھل الحل والعقد فضلاً من اجماع الامۃ من علماء امصار الاسلام ومجتھدی جمیع اقطارھا ھذا کما مضی ولم ینکر علیہ احد وحلیہ ای علی الاکتفاء بلوا معدوا لاثنین فی عقد الامامۃ افتوت الاعصار بعدھم الی وقتنا ھذا۔

شرط ضروری نہیں سمجھی کہ خاص مدینہ کے تمام حل و عقد ہوں چہ جائیکہ تمام ممالکِ اسلامیہ کے مسلمانوں کا اور تمام اطرافِ دنیا کے مجتہدین کا اجماع و اتفاق۔ جیسا کہ سابق میں گزرا اور اسی طریقہ پر ایک یا دو کا مقرر کرنا امامت کیلئے کافی سمجھا جاتے پر زمانہ کے ورق الٹتے رہے ان کے بعد سے برابر آج کے دن تک۔

یہی ہے وہ جمہوری اصولِ خلافت جس کو تمام افرادِ اسلام کے حقوق کی مراعات کا ذریعہ بتایا جا رہا ہے اور اسے "عقلِ عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" کے مطابقت کی سند عطا کی جا رہی ہے۔ اچھا حضرت ابوبکر خلیفہ ہو گئے اور مانئے کہ اجماع امت سے ہوئے۔ لیکن اس کے بعد حضرت عمر ان کی خلافت استخلاف کے ذریعہ سے ثابت ہوتی ہے۔ یعنی حضرت ابوبکر اپنے بعد کے لیے ان کو خلیفہ بنا جاتے ہیں۔ اور ایک عجیب انوکھے طریقہ سے لوگوں سے اس کا اقرار لیا جاتا ہے جس کی مثال شاید دنیائے تاریخ میں اس کے سوا نہ مل سکے۔ ملاحظہ ہو شرح عقائد نسفی۔

ان ابا بکر لما ایس من حیاتہ دعا عثمان رضی اللہ عنہ واملا علیہ کتاب عھدہ لعمر فلما کتب ختم الصحیفۃ واخرجھا الی الناس امرھم ان یبایعوا لمن فی الصحیفۃ فبایعوا

حضرت ابوبکر جب اپنی زندگی سے مایوس ہوئے تو حضرت عثمان کو بلوایا اور انکو لکھوائی حضرت عمر کی خلافت کی دستاویز۔ جب وہ لکھی جا چکی تو اس کاغذ کو سر بمہر کیا اور بند کاغذ کو لوگوں کے سامنے باہر نکالا اور حکم دیا کہ وہ بیعت کریں اس شخص کی جس کا نام کاغذ کے اندر تحریر ہے۔

حتی مرت بعلی رض فقال	سب نے اسی طرح بیعت کی جب حضرت علیؓ کے پاس
بایعنا لمن کان فیہا	یہ کاغذ آیا تو آپ نے کہا ہم نے بیعت کی اس شخص کی
وان کان فیہا عمر۔	جس کا نام اس میں ہے۔ اگرچہ وہ عمر ہوں۔

یہ خلیفہ کے انتخاب کی لاٹری تھی جس پر ادارۂ خلافت کی جانب سے لوگوں سے بیعت لی گئی۔ تاریخ طبری سے صاف ظاہر ہے کہ صحابہ حضرت عمر کی ولیعہدی پر راضی نہ تھے۔ (ملاحظہ ہو صـ۵۲ جلد۴) عبدالرحمٰن بن عوف بیماری کی حالت میں حضرت ابوبکر کے پاس آئے۔ حضرت ابوبکر نے ان سے مخاطب ہو کر کہا "انی ولیت امرکم خیرکم فی نفسی فکلکم ورم انفہ ذلک یرید ان یکون الامر لہ دونہ"۔ "میں نے اس شخص کو مقرر کیا جو میرے نزدیک تم سب میں بہتر ہے۔ تو تم میں سے ہر ایک کی ناک پھول گئی اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ خلافت کا منصب اس کے لیے ہوتا اور عمر کو نہ ملتا۔"

اب آپ دیکھیے کہ رسول اللہؐ کا کسی کو مقرر کر جانا اصولِ جمہوریت کے خلاف قرار دیا جائے اور اسے مسلمانوں کے حقوق پر ضرب کاری سمجھا جائے لیکن حضرت ابوبکر کی مستبدانہ کارروائی بالکل درست، اصولِ جمہوریت کے مطابق اور "عقلِ عمومی" و "حاسۂ اجتماعیہ" کے موافق ہو۔ حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان کی خلافت کا مسئلہ کس طرح مقرر ہوا؟ کہ حضرت عمر نے ایک چھ آدمیوں کی کمیٹی بنا دی کہ یہ لوگ اپنے میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام شرق و مغرب کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ان چھ آدمیوں کے ہاتھ میں آگیا۔ اور کسی دوسرے شخص کو رائے زنی کا حق باقی نہیں رہا۔ پھر چونکہ یہ چھ آدمی بھی جمہور قوم کے منتخب کیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ پیشرو خلیفہ نے انھیں منتخب کر دیا اس لیے حقیقتاً اس میں تمام ذمہ داری انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ اب اسے جانے دیجیے کہ ان افراد کے انتخاب میں کیا صورتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں اور عبدالرحمٰن بن عوف کو اس کمیٹی کا صدر کس لیے قرار دیا گیا تھا اور

کمیٹی کی کارروائی میں کیا چابک دستیاں عمل میں آئیں۔ اس سب کو جانے دیجیے کمیٹی نے انتہائی دیانتداری کے ساتھ ہی فیصلہ کیا ہو لیکن آخر اس فیصلہ میں جمہور قوم کے کسی فرد کو حق رائے دہندگی کا حاصل نہ ہونا کیا ان کے حقوق پر ضرب نہیں ہے۔ اور کیا اس سے ان کی آزادی و حریتِ ضمیر کو صدمہ نہیں پہنچتا اور کیا اس کو استبداد کے علاوہ کچھ اور بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہے اس پوری خلافت کی تشکیل کی سرگذشت جس سے اصولی حیثیت سے اختلاف رکھنے کی بنیاد پر آج شیعہ اسلام اور انسانیت کے وسیع احاطہ سے خارج کیے جا رہے ہیں۔ اور انھیں "عقلِ عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" کا مخالف بتایا جا رہا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ حق و حقیقت کی قسم، شرفِ انسانیت کی قسم، راستی و حقانیت کی قسم کہ مذہبی تعصبات کو بالکل ہٹاتے ہوئے ایک غیر جانبدار انسان کی حیثیت سے جہاں تک غور کرتا ہوں میری تو یہی سمجھ میں آیا ہے کہ اگر خلافت کوئی چیز ہے تو جو شیعہ کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ کہ رسول اللہ ص نے وحی الٰہی کی بنا پر اپنے بعد کے لیے خلیفہ کو نامزد کر دیا۔ اور اس کا اظہار فرما دیا جس کے بعد پھر مسلمانوں کو اپنی طرف سے انتخاب و اختیار کا حق باقی نہیں رہا۔ تو یہی ٹھیک ہے اور خلافت اس صورت پر واقعیت رکھتی ہے۔ اور یا پھر یہ "دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ"؟ یہ خلافت کا ڈھونگ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ بلکہ خوارج کا مسلک ٹھیک ہے کہ جب ضرورت ہو جہاد کا موقع پیش آئے تو وقتی حیثیت سے اپنے میں سے ایک حاکم مقرر کر لیں اور اس کے آگے نہ خلافت کوئی چیز ہے اور نہ خلیفہ کو کوئی مذہبی حیثیت حاصل ہے۔

شیعی مذہب کی کتنی غلط تصویر پیش کی گئی ہے۔ ان الفاظ میں کہ:۔

"نسلی امتیاز جبر کے ماتحت اور اگر رسولؐ دنیا کے تمام انسانوں

> پر ابدالآباد تک حکمران ہونے کی حقدار ہے اور آلِ علیؓ کا ہر بچہ ماں کے پیٹ سے یہ استحقاق لے کر پیدا ہو کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کی گردنیں اس کے سامنے عقیدت و احترام کے ساتھ خم ہو جائیں محض اس لیے کہ وہ "یکے از آلِ علیؓ" ہے۔"

یہ صورت گری اس وقت درست ہو سکتی تھی جب شیعہ انتخاب و اختیار کو عامۂ خلق کے سپرد قرار دے کر پھر آلِ علیؓ میں سے ہونا اس کی شرط قرار دیتے لیکن جبکہ وہ نص پر مبنی ہے اور اس لیے جس کے واسطے نص ثابت ہو وہ مخصوص ذات ہی خلافت کی مستحق ہے تو اب کسی کو بھی آلِ علیؓ میں سے صرف آلِ علیؓ ہونے کی بنا پر یہ استحقاق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ دنیا پر حکمرانی کرے۔ شیعوں کے مذہب کی یہ خصوصیت بالکل نمایاں ہے کہ وہ دنیا کے ان بادشاہوں کو جو فاطمی النسل ہوں اور علوی نژاد بالکل اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کو۔ اور ہرگز کسی مذہبی حیثیت سے ان کے قائل نہیں ہیں۔

استدلالی بے مائگی کا کتنا حسرتناک مظاہرہ ہے "خلافتِ الٰہیہ" کے عقیدہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے سر آغا خاں اور طاہر سیف الدین کی اور ان کے اتباع کی مثال پیش کرنا اور اس پر یہ دعویٰ کرنا کہ اگر تمام مسلمان "الٰہی خلافت" کے مسئلہ پر ایمان لے آتے تو تمام چالیس کروڑ "فرزندانِ توحید" کا بھی عالم ہوتا۔ دنیا کو معلوم ہے کہ "خلافتِ الٰہیہ" کا عقیدہ شیعی جماعت کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور شیعوں کا وہ فرقہ جو دنیا کے ہر حصہ میں پوری کثرتِ تعداد کے ساتھ موجود ہے اور کم از کم دو کروڑ افراد اس کے تو خود ہندوستان میں موجود ہیں وہ فرقۂ امامیہ اثنا عشریہ ہے۔ اگر "خلافتِ الٰہیہ" کے عقیدہ کو اختیار کرنے کے لوازم میں سے ہوتا، وہی تاریک منظر جو جناب برقی صاحب کے اظہار کے مطابق آغاخانی یا داؤدی جماعت میں ہے

تو موصوف کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں جا کر ان دونوں مخصوص محدود فرقوں کی مثال تلاش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ کیا یہ انصاف کا تقاضا ہے کہ "الٰہی خلافت" کے نتائج کے دکھلانے میں سر آغا خان اور طاہر سیف الدین کی مثال پیش کی جائے۔ جنھیں شیعوں کا قابلِ لحاظ طبقہ امام "مفترض الطاعہ" نہیں مانتا ہے اور اپنی "جمہوری خلافت" کے نتائج کے لیے جو براہِ راست "عقلِ عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" کے مطابق ہے؟ "دمشق" اور "بغداد" کے سراپا رنگین اور حسن پرور "خلافت کدوں" کا جائزہ نہ لیا جائے جہاں "آفتاب و ماہتاب" کے جلوے اور "زہرہ و مشتری" کے نغمے "خلافتِ رسولؐ" کی "مقدس مسند" کی زینت کو ہر وقت دوبالا کیے ہوئے تھے اور بے گناہوں کے خون کی تحریریں "دیہیم خلافت" کے دل افروز نقش و نگار تھے۔ مضمون اب نگار کے وسعتِ داماں کے حدود سے بہت بڑھ رہا ہے۔ ورنہ یہاں بہت کچھ لکھا جاتا۔ اور وہ رنگیں مرقعے کاغذ پہ کھینچ کر پیش کر لیے جاتے۔ جہاں ہر ہر قدم پر "کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست" "الوہیت" کے عقیدہ کا نتیجہ "اصنامِ باطل" کی پرستش اور نمرودیت و فرعونیت کی نشو و نما اگر قرار ی جا سکے۔ "رسالتِ الٰہیہ" کے عقیدہ کا نتیجہ "مسیلمہ" "سجاح" "اسود عنسی" وغیرہ کے طرزِ عمل کو ٹھہرایا جا سکے تو بے شک "خلافتِ الٰہیہ" کے نتائج میں اس قسم ا بہت سی مثالوں کا شمار کرنا بالکل درست ہوگا۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور کوئی نظریہ اپنے غلط محلِ انطباق کی وجہ سے موردِ الزام نہیں ہو سکتا۔ تو اس قسم کوئی مثال بھی شیعی فرقہ کے نظریہ "خلافتِ الٰہیہ" کو بحیثیت نظریہ غلط ثابت نے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ شیعوں نے امامت میں "عصمت" کی شرط اس ے لگائی ہے کہ ان تمام مفاسد کا سدِّ باب ہو سکے جو خطا کار ہستیوں کے حاکم لق اور پیشوائے مذہب بن جانے سے نمودار ہو سکتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ عی فرقہ کے حقیقی ائمہ اپنے معیارِ زندگی کے لحاظ سے ہمیشہ ایسے اوصاف

کے حامل رہے جن کی بنا پر باوجود حکومتِ وقت کی مخالفت اور معاندین کی کثرت کے ان کی زندگی کا تقدس اور اخلاق کی بلندی آج بھی موافق و مخالف میں ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اسے بھی زیرِ نظر مقالہ کا ایک باب سمجھیے جسے اختصار کی غرض سے یہیں پر ختم کیا جاتا ہے۔

مسئلہ خلافت و امامت

ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

مسئلۂ خلافت و امامت

استحقاقِ خلافت کے کیا شرائط ہیں؟

اور کیا وہ خلفائے ثلاثہ میں موجود تھے اور حضرت علیؑ میں مفقود؟

اس بحث کے سلسلہ میں پہلے خلافت کے مفہوم پر بحث کی جائے گی۔ اور پھر اس کے شرائط پر روشنی ڈالی جائے گی۔

خلافت کا مفہوم "خلافت" کے معنی شیعی نقطۂ نظر سے یہ ہیں کہ "کسی شخص کا رسول کے بعد بحیثیت جانشین، امام یعنی پیشوائے خلق ہونا"۔ امامت کے معنی لغت میں بھی پیشوائی ہی کے ہیں۔ شیعہ بھی اس لفظ کا اطلاق اسی معنی میں کرتے ہیں بیشک وہ پیشوائی مطلق کا درجہ کسی کو بغیر انتخاب الٰہی کے دینے میں صحیح نہیں سمجھتے اور اسی لیے "امامت" ان کے نزدیک "رسالت" و "نبوت" کی طرح کا ایک منصب ہے۔ جو خدا کی طرف سے کسی ہستی کو عطا ہوتا ہے۔ وہ ہستی کبھی اس کے ساتھ نبی و رسول بھی ہوتی ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ (انّی جاعلک للنّاس اماما) اور کبھی بحیثیت خلیفۂ رسول اس منصب پر فائز ہوتی ہے۔

امامت کے لیے "م۔ح" صاحب نے مذہبِ شیعہ کی طرف جو خصوصیات منسوب کیے ہیں کہ امامت ساری دنیا میں صرف قریش کے لیے مخصوص ہے اور پھر قریش میں سے بھی صرف بنی ہاشم کے لیے اور بنی ہاشم میں سے بھی صرف علیؑ اور اولادِ علیؑ کے لیے الخ

اس پر تفصیلی تبصرہ برقی صاحب کے ارشادات کے جواب میں اس کے پہلے ہو چکا ہے۔ اور بتلایا جا چکا ہے کہ مذہبِ شیعہ کی تشریح کس غلط طریقہ پر کی گئی ہے۔

امامت کو نبوت کا ترکی بہ ترکی جواب قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی غیر مسلم کہے کہ مسلمانوں کے یہاں نبوّت، الوہیت کا ترکی بہ ترکی جواب ہے۔ کیونکہ جس طرح اللہ پر ایمان لانا لازم ہے اسی طرح رسولؐ پر ایمان (امنوا باللہ ورسولہ)

جس طرح اللہ کی اطاعت واجب ہوتی ہے اسی طرح رسولؐ کی اطاعت (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول)

جس طرح اللہ کی معصیت ناجائز ہے رسولؐ کی بھی معصیت اسی طرح حرام (ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدا فیہا)

اللہ کے لیے ولایت ثابت ہے، اسی طرح رسولؐ کے لیے (انما ولیکم اللہ ورسولہ)

اللہ سے منازعت ناجائز ہے اور رسولؐ سے بھی منازعت ناجائز (ومن یشاقق اللہ ورسولہ فان اللہ شدید العقاب)

اللہ کی دعوت پر لبیک کہنا واجب اور رسولؐ کی بھی (یا ایہا الذین امنوا استجیبوا للہ وللرسول)

اللہ کی خیانت حرام رسولؐ کی بھی خیانت حرام (لا تخونوا اللہ والرسول)

اللہ کی حرام کردہ باتوں سے پرہیز لازم، رسولؐ کی بھی حرام کردہ چیزوں کی پابندی لازم (قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الاٰخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ)

اللہ نعمتوں کا عطا کرنے والا، رسولؐ بھی نعمتوں کے عطا کرنے والے (ولو انہم رضوا ما اٰتاہم اللہ ورسولہ وقالوا حسبنا اللہ سیؤتینا اللہ من فضلہ ورسولہ)

دونوں [illegible] (وما نقموا الا ان اغناہم اللہ ورسولہ من فضلہ)

اللہ کو رضامند کرنا لازم۔ رسولؐ کو بھی رضامند کرنا ضروری۔

(واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مؤمنین)

اللہ اعمال کا نگران ہے، رسولؐ بھی اسی طرح اعمال کے نگران ہیں۔

(وسیری اللہ عملکم ورسولہ)

اللہ کے لیے عزت ہے اور رسولؐ کے لیے بھی اسی طرح عزت حاصل ہے۔

(لِلّٰہ العزۃ ورسولہ)

ترازو کے ایک پلّہ میں نبوت ہے اور دوسرے میں الوہیت۔ مذہب اسلام تول رہا ہے اور دونوں پلّے برابر ہوتے ہیں۔

پھر اگر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ رسولؐ پر ایمان، رسولؐ کی اطاعت رسولؐ کی ولایت، رسولؐ کی محبت، رسولؐ کی عزت جو کچھ بھی ثابت ہے وہ اللہ کے رسولؐ ہی ہونے کی حیثیت سے ہے اس لیے وہ اللہ کے ہم پلّہ نہیں قرار پا سکتے تو اسی طرح امام کی اطاعت، پیروی جو کچھ بھی لازم ہے وہ خلیفۂ رسولؐ ہونے کی حیثیت سے ہے اس لیے امام اپنے پیشرو رسولؐ سے بالکل مساوی کسی طرح قرار نہیں پا سکتے۔ معصوم اور مفترض الطاعۃ ہونے سے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ ائمہ رسولؐ کے برابر ہو جائیں کیونکہ انبیائے سابقینؑ سب معصوم تھے۔ اور اس میں بھی کیا شبہہ کہ ہر ایک اپنے زمانہ میں مفترض الطاعۃ بھی تھا۔ لیکن پھر بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض (ان پیغمبروں میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے) اور مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ ہمارے پیغمبرؐ تمام دوسرے انبیاء سے افضل تھے۔

اسی طرح رسولؐ کے درجۂ نبوت کے خصوصیات وہ رسولؐ کے ساتھ مخصوص ہیں ہرگز ائمہؑ کے لیے حاصل نہیں ہیں۔ پھر بھی ہر امام کی اطاعت اس کے زمانہ میں خلق خدا پر اسی طرح واجب ہے جس طرح رسولؐ کی اطاعت واجب، چونکہ احکام بھی امام کے

حقیقی علم کا ذریعہ ہر زمانہ میں وہ امام ہی ہے۔ اس لیے ما اتٰکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا پر عمل کی ہر زمانہ میں یہی صورت ہوسکتی ہے کہ ما اتاکم الامام فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا اور یہ قانون برابر ہر امام کیلئے ثابت ہے (وکذالک یجری لائمۃ الھدیٰ واحد بعد واحد)

امام کے لیے تشریع احکام کا اپنی جانب سے ہرگز حق نہیں ہے لیکن باعتبار مصالح جزئیہ وضروریات وقتیہ قوانین کلیہ کے تحت میں بہت سی حلال باتیں عارضی طور پر حرام اور بہت سی حرام چیزیں بطور کلیہ عارضی طور پر حلال ہوسکتی ہیں۔ اس کا نگران اپنے وقت میں امام ہی ہے۔ اس سے ہرگز امام کی مساوات یا افضلیت رسول سے ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ درجہ تو ایک ناقص حد تک عام مجتہدین کے لیے بھی حاصل ہے چہ جائیکہ امام۔

چونکہ ائمہ ترجمانِ رسولؐ ہیں اور رسول ترجمانِ خدا اس لیے کیا شبہہ کہ "امام پر اعتراض کرنے والا اُن کے کسی حکم کی بابت مثل اس کے ہے جو خدا اور رسولؐ پر اعتراض کرنے والا ہے۔ اور امامؑ کی رد کرنے والا ویسا ہی ہے جیسے اُس نے خدا کی بات کو رد کیا۔"

شیعہ چونکہ امامت کے مسئلہ کو خدا اور رسولؐ کی جانب سے سمجھتے ہیں اس لیے کوئی قابلِ تعجب امر نہیں کہ وہ اس کے اقرار کو جزوِ ایمان قرار دیں۔ یا رکنِ مذہب سمجھیں کیونکہ وہ (وما انزل الی النبی) میں داخل ہے جس پر ایمان ہر مسلمان کا فریضہ ہے مگر حیرت کے لائق ہے یہ کہ خلافت کے مسئلہ کو خدا و رسولؐ سے بالکل غیر متعلق قرار دے کر بھی اس کو مذہبی حیثیت سے انتہائی اہمیت دی جائے۔ اور مدارِ نجات قرار دیا جائے۔

ملاحظہ ہو، علامہ ابن حزم کی کتاب "المحلّیٰ" مطبوعہ مصر، جلد ۱ صفحہ ۴۵ ؛ ۔

لا یجوز ان یکون فی الدنیا الا امام واحد فقط ومن بات لیلۃ ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ

" دنیا میں بس ایک ہی امام ہو سکتا ہے اور جو شخص ایک رات بھی گزارے اس حالت میں کہ اس کی گردن میں کسی امام کی بیعت نہیں ہے، تو وہ جاہلیت (کفر) کی موت مرے گا۔"

اب اس خلافت کا جاہ وجلال دیکھنے کے قابل ہے جو اپنے ہی ہاتھوں کی تراشی ہوئی ہے، مگر اس کی عمارت کا کاخ بلند نبوت و رسالت سے ٹکرا رہا ہے۔

اور احکام خدا میں تغیر کا اختیار بھی بعض علمائے اہل سنت نے خلفاء کو دے ہی ڈالا۔ چنانچہ علامہ ابن قیم زاد المعاد فی ہدی خیر العباد (مطبوعہ مصر ج ا ص۳۴۳ میں مسئلہ متعہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

فان قیل فما تصنعون بما رواہ مسلم فی صحیحہ عن جابر بن عبد اللہ قال کنا نستمتع بالقبضۃ من التمر والدقیق الایام علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر حتی نہی عنہا عمر فی شان عمرو بن حریث وفیما ثبت عن عمر انہ قال متعتان کانتا علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا انہی عنہما متعۃ النساء ومتعۃ الحج قیل الناس فی ھذا طائفتان طائفۃ تقول ان عمر ھو الذی حرمہا ونہی عنہا وقد امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باتباع ما سنۃ الخلفاء الراشدون۔

" اگر کوئی دریافت کرے کہ کیا صورت کروگے اس روایت کے متعلق جو مسلم نے اپنی صحیح میں جابر بن عبد اللہ سے نقل کی ہے کہ ہم ایک مٹھی

خرمے اور آٹے کے عوض میں برابر متعہ کرتے رہے۔ جناب رسالتمآبؐ اور پھر ابوبکر کے زمانے میں، یہاں تک کہ عمر نے اس سے ممانعت کی عمرو بن حریث کے معاملہ میں اور اس روایت میں جو حضرت عمر سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا کہ دو متعے عہدِ رسولؐ میں تھے اور میں ان سے ممانعت کرتا ہوں۔ ایک متعہ نساء اور دوسرے متعۃ الحج؟ تو جواب میں کہا جائے گا کہ لوگ اس کے متعلق دو گروہوں پر منقسم ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ حضرت عمر ہی وہ ہیں جنھوں نے متعہ حرام کیا اور اس سے ممانعت کی اور جناب رسالتمآبؐ نے حکم دیا تھا، خلفائے راشدین کے احکام پر عمل کرنے کا اور انکی سنّتوں کے اتباع کا۔“

حضرات اہل سنّت نے خلافت کی تعریف اپنے مذاق پر کی ہے (شرح مواقف مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ص۷۲۹)

قال قوم من اصحابنا الامامۃ ریاسۃ عامۃ فی امور الدین والدنیا لشخص من الاشخاص — ونقض ھذا التعریف بالنبوّۃ والاولیٰ ان یقال ھی خلافۃ الرسول فی اقامۃ الدّین وحفظ حوزۃ الملۃ بحیث یجب اتباعہ علیٰ کافۃ الامۃ۔

”ہمارے بعض علماء نے کہا ہے کہ ”امامت“ ہمہ گیر حکومت ہے، دین و دنیا کے تمام امور میں کسی خاص شخص کے لیے اشخاص میں سے — اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ اس میں نبوّت داخل ہو جاتی ہے۔ اور بہتر یہ تعریف ہے کہ وہ رسولؐ کی نیابت ہے دین کے قائم کرنے میں اور ملّت کی اجتماعی مرکزیت کو محفوظ رکھنے میں اس طرح کہ اس کا اتّباع تمام امّت پر واجب ہو۔“

میرے گذشتہ مضمون کو پورا پڑھیے۔ معلوم ہوگا کہ میں نے خلافت کے مفہوم پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔ اور نہ کوئی اس کی تعریف از روئے اصطلاح شرعی بیان کی ہے۔ لیکن "ہرنام" صاحب نے اپنے آخری مضمون میں جو نیاز صاحب کے محاکمہ کے بعد لکھا ہے اس سلسلہ میں کہ خلافت کا تعلق مذہب کے ساتھ ہے یا نہیں، یہ لکھا تھا کہ "خلافت کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ "النیابۃ فی امور الدین والدنیا"، تو اب مذہب کے ساتھ اس کا کھلا کھلا تعلق ہو جاتا ہے۔"

میں نے اپنے مضمون میں ہرنام صاحب کے اس استدلال کا صرف حوالہ دیا تھا لیکن "م۔ ح" صاحب نے بہت اطمینان کے ساتھ میری جانب نسبت دی ہے کہ "صاحب تبصرہ نے خلافت کی از روئے اصطلاح شرعی تعریف یوں بیان کی ہے کہ "ھی النیابۃ فی الدین والدنیا"، خلیفہ امور دینی (مذہبی) و غیر دینی (دنیوی) میں نبی کا نائب ہوتا ہے۔"

اس پر آپ نے دو ایراد فرماتے ہیں۔ ایک یہ کہ خلیفہ نبی کا نائب دین کے ایک شعبہ میں ہوتا ہے یعنی نشر و نفاذ احکام الٰہیہ میں۔ لیکن پہلا شعبہ یعنی اخذ احکام الٰہیہ اس میں نائب نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ خلیفہ نبی کا امور دنیوی یعنی وظائف بشریہ میں نائب نہیں ہوتا۔

دیکھا جائے تو ہرنام صاحب کی تعریف شرح مواقف کی تعریف اور اس کے ایراد سے خلاصہ کے طور پر مستنبط تھی۔ میری رائے میں "ہرنام" صاحب کو بہت خوشی کے ساتھ یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ "نیابۃ عن النبی" کے پہلے "ریاسۃ عامۃ" کا جزو نظر انداز ہو گیا ہے۔ تاکہ نیابت کا تعلق صرف اس حیثیت کے ساتھ ہو جائے جو رسول کو خلق کے ساتھ حاصل ہے اور اس حیثیت کے ساتھ نہ ہو جو رسول کو خالق کے ساتھ پائی جاتی ہے رہ گیا دوسرا ایراد، وہ بالکل بے محل ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ نیابت کا تعلق انھیں امور میں ہے

جو نبی کے لیے بحیثیت نبوت ثابت ہیں۔ نہ وہ کہ جو ان کی ذاتی حیثیت سے شخصی طور پر ثابت ہیں۔

بہرحال ہزام صاحب کا استدلال اپنے مقام پر برقرار ہے کہ جب خلافت صرف دنیوی باتوں میں نہیں ہے بلکہ دین کا جزو اس کے ساتھ شریک ہے تو وہ مذہب کے شعبہ سے بے تعلق چیز نہیں سمجھی جا سکتی۔

⁂

اب سُنیے کہ "م - ح" صاحب نے خلافت کی کیا تعریف فرمائی ہے :-

آپ فرماتے ہیں کہ "خلافت و امامت بادشاہت کو کہتے ہیں۔ لیکن ایسی بادشاہت جو قیام و استحکام دین کے لیے بہ نیابت پیغمبر ہو۔ ورنہ وہ خلافت نہ ہوگی صرف ملوکیت یا قیصریت ہوگی" ــــــــــ لیکن آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ :-

> "عملۂ خلافت کی حیثیت بیک وقت پولیس اور فوج کی سی ہے کہ پولیس کا منصب صرف نفاذ احکام ہے اور فوج نام ہے ان ہی احکام و قوانین کی محافظ طاقت کا لیکن پولیس اور فوج کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ اسمبلی اور کونسل کے پاس شدہ قوانین میں دست اندازی کریں۔ عملۂ خلافت کی اسی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ آج تک کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور فوج میں صرف شاہی خاندان ہی کے افراد برسر کار ہوں، کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس شعبہ میں اپنی خدمات سے حکومت کو فائدہ پہنچا سکے۔"

اب اس ژولیدہ بیانی کی بنا پر دیکھنے والا کیا سمجھے کہ خلافت بادشاہت کا ایسا اعلیٰ عہدہ ہے، یا پولیس اور فوج کا سا معمولی درجہ ہے۔ بہرحال مانیے کہ خلافت بادشاہت ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ جزو دیکھنے کے قابل ہے کہ "قیام و استحکام دین کے لیے بہ نیابت پیغمبر ہو"۔ ظاہر ہے کہ نیابت کا تعلق انہی حیثیتوں کے ساتھ ہو سکتا ہے جو "منوب عنہ" کے لیے حاصل ہیں۔ بادشاہت کو اگر ظاہری شان و شوکت، وجاہت و حشمت، طنطنہ و

طمطراق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کا انبیاء میں پتہ بھی نہیں ملے گا۔ اور اس لیے آپ دیکھیں گے کہ انبیاء کے زمانہ میں مختلف ملوک و سلاطین تخت سلطنت پر متمکن ہوتے تھے اور انبیاء ان کے ساتھ کوئی تعرض نہ کرتے تھے۔ بلکہ اپنے فرائض منصبی میں بطور خود مشغول رہتے تھے۔ انبیاء کی بادشاہت کا کوئی مفہوم اگر ہو سکتا ہے تو وہ مذہبی حیثیت سے "مفترض الطاعۃ" ہونا، لیکن آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ مضمون نگار اس حیثیت کی خلیفہ سے نفی کر دیں گے۔ فرماتے ہیں کہ :-

"نبی کا خلیفہ دینی بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے، وہ نبی کی طرح مفروض الطاعۃ یا نبی کا جملہ امور میں نائب نہیں ہوتا ہے۔"

اب دیکھیے کہ "مفروض الطاعۃ" نہ ہونے کے بعد اس کی بادشاہت کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ "یاد رہے" طالوت کا بحیثیت بادشاہ، نبی کی موجودگی میں مبعوث ہونا صاف اس امر کی دلیل ہے کہ نبی کی حیثیت بادشاہ کی حیثیت سے مختلف ہے۔ پھر آخر نیابت رسول کو بادشاہت کا مرادف سمجھ لینا کب صحیح ہو سکتا ہے؟

یہ بھی اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ بادشاہ دینی کا انتخاب بھی خدا کی جانب سے ہو تو عام افراد کو کوئی حق انتخاب کا باقی نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کا اختلاف کہ "انّی یکون لہ الملک علینا ونحن احق بالملک منہ ولم یؤت سعۃ من المال" (یعنی) اس کو کہاں سے بادشاہت کا حق ہم پر ہو سکتا ہے درصورتیکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے مستحق ہیں اور یہ کوئی مالدار شخص نہیں ہے" مسترد کر دیا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ "ان اللہ اصطفٰہ علیکم" (خدا نے ان کو تمہارے اوپر برگزیدہ کیا ہے)

لیکن رسول اللہؐ کی خلافت کے لیے مسلمان اس حق کو اللہ و رسولؐ سے سلب کر کے اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خدا و رسولؐ کی طرف سے اس امر میں مداخلت ہونا "عقل عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" کے خلاف اور اصول جمہوریت کے منافی ہے۔

عملاً خلافت کی حیثیت پولیس اور فوج کی ہے" لیکن آج تک کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور فوج کے تقرر کا اختیار حکومت کو نہ ہو بلکہ عام پبلک اپنے اختیارات سے پولیس اور فوج کو مقرر کرے جو ظاہر ہے ایسے ہی افراد کو منتخب کرے گی جو اس کے ڈھب کے ہوں اور نہ اس پولیس اور فوج کی یہ ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ فرائض کی انجام دہی میں کسی سخت گیری کی جرأت کرے کیونکہ وہ سمجھے گی کہ ہمارا عزل و نصب اسی عام خلقت کی رضامندی سے وابستہ ہے۔

یہ کہنا کہ "کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور فوج میں صرف شاہی خاندان کے افراد برسرِ کار ہوں" یہ صحابۂ کبار اور بالخصوص حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے فہم و دانش پر حملہ ہے اس لیے کہ جیسا گذشتہ تنقیح کے ذیل میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ خیال سب سے پہلے ان ہی حضرات کا ظاہر کیا ہوا ہے۔ اور اس کی نسبت حدیث حضرت رسولؐ کی طرف دی گئی ہے۔

چلتے چلاتے ایک سند اس کی اور سن لیجیے :-

(محلی ابن حزم جلد ا مطبوعہ مصر ص۴۴)

ولا تجوز الخلافة الا في قريش وهم ولد فهر بن مالك بن نضر
بن كنانة الذين يرجعون بانسابهم اليه حدثنا عبد الله
بن يوسف ثنا احمد بن فتح ثنا عبد الوهاب بن عيسى ثنا
احمد بن محمد ثنا احمد بن علي ثنا مسلم بن حجاج ثنا احمد
بن عبد الله ثنا يونس ثنا عاصم بن محمد بن زيد بن عبد الله
بن عمر بن الخطاب عن ابيه قال قال عبد الله بن عمر
قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يزال هذا الامر
في قريش ما بقي من الناس اثنان

"(یعنی خلافت جائز نہیں ہے، مگر قریش میں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا سلسلۂ نسب فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ تک پہنچتا ہے ——— (بسند متصل) عبداللہ بن عمر سے روایت ہے حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ ہمیشہ یہ امر (خلافت) قریش میں رہے گا جب تک کہ دنیا میں دو شخص بھی موجود ہوں۔"

علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ (مطبوعہ مصر ص۶) میں لکھا ہے:۔

فی روایۃ ان ابابکر احتج علی الانصار بخبر الائمۃ من قریش وھو حدیث صحیح ورد من طرق عن نحو اربعین صحابیا۔

(یعنی) ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے انصار کے مقابلہ میں استدلال کیا اس روایت سے کہ ائمہ قریش سے ہوں گے اور یہ حدیث صحیح ہے جو تقریباً چالیس صحابیوں کے طریق سے وارد ہوئی ہے۔"

اب "م۔ح" صاحب کو اختیار ہے کہ اس شرط کو مہمل قرار دیں یا خود ساختہ اور عقل والے انسانوں کے باور کرنے کے قابل سمجھیں یا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جیسا ہزام صاحب نے اپنے آخری مضمون میں لکھا ہے، اگر خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو کوئی مذہبی حیثیت عطا نہ کی جائے اور انھیں صرف ایک مسلمان بادشاہ سمجھا جائے تو شیعی اور سنّی اختلاف باقی ہی نہیں رہ سکتا۔

میں ہزام صاحب کی نکتہ رسی کی قدر کرتے ہوئے ان کی تحریر کا یہ جزو اس موقع پر ضرور نقل کروں گا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس وقت مسلمانوں کے لیے مسئلہ خلافت کا عملی پہلو صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایانِ دین کو اپنا رہنما قرار دیں اور ان کے تعلیمات پر عمل کریں؟

اگر یہ مسئلہ اس وقت بھی طے پا جائے اور تمام اہلِ اسلام متفقہ حیثیت سے

> عترتِ رسولؐ کی مذہبی پیشوائی کو قبول کریں اور احکام و تعلیماتِ مذہبی میں اُن ہی کے تعلیمات کو مستند سمجھنے لگیں تو پھر کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لیے کہ خلافت بمعنی بادشاہت تو ایک وقتی چیز ہے جس کے احکام انتظامی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کا کوئی تعلق آئندہ نسلوں کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر حضرات خلفاء کی حکومت کو اس حیثیت سے ان کے زمانہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ اس کا کوئی عملی یا اعتقادی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور اس لیے موجودہ زمانہ میں شیعہ اور سنی تفریق کا کوئی سبب باقی نہیں رہتا۔"

یہ اضطرابِ بیان کیا حقیقت رسی کا پتہ دیتا ہے کہ شروع میں خلیفہ کو "امورِ دینیہ میں نبیؐ کا نائب" بتلایا جاتا ہے اور یہ کہ اس کا کام ہے نشر و نفاذ احکامِ الٰہیہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ رسولؐ کی نیابت میں احکامِ شرعیہ سے امت کو آگاہ کرنے والا ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑی ضرورت ہے احکامِ شرعیہ کے علم کی۔

آگے بڑھ کر اس کی حیثیت قرار دی جاتی ہے "بادشاہ" کی اور بتایا جاتا ہے کہ "اس کا سب سے بڑا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ وہ قیام و بقائے دین کے لیے فرائض جہاد کو انجام دے۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھنا چاہیے کہ تحفظِ اسلام کے لیے جو کوششیں ملکی اور بین الاقوامی حیثیت سے کی جا سکتی ہیں ان ہی کا نام اسلام کے اندر "اسلامی ریاست" ہے۔ خلیفہ اسی اسلامی ریاست کا نگران ہوتا ہے اور بس۔

اسی بنا پر خلیفہ میں صرف ان ہی امور کے موجود ہونے کی ضرورت ہے جو بادشاہت کے لیے ضروری ہیں اور وہ طاقت و قوت ہے اور علم، مگر علمِ شریعت نہیں بلکہ علمِ سیاست۔

تیسری کروٹ میں خلیفہ کی حیثیت قرار دی گئی ہے "پولیس اور فوج کی" اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیاست بین الاقوامی کا نگران نہیں بلکہ صرف انتظام داخلی کا محافظ اور

کار گذار ہے۔

بہرحال اب وقت ہے اس کا کہ شرائطِ خلافت پر تبصرہ کیا جائے۔

شرح مواقف (مطبوعہ نولکشور صـ۷۲۱) میں ہے:۔

المقصد الثانی فی شروط الامامة الجمهور علی ان اهل الامامة ومستحقها من هو مجتهد فی الاصول والفروع لیقوم بامور الدین متمکنا من اقامة الحجج وحل الشبهة فی العقائد الدینیة مستقلا بالفتوی فی النوازل والاحکام والوقائع نصا واستنباطا لان اهم مقاصد الامامة حفظ العقائد وفصل الحکومات ورفع المحاکمات ولم یتم بدون هذا الشرط ذا رأی وبصارة بتدبیر الحروب والسلم وترتیب الجیوش وحفظ الثغور لیقوم بامر الملک شجاعا قوی القلب لیقوی علی الذب عن الحوزة والحفظ لبیضة الاسلام بالثبات فی المعارک کما روی انه علیه الصلوٰة والسلام وقف بعد انهزام المسلمین فی الصف قائلا انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب۔ ولا تهوله ایضا فی اقامة الحدود وضرب الرقاب۔ ——

یجب ان یکون عدلا فی الظاهر لئلا یجور فان الفاسق ربما یصرف الاموال فی اغراض نفسه فیضیع الحقوق عاقلا لیصلح للتصرفات الشرعیة والملکیة بالغا لقصور عقل الصبی ذکرا اذ النساء ناقصات العقل والدین حرا لئلا یشغله خدمة السید عن وظائف الامامة ولئلا یحتقر فیعصی فان الاحرار یستحقرون العبید ویستنکفون عن

طاعتها فهذه الصفات معتبرة فی الامامة بالاجماع۔

ترجمہ۔ دوسرا مقصد بحثِ امامت کا شرائط امامت کے بیان میں ہے۔ جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ امامت کا مستحق وہ شخص ہے جو اصول عقائد اور فروع احکام دونوں میں مجتہد ہو تاکہ امورِ دینیہ کا انصرام کر سکے، اور عقائدِ مذہبی میں دلائل قائم کرے اور شبہات کو حل کرے۔ مسائل اور احکام اور رونما ہونے والے واقعات میں نص صریح اور استنباط کی بنا پر بذاتِ خود فتویٰ دے سکے۔ اس لیے کہ امامت کے مقاصد میں سب سے اہم بات عقائد کی حفاظت ہے اور مقدموں کا فیصل کرنا اور اختلافات کا دور کرنا ہے اور یہ بغیر اس شرط کے نہیں ہو سکتا۔ جنگ و صلح کے تدابیر اور لشکروں کی ترتیب اور سرحدوں کی حفاظت میں رائے اور نظرِ صائب رکھتا ہو تاکہ ملکی امور کو انجام دے سکے۔ بہادر ذی دل ہو تاکہ اسلام پر کوئی مصیبت آتے تو وہ اس کے دفع کرنے پر قادر ہو۔ اور مرکزِ اسلامی کی حفاظت کی طاقت رکھتا ہو۔ تاکہ اسلام اس کو جنگ کے معرکوں میں پامردی کی بنا پر کھڑا کر سکے جیسا کہ روایت میں وارد ہوا ہے کہ حضرت رسولؐ تمام مسلمانوں کے شکست کھانے کے بعد بھی صفِ جنگ میں کھڑے رہے اور آپ نے فرمایا:۔

"میں نبی ہوں، کوئی جھوٹا شخص نہیں ہوں، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔"

اس کے علاوہ حدود کا قائم کرنا اور گردنوں کا مارنا کوئی آسان کام نہیں ہے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بظاہر عادل ہو، تاکہ بے انصافی نہ کرے، کیونکہ فاسق شخص اکثر اموال کو اپنے ذاتی اغراض میں صرف کر دے گا تو حقوق ضائع ہوں گے۔ عاقل ہو (یعنی دیوانہ نہ ہو) تاکہ تصرفاتِ شرعیہ اور امورِ سلطنت کے

قابل ہو سکے۔ بالغ ہو اس لیے کہ بچہ کی عقل ناقص ہوتی ہے۔ مرد ہو اس لیے کہ عورتیں عقل اور مذہب دونوں حیثیتوں سے ناقص ہیں۔ آزاد ہو تاکہ اپنے مالک کی خدمت گزاری اس کو فرائض امامت سے مانع نہ ہو نیز اس لیے کہ اس کو حقیر سمجھ کر اس کی نافرمانی نہ کی جائے کیونکہ آزاد لوگ غلاموں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور ان کی اطاعت اپنے لیے ننگ خیال کرتے ہیں۔ یہ صفتیں وہ ہیں جو امامت میں باجماع معتبر ہیں۔"

عقائد نسفی میں لکھا ہے:-

یشترط ان یکون من اهل الولایة المطلقة الکاملة سائسا
قادرا بعلمه وعدله علی تنفیذ الاحکام وحفظ حدود
دار الاسلام وانصاف المظلوم من الظالم

(ترجمہ) "خلیفہ کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ کامل ولایت کے تمام خصوصیات رکھتا ہو یعنی مسلمان، آزاد، مرد، عاقل، اور بالغ ہو۔ اور انتظام کی قابلیت رکھتا ہو۔ اور اپنے علم اور عدالت کی بنا پر احکام شرعیہ کا اجرا اور دار الاسلام کے حدود کی حفاظت اور ظالم سے مظلوم کے انصاف پر قدرت رکھتا ہو۔"

علامہ ابن روزبہان کی عبارت اس کے پہلے درج ہو چکی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔ "امام کہ جو اس منصب کا اہل اور مستحق ہے اس کے شرائط یہ ہیں کہ وہ اصول و فروع میں مجتہد ہو تاکہ امور دین کو انجام دے سکے، جنگ کے تدابیر میں رائے اور نظر صائب رکھتا ہو، بہادر قوی دل ہو تاکہ مرکز اجتماعی سے مدافعت کر سکے، عادل ہو تاکہ ظلم و جور نہ کرے، اس لیے کہ فاسق اکثر اموال کو اپنے ذاتی اغراض میں صرف کر دیتا ہے اور عادل ہمارے نزدیک وہ ہے جو کبائر کا ارتکاب نہ کرتا ہو اور صغائر

پر اصرار نہ رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ عادل ہو تاکہ تصرفاتِ شرعیہ اس کے جائز ہوں۔ بالغ ہو، کیونکہ بچہ کی عقل ناقص ہوتی ہے۔ مرد ہو، اس لیے کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں، آزاد ہو اور قبیلۂ قریش میں سے ہو۔ جس میں یہ سب صفتیں موجود ہوں۔ وہ خلافت کے منصب کا مستحق ہوگا۔"

ان کلمات سے ظاہر ہے کہ خلافت میں سب سے زیادہ اہمیت علمِ شریعت اور مذہبی اصول و فروع میں قوتِ اجتہاد کو دی گئی ہے اور شارح مواقف نے تصریح کی ہے کہ "امامت کے مقاصد میں سب سے اہم بات عقائد کی حفاظت اور مقدموں کا فیصلہ کرنا اور اختلافات کا دور کرنا ہے۔"

شرحِ عقائد نسفی میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

فان قیل فلیکتف بذی شوکۃ یملک العامۃ سواء کان اماما او غیر امام فان انتظام الامور یحصل بذلک کما فی عھد الاتراک قلنا نعم یحصل بعض النظام فی الدنیا لکن یختل امر الدین وھو المقصود الاھم والعھدۃ العظمیٰ

ترجمہ "اگر کہا جائے کہ کوئی شخص ایسا ہو جو جاہ و حشمت رکھتا ہو اور عام افراد پر سلطنت کرے وہ کافی سمجھا جانا چاہیے۔ خواہ امام ہو یا غیر امام۔ کیونکہ انتظام کا مقصد اس سے حاصل ہو جائے گا۔ جیسا کہ ترکوں کے زمانہ میں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں اس سے دنیاوی معاملات کا تو کچھ انتظام ہو جائے گا۔ لیکن دینی امور درہم برہم ہو جائیں گے اور اہم ترین مقصد اور سب سے بڑا رکن یہی ہے۔"

علامہ قوشجی نے شرح تجرید میں لکھا ہے:۔

انتظام امر عموم الناس علی وجہ یؤدی الی صلاح الدین

والدنیا یفتقر الیٰ ریاسۃ عامۃ فیہما اذ لو تعدد الرؤساء
فی الاصقاع والبقاع لادی الی منازعات ومخاصمات موجبۃ
لاختلال امر النظام ولو اقتصرت ریاسۃ علی امر الدنیا
لفات انتظام امر الدین الذی ہو المقصود الاہم والعمدۃ
العظمیٰ۔

(ترجمہ) "تمام لوگوں کے امور کے انتظام کے لیے اس صورت پر کہ دین و دنیا دونوں کی بہتری ہو، ضرورت ہے کہ دین و دنیا دونوں میں ریاست عامہ حاصل ہو۔ اس لیے کہ اگر متعدد حاکم ہوں اور مختلف ممالک میں تو آپس میں لڑائیاں ہوں گی جس سے انتظامات میں خرابی واقع ہوگی اور اگر اس کی ریاست دنیاوی امور سے مخصوص ہو تو دین کا انتظام رہ جائے گا جو اہم مقصد اور سب سے بڑا رکن ہے۔"

ملاحظہ کیا آپ نے کہ یہ علمائے اسلام خلافت کے بارے میں بہت زیادہ زور علم دین و شریعت پر دے رہے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک ملوکیت اور خلافت میں حدِ فاصل یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف امورِ دنیا سے ہوتا ہے لیکن اس میں "مقصودِ اہم اور رکنِ اعظم" دین ہوتا ہے۔

خلفاء کے صفات کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جزو ہونا چاہیے تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقابلہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے۔ اس لیے "م۔ ح" صاحب نے اس میدان میں اپنی جماعت کی شکست کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنی رزمگاہ کا دوسرا میدان تلاش کیا ہے۔ انھیں علم دین و شریعت کے مسئلہ میں اتنی مایوسی ہوئی ہے کہ وہ طالوت کی بادشاہت کے بارے میں قرآن مجید کی آیت میں جو "علم" و "جسم" کا لفظ ہے اس سے بھی فوراً خطرہ کا احساس کرنے لگے

"علم" کے ساتھ اپنے ترجمہ میں بریکٹ کے اندر (سیاست) کا لفظ لکھ دیتے ہیں تاکہ علم شریعت کی ضرورت خلافت کے لیے ضروری نہ قرار پائے۔

اب دیکھیے کہ اُنھوں نے "امورِ استحقاقِ خلافت" کے ذیل میں کیا چیزیں پیش کی ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔ وہی امور جو بادشاہت کے لیے ضروری ہیں ان کی ایک شخص میں موجودگی اس کو مستحقِ خلافت قرار دے گی۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے امور ہیں جو بادشاہت کے لیے ضروری ہیں کہ بغیر اُن کے کوئی شخص بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ہم کو یہ نظر آتی ہے کہ سلطنت و حکومت کے لیے جابرانہ قوت اور قاہرانہ طاقت کا ہونا ضروری ہے۔ جس میں قوت نہ ہوگی وہ کیا حکومت کر سکے گا۔ اس طاقت کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ جسمانی طور سے جسمانی قوت کافی رکھتا ہو۔ فنونِ جنگ و سپہ گری میں اس کو مہارتِ تامہ ہو اور عزم و ارادہ کی بھی اس کے پاس غیر معمولی طاقت ہو۔ اور طاقت کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے عزم کا مضبوط اور ارادہ کا پکا انسان ہو اور علم و تدبر سے بھی بڑی حد تک بہرہ ور ہو تاکہ امورِ سیاست کی گتھیوں کو آسانی سے سلجھا سکے۔ اور ملکی نظم و نسق کو عمدہ اسلوب پر قائم کر سکے۔ اگر کسی میں یہ دو صفات موجود ہیں تو وہ بادشاہت کر سکتا ہے ورنہ ناممکن ہے۔

خلافت کا مستحق بھی وہی شخص ہوگا جس میں مذکورہ بالا دو شرطیں موجود ہوں، کیونکہ اس کا مشن صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ احکامِ شرعیہ کا نفاذ کرے، حدود اللہ کو قائم کرے اور حفاظتِ بقا و دین کے لیے اگر ضرورت پیش آجائے تو مردانہ وار جنگ سے بھی دریغ نہ کرے۔ ان امور کی انجام دہی کے لیے ضرورت ہے کہ وہ پختہ کار انسان ہو۔ اس کے عزائم میں اس قدر استقلال ہو کہ دوسری طاقتیں اسے متزلزل نہ کر سکتی ہوں۔ پُرخطر مواقع میں اس کے پاؤں نہ ڈگمگا سکتے ہوں۔ وہ ایسی کمزور ذہنیت کا مالک

نہ ہو۔ کہ مختلف آرا۔ اُسے ہر موقع پر شکست دے سکیں، بلکہ سنجیدہ دل و دماغ رکھنے والا انسان ہو۔ فہم و تدبر اور فراست و دانائی سے کافی حصہ پایا ہو۔ نڈر ہو اور بیباک پختہ خیال ہو اور راسخ العزم مشکلات کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ہمت و جرأت رکھتا ہو۔ لوگوں پر اس کی غیر معمولی طاقت کا اثر قائم ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے احکام دوسروں سے منوا سکتا ہو۔ ایسا شخص خلیفہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خلافت کا مستحق ہے۔“

صاحبِ تبصرہ نے بہت سمجھ بوجھ کر خلافت کے لیے بس دو شرطیں قرار دی ہیں ایک یہ کہ وہ جسمانی قوت رکھتا ہو اور فنونِ جنگ و سپہ گری میں اس کو مہارت ہو اور دوسرے اپنے عزم و ارادہ کا پختہ ہو۔ حالانکہ جناب بزمی صاحب بھی جو اپنے پہلے مضمون میں سیاست کے پہلو پر بہت کچھ زور دے چکے ہیں، خلیفۂ اسلام کے لیے صرف اسی کو کافی نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے شرائطِ خلافت کو بہت ایجاز کے ساتھ حسب ذیل الفاظ میں منحصر قرار دیا ہے :-

> ”خلافت و امامت کے مسئلہ میں اگر بے تعصبی کے ساتھ ذرا سے غور سے بھی کام لیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ نبی کریمؐ کا صحیح جانشین وہی ہو سکتا ہے جو ایک طرف تو اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو اور دوسری طرف سیاسی حل و عقد میں دنیا کا مہذب ترین فرمانروا۔“

* * *

امورِ استحقاقِ خلافت

اب گذشتہ تمام اقوال کو پیشِ نظر رکھ کر اگر خلافت کے شرائط پر نظر ڈالی جائے

تو وہ حسب ذیل قرار پاتے ہیں:۔

۱۔ دین و شریعت کا کامل علم رکھتا، یعنی اصولِ دین اور احکامِ شرعیہ میں استنباط کی قدرت رکھتا ہو تاکہ عقائدِ دینیہ میں جو شبہات واقع ہوں اور جو شرعی مسائل درپیش ہوں ان سب کو حل کر سکے۔

۲۔ تدابیرِ جنگ سے خوب واقف ہو اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا ہو۔

۳۔ شجاع قوی دل ہو جس کا جنگ میں ثبات مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہو اور نیز اجرائے حدود اور قصاص کے معاملہ میں اس سے کمزوری کا اندیشہ نہ ہو۔

۴۔ عادل ہو تاکہ اموالِ مسلمین میں تغلب و تصرف نہ ہونے پائے۔

یہ شرائط مستند علمائے اہلِ سنت کے بیان کردہ ہیں اور اسی کے ساتھ "م۔ ح" صاحب کی خاطر سے بڑھا لیجیے، کہ:۔

۵۔ اپنے عزم کا مضبوط اور ارادہ کا پکا انسان ہو۔

اور بزمی صاحب کے نقطۂ نظر سے:۔

۶۔ اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو۔

کیا حضرات خلفائے ثلثہ مستحق خلافت تھے؟

یہ گذشتہ بحث کا لازمی نتیجہ ہے۔ شرائطِ خلافت جو اہلِ سنت کے نقطۂ نظر سے درج کیے گئے ہیں آپ کے سامنے ہیں۔ ان امور کے لحاظ سے فہم و درایت کی روشنی میں دیکھئے کہ حضرات خلفائے ثلثہ میں کہاں تک خلافت کی استعداد و صلاحیت تھی۔

حضرت بزمی صاحب نے اپنے ابتدائی مضمون میں اس بحث کو اس طرح ختم کرنا چاہا ہے کہ:۔

"دُنیا کا عام اصول یہ ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام

دے سکے اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی لیے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی اہلیت میں تو کوئی شک ہونا ہی نہیں چاہیئے۔"

اس پر مجھے اُس ایرانی کی نقل یاد آجاتی ہے جس نے کہا تھا۔

"می گویند نماز بے وضو نمی شود، من نماز بے وضو کردم و شد"

بندہ پرور، اصل محلِ بحث وہ حکومت ہے جو رسولؐ کی جانشینی کے لحاظ سے مذہبی طور پر صحیح بھی ہو۔ اس کے لیے اگر وہ شرائط موجود نہیں ہیں جو ضروری قرار دیے گئے ہیں تو یہ تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ عہدہ بغیر کسی قباحت کے انجام پاگیا ورنہ "کردم و شد" کی صورت پر تو یزید و ولید ایسے فاسق و فاجر بھی "امیر المومنین" بنے اور ہو گئے اور ایک غیر مسلم بھی اس عہدہ کو انجام دے سکتا ہے اور ہو جائے گا۔

پہلی شرط:- دین و شریعت کا کامل علم

افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہی شرط جو "مقصودِ اہم اور رُکنِ اعظم" ہے ان حضرات کے کمالات کا سب سے زیادہ کمزور پہلو ہے۔ اُن کی واقفیت مسائلِ شرعیہ میں اتنی بھی نہ تھی جتنی بہت سے عام صحابہ کی تھی۔ اور اس کمزوری کا احساس خود آپ حضرات کو بھی تھا۔ اس لیے برابر ایسے صحابہ کو مددگار رکھا جاتا تھا جو ان مہموں میں دستگیری کرسکیں

ایسے اتفاقات بھی ہوئے ہیں کہ فیصلہ غلط کیا اور کسی صحابی نے اعتراض کر دیا۔ فوراً فیصلہ بدل دیا، اور اس صحابی کے قول کے مطابق حکم دے دیا۔ حضرت ابوبکر کی خلافت کی مدت ہی کتنی تھی، اور وہ بھی "فتنۂ ارتداد" اور "انتظامِ مملکت" کے جھگڑوں میں صرف ہوئی۔ لیکن اس میں بھی بعض واقعات ایسے پیش آگئے جن میں آپ کو زحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں میراثِ جدّہ کا مسئلہ بہت مشہور و معروف ہے[1]۔ علامہ

---

[1] ملاحظہ ہو اسد الغابۃ ابن اثیر جزری ج ۳ ص ۲۹۵ ۔

ابن تیمیہ نے "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام"[1] میں لکھا ہے۔ کہ جب آپ سے میراثِ جدّہ کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس مسئلہ کا بالکل علم نہیں۔ ہاں میں لوگوں سے دریافت کروں گا۔ چنانچہ آپ نے دریافت کیا مغیرہ بن شعبہ و محمد بن مسلم نے بتایا کہ رسول اللہؐ نے اس کو سدس عطا کیا ہے۔

قرآن مجید کی آیت "وفاکھۃ وابا" کے معنی میں آپ ہمیشہ متحیر رہے اور کبھی سمجھ میں نہ آئے[2]

چور کا بایاں ہاتھ کٹوا دیا، فجاہ سلمی کو آگ میں جلوا دیا، جس کے لیے علامہ قوشجی کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ یہ آپ کی غلطی تھی۔ یہ آپ کے مختصر دورِ خلافت کے چند واقعات ہیں جو تاریخ سے اب تک پہنچائے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا دور اپنے "جبروت" کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کا زمانہ بھی نسبتہً طولانی ہے۔ اس میں ان واقعات کی بہت کثرت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ حرانی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر حسب ذیل مسائل کو نہ جانتے تھے۔ سنت استئذان، میراث دیت، حکمِ مجوس باعتبار جزیہ، انگلیوں کی دیت کے بارے میں آپ نے غلط فیصلہ کیا جسے معاویہ کو اپنے دور میں منسوخ کرنا پڑا اور مسلمانوں کو کوئی چارۂ کار سوائے اس کے نہ ہوا کہ وہ معاویہ کے فیصلہ پر عمل کریں[3] کلالہ کے معنی کبھی آپ کی سمجھ میں نہ آئے حالانکہ آپ نے سمجھنے کی کوشش بھی کی[4] جو مسئلے آپ کو معلوم تھے وہ بھی آپ کو وقت پر یاد نہیں آتے تھے، چنانچہ ایک شخص نے دریافت کیا کہ مجھے ضرورتِ غسل تھی اور پانی موجود نہ تھا، فرمایا اس صورت میں نماز نہ پڑھو۔ عمار نے کہا، کیا آپ کو یاد نہیں کہ ہم اور آپ ایک غزوہ میں گئے اور ہم کو غسل کی ضرورت

---

[1] مطبوعہ مصر ص ۲۴۔ [2] اتقان سیوطی مطبوعہ دہلی ص ۱۲۴۔ [3] رفع الملام عن الائمۃ الاعلام ص ۲۴

[4] اتقان مطبوعہ دہلی ص ۳۱۱

پیش آئی تو آپ نے تو نماز ہی نہیں پڑھی اور میں مٹی میں لوٹا اور نماز پڑھ لی۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ اس صورت میں خاک پر ہاتھوں کو مار کر چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کر لینا چاہیے[1] اس قسم کے مسلسل واقعات کا نتیجہ یہ تھا کہ مسائل شرعیہ میں آپ کے کسی حکم یا فیصلہ کا کوئی وزن عام نظروں میں باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ آپ نے اعلان کیا کہ عورتوں کے مہر میں کوئی زیادتی نہ کی جائے، اگر ایسا ہوگا تو زیادتی کی رقم بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔ ایک عورت نے کہا کہ یہ حکم خدا کے خلاف ہے۔ اور قرآن کی آیت پڑھ دی تب آپ کو اعتراف کرنا پڑا[2] ابی بن کعب پر آپ تے قرآن کی کسی آیت کے بارے میں اعتراض کیا۔ انھوں تے فوراً کہہ دیا۔ "کان یلھینی القرآن و یلھیک[3] الصفق بالاسواق"۔ میں رسول اللہ ؐ سے قرآن کا علم حاصل کرتا تھا اور آپ کو بازاروں میں خرید و فروخت سے فرصت نہ تھی۔

وہ صاحب جاہ و جلال انسان جو سعد بن ابی وقاص ایسے بڑے جرنیل کو اتنی سی بات پر کوڑا مار دے کہ وہ تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوئے تھے اور یہ کہے کہ "لم تھب الخلافۃ فاردت ان تعرف ان الخلافۃ لا تھابک" تم خلافت کی ہیبت سے متاثر نہیں ہوئے۔ میں نے چاہا تم کو بتلاؤں کہ خلافت بھی تم سے مرعوب نہیں ہوتی[4] ایسا پرہیبت انسان علمی مسائل میں اس طرح کی باتیں سنتا ہے اور شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتا ہے۔ یہ اسی لیے کہ اس معاملہ میں خود آپ کا نفس اپنی عظمت کا قائل نہیں تھا اسی لیے آپ مختلف صحابہ سے اس مرحلہ میں مدد حاصل کرتے رہتے تھے۔ جن میں سے ایک یہی ابی ابن کعب ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:۔

روی عنہ من الصحابۃ عمر و کان یسئلہ عن النوازل و یتحاکم الیہ

---

[1] محلی جلد ۲ ص ۱۵۵۔ [2] اتحاف السادۃ المتقین فی شرح احیاء علوم الدین ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۲۸۹

رفع الملام عن الائمۃ الاعلام ص ۲۹۔ [4] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص

فی المعضلات" ان سے صحابہ میں سے حضرت عمر نے احادیث کی روایت کی ہے اور وہ ان سے پیش آمدہ مواقع میں مسائل دریافت کیا کرتے تھے اور مشکل مقدمات کا ان سے فیصلہ کراتے تھے[1] یہاں تک کہ ابن عباس جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں کمسن تھے اور انہوں نے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا حضرت عمر کے ملجا و ماویٰ تھے۔

ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:- انّ عمر کان اذا جاءتہ الاقضیۃ المعضلۃ قال لابن عباس انھا قد طرت علینا اقضیۃ وعضل فانت لھا ولامثالھا ثم یأخذ بقولہ۔

جب حضرت عمر کے پاس مشکل مسائل پیش ہو جاتے تھے تو ابن عباس سے فرماتے تھے ہمارے پاس کچھ مقدمات اور دشوار مسائل آگئے ہیں ان کا فیصلہ تمہیں کر سکتے ہو پھر جو کچھ ابن عباس کی رائے ہوتی تھی اس پر عمل کرتے تھے[2]

یہ ابن عباس وہ تھے جو حضرت علی کے شاگرد تھے اور ان کا قول تھا کہ "اذا جاءنا الثبت عن علی لم نعدل عنہ" جب کوئی حکم شرعی ہم کو علیؑ کی جانب سے ثابت ہو جاتا تھا تو پھر ہم اس سے عدول نہیں کرتے تھے۔"

پھر کیا تعجب ہے اگر حضرت عمر مسائل شرعیہ میں خود حضرت علی بن ابی طالب کی طرف رجوع کریں اور ان کے احکام پر کاربند ہوں۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات بے شمار ہیں۔ اور ایسے ہی مواقع پر آپ کی زبان سے یہ فقرہ نکلا تھا جو زباں زد خلائق ہے۔ لولا علی لھلک عمر۔ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔" اور "اعوذ باللہ من معضلۃ لیس لھا ابو الحسن"۔ خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس مشکل سے جس کے لیے ابو الحسن (علیؑ بن ابی طالب) نہ ہوں۔"

تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو امام ابن قتیبہ دینوری متوفی ۲۷۶ھ کی کتاب

---

[1] اصابہ جلد ۱ صـ ۱۹۱۔ [2] اسد الغابہ ج ۳ صـ ۱۹۳۔

"تاویل مختلف الحدیث فی الرد علی اعداء اہل الحدیث" مطبوعہ مصر ۱۳۲۶ھ ص۲۰۱۔ استیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ابن عبدالبر قرطبی مالکی متوفی ۴۶۳ھ (مطبوعہ حیدرآباد جلد ۲ ص۴۷۴) اسدالغابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۳۰ھ مطبوعہ مصر ج ۴ ص۲۲۔ تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ مطبوعہ حیدرآباد ج ۷ ص۳۳۷۔ اصابہ حافظ ابن حجر ج ۲ ص۵۰۹۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید مصر ج ۱ ص۶۔ ذخیرۃ المآل شہاب الدین عبدالقادر عجیلی۔ مطالب السؤل کمال الدین ابن طلحہ شافعی (مطبوعہ ایران) ص۱۳۔ مناقب اخطب خوارزم ص۴۸۔ ملفوظات سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء۔ توضیح الدلائل شہاب الدین احمد شرح قصیدۂ تائیہ ابن فارض مؤلفہ سعیدالدین محمد بن احمد فرغانی۔ مطول سعدالدین تفتازانی مطبوعہ تبریز ص۱۳۶۔ فصول مہمہ ابن صباغ مالکی ص۱۸۔ کفایۃ الطالب حافظ بن محمد یوسف گنجی شافعی باب ۵۷۔ الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ شمس الدین ابن قیم جوزیہ حنبلی مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ ص۴۶۔ مواقف عضدالدین الایجی۔ شرح مواقف ابوالعلی بن محمد رضا بخاری مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۱۴ھ ص۴۳۷۔ ابطال الباطل فضل اللہ بن روزبہان شیرازی شرح تجرید قوشجی۔ جواہر العقدین نورالدین سمہودی۔ صواعق محرقہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر ص۷۴ اسعاف الراغبین محمد بن علی بن صبان مصری برحاشیہ مشارق الانوار شیخ حسن حمزاوی مطبوعہ مصر ص۱۵۲۔ تاریخ الخلفاء حافظ جلال الدین السیوطی مطبوعہ مصر ص۶۶۔ نورالابصار سید مومن شبلنجی مطبوعہ مصر ص۷۳۔ ہدایۃ المرتاب حاج احمد آفندی مطبوعہ مصر ص۱۴۶ وغیرہ وغیرہ

مثل مشہور ہے "الناس اعداء لما جھلوا"۔ بادشاہِ وقت میں جتنا علمی ذوق اعلیٰ پایہ کا ہوگا اتنا وہ علوم و فنون کی ترویج کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا۔ لیکن دوسری صورت میں اس کے برعکس صورت پیدا ہونا یقینی ہے۔

یہ تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت عمر کے دور میں مسلمانوں کی علمی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ خود آپ کے احادیث بہت کم تھے۔ اس لیے کہ

آپ کو اپنی قوتِ حافظہ پر اعتماد نہیں تھا۔ چنانچہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا بات ہے آپ رسول اللہ ص کے کچھ احادیث بیان نہیں فرماتے تو ارشاد کیا۔ انما اخشی ان ازید النقص۔ "مجھ کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کچھ زیادتی کمی نہ کر دوں"[1]۔

اس کے باوجود آپ نے جرأت سے کام لے کر کبھی دو ایک حدیثیں ارشاد فرمائیں تو ان میں بھی اشتباہ واقع ہو گیا۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری۔ باب ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ۔ حضرت عائشہ کے سامنے یہ حدیث جناب عمر کے انتقال کے بعد آپ کی زبانی بیان ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ عمر کو دھوکا ہوا۔ یہ حدیث اس طرح نہیں تھی۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنے زمانہ میں احادیث کی روایت سے ممانعت کر دی تھی۔ اور بہت سختی کرتے تھے۔ چنانچہ اس مصیبت سے جناب ابوہریرہ کو بھی دوچار ہونا پڑا[2]۔

اگر کتب خانۂ اسکندریہ کے جلانے کا واقعہ غلط بھی ہو تب بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ تصنیف و تالیف کے مخالف تھے۔ اور مسلمانوں میں "کتابت" کے رواج ہی کو پسند نہ کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جمہور مسلمین تصنیف کے معاملہ میں پیچھے ہو گئے تھے۔

مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی افسر مدرس مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل نے "تدوین حدیث" ایک مضمون مسلم اکاڈمی لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھا تھا۔ جو کتابی صورت سے شائع ہوا ہے۔ اس میں آپ نے حدیث کی جمع و تالیف کے متعلق صحابہ میں جو اختلاف رائے تھا اسے تحریر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"صحابہ مذہب میں بدعت سے اس قدر بچتے تھے کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں

---

[1] حیوۃ الحیوان دمیری ج ۱ ص ۲۵۲ [2] شرح ابن ابی الحدید جلد ۱ جزو دہم ص ۲۲۔

بدعت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ قرآن کی تدوین پر ایک گروہ صحابہ کو سخت اعتراض تھا۔ روایتِ حدیث پر سزا تک کی نوبت آئی۔ تدوینِ احادیث میں تو ایک یہی خرابی کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن جو اس وقت تک موجودہ طور پر مکتوب نہیں تھا اور کلامِ حضرت رسالت پناہی مخلوط نہ ہو جائیں۔ حضرت ابوہریرہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشہور ہے کہ اکثار حدیث پر سزا دی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاعدہ تھا کہ جب کسی کو والی مقرر فرماتے تو منجملہ دوسرے نصائح کے یہ بھی اس کو نصیحت فرماتے کہ دیکھو جن لوگوں کے پاس جا رہے ہو وہ قرآن پڑھنے میں مصروف ہیں اور شب و روز اپنا وقت تلاوتِ قرآن میں صرف کرتے ہیں، ان سے زیادہ حدیثیں بیان کر کے ان کے ذہنوں کو تشویش میں نہ ڈالنا۔ غرض کہ جب روایت حدیث کی یہ صورت ہو تو تدوین و کتابتِ حدیث کی کیا صورت ہو سکتی ہے"

پھر تحریر فرماتے ہیں :-

"حضرت عمر ہی کے زمانہ میں جمع حدیث کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی اور تمام صحابہ اس کو جمع کر دینے کی رائے ظاہر کر چکے تھے مگر قرآن کے ساتھ بے توجہی کے خوف نے اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجبوراً باز رکھا تھا اور اس کے بعد ہم کو باوجود تلاش پھر کبھی صحابہ کا جمع کی جانب توجہ کرنا نظر نہیں پڑا۔ اگر کہیں احادیث کو بھی قرآن کی طرح خلفائے راشدین نے مدوّن کر دیا ہوتا تو یقین کیجیے کہ بہت کچھ کیا بلکہ قرآن کی طرح وہ بھی دستِ تصرف سے محفوظ ہو جاتے اور باہمی مسلمانوں میں کثیر فرقہ بندیوں کی شاندار روک تھام ہو جاتی۔ آج احادیث میں جو جو شبہات اور شکوک اسناد اور الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے پیش

> آئے ہیں وہ ان کی تدوین و جمع کے بعد پیش نہیں آ سکتے تھے۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔"

امام مسلم نے بھی اپنی کتاب صحیح کے شروع میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے۔ اختلفوا فی کتابۃ الحدیث فکرھا طائفۃ منھم عمر بن الخطاب۔ "احادیث کے قلمبند کرنے کے بارے میں اختلاف ہوا۔ ایک جماعت نے اس کو ناپسند کیا۔ جن میں سے حضرت عمر ہیں۔"

عقائد کے معاملہ میں جو شبہات پیدا ہوتے تھے ان کا حل علمی دلائل کے بجائے آپ کی جانب سے بزور "تازیانہ" کیا جاتا تھا۔ امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم میں اس کی کافی تفصیل موجود ہے۔

رسالہ "حقائق" لکھنؤ میں شعبان ١٣٥٣ھ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں اس صورتِ حال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے :۔

> "وہ دور کس حد تک روشن کہے جانے کے قابل ہے جس میں معارف و حقائق کا چرچا نہ رہے۔ فلسفۂ الٰہیات اور علمِ کلام کے مسائل گوشۂ گمنامی میں پڑ جائیں۔ تصنیف و تالیف کا دروازہ بند ہو اور روایتِ احادیث پر سخت پابندیاں عائد ہوں۔ کتبِ علمیہ کی چھان بین اور جستجو تو کجا علمی تحقیقات کے راستے میں روڑے اٹکائے جائیں۔"

تفسیرِ قرآن کے متعلق ایک سوال پر سزا کے لئے "تازیانہ" دیئے جانے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

> "حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہبی سوال پر سختی و تشدد کسی طرح مناسب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس سختی و تشدد کے بعد معترض کا یہ کہہ دینا کہ اس کی تسکین ہو گئی اس کے تسکینِ قلب کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے

طرزِ عمل سے عام افراد کو یہ خیال قائم کرلینے کا موقع مل سکتا ہے۔ کہ سوال لاجواب تھا، اور سوائے مظاہرہِ جبر و تشدد کے اس کا کوئی حل موجود نہ تھا۔" اکثر ایسے موقعوں پر بھی آپ کا تازیانہ اٹھ گیا جہاں کہنے والے نے ایک صحیح علمی بات اپنی زبان سے نکالی تھی۔ ملاحظہ ہو اتقان علامہ سیوطی مطبوعہ دہلی صفحہ ۵۱۶ ۔

> "ایک شخص نے حضرت عمر سے کہا کہ میں جانتا ہوں ایک آیت جو کتابِ خدا میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ آپ نے اس کو درّہ لگایا اور کہا کہ تجھے بھلا اس کا علم کیسے حاصل ہوا۔ اچھا بتا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا "من یعمل سوء یجزبہ" "جو کوئی بھی برائی کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ لہٰذا کسی کو ہم میں سے مطمئن نہ ہونا چاہیئے۔ جو کوئی گناہ ہم سے صادر ہوگا اس کی پاداش ملے گی۔" دیکھا آپ نے یہ درّہ کس قصور پر اٹھایا گیا۔ کاش دریافت کرنے کے بعد یہ "تازیانہ اٹھایا جاتا، جب وہ کوئی بے جا بات کہتا۔

اس صورتِ حال میں کیا کسی مسلمان کو جرأت ہوسکتی ہے کہ وہ کسی علمی بات کا تذکرہ زبان پر لائے یا کوئی استفسار و سوال کرے۔ کیا اس طرح عقول و افکار مسلمانوں کے زنگ آلود نہیں بنائے گئے؟ اور کیا یہی وہ علمی فریضہ ہے جو ایک خلیفۂ رسولؐ کو انجام دینا چاہیے؟

حضرت عثمان کو تو صحابہ کی عام مخالفت اور بغاوت کی وجہ سے اس طرح کے مواقع ہی حاصل نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا پھر بھی معلوم ہوسکا کہ آپ کو اس مسئلہ کا علم نہیں تھا کہ زوجہ کو اپنے شوہر کی وفات کے بعد اسی مکان میں رہنا چاہیئے جہاں کہ اس نے چھوڑا تھا۔ یہاں تک کہ فریعہ بنت مالک، ابوسعید خدری کی بہن نے آپ کو اس مسئلہ سے آگاہ کیا۔[۱]

یہ ہے حالت اس شرط کی جو ایک "خلیفۂ دینی" کے لیے "مقصود اہم اور رکنِ اعظم" کی حیثیت سے قرار دی گئی ہے۔ مذکورہ بالا واقعات کی بناء پر کہنے دیجیے کہ اس پہلو سے یہ حضرات نہ صرف امیر المومنین حضرت علیؑ سے بلکہ دوسرے بہت سے ان صحابہ کے عقب میں تھے جو مسائلِ شرعیہ میں فقیہہ کا درجہ رکھتے تھے۔ اور رسالت مآبؐ کے فیضِ علم سے مستفید ہوئے تھے۔

دوسری شرط تدابیرِ جنگ سے واقفیت اور سیاسی بصیرت

اس شرط کے پہلے جزو کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ اس قسم کا سوال اسی وقت پیدا ہو سکتا تھا جب آپ حضرات کو کبھی بحیثیت جرنیل فوج کی تنظیم و ترتیب اور اس کو دشمن سے صف آرا بنانے کا موقع ہوا ہوتا۔ لیکن یہ تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حضرات کو کبھی کوئی ذمہ وارانہ منصب سپرد نہیں کیا۔ اور ہمیشہ دوسروں کا ماتحت رکھا۔ یہاں تک کہ سب سے آخر عمر میں تو اسامہ بن زید کو جو عام طور سے ایک غلام کے فرزند سمجھے جاتے تھے جنگِ روم کے لیے ان پر افسر مقرر کر دیا۔ جس پر بڑی "سرکہ جبینی" اور "سرگرانی" پیدا ہوئی۔ بلکہ حکمِ رسولؐ سے "سرتابی" نے عملی شکل اختیار کر لی اور رسول اللہؐ کو تاکیدی حکم دینا پڑا اور اتنے سخت الفاظ استعمال فرمانا پڑے کہ

جهزوا جيش اسامة لعن الله من تخلف عنها۔

لیکن یہ تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ یہ لشکر رسول اللہؐ کی موجودگی میں روانہ ہونا تھا نہ روانہ ہوا۔ اور وہی لوگ جو آج بڑے درجوں پر فائز سمجھے جاتے ہیں ان الفاظ کی زد میں آ گئے۔ اور ہمیشہ کے لیے رہ گئے۔ اس لیے کہ اس کے بعد پھر رسولؐ کی طرف سے کسی رحمت کی دعا کا ثبوت نہیں ہے۔

رہ گیا دوسرا جزو، اس پر بڑا زور صرف کیا جا رہا ہے اور پھر پھر کے یہی ایک چیز رہ جاتی ہے جسے خلفاء کے لیے بڑے شد و مد سے ثابت کیا جاتا ہے ۔ لیکن اس سلسلہ میں نمائشی الفاظ کی روانی، تقریر کی صفائی آواز کی بلندی اور اظہار کی طاقت سب ختم ہو جاتی ہے ۔ حضرت عمر کی ذات پر مگر حضرت عثمان کی تاریخ کا ورق سامنے آیا اور طاقتِ گفتار نے جواب دیا۔

آپ کا پورا دورِ خلافت مجموعہ ہے سیاسی غلطیوں کا جنھوں نے آخر میں آپ کی کشتیٔ حیات کو غرق کیا ۔ اور کہنے دیجیے کہ بالکل اسی طرح کا اجماع جیسا ان حضرات کی خلافت پر ہوا تھا ویسا ہی بلکہ اس سے زیادہ پُرشکوہ اجماع آپ کے قتل پر ہوا اور اسلام میں وہ شرمناک مثال قائم ہوئی جو انتہائی قابلِ افسوس ہے ۔ حقیقتاً حضرت علیؑ بن ابی طالب کے دَور کا تمام اضطراب و انتشار نتیجہ ہے اس حد سے گزری ہوئی صورتِ حال کا جو حضرت عثمان کے دور میں موجود تھی ۔ حضرت عمر کا مخصوص تدابیر کے ماتحت جناب عثمان تک خلافت کا پہنچانا اسے اگر اسلام کی خیر خواہی کے نقطۂ نظر سے بغیر نیت پر حملہ کیے ہوئے تعبیر کیا جائے تو وہ ایک بڑی سیاسی غلطی ہی ہو سکتی ہے ۔ جس کے نتائج بہت خراب صورت میں نمودار ہوئے۔

شام پر امیر معاویہ کا تسلّط بھی جس نے "ملوکیت" کی شکل اختیار کی اسی دور میں انجام پایا ۔ اور یہ واقعہ ہے کہ "نوجوان" "پُرحوصلہ" معاویہ نے حضرت عمر کے سیاسی جبروت کو تھوڑی ہی مدت میں "مرعوبیت" کی حد تک مغلوب کر لیا تھا جس کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب آپ شام تشریف لے گئے اور معاویہ کی شان و شوکت کو دیکھ کر آپ نے ٹوکنے کی ضرورت محسوس کی اور ادھر سے دو فقروں میں آپ کو اس طرح قائل کر دیا گیا جس کا اقرار آپ کو خود کرنا پڑا۔

غرض یہ ہے کہ سیاسی تدبر کی حیثیت سے اگر کچھ درجہ قرار دیا بھی جاسکتا ہے، تو حضرت عمرؓ کا۔ لیکن وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں ہے۔ اور وہ غلطیاں اتنی اہم اور غیر معمولی تھیں جن کے نتائج انتہائی خراب صورتوں میں نمودار ہوئے۔

تیسری شرط شجاعت و قوت اور ثباتِ قدم و استقلال

یہ انتہائی مایوسی کی جگہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے دل کو رسول اللہؐ کی موجودگی میں اور حضرتؐ کے ساتھ جو قوت و طاقت حاصل ہو سکتی ہے وہ رسول اللہؐ کے بعد کبھی حاصل نہیں ہو سکتی خصوصاً جب کہ وہ رسولؐ خود ثبات و استقلال میں ایک ایسا نمونہ تھا جس کی مثال غیر ممکن ہے۔

پھر اگر رسول اللہؐ کے ساتھ کی لڑائیوں میں کمزوری کا مظاہرہ ہو اور ثبات و استقلال رخصت نظر آئے تو اس کے بعد کیا امید باقی رہ سکتی ہے۔ ”ہرنام صاحب“ نے اپنے ابتدائی مضمون میں جو تمام اس بحث کا سنگِ بنیاد ہے اس قسم کے واقعات پوری امانت و دیانت کے ساتھ نقل کر دیے ہیں جو ناقابلِ انکار حیثیت رکھتے ہیں۔ جناب جلیل الرحمٰن صاحب اعظمی بھی اپنے مضمون مندرجہ نگار میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> ”حضرت علیؓ نوجوان تھے۔ بہادر اور شیر دل تھے، اس لیے میدانِ کارزار ہمیشہ ان کے ہاتھ رہا۔ حضرت ابوبکر بوڑھے اور کمزور تھے، اس لیے انھیں معرکہ ہائے جنگ میں کوئی طرۂ امتیاز حاصل نہ تھا۔“

حالانکہ حضرت ابوبکر کے بڑھاپے کا جن رقت انگیز الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے، وہ چنداں صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ آپ رسول اللہؐ کے بالکل ہمسن تھے۔ اس لیے اگر اپنے زمانۂ خلافت میں ضعیف العمر رہے بھی ہوں تو اسلام کی لڑائیوں میں اس حد تک بوڑھے نہ تھے۔

اسلامی مجاہدین میں بہت سے افراد ان سے زیادہ کبیرالسن تھے۔ علی بن ابی طالب نے آخر عمر میں اپنی جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں دکھلا دیا کہ شجاعت و قوت یا ثباتِ قدم و استقلال کا تعلق کسی خاص عمر کے ساتھ نہیں ہے۔ جس کے قدموں کو بھاگنے کی عادت نہ ہو وہ بڑھاپے میں بھی اسی طرح ثابت قدم رہ سکتا ہے جسطرح جوانی میں

پھر اگر حضرت ابوبکر بوڑھے اور کمزور تھے تو حضرت عمر اور عثمان تو اس طرح نہ تھے حالانکہ میدانِ جنگ کے ناگوار واقعات میں یہ بزرگوار ان حضرت ابوبکر سے تقدم رکھتے ہیں۔

اپنی خلافت کے زمانہ میں ان حضرات نے کبھی اس طرح کا موقع آنے ہی نہ دیا کیونکہ ہمیشہ دوسرے سپہ سالاروں کو لڑنے کے لیے بھیجا اور خود مرکزِ خلافت سے قدم نہیں ہٹایا۔ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت عمر نے خود یا لوگوں کے کہنے سے خیال ظاہر کیا جنگ میں تشریف لے جانے کا۔ مگر اس موقع پر کچھ سوچ کر علیؑ بن ابی طالب سے مشورہ کیا جن کی اصابت رائے اور سیاسی تدبر کو آج معرض بحث میں لایا جا رہا ہے اور "خود اعتمادی کی سپرٹ رکھنے والے" "اپنی رائے پر قائم رہنے والے" خلیفۂ وقت نے علیؑ بن ابیطالب کے منع کرنے سے ہی جنگ میں جانے کا خیال ترک کر دیا۔

یہ دونوں مشورے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر کو خود اپنی شجاعت پر اور دوسرے حقیقت سے واقف افراد کو بھی کتنا اعتماد حاصل تھا۔

پہلا مشورہ غزوۂ روم کے متعلق ہے۔ جب حضرت عمر نے خود جانے کا حضرت علیؑ سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا:۔

قد توکل اللہ لاھل ھذا الدین باعزاز الحوزۃ وستر
العورۃ والذی نصرھم وھم قلیل لا ینتصرون ومنعھم
وھم قلیل لا یمتنعون حیّ لا یموت انک متی تسر الی
ھذا العدو بنفسک فتلقھم فتنکب لا تکن للمسلمین

کانفۃ دون اقصٰی بلادھم فلیس بعدلک مرجع یرجعون الیہ فابعث الیھم رجلاً مجرباً ولحفز معہ اھل البلآء و النصیحۃ فان اظھر اللہ فذلک ما تحب وان تکن الاخریٰ کنت ردءً للنّاس ومثابۃ للمسلمین۔

(ترجمہ) "خداوند عالم نے اس دین کے متعلق یہ ذمہ داری لی ہے کہ اس کے مرکز کی تقویت ہو اور کمزوریوں کی پردہ پوشی ہو اور اس نے ان کی حفاظت کی جب وہ کم تھے، خود اپنی حفاظت پر قادر نہ تھے، وہ اب بھی موجود ہے، زندہ ہے اور مرنے والا نہیں۔ اگر آپ خود دشمنوں کے مقابلہ کو گئے اور جنگ ہوئی اور آپ نے شکست کھائی تو مسلمانوں کے لیے کوئی جائے پناہ ان دشمنوں کی سرحد کے قریب نہ ہوگی۔ اور آپ کے شکست کھانے کے بعد کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جس کی طرف وہ رجوع کریں۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ آپ ایک تجربہ کار شخص کو روانہ کیجیے اور اس کے ساتھ ان اشخاص کو بھیجیے جو سختیاں جنگ کی اٹھانے کی طاقت اور اخلاص و خیر خواہی رکھتے ہوں۔ اس صورت میں اگر خداوند عالم نے غلبہ عطا کیا تو یہی آپ کا مقصد ہے اور اگر معاملہ نے رخ دگر ہوا تو آپ تو یہاں موجود ہیں۔ آپ کے پاس مسلمان واپس آئیں گے اور پناہ لیں گے۔"

(جناب سید العلماء دام ظلہ نے اس مشورہ پر بہت مبسوط بحث کی ہے جو امامیہ مشن لکھنؤ کے شائع کردہ رسالہ "ابو الائمہ کی تعلیمات" میں موجود ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مشورے دے کر حضرت علیؑ بن ابی طالب نے اسلام کی عزت رکھ لی، ورنہ آج تاریخ اسلام کسی اور صورت پر مرتب ہوتی۔

چوتھی شرط۔ عدالت اور اموال مسلمین کی حفاظت

اس سلسلہ میں کچھ کہنا جمہور مسلمین کے نقطۂ نظر سے بالکل بے محل ہے۔ اس لیے کہ وہاں تمام رسول اللہؐ کی صورت دیکھنے والے مسلمانوں کے لیے (الصحابۃ کلھم عدول) کا کلیہ قرار دے لیا گیا ہے۔ اس لیے "تردامنی" آنکھوں کے سامنے نظر آئے تب بھی عدالت کا حصار "حرف گیری" سے مانع ہے۔

یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے کبھی راہ چلتے دم زدن کے لیے بھی بحالت اسلام رسول اللہؐ کی زیارت کر لی ہے۔ پھر چہ جائیکہ وہ "صحابہ کبار" جن کو اکثر رسول اللہؐ کی صحبت کا شرف حاصل رہا ہو، ان میں تو اس کے خلاف شبہ کرنا بھی کفر کے درجہ سے قریب ہے۔

مگر اس کو کیا جائے کہ "آزاد بحث" اس طرح کے یک طرفہ مسلمات کی پابند نہیں ہو سکتی۔

اگر عدالت کو عام معنی میں لیا جائے جسے کہتے ہیں "کبائر سے اجتناب اور صغائر پر عدم اصرار" تو قرآن و حدیث اور تاریخ "فرار عن الزحف" ہی کا وہ مرقع پیش کر دے گی جس کے سامنے دعوائے عدالت سر بگریبان ہو جائے اور رسول اللہؐ کی زندگی کے بالکل آخری حصہ میں جیش اسامہ سے تخلف کا قصہ سامنے آئے گا جس کی معافی کی سند بھی ڈھونڈے سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔

لیکن جبکہ عدالت کو محدود معنی میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور اموال مسلمین کی منصفانہ رعایت کے ساتھ حفاظت کے اعتبار سے دیکھا جائے جو اس شرط کے اعتبار کا منشاء قرار دیا گیا ہے، تو

"فدک" کا معاملہ سامنے آجاتا ہے جس میں شیعہ تو شیعہ بہت سے تحقیق شیوہ

علمائے اہلِ سنت بھی "انگشت بدنداں" نظر آتے ہیں اور بہرحال وہ مسئلہ اب تک "عقدۂ لاینحل" بنا ہوا ہے۔

پھر حضرت عثمان کے زمانہ میں تو تقسیم اموال کی جو صورت ہوئی وہ ایسی ہے کہ تمام صحابہ فریادی نظر آنے لگے۔ اور انجام کار یہ بھی ایک سبب ہوا اس ہنگامہ کا جو آپ کی "شہادت" پر ختم ہوا۔ یہ واقعات "تاریخ اسلام" میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں ان کا تذکرہ اس موقع پر طول کے اندیشہ سے ترک کیا جاتا ہے۔

پانچویں شرط عزم کی مضبوطی اور ارادہ کی پختگی

یہ شرط جناب "م۔ ح" صاحب کی قرار دی ہوئی ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں "خود اعتمادی" اور "مستقل مزاجی" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں اپنی صحیح رائے پر پورا بھروسہ ہونا اور مخالف رائے سے متاثر نہ ہونا۔ یہ بحث بعد کو آئے گی کہ یہ شرط کہاں تک "قابلِ قبول" ہے۔ ابھی یہ دیکھنا ہے کہ یہ شرط حضرات خلفائے ثلٰثہ پر کہاں تک منطبق ہوتی ہے۔

خطا معاف۔ حضرت ابوبکر کی "خود اعتمادی" کی صفت یا اپنی صحیح رائے پر بھروسا ہونے کا خیال اس خطبہ سے ظاہر ہو جاتا ہے جو آپ نے سب سے پہلے تختِ خلافت پر قدم رکھتے ہی ارشاد فرمایا تھا:۔

ملاحظہ ہو صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص۷

تکلم ابو بکر فحمد الله واثنی علیه ثم قال اما بعد ایها الناس فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقوّمونی۔

(ترجمہ) "حضرت ابوبکر نے تقریر کی۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ ایہا الناس

میں تمھارا حاکم ہوا ہوں۔ مگر میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں ٹھیک طریقہ اختیار کروں تو میری امداد کرنا اور اگر میں غلطی کروں تو میری اصلاح کر دینا۔"

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:-

اما بعد فانی قد ولیت ہٰذا الامر وانا لہ کارہ و واللہ لوددت ان بعضکم کفانیہ الا وانکم ان کلفتمونی ان اعمل فیکم بمثل عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم اقم کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداً اکرم اللہ بالوحی وعصمہ بہ الا وانما انا بشر ولست بخیر من احدکم فراعونی فاذا رأیتمونی استقمت فاتبعونی واذا رأیتمونی زغت فقومونی.

(ترجمہ) "میں اس منصب پر مقرر ہوا ہوں درصورتیکہ میں اسے ناپسند کرتا تھا اور خدا کی قسم مجھے آرزو تھی کہ کوئی تم میں سے اس بار کو مجھ سے لیتا۔ اب اگر تم مجھ سے یہ چاہو کہ میں تم میں ویسا طرز عمل اختیار کروں جو رسول اللہؐ کا تھا تو میں اسے پورا نہیں کر سکوں گا۔ رسول اللہؐ ایک مخصوص بندے تھے جن کو خدا نے وحی کے ساتھ معزز کیا تھا۔ اور اس طرح غلطی سے انھیں محفوظ رکھا تھا۔ مگر میں ایک معمولی انسان ہوں اور تم میں سے کسی ایک سے بہتر نہیں ہوں۔ لہٰذا تم میری نگرانی کرتے رہو۔ اگر دیکھو کہ میں سیدھی راہ پر ہوں تو میری پیروی کرو۔ اور اگر دیکھو کہ میں کج ہو رہا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جن سے ضمیر کا غیر مطمئن اور دل کا ڈانواں ڈول ہونا صاف ظاہر ہے۔ ذرا موازنہ کیجیے ان سے امیر المومنین حضرت علیؑ کے قول کا جو آپ اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں[1]

---

[1] نہج البلاغہ جلد ۱ مطبوعہ مصر ص۴۲

اقمت لکم علیٰ سنن الحق فی جواد المضلۃ حیث تلتقون ولا دلیل وتحتفرون ولا تیہون۔ عزب رأی امری تخلف عنی ما شککت فی الحق مذ اریتہ۔

"کھڑا ہوں میں تمہارے واسطے حق کے راستے پر گمراہی کے چوراہے کے اندر جس جگہ تم سب بھم ہوتے ہو اور کوئی رہنما نہیں ملتا اور کوشش کرتے ہو اور کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ غلط ہے رائے اس کی جو مجھ سے مخالفت کرے، شک نہیں ہوا مجھے حق میں کبھی جب سے میرے سامنے وہ پیش کیا گیا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان ہے جس کا ضمیر مطمئن ہے، جسے اپنی حقیت پر اعتماد ہے اور اپنی راست روی پر پورا بھروسہ۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں[1]

وان معی البصیرتی ما لبست علی نفسی ولا لبس علیّ۔ "میرے ساتھ ہے میری حق بینی، نہ کبھی میں نے اپنے تئیں مغالطہ میں مبتلا کیا اور نہ کبھی مجھے شبہ واقع ہوا۔"

بھلا وہ شخص دوسروں کی اصلاح کیا کرسکتا ہے جو خود طالب اصلاح ہو۔

(ام من یہدی الی الحق احق ان یتبع ام من لا یہدی الا ان یہدیٰ)

ایک رہنمائے حقیقی کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے لیے اپنی ذات کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے[2]

رکزت فیکم رأیۃ الایمان ووقفتکم علیٰ حدود الحلال والحرام والبستکم العافیۃ من عدلی وفرشتکم المعروف من قولی وفعلی واریتکم کرائم الاخلاق من نفسی۔

"میں نے تم میں ایمان کا جھنڈا گاڑ دیا۔ اور تم کو حلال وحرام کی حدود

---

[1] نہج البلاغہ ص۸۲ [2] نہج البلاغہ ص۱۲۸

سے باخبر کیا اور تمھیں اپنی عدالت سے امن و امان کا لباس پہنا دیا اور اپنے قول و فعل سے حسنِ سلوک کا اوڑھنا بچھونا تمہارے لیے کر دیا۔ اور تمہارے سامنے اپنی ذات کی جانب سے بزرگ ترین اخلاق کا نمونہ پیش کیا۔"

وہ یہ کہہ کر جان نہیں چھڑاتا کہ مجھ پر وحی نہیں اترتی' اس لیے مجھ سے سنتِ رسولؐ پر چلنے کا مطالبہ نہ کرو بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہوتا ہے[1]

واللّٰہ ما اسمعھم الرسول شیئاً الا وھا انا ذا الیوم مسمعکموہ
وما اسماعکم الیوم بدون اسماعھم بالامس ولا شقت
لھم الابصار ولا جعلت لھم الافئدۃ فی ذلک الاوان
الا وقد اعطیتم مثلھا فی ھذا الزمان۔

"خدا کی قسم رسول اللہؐ نے اپنے زمانہ والوں کو جتنے تعلیمات پہنچائے تھے وہ آج میں تم تک پہنچا رہا ہوں۔ اور تمھیں کوئی ایسی نئی بات نہیں سنائی جاتی جو انھیں سنائی نہ گئی ہو۔ اور نہ ان کے لیے آنکھیں کھولی گئیں اور دلوں میں احساس پیدا کیا گیا مگر یہ کہ آج تمہارے لیے وہی بات حاصل ہے۔"

وہ دوسروں سے چاہتا بھی ہے تو یہ نہیں کہ وہ اسکی خود اصلاح کریں۔ بلکہ یہ کہ وہ اپنے نفوس کی اصلاح میں اس کے لیے آسانیاں بہم پہنچائیں[2]

ایھا الناس اعینونی علیٰ انفسکم وایم اللّٰہ لانصفن المظلوم
من ظالمہ ولاقودن الظالم بخزامتہ حتی اوردہ
منھل الحق وان کان کارھا۔

"میری امداد کرو خود اپنے نفسوں کے خلاف اور خدا کی قسم میں مظلوم کی ظالم سے داد ضرور دلاؤں گا۔ اور ظالم کو اس کی مہار پکڑ کر کھینچوں گا یہاں تک

---

[1] نہج البلاغہ ص۱۷۱ [2] نہج البلاغہ جلد ۱ ص۲۷۴

کہ اسے حق کے چشمہ پر پہنچا دوں۔ اگرچہ وہ اسے ناپسند کرتا ہو۔"

نظم و نسق اور ملکی انتظامات میں حضرت ابوبکر کے پختگی عزم، قوتِ فکر اور مستقل مزاجی اپنی صحیح رائے پر اعتماد اور مخالف طاقتوں سے مرعوب نہ ہونے کا اندازہ اس روایت سے کیجیے، جسے شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ جلد۳ ص۵۵ میں لکھا ہے اور ابن الحدید نے شرح نہج البلاغہ جلد۱۲ ص۱۰۸ میں بھی اس کو درج کیا ہے۔ کہ ا۔

> "عینیہ بن حصین اور اقرع بن عابس حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے پاس ایک شورہ زار زمین ہے جس میں نہ آب و گیاہ ہے اور نہ کوئی فائدہ ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں، تو وہ زمین ہمیں بطور جاگیر دے دیجیے۔ شاید خدا اس کے ذریعہ سے ہم کو فائدہ پہنچائے۔ حضرت ابوبکر نے ان لوگوں سے جو آپ کے گرد و پیش بیٹھے تھے پوچھا، کہ کیوں تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ نے اُن کے لیے نوشتہ تحریر فرما دیا۔ وہ اس کو لیے ہوئے حضرت عمر کے پاس گئے کہ وہ اس میں اپنی گواہی تحریر فرمادیں۔ آپ نے اس کو لے کر اس میں تھوک دیا اور مٹا دیا۔ وہ بڑے برافروختہ ہوئے اور بدزبانی کرنے لگے۔ پھر ابوبکر کے پاس جز بز ہوتے ہوئے گئے اور کہنے لگے خدا کی قسم کچھ سمجھ میں نہیں آتا خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ حضرت ابوبکر نے فرمایا، نہیں بھئی خلیفہ ان ہی کو سمجھو۔ اتنی دیر میں عمر آگئے اور بڑے غصہ میں حضرت ابوبکر کے سامنے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے مجھے بتاؤ یہ زمین جو تم نے ان دونوں کو دے دی یہ تمہاری ملکیت تھی یا مسلمانوں کی تھی؟ انھوں نے کہا۔ مسلمانوں کی تھی۔ آپ نے کہا پھر تمھیں کیا ہو گیا تھا جو تم نے اسے ان دونوں سے مخصوص کر دیا۔ آپ نے فرمایا میں نے اپنے

گرد و پیش کے لوگوں سے رائے لے لی تھی حضرت عمر نے کہا۔ کیا تمام مسلمانوں سے آپ نے مشورہ لیا تھا اور رضامندی حاصل کی تھی؟ حضرت ابوبکر نے (بڑی بے بسی سے کہا) فقد کنت قلت لک انک اقوی علی هٰذا الامر منی لکنک غلبتنی۔ "میں نے تو کہا تھا کہ تم میں امر خلافت کے انجام دینے کی مجھ سے زیادہ طاقت ہے۔ لیکن تم ہی نے مجھے مجبور کیا۔"

فقہ حنفی کی مشہور کتاب قدوری کی شرح "جوہرۂ نیرہ" میں جو مصر میں شائع ہوئی ہے جلد ا صـ ۱٦۴ میں اسی طرح کا یہ واقعہ مذکور ہے۔ کہ:۔

"مؤلفۃ القلوب جنھیں رسول اللہؐ کی زندگی میں عطایا دیے جاتے تھے وہ بعد رسول اللہؐ کے ابوبکر کے پاس آئے تاکہ آپ ان کے لیے حسب معمول عطیہ کا فرمان صادر کریں۔ آپ نے لکھ دیا۔ وہ اس نوشتہ کو لیے ہوئے حضرت عمر کے پاس گئے کہ آپ کی تحریر بھی حاصل کریں۔ آپ نے اس کاغذ کو پھاڑ ڈالا اور فرمایا۔ کہ اب ہم کو تمہاری ضرورت نہیں ہے خدا نے اسلام کو غلبہ عطا کر دیا ہے۔ اور تم سے مستغنی کر دیا۔ اب اگر تم مطیع فرمان رہے تو خیر نہیں تو تلوار سے تمھیں ٹھیک کیا جائے گا۔ وہ لوگ حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا۔ خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ فرمایا نہیں خلیفہ وہی ہیں انشاء اللہ، اور آپ نے حضرت عمر کی رائے کو برقرار رکھا۔"

اس کے بعد سے اہل سنت کے مذہب میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ ساقط ہو گیا۔ یہاں تک کہ اگر انھیں خمس سے حصہ دیا جائے تو برأت ذمہ حاصل نہیں ہوگی۔

یہ ہے حضرت ابوبکر کی بلند حوصلگی کی صفت جس کے لحاظ سے "م۔ح" صاحب آپ کی مدح میں اس طرح رطب اللسان ہیں کہ "وہ ابوبکر تھے۔ ایک

کوہِ عزم و ثبات، ایک آسمانِ عظمت و جلال، انھیں اپنی اصابت رائے پر کامل اعتماد و اطمینان تھا حضرت عمر جیسا دبنگ انسان ان کو اپنی رائے سے باز رکھنے گیا لیکن ایسی ڈانٹ بتائی کہ اُن کو خاموش ہی رہنا پڑا۔"

یقیناً اس مدح کا ایک ایک حرف گذشتہ واقعہ سے بالکل ثابت ہے۔ "یہ شانِ خلافت تھی۔"[۹]

حضرت عمر کے بقول "م - ح" صاحب "دبنگ" ہونے میں بیشک کوئی شبہ نہیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکر کے زمانے میں بھی خلافت درحقیقت آپ ہی کر رہے تھے جیسا کہ مذکورہ بالا واقعہ سے آپ نے دیکھ لیا۔ لیکن دو موقعوں پر آپ کے عزم و استقلال، ثباتِ رائے اور خود اعتمادی کو شکست اٹھانا پڑتی تھی۔ ایک وہ جب کوئی مسئلہ ایسا پیش ہو جائے جس کا فیصلہ حکمِ شرع کے مطابق ہونا چاہیے تو آپ کے قلبی "تزلزل" کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ایک کسی بڑے آدمی کا کیا ذکر، ہر معمولی صحابی بلکہ ادنیٰ عورت کے کہنے سے بھی فوراً فیصلہ پلٹ دیتے تھے۔ اس کی مثالیں سابق میں پیش ہو چکی ہیں اور دوسرے وہ جب جان جوکھم کا مرحلہ سامنے آجائے، جیسے فارس اور روم کی جنگ میں بذاتِ خود جانے کا ارادہ اور حضرت علیؑ کا اس کے خوفناک پہلو کو دکھلانا اور بس آپ کا اس ارادہ کو ترک کر دینا۔ اس کی تفصیل بھی پہلے درج ہو چکی ہے۔

خالد بن الولید سے مالک بن نویرہ کے قتل کا قصاص لینے پر آپ کا حضرت ابوبکر کے زمانہ میں اصرار اور کسی اندیشہ سے حضرت ابوبکر کا اس پر عمل نہ کرنا، اس کا تقاضا تھا کہ جب حضرت عمر خلیفہ ہوں تو خالد بن الولید سے قصاص لے لیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیوں؟ صرف خالد کی ہیبت جو حضرت ابوبکر کو اس معاملہ میں حضرت عمر کے اصرار کے باوجود مانع رہی۔ اسی وجہ سے خود آپ اس فرض کے انجام دینے سے قاصر رہے۔

جب ان دونوں مہتم بالشان خلافتوں کا یہ عالم تھا تو اب میں حضرت عثمان کی خلافت کا جائزہ کیا لوں۔ بہرحال اس داستان کو بھی دیکھ لیجیے، میرے قلم نے نہیں بلکہ خواجہ حسن نظامی کے دلچسپ اندازِ تحریر میں۔ اس لیے نہیں کہ میں ان کی روایت کو تمام اہل سنت کے سامنے بطورِ سند پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ یہ واقعات تو تمام مسلّمہ تاریخوں میں موجود ہیں۔ لیکن صرف اس لیے کہ ان ہی واقعات کو انھوں نے اپنے انداز میں درج کیا ہے۔

وہ اپنی کتاب "محرم نامہ" میں جو بارِ دہم ۱۳۴۸ھ میں دہلی میں شائع ہوئی ہے اور ممکن ہے اس کے بعد بھی چھپی ہو، لیکن میرے سامنے یہی ایڈیشن ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:-

> "تاریخوں اور معتبر کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت عثمانؓ بہت نرم دل آدمی تھے۔ حدیث میں آیا ہے۔ "اھل الجنۃ بلہ" جنّتی بھولے ہوتے ہیں۔ ان میں بھی بھولپن بہت تھا۔
>
> حضرت عمر نے تاکید کردی تھی کہ خلافت حاصل ہونے کے بعد اپنے خاندان اور قبیلہ کی رعایت نہ کرنا۔ مگر حضرت عثمان اس پر عمل نہ کرسکے" الخ۔ اس کی پوری تفصیل محرم نامہ میں ملاحظہ کیجیے۔

اطمینان کے لیے صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مطبوعہ مصر ص۱۲ میں بھی یہی واقعات پڑھ لو۔ کیا اسی کا نام ہے عزم و استقلال، قوتِ نفس اور اطمینان۔ جس کا گذشتہ واقعات میں مظاہرہ ہے۔ اگر پھر ضرورت ہوئی تو اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ اس وقت اتنے ہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

چھٹی شرط — اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو

یہ برزمی صاحب نے اپنے سابق مضمون میں شرط لکھی ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں

کہ یہ انھوں نے بالکل بلا قصد و ارادہ لکھی ہے اور ہرگز اس کا مفہوم ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ کیونکہ اگر دنیا کے مختلف افراد کے اخلاقی حدود کے اعتبار سے دیکھا جائے اور اخلاق کے معنی پر نظر کر لی جائے تو معلوم ہوگا کہ اخلاقی فضیلت میں دنیا کا "مکمل ترین انسان" سوائے "معصوم" کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن عصمت کی شرط کی نفی بزمی صاحب اور ان کے تمام ہم خیال کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ پھر یہ شرط قلم سے کیونکر نکلی؟ صرف "عقل عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" کی فطری تحریک سے۔ خیر جانے دیجیے۔ "اخلاق" کا یہ مفہوم بلکہ اس کو لے لیجیے اس عام معنی میں جو "حسن معاشرت" کی مرادف صورت سے ہماری زبان میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ اخلاقی فضیلت میں خلفائے ثلاثہ دنیا کے "مکمل ترین" نہ سہی بجائے خود "مکمل" انسان تھے؟ افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے

حضرت ابوبکر کو خود اس کا احساس تھا۔ چنانچہ جو سب سے پہلا تاریخی خطبہ آپ نے ارشاد فرمایا جس کے بعض اقتباسات اس کے پہلے آ چکے ہیں اس میں آپ نے فرمایا۔ "واعلموا ان لی شیطانا یعتریني فاذا رأیتموني غضبت فاجتنبوني" تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھ پر شیطان کا غلبہ ہوا کرتا ہے۔ اس لیے جب تم دیکھو کہ مجھے غصہ آیا ہے تو مجھ سے بچا کرو[1]

یہ حقیقت ہے کہ قدیم عادتیں مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ جاہلیت کے لوگوں کی زبان پر گالیاں اکثر آتی تھیں۔ اسلام نے اس عادت کی بہت اصلاح کی مگر وہ پھر بھی باقی رہی۔ مؤرخ ابن عساکر دمشقی نے لکھا ہے "استب عقیل بن ابی طالب و ابوبکر قال وکان ابوبکر سبابا" (ونسابا) عقیل بن ابی طالب اور ابوبکر میں گالم گلوچ ہوئی اور ابوبکر بڑے گالیاں جلنتے والے تھے یانسب سے بخوبی واقف تھے[2]

---

[1] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص۶ [2] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص۲۲

سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ "نساباً" کا لفظ بھی ہو جب بھی اس کا مطلب یہی ہے کہ گالیوں کے لیے ماں بہن کے بکھان خوب کرتے تھے۔

اور حضرت عمر، ان کی تو سخت مزاجی اور درشت خوئی شہرۂ آفاق ہے۔ جس کا مظاہرہ رسول اللہ ؐ تک کے ساتھ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب رسول اللہ ؐ عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھانے کھڑے ہوئے تو تاریخ میں ہے کہ جذبہ عمر قال الیس قد نہی اللہ ان تصلی علی المنافقین۔ حضرت عمر نے پکڑ کر کھینچا اور کہا، کیا خدا نے آپ کو ممانعت نہیں کی ہے منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے[1]

آپ کی اس درشت خوئی کا اتنا شہرہ تھا کہ ہر شخص واقف تھا اور آپ سے ڈرتا تھا۔ چنانچہ جب آپ نے ام کلثوم دختر ابوبکر کے ساتھ شادی کی درخواست حضرت عائشہ سے کی اور ام المومنین نے مصلحتاً آپ سے اس کا وعدہ کیا اور آپ اٹھ کر تشریف لے گئے تو لڑکی نے اپنی بڑی بہن سے کہا۔ تزوجینی وقد عرفت غیرتہ وخشونۃ عیشہ۔ واللہ لئن فعلت لاخرجن الی قبر رسول اللہ ولاصیحن بہ۔

آپ میری شادی ان کے ساتھ کر دیں گی حالانکہ آپ کو ان کا غصہ اور طرز معاشرت کی درشتی معلوم ہے۔ بخدا اگر آپ نے ایسا کیا تو میں رسول اللہ ؐ کی قبر پر جا کر فریاد کرونگی[2]

سقیفہ میں جو آپ کی جانب سے اخلاقی نمونہ پیش ہوا وہ اس کے پہلے آچکا ہے دوسرے موقعوں پر جو بات بات پر آپ کا کوڑا اٹھ جاتا تھا اس کی بعض مثالیں پہلے آچکی ہیں۔ کوئی آپ کی تعظیم کے لیے نہ کھڑا ہوا کوڑا مار دیا۔[3]

کسی نے قرآن کے کسی متشابہ آیت کے معنی دریافت کیے آپ نے کوڑے لگائے اتنے کہ وہ زخمی ہو گیا اور اس کے سر سے خون جاری ہو گیا۔[4]

---

[1] استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ۱ ص ۳۷۸ [2] استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ۲ ص ۴۷۶

[3] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص ۵۳ [4] اتقان سیوطی مطبوعہ دہلی ص ۲۸۶

کسی نے قرآن کی کسی آیت کے بارے میں کچھ معلومات کا اظہار کرنا چاہا، آپ نے کوڑا لگا دیا۔[1]

اس کا ایک نمونہ اور ملاحظہ کر لیجیے۔ قبیصہ بن جابر اسدی کی روایت ہے کہ میں احرام باندھے ہوئے تھا۔ میں نے ایک ہرن دیکھا، اس کے تیر لگا دیا، وہ مر گیا۔ اس سے مجھے شک پیدا ہوا۔ میں حضرت عمر کے پاس آیا۔ آپ کے پہلو میں عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔ میں نے حضرت عمر سے مسئلہ دریافت کیا۔ آپ نے عبدالرحمٰن کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "کیوں تمھارے نزدیک ایک بکری کی قربانی کافی ہوگی" انھوں نے کہا۔ "ہاں کافی ہے۔" تب حضرت عمر نے مجھے حکم دیا کہ ایک بکری ذبح کر دوں۔ جب ہم لوگ وہاں سے اٹھے تو میرے ایک ساتھی نے مجھ سے کہا کہ امیرالمومنین لم یحسن ان یفتیک حتی سئل الرجل۔ "خلیفہ صاحب خود فتویٰ نہیں دے سکے جب تک اس شخص سے پوچھ نہیں لیا۔" حضرت عمر نے کلام اس کا کچھ سن لیا۔ فوراً کوڑا لے کر بڑھے اور اسے کوڑا مار دیا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے کہ مجھے ماریں۔ میں نے کہا حضور میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کہا اس نے تھا۔ تب آپ نے مجھ کو چھوڑ دیا۔[2]

اس آپ کی مزاجی خصلت کا علمائے اہل سنت کو اقرار ہے۔ چنانچہ اسمٰعیل بن حماد بن ابوحنیفہ کی روایت ہے کہ ہمارے یہاں ایک آٹا پیسنے والا رافضی تھا۔ جس کے پاس دو خچر تھے۔ ایک کا نام اس نے رکھا تھا ابوبکر اور دوسرے کا عمر۔ ایک نے ان میں سے اس کو لات ماری جس سے وہ مر گیا۔ میرے دادا امام ابوحنیفہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا دیکھو جس نے لات ماری ہے وہ وہی ہوگا جس کا نام "عمر" ہے۔ لوگوں نے دیکھا تو واقعہ یہی تھا۔[3]

رہ گئے جناب عثمان، ان کے بہت سے واقعات آپ کے سامنے آ چکے ہیں۔

---

[1] اتقان مطبوعہ دہلی ص ۲۴۴۔ [2] حیواۃ الحیوان ج ۲ ص ۶۔ [3] حیواۃ الحیوان ج ۱ ص ۲۴۲!

جن میں آپ کو اخلاقی جوہر بھی دکھلائی دیں گے۔

حضرت ابوذر غفاری جن کے متعلق رسول اللہ کا ارشاد تھا۔ ما اظلّت الخضرآء ولا آقلت الغبرآء علی اصدق من ابی ذر۔ "نہ آسمان نے سایہ ڈالا اور نہ زمین نے اٹھایا کسی ایسے شخص کو جو ابوذر سے زیادہ سچا ہو"

حضرت عمار یاسر کے لیے رسول اللہ کا ارشاد تھا۔ عمار جلدۃ ما بین عینی "عمار میری آنکھوں کے درمیان کی کھال ہے"

حضرت عبداللہ بن مسعود جن کے لیے رسول اللہ کا ارشاد تھا۔ من اراد ان یقرأ القرآن غضاً فلیقرأہ علی قراءۃ ابن ام عبد۔ "جو شخص قرآن کو تر و تازہ پڑھنا چاہتا ہو وہ ابن مسعود کی قرأت پر پڑھے" ان تمام محترم صحابیوں کے ساتھ ضرب شدید کا ارتکاب کس نے کیا؟ مسلمانوں کے نمائندوں کو محل کے دروازے پر سے دھکے دے کر کس نے نکلوا دیا؟ حضرت علیؑ کے درمیان میں پڑنے پر مروان کی علیحدگی کے وعدے کرکے پھر ان وعدوں کی مخالفت کس نے کی؟

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں۔

کیا ایسے ہی اشخاص کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ "وہ اخلاقی فضیلت میں دنیا کے مکمل ترین انسان تھے" معلوم ہوا کہ شرائط خلافت میں سے کوئی ایک شرط بھی ایسی نہ تھی جو ان حضرات میں موجود سمجھی جا سکے۔ پھر آخر ان کی حکومت کو خلافت رسول کس طرح سمجھا جائے۔ اور ان کی امامت کو کیونکر صحیح و حق بجانب قرار دیا جائے۔

بیشک اگر صرف بادشاہت کا سوال ہے تو اس میں کیا شبہ کہ یہ لوگ حکمران تھے۔ پھر یہ جھگڑے کی کون سی بات ہے اور اس میں اختلاف کی کیا گنجائش ہے۔

حضرت علیؑ ابن ابیطالب پر شرائطِ خلافت کا انطباق

اب آئیے دیکھیں، گذشتہ شرائط کے لحاظ سے حضرت علیؑ بن ابی طالب کا کیا درجہ نظر آتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ پہلی، تیسری، چوتھی اور چھٹی شرط کے لحاظ سے آپ کی بلندی اتنی واضح ہے کہ کسی کو اس میں گنجائش کلام ملتی ہی نہیں۔

علیؑ کا علم، علیؑ کی شجاعت، علیؑ کی عدالت، اور علیؑ کی اخلاقی فضیلت اتنی روشن حقیقتیں ہیں کہ ان کے متعلق کچھ لکھنا بھی بیکار ہے۔

بہت کاہش و کاوش کے ساتھ اگر گنجائش بحث نکالی جاتی ہے تو وہ صرف دو باتوں میں۔ ایک سیاسی قابلیت اور دوسرے عزم و ارادہ کی پختگی۔ "م۔ ح" صاحب نے جانفشانی اور عرق ریزی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جناب امیرؑ میں یہ دونوں صفتیں مفقود تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ان کو دوسروں سے اختلاف رائے کی ہمت کم ہوتی تھی۔ وہ اپنے عزائم میں غیر معمولی طریقہ سے ثبات و استقلال نہیں رکھتے تھے۔ ان کو خود اپنی صحیح رائے پر پورا بھروسہ نہ ہوتا۔ وہ مخالف طاقتوں سے مرعوب ہو جاتے۔ ان میں وہ قاہرانہ سطوت اور آمرانہ دبدبہ نہیں تھا جس کی وجہ سے لوگ ان کی باتیں مان لیتے یا ان کے احکام پر عمل پیرا ہوتے۔"

میں اس نکتہ رسی پر "م۔ح" صاحب کو قابل الزام نہیں سمجھتا۔ کیونکہ حضرت علیؑ بن ابی طالب کی حکومت کا دور جن متواتر مثالوں کے بعد آیا ان کے تناسب سے جب حضرت علیؑ کے طرز حکومت کو دیکھا جائے گا تو وہ بالکل مختلف ضرور نظر آئے گا۔ اور اسی لیے اس موقع پر آپ خلافت کے قبول کرنے سے انکار بھی فرما رہے تھے اور کہتے تھے۔ دعونی والتمسوا غیری۔ "مجھ کو معاف کرو، کسی اور سے کہو"

اور اسی لیے حضرت عثمان کی خلافت پر آپ نے صاف انکار کر دیا کہ سنتِ

شیخین کی پابندی میں نہیں کرسکتا۔ اس کی تفصیل بعد کو آئے گی۔

مجھے حضرت علیؑ کی خلافت کے سمجھانے کے لیے ضرورت پڑتی ہے کہ پچیس برس پہلے کی تاریخ الٹ کر حضرت رسول اللہؐ کی طرزِ حکومت کو دیکھوں سجھے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نقش ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور آپس میں اختلاف نہیں ہے۔

"م۔ ح" صاحب کے نقطۂ نظر کی عینک لگا کر جب میں دیکھتا ہوں تو مجھے وہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے اختلاف رائے کی بنا، پر وہ اپنی رائے پر قائم نہیں رہے جس کا نتیجہ ان کے حق میں خراب بھی نکلا۔

چنانچہ جنگ احد میں حضرت رسولؐ کی خود رائے یہ تھی کہ مدینہ ہی میں قیام فرمائیں۔ اور وہیں رہ کر دشمنوں سے جنگ کریں۔ مگر بہت سے مسلمانوں نے یہ کہا کہ نہیں، اس میں کفار سمجھیں گے کہ ہم ڈر گئے اور ہم نے بزدلی سے کام لیا۔ یہ سن کر حضرت بیت الشرف میں تشریف لے گئے اور آپ لباسِ حرب سے آراستہ ہوکر باہر تشریف لائے جب ان لوگوں نے دیکھا کہ حضرت آمادہ ہوگئے تو یہ لوگ پشیماں ہوئے اور آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ کتنا بُرا کیا تم لوگوں نے رسول اللہؐ کو ان کی رائے کے خلاف مشورہ دیا۔ حالانکہ ان پر وحی اترتی ہے۔ آخر رسول اللہؐ سے کہا کہ جو آپ کو مناسب معلوم ہو وہ کیجیے، اور معذرت کی۔

آپؐ نے فرمایا۔ نہیں، اب جب میں تیار ہوگیا تو جاؤں گا ضرور۔[1]

نتیجہ وہی ہوا جس کی آپ نے پہلے سے خبر دی تھی کہ سخت شکست اور تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ صرف رسول اللہؐ کا اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کی مخالفت کی بنا، پر بدلنا کیسا بلکہ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ احکامِ خدا میں تبدیلی ہوگئی، لوگوں کی عملی مخالفت کی وجہ سے جیسے ابتدائے اسلام کا یہ حکم کہ زمانۂ ماہِ صیام میں رات کے وقت بھی عورتوں کے

---

[1] حیواۃ الحیوان جلد ۲ صفحہ ۴۲ - ۴۳

ساتھ مخصوص تعلقات جائز نہیں ہیں۔ جناب عمر بن الخطاب اور مالک ابن ابی انس یا کعب بن مالک نے اس حکم کی مخالفت کی۔ آخر وہ حکم منسوخ ہوگیا اور رات کو یہ امر جائز ہوگیا[1]

یا رسول اللہ کے ساتھ نجوی کے لیے صدقہ پیش کرنے کا حکم اور اس کی مخالفت پر اس آیت کا اترنا۔ (ءاشفقتم ان تقدموا بین یدی نجوٰکم صدقات) "تم لوگ ڈر گئے اتنے سے کہ رسول کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے کچھ صدقہ پہلے دے دو[2]" آخر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت رسول کی رعایا آپ کا کہنا ہمیشہ نہیں مانتی تھی۔

(ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم) "اگر ہم ان کو حکم دیں کہ تم اپنے خاص اشخاص کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو بہت کم وہ لوگ ہوں گے جو ایسا کریں[3]"

ان میں سے بہت لوگ وہ تھے جو جہاد کے حکم پر دہشت زدہ ہو جاتے تھے اور حیلہ حوالہ کرنے لگتے تھے۔ "فلما کتب علیھم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ وقالوا ربنا لم کتبت علینا القتال"

"جب ان پر جہاد کا فرض عائد کیا گیا تو ایک جماعت ان میں سے لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگی جیسے خدا سے ڈرا جاتا ہے۔ یا اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے پروردگارا تو نے ہم پر جہاد کیوں واجب کیا[4]؟؟"

یہ لوگ رسول کے رعب و دبدبہ سے اتنے کم متاثر تھے کہ وہ رسول سے لڑتے اور جھگڑا کرتے تھے۔ کما اخرجک ربک من بیتک بالحق وان فریقا

---

[1] استیعاب ج ۱ مطبوعہ حیدرآباد ص ۳۳ مفحمات القرآن فی مبہمات القرآن حافظ السیوطی مطبوعہ مصر ص ۶ [2] سورہ مجادلہ پ ۲۸ [3] سورۂ نساء پ ۵ [4] نساء پ ۵

من المؤمنین لکارھون یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون ۔

"جیسے تم کو تمہارے رب نے سچائی کے ساتھ اپنے مکان سے نکلنے کا حکم دیا اس حالت میں کہ ایک جماعت مسلمانوں کی اس کو ناپسند کرتی تھی۔ یہ لوگ تم سے لڑتے تھے حق کے معاملہ میں جبکہ وہ ظاہر ہو چکا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ موت کی طرف لے جائے جا رہے ہیں درآنحالیکہ وہ دیکھ رہے ہیں"[1]

رسول اللہ جہاد کا حکم دے رہے ہیں اور لوگ سرگرانی سے کام لے رہے ہیں مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض ۔

"آخر یہ کیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں جنگ کے لیے نکلو تو تم گراں جانی کے ساتھ زمین گیر ہو جاتے ہو"[2]

ان لوگوں میں وہ لوگ بھی تھے جو رسول کو ایذا پہنچاتے تھے۔ منھم الذین یؤذون النبی ویقولون ھو اذن ۔

ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو رسول کو اذیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو بس "کان" ہیں (یعنی ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں) وہ رسول اللہ کا اور ان کی باتوں کا مذاق تک اڑاتے تھے۔ ولئن سألتھم لیقولن انما کنا نخوض ونلعب قل اباللہ وآیاتہ ورسولہ کنتم تستھزءون ۔

"اگر ان سے پوچھو تو یہ کہیں گے کہ ہم تو باتیں کر رہے تھے اور ہنس کھیل رہے تھے۔ کہو کہ کیا تم خدا اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول کا مذاق اڑا رہے تھے"[3]

اطاعت و فرماں برداری تو بعد کی چیز ہے اور وقعت دینا دوسرا مرحلہ ہے، یہ لوگ آپ کی باتوں کو غور سے سنتے تک نہ تھے۔ (ومنھم من یستمع الیک حتی

---

[1] انفعال پ ۹ [2] توبہ پارہ ۱۰۔ [3] توبہ پ ۱۰

اذا خرجوا من عندک قالوا للذین اوتوا العلم ماذا قال انفا)

"ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہاری باتوں کو ظاہر میں سننے آتے ہیں اور جب تمہارے پاس سے جاتے ہیں تو دوسرے لوگوں سے جو واقفیت رکھتے ہیں پوچھتے ہیں، ابھی انھوں نے کیا کہا تھا[1]"

یہ لوگ رسول اللہؐ کی محفل میں بیٹھ کر آدابِ مجلس تک کا لحاظ نہ کرتے تھے۔ اور آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے تھے۔ ان کو منع بھی کیا گیا۔ جب بھی کوئی سماعت نہیں کی۔

الم تر الی الذین نهوا عن النجوی ثم یعودون لما نهوا عنه و یتناجون بالاثم والعدوان ومعصیت الرسول" کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں سرگوشیوں سے ممانعت ہوئی تھی۔ پھر بھی انھوں نے وہی کیا جس سے منع کیا گیا اور گناہ و ظلم اور رسولؐ کے حکم کی مخالفت کے ساتھ یہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔"

ان لوگوں کے دل پر خود رسولؐ کی عظمت کا اتنا کم اثر تھا کہ مسجد میں آپ کی موجودگی میں اور آپ کے خطبہ پڑھنے کی حالت میں باجے کی آواز سن کر یہ دیکھنے چلے جاتے تھے اور رسول اللہؐ کو کھڑے کا کھڑا چھوڑ دیتے تھے۔

واذا راوا تجارۃ او لهوا انفضوا الیها وترکوک قائما۔

"جب انھوں نے تجارت دیکھی یا لہو و لعب دیکھا متفرق ہو گئے اس کے لیے اور تم کو کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔"[2]

وہ لوگ سب مخالفتیں کرتے تھے رسولؐ کو تکلیفیں دیتے تھے۔ آپ کی رد کرتے تھے اور بے اعتنائی سے کام لیتے تھے۔ مگر رسول اللہؐ کی جانب سے نہ ان کے خلاف تلوار اٹھائی جاتی تھی نہ کوڑا بلند کیا جاتا تھا، بلکہ بے بس اور کمزور لوگوں کی طرح انھیں عذابِ خدا سے ڈرانے پر اکتفا کی جاتی تھی۔ اور خدا کی قوت کا حوالہ دیا جاتا تھا۔

---

[1] سورۂ محمد پ ۲۶ [2] سورۂ جمعہ پ ۲۸

فان زللتم من بعد ما جاءتکم البینات فاعلموا ان اللہ عزیز حکیم۔ "اگر تم لوگ ٹھوکر کھاؤ بعد اس کے کہ روشن دلیلیں تمہارے سامنے آچکیں تو سمجھ لو کہ خدا غالب و قاہر اور بڑا مصلحت میں ہے[1]

الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما۔ اگر تم جہاد کو نہ گئے تو خدا تمھیں دردناک عذاب کرے گا[2]

والذین یؤذون رسول اللہ لہم عذاب الیم۔ "جو لوگ رسولؐ کو ایذا پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔[3]

فان یتوبوا یک خیرا لہم وان یتولوا یعذبہم اللہ عذابا فی الدنیا والاخرۃ۔ "اگر انھوں نے توبہ کر لی تو ان کے لیے بہتر ہے اور اگر انھوں نے روگردانی کی تو خدا ان پر عذاب نازل کرے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی"[4]

ان الذین یوذون اللہ ورسولہ لعنہم اللہ فی الدنیا والاخرۃ واعد لہم عذابا مہینا۔ "یہ لوگ جو خدا و رسولؐ کو ایذا پہنچاتے ہیں، دنیا و آخرت میں ان پر لعنت ہے اور خدا نے اپنے حقارت آمیز عذاب کو ان کے لیے مہیا کر رکھا ہے"۔[5]

ان کے لیے رسول اللہؐ کی جانب سے اعلان کر دیا گیا تھا کہ رسولؐ کا کام تمھیں صرف ہدایت کرنا ہے اور بس۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولیتم فانما رسولنا البلاغ المبین۔

"خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی۔ اگر تم نے روگردانی کی تو ہمارے رسولؐ کا فرض صرف واضح تبلیغ کر دینا ہے"۔[6]

---

[1] بقرہ پ۲ [2] توبہ پ۱۰۔ [3] توبہ پارہ ۱۰ [4] توبہ پارہ ۱۰
[5] احزاب پارہ ۲۲ [6] تغابن پارہ ۲۸

خداوندِ عالم کی جانب سے خود رسول اللہؐ کو مطلع کر دیا گیا کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ومن تولیٰ فما ارسلناک علیھم حفیظا۔ "جو شخص رسولؐ کا کہنا مانے اس نے خدا کا کہنا مانا اور جو شخص روگردانی کرے تو ہم نے تم کو ان کا ذمہ دار قرار دے کر نہیں بھیجا ہے"[1]

ما علی الرسول الا البلاغ واللہ یعلم ما تبدون وما تکتمون "رسولؐ کا کام صرف تبلیغ کر دینا ہے۔ اور خدا جانتا ہے تمھاری سب باتوں کو جنھیں تم ظاہر کرتے ہو اور جنھیں تم مخفی کرتے ہو"[2]

فان تولوا فانما علیک البلاغ المبین "اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو تمھارا فرض صرف واضح طور پر تبلیغ کر دینا ہے"[3]

بالکل اس طرح جیسے حضرت علیؑ اپنی رعیت کے لیے بددعا کرتے تھے۔

قاتلکم اللہ لقد ملأتم قلبی قیحا وشحنتم صدری غیظا۔

"اللہ تم لوگوں کو ہلاک کرے۔ تم نے میرے دل کو پیپ سے بھر دیا اور میرے سینہ کو غصہ سے۔"

اسی طرح رسولؐ کو اپنی رعیت کے لوگوں کی کارروائیوں پر بددعا ہی کرتے بنتی تھی۔ "قاتلھم اللہ انی یؤفکون۔" "اللہ ان لوگوں کو ہلاک کرے یہ کیسے بھٹکتے پھرتے ہیں"[4]

کیا یہ بادشاہانِ دنیا کی شان ہوتی ہے، کیا اسی طرح رعب و سطوت و دبدبہ قائم ہوتا ہے کہاں وہ شانِ جبروت و جلال کہ کوئی تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہوا تو کوڑا مار دیا گیا۔ اور کہاں یہ کہ رسول اللہؐ کو صرف ان کا نام لے کر لوگ پکارتے ہیں اور وہاں سے صرف زبانی ہدایت پر اکتفا کر دی جاتی ہے کہ لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا "رسول اللہؐ کے پکارنے کو اپنے اندر اس طرح نہ بناؤ جیسے آپس میں ایک دوسرے کو

---

[1] نساء پ۵ [2] مائدہ پ۷ [3] نحل پ۱۴ [4] منافقون پ۲۸

آواز دیتے ہو"۔ ؎۱

رسول اللہؐ سے لوگ چیخ چیخ کر بات کرتے تھے اس پر بھی اخلاقی حیثیت سے تعلیم دی جاتی ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں پھر وہی عذاب آخرت کا خوف۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا له بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون۔

"اے مسلمانو! رسولؐ کی آواز پر تم اپنی آواز بلند نہ کرو۔ اور ان سے بلند آواز سے باتیں نہ کرو، جیسے آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو۔ اس صورت میں تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے اور تمھیں خبر نہ ہو گی"۔ ؎۲

کیا شاہانِ دنیا کا یہی انداز ہوتا ہے:

رسول اللہؐ خود یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کو دنیا کے بادشاہوں کی صورت پر سمجھ لیا جائے۔ جب ایک شخص رسول اللہؐ کے سامنے آیا اور رعب سے کانپنے لگا تو آپ نے فرمایا۔

ھوّن علیک فانی لست بملک انما انا ابن امرأۃ من قریش کانت تاکل القدید۔ "ٹھہر جا، ٹھہر جا، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو قریش کی ایک عورت کا فرزند ہوں جو معمولی کھانا کھاتی تھی"۔ ؎۳

ان اعلانات کے بعد کہ "ان تولیتم فانما   رسولنا البلاغ المبین فان تولوا فانما علیک البلاغ المبین" لوگ کیا سمجھتے کہ اگر ہم ان کا کہنا نہ مانیں گے تو یہ کچھ بنا سکیں گے۔

پھر جب رسول اللہؐ کا یہ عالم ہے تو خلیفۂ رسولؐ کو اس سے زیادہ کیا قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔ مذکورہ واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کا فرض ہے تبلیغ اور نفاذِ احکام اور مسلمانوں کے لیے آپ کی اطاعت اور آپ کے احکام کا بجا لانا

؎۱ نور ۶۳/۲۴ ؎۲ حجرات ۲/۲۶ ؎۳ طبقات ابن سعد جلد اول مطبوعہ لیڈن ص۷

ایک مذہبی فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی مخالفت میں سزائے اخروی ہے۔ دنیاوی سزا ان ہی احکامِ الٰہی کی مخالفت میں ہے کہ جس میں شریعت کی جانب سے حدود تعزیرات مقرر ہو گئے ہیں۔ ان کی مخالفت میں بحیثیت حاکم شرع کے رسولؐ اور امامؑ حدود تعزیرات قائم کرتا ہے۔ جس میں اس کی جانب سے کمزوری نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت علیؑ نے خلیفۂ رسولؐ اور عام امت کی اس پوزیشن کو صاف الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے[1]

ایہا الناس ان لی علیکم حقا و لکم علیّ حق فاما حقکم علیّ فالنصیحۃ لکم و توفیر فیئکم علیکم و تعلیمکم کیلا تجہلوا و تأدیبکم کیما تعلموا و اما حقی علیکم فالوفاء بالبیعۃ والنصیحۃ فی المشہد والمغیب والاجابۃ حین ادعوکم والطاعۃ حین آمرکم۔

"ایہا الناس! میرا تمہارے اوپر ایک حق ہے۔ اور تمہارا میرے اوپر ایک حق ہے۔ تمہارا حق تو میرے اوپر یہ ہے کہ میں تمہاری خلوص دل کے ساتھ ہدایت کروں تمہارے حقوق جو زکوٰۃ و خمس وغیرہ میں ہیں انھیں تم میں تقسیم کروں۔ اور تمھیں تعلیم دوں کہ تم جاہل نہ رہو۔ اور تمہیں آداب و قواعد سکھلا دوں تاکہ تم عمل کرو۔ اور میرا حق تم پر یہ ہے کہ تم بیعت کے ساتھ وفا کرو اور سامنے اور پسِ پشت ہر حال میں خیر خواہی کرو اور جب تمہیں جہاد کے لیے دعوت دوں تو تم لبیک کہو اور جب حکم دوں تو تم اطاعت کرو۔"

دوسری جگہ فرماتے ہیں[2]

انہ لیس علی الامام الا ما حمل من امر ربہ الابلاغ فی الموعظۃ والاجتہاد فی النصیحۃ والاحیاء للسنۃ واقامۃ الحدود علی مستحقیہا واصدار السہمان علی اہلہا۔

---

[1] نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ص ۹۲-۹۳۔ [2] نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ص ۲۱۹

"امام کا فرض نہیں ہے مگر وہی جس کا وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ بس موعظہ و نصیحت کے ذریعہ سے تبلیغ کرنا۔ اور خالص خیر طلبی میں جد و جہد کرنا، اور احکامِ شریعت کو زندہ رکھنا اور حدود کا جاری کرنا، ان لوگوں پر جو مستحق ہوں اور زکواۃ و خمس کے حصوں کو پہنچانا ان کے اہل تک۔"

یہ ہے وہ حکومت جو خلافتِ رسول اللہؐ کی حیثیت سے حاصل ہوتی ہے۔

دنیا کے ظاہر بیں لوگ جو خلافتِ رسولؐ کی کامیابی فتوحات کی کثرت کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں، حضرت علیؑ کی خلافت کی کیا قدر کر سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنے مختصر دورِ خلافت میں دنیا کو دکھلا دیا کہ "سیاستِ رسالت" کیا چیز ہے اور "خلافتِ نبوی" کے معنی کیا ہیں۔

بہرصورت ایک رائے پر قائم رہنا ہرگز صحیح عزم و ارادہ کی پختگی نہیں ہے کیونکہ کبھی لوگوں کی مخالفت کی صورت میں حکمت و دانش مندی کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اپنی رائے پر عمل نہ کیا جائے، اس صورت میں اپنی رائے پر عمل کرنے والا ضدی اور ہٹ دھرم کہلائے گا۔ ہرگز ہرگز عزم و ارادہ کی صفت کے ساتھ قابلِ تعریف نہ ہوگا۔ جیسے حضرت عثمان کا تمام مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود مروان بن الحکم کے سر چڑھائے رکھنے پر اصرار نہ سیاسی تدبر کا نتیجہ ہے نہ حکمت و مصلحت بینی کا تقاضا۔

لیکن جو شخص تدبر و حکمت کے ساتھ عزم و ارادہ کی صفت کا بھی مالک ہوتا ہے وہ جب مصلحت اس میں دیکھتا ہے کہ مخالفت کے ساتھ رائے میں تبدیلی کر دے اس وقت ایسا کرتا ہے اور جب اس کے خلاف مناسب سمجھتا ہے تو مخالفت کے باوجود اپنی رائے پر قائم رہتا ہے۔

رسول اللہؐ کی سیرت میں ہم کو دونوں طرح کے نمونے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح

حضرت علیؑ بن ابی طالب، ایک وقت آپ دوسرے لوگوں کی رائے پر عمل کر لیتے ہیں، یہ بتا دینے کے بعد کہ وہ غلط ہے۔ اس لیے کہ اس کے خلاف کرنے میں اپنی ہی رعیت کے اندر خونریزی کی صورت میں پیش آئے گی۔ جسے آپ موجودہ حالت میں تباہ کن سمجھتے ہیں۔

اور دوسرے مواقع پر لوگ مخالفت کرتے ہیں لیکن آپ اپنی رائے پر سختی سے قائم رہتے ہیں۔ اس کی نظیریں بہت ہیں۔ طلحہ و زبیر بغاوت کرتے ہیں اور لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ ان کا مقابلہ نہ کیجیے اور آپ فرماتے ہیں[1]

واللہ لا اکون کا الضّبع تنام علی طول اللدّم حتی یصل الیہا طالبہا ویختلہا راصدہا ولکنی اضرب بالمقبل الی الحق المدبر عنہ وبالسامع المطیع العاصی المریب ابدا حتی یأتی علی یومی۔

"خدا کی قسم میں اس طرح نہیں ہو سکتا جیسے بجو۔ جتنا اس کو کھٹکھٹایا جائے وہ سوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شکار کرنے والا پہنچ جائے۔ اور اس پر حملہ کر دے لیکن میں ان لوگوں کو لے کر جو حق کی طرف متوجہ ہوں اور اطاعت گزار ہوں جنگ کروں گا ان سے جو حق سے روگرداں ہیں اور نافرمان ہیں، ہمیشہ یہاں تک کہ میری عمر کا آخری دن آ ئے۔"

حضرت عثمان نے جو جاگیریں لوگوں کو دے دی تھیں آپ نے سب واپس لے لیں، لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، آپ نے فرمایا[2]

واللہ لو وجدتہ قد تزوج بہ النساء وملک بہ الاماء لرددتہ فان فی العدل سعۃ ومن ضاق علیہ العدل فالجور علیہ اضیق۔

"خدا کی قسم اگر میں دیکھتا کہ اس مال سے عورتوں کے ساتھ شادی کی گئی ہے اور کنیزوں کی

---

[1] نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ص۴۷ [2] نہج البلاغہ ص۵۲

ملکیت حاصل ہوئی ہے تو بھی میں مسترد کر دیتا، اور جس شخص پر عدالت کا دائرہ تنگ ہو اس پر ظلم و جور اور تنگی کا باعث ہوگا۔"

جریر بن عبداللہ بجلی آپ کی جانب سے شام بھیجے جاتے ہیں اور لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ جنگ کے لیے آمادہ ہو جائیے اور آپ اختلاف فرماتے ہیں[1]

جنگِ صفین میں لوگوں کا اصرار ہے کہ جنگ شروع کیجیے اور اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اور آپ جب تک مناسب نہیں سمجھتے اجازتِ جہاد نہیں دیتے[2]

اطمینانِ قلب کا یہ عالم کہ لڑائیوں میں بغیر زرہ وغیرہ کے دشمن کی فوج پر حملہ کرتے ہیں اور لوگوں کے منع کرنے سے باز نہیں رہتے[3]

تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ آپ کے مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد سب اس بات کے مخالف تھے کہ معاویہ کو حکومتِ شام سے معزول کیا جائے لیکن آپ نے کسی کے مشورہ پر عمل نہ کیا، اس لیے کہ آپ ایک ظالم شخص کے افعال کی ذمہ داری تھوڑے دن کے لیے بھی خود نہیں لینا چاہتے تھے۔

اقامۂ حدود میں آپ کے عزم و ارادہ اور سطوت و قوت کی عجیب شان تھی۔ وہ سابقہ خلافتیں تھیں جن میں کمزوروں پر حد آسانی سے جاری ہو جاتی تھی۔ مگر طاقتور یا خاندانی امتیاز رکھنے والوں کے ساتھ مراعات ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ خالد بن ولید سے مالک ابن نویرہ کا قصاص اس لیے نہ لیا گیا کہ وہ "سیف اللہ" بن چکے تھے۔

حضرت عثمان نے عبیداللہ بن عمر سے ہرمزان کے قتل کا قصاص اس لیے نہ لیا کہ وہ خلیفہ زادے تھے۔

جب حضرت علیؑ خلیفہ ہوئے تو عبیداللہ کو اپنے متعلق اندیشہ ہوا، اور اس لیے وہ بھاگ کر شام چلے گئے آخر صفین میں قتل ہوئے[4]

---

[1] نہج البلاغہ ص ۱۰۲ [2] نہج البلاغہ ص ۱۰۳ [3] نہج البلاغہ ص ۱۰۱۔ [4] استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ۲ ص ۲۱۴

حضرت علیؑ کے عزم و ارادہ کی اس بارہ میں یہ شان تھی کہ فرماتے تھے:[1]

الذلیل عندی عزیز حتی اٰخذ الحق له والقوی عندی ضعیف حتی اٰخذ الحق منه۔

"کمزور شخص میرے نزدیک طاقتور ہے یہاں تک کہ اس کا حق میں حاصل کروں اور طاقتور میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ اس سے حق کو وصول کروں۔"

حضرت عمر نے اپنے سالے قدامہ بن مظعون پر شراب خوری کی حد جاری کرنے میں جتنا تامل مٹول اور حیلہ بہانہ کیا ہے وہ ایک طویل داستان ہے[2] مگر حضرت علیؑ اس معاملہ میں اتنے بے لوث تھے کہ اپنے عزیز چچازاد بھائی کو صرف مال کے معاملہ میں بے اعتدالی پر تحریر فرماتے ہیں:[3]

فاتق الله واردد الی هؤلاء القوم اموالهم فانك ان لم تفعل ثم امكنني الله منك لاعذرن الی الله فيك ولا ضربنك بسيفي الذی ما ضربت به احدا الا دخل النار والله لو ان الحسن والحسين فعلا مثل الذی فعلت ما كانت لهما عندی هوادة ولا ظفرا منی بارادة حتی اخذ الحق منهما وازيل الباطل عن مظلمتهما۔

"خدا سے ڈرو اور ان لوگوں کے اُن کے اموال واپس کر دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا اور خدا نے مجھے موقع دیا تو میں خدا کی بارگاہ میں تمہارے بارے میں اپنی جواب دہی کا سامان کروں گا۔ اور تم کو اپنی اسی تلوار کی ضرب لگاؤں گا جس سے میں نے کسی کو نہیں مارا ہے مگر یہ کہ وہ آتشِ جہنم میں داخل ہوا اور خدا کی قسم اگر حسنؑ و حسینؑ ایسا کرتے تو اُن کے لیے بھی میرے

---

[1] نہج البلاغہ ص ۹۸، ۱۹۷ [2] استیعاب جلد ۱ ص ۵۱۹۔ [3] نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۶۸، ۶۹

> پاس کوئی رعایت نہ ہوتی اور نہ مجھ سے وہ اپنا مطلب نکال سکتے۔ یہاں تک کہ میں حق کو اُن سے لے لیتا اور باطل کو اُن کے ظلم سے برطرف کر دیتا۔"

یہ ہیں علی بن ابی طالبؑ اور یہ ہے ان کی خلافت کی شان۔

بالکل غلط ہے یہ کہ ان کو حضرت ابوبکر کی خلافت سے اختلاف کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی۔ انھوں نے برابر اظہار کیا، اور اگر اظہار نہ کرتے تو آج ساڑھے تیرہ صدی کے بعد وہ اس درجہ ظاہر نہ ہوتا کہ "م۔ ح" صاحب کو بادلِ ناخواستہ اقرار کرنا پڑ رہا ہے کہ:۔

> "یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت سے ان کو انکار و اختلاف تھا" لیکن پھر بھی جنگ کو وہ مفادِ اسلامی کے لیے مضر سمجھتے تھے۔

یہ بھی ان کی قوتِ ارادی اور عزم کی شان تھی کہ باوجود طاقت جسمانی کے پھر بھی مصلحت کو مقدم کیا اور کمزور ارادہ اور رائے کے اشخاص کی طرح ورغلانے والوں اور سبز باغ دکھلانے والوں سے متاثر نہیں ہوئے۔

ابوسفیان ایسا صاحبِ قوم و قبیلہ شخص جس کے راضی کرنے کے لیے مالکِ تاج و تخت اور صاحبِ شان و شوکت اور "م۔ ح" صاحب کے الفاظ میں دبنگ انسان حضرت عمر کو بھی شام کا پورا علاقہ ہمیشہ کے لیے فروخت کر دینا پڑا اور تیسرے دور کے واسطے بنی امیہ کے لیے جگہ بھی دینی پڑی، وہ علیؑ بن ابی طالب کو نصرت کے پورے وعدہ کے ساتھ ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے کہ میں مدینہ کو سوار و پیادہ سے بھر دوں گا اور علیؑ اس کو یہ کہہ کر ڈانٹ دیتے ہیں کہ تو ہمیشہ سے اسلام کا دشمن رہا ہے[1]

وہ علم، جسے آپ فرماتے تھے کہ تمھیں نہیں حاصل ہے۔ یہی ہے کہ اس وقت جنگ

---

[1] استیعاب ج ۲ ص ۱۱ا صواعق محرقہ ص ۲۸۔

کرنا اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا سبب ہے۔

اسی لیے رسول اللہؐ کی وصیت بھی سکوت کے لیے تھی جس کا آپ نے ایک اور موقع پر حوالہ دیا ہے[1]

یہ آپ نے کبھی نہیں فرمایا کہ میں مستحق خلافت نہیں ہوں۔ بلکہ صاف ارشاد کیا[2]

لقد علمتم انی احق الناس بها من غیری "تم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں اس خلافت کا سب سے زیادہ مستحق ہوں۔" آپ نے حضرت عثمان کے بعد قبول خلافت سے انکار ضرور کیا مگر اس کا سبب بھی بیان کر دیا۔ کہ جمہور کا مزاج اخلاقی اتنا خراب ہو گیا ہے اور عادتیں اتنی بگڑ گئی ہیں کہ وہ میرے بے لوث ہدایات پر عمل کے قابل نہیں رہے[3]

دعونی والتمسوا غیری فانا مستقبلون امرا له وجوه والوان لا تقوم له القلوب ولا تثبت علیه العقول وان الآفاق قد اغامت والمحجة قد تنکرت واعلموا انی ان اجبتکم رکبت بکم ما اعلم ولم اصغ الی قول القائل و عتب العاتب وان ترکتمونی فانا کاحدکم۔

"معاف کرو مجھ کو کسی اور سے کہو۔ کیونکہ ہمارے سامنے ایسا معاملہ درپیش ہے جس کے بہت سے رخ ہیں اور مختلف پہلو ہیں۔ دل اس کے لیے برقرار نہیں رہ سکتے اور عقلیں اس کے لیے ٹھہر نہیں سکتیں اور فضا پر ابر چھا گیا ہے۔ اور راستہ (شریعت کا) ناشناس ہو گیا ہے اور میں نے اگر تمہاری خواہش کو قبول کیا تو میں تم کو اپنے علم کے مطابق چلاؤں گا۔ اور کسی کہنے والے کے قول اور معترض کے اعتراض کو نہیں سنوں گا۔ اور اگر تم نے مجھ کو چھوڑ دیا تو میں تمہارا ہی ایسا ایک فرد ہوں گا۔"

کتنی جسارت ہے یہ کہ اس کلام کا پہلا اور آخری جزو صرف لے کر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ اپنے تئیں مستحق خلافت نہیں سمجھتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر اس

---

[1] نہج البلاغہ ج ۱ ص ۹۱ [2] نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۳۵ [3] نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۹۸

صورت میں کسی دوسرے کو خلیفہ مقرر کر دیا جاتا تو حضرت علیؑ انتظامِ ملکی میں اس کے احکام پر سب سے زیادہ ہی عمل کرتے، جیسا کہ ایک بااصول انسان کا وطیرہ ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خلافت حقیقیہ کا سوال ہی درپیش نہیں تھا۔ بلکہ تمام لوگوں کے اعتقاد کے مطابق صورت یہی تھی کہ وہ لوگ آپ کے سامنے اسی طرح حکومت پیش کر رہے تھے جس طرح اس کے پہلے کے لوگ مسندِ خلافت پر عام اشخاص کی جانب سے متمکن ہوتے تھے اس لیے حضرت علیؑ کے اس ارشاد سے کہ "جس کو تم حاکم بناؤ گے اس کی میں اطاعت کروں گا" یہ نتیجہ کس طرح نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقتہً خلافت کے لیے عام پبلک کے اختیار کا نظریہ درست ہے اور اس کا تقرر خدا کے ذمہ نہیں ہے۔ جبکہ خدا کی قرارداد کو اس مسئلہ میں تسلیم ہی نہیں کیا گیا اور نظام دوسری صورت سے قرار پا چکا اور اسی نظام کے مطابق انتخاب کا سوال درپیش ہے۔

یہ بھی علیؑ بن ابی طالب کی قوتِ ارادی کی انتہا ہے کہ طاقت و قوت کے باوجود صرف مصالحِ اسلامی کے لیے رسولؐ کے بعد والے دور میں مظالم بھی برداشت کیے مگر جو طریقۂ کار اختیار کر لیا تھا اس میں سرِمو فرق نہ ہوا۔

آپ کی شجاعت و قوت کے لحاظ کے ساتھ جو ابتدا میں بدر و احد و خندق و خیبر اور آخر میں جمل و صفین و نہروان کی صورت میں مشاہدہ میں آ چکی جتنا آپ پر سختی و ظلم کے واقعات زیادہ دہرائے جائیں گے ان سے آپ کی قوتِ نفس قوتِ ارادہ اور عظیم ثبات و استقلال و تحمل ہی کی صفت پر روشنی پڑتی جائے گی۔

کیا اثر پڑ سکتا ہے حقیقت واقعہ پر اس روایت کا کہ حضرت فاطمہؑ نے آپ کے سکوت پر سخت الفاظ میں اعتراض کیا اور غیرت انگیز الفاظ کہے یا نہیں۔ جانے دیجئے کہ روایت کہاں تک صحیح ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں بات ہی کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ دو ہی صورتیں ہیں یا تو سیدۂ عالم فاطمہ زہراؑ جیسا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے معصومہ اور غیر جائز الخطا تھیں اور یا جیسا کہ عام مسلمانوں کا خیال ہے ایسا نہیں تھا۔

پہلی صورت میں شیعہ لوگ اس کی نظیریں پیش کرتے ہیں ملائکہ کا خدا پر اعتراض (اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء) ابراہیم کا خدا سے مجادلہ (یجادلنا فی قوم لوط) موسیٰؑ کی ہارونؑ پر سختی (یا ابن ام لا تاخذ بلحیتی ولا براسی) وہ کہتے ہیں کہ جس طرح ان مقامات پر حقیقۃً نزاع نہیں ہے۔ اعتراض نہیں ہے، جنگ نہیں ہے بلکہ دوسروں پر اظہارِ حقیقت کی ایک صورت ہے۔ اسی طرح یہاں بھی واقعی اعتراض اور جنگ نہیں ہے بلکہ دوسروں پر اس حقیقت کا انکشاف کرنا تھا کہ اتنی اظہارِ ناگواری کے باوجود کتنا عظیم ہے وہ مفاد جو علیؑ بن ابی طالب کو مخالفت سے مانع ہے۔ چنانچہ اس روایت میں یہ ہے کہ اسی وقت جب سیدہؑ علیؑ سے مصروفِ شکوہ تھیں، مؤذن نے اذان دی اور جناب امیرؑ نے کہا دیکھو میں تلوار اٹھاتا ہوں مگر یہ آواز تم کو سنائی نہ دیگی یہ سن کر سیدہؑ خاموش ہو رہیں۔

یہ اس صورت میں ہے جب سیدہؑ کو معصومہ مانا جائے۔ اور اگر عام مسلمانوں کی طرح یہ عقیدہ نہ رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک عورت کا دل و دماغ اُن تمام مصالح و اسرار تک نہیں پہنچ سکتا جو ایک مدبّر اور بڑے عقل و فکر والے مرد کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر جناب فاطمہؑ نے اس طرح کا شکوہ کیا ہو تو اس سے علیؑ بن ابی طالب کے طریقہ کار کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

ناقابل برداشت مصیبت کی بناء پر علیؑ بن ابی طالب ایک جذباتی انسان قرار پا جاتے اگر وہ صرف ایسے غیرت انگیز الفاظ کو سن کر متاثر ہو جاتے اور اپنے طریقہ کار میں تبدیلی کرتے جو بڑی حکمت و مصلحت مبنی کا نتیجہ تھا۔

اس سے تو علیؑ بن ابی طالب کی قوتِ ارادی اور بلندیٔ حوصلہ کا اور اندازہ

ہوتا ہے نہ یہ کہ اس کے خلاف کوئی نتیجہ برآمد ہو۔ کیا ان روشن حقائق کی موجودگی میں صرف خلفائے ثلاثہ سے عقیدت کی بنا پر علیؑ بن ابی طالب کی بلندیٔ مرتبت کا انکار کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ خلافت کے مستحق نہیں تھے بلکہ خلفائے ثلثہ مستحق تھے۔

اس تنقیح کو اب اس سے زیادہ کیا بڑھایا جائے۔ حالانکہ بہت باتیں پھر بھی تشنۂ تفصیل رہ گئیں، لیکن اب دوسری تنقیحوں کا انتظار کیجئے۔

چوتھی تنقیح

آیات سے استدلال کا معیار اور اخبار و احادیث کا درجہ

اس تنقیح کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ مسئلہ امامت و خلافت میں نص خدا و رسول کے ثابت کرنے میں کچھ آیاتِ قرآنی پیش کیے گئے تھے جن کی مستند تفسیر خلافت علیؑ بن ابی طالبؑ کے لیے قطعی دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے برقی صاحب اور "م۔ ح" دونوں بزرگواروں کی جانب سے یہ شکایت کی گئی ہے کہ استدلال میں آیات کے ساتھ احادیث و اخبار کا ضمیمہ لگا دیا ہے اور اس لیے صرف قرآن سے حضرت علیؑ کی خلافت ثابت نہیں ہوئی ہے۔ "م۔ ح" صاحب تو اس کو "ایک گہری مناظرانہ چال" اور "علمی فریب کاری" سے تعبیر کرتے ہیں اور برقی صاحب اسے "شیعہ حضرات کی بیکسی" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ ان حضرات کی یہ شکایت صحیح ہے یا نہیں۔

یہ موجودہ زمانہ میں ایک فیشن ہو گیا ہے یا روشن خیالی کا مظاہرہ کہ قرآنی آیات سے مطالب کے استخراج کے لیے اخبار و روایات کی مدد لینے سے

انکار کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ غور سے دیکھئے تو بغیر خارجی روایات اور اخبار کے سہارے کے آپ قرآن کے معانی میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

کسی اور چیز کا کیا ذکر میں تو کہتا ہوں کہ خود قرآن سے یہ تک ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہ حضرت محمد مصطفےٰ کے شخص خاص پر نازل ہوا ہے۔ اس میں کہیں رسول اللہؐ سے یا محمدؐ کہہ کر بات ہی نہیں کی گئی۔ ہر جگہ اوصاف کا ذکر ہے، لیکن موصوف کی تعیین ان اوصاف کے لیے صرف قرائن اور خارجی روایات کی مرہونِ منت ہے۔ یہی قرائن جن سے مدد لینے کی ضرورت پر آپ خلافت کے مسئلہ کو قرآن سے بیگانہ بنا دینا چاہ رہے ہیں۔ فرض کیجیے کہ اس میں یہ آیت ہے:-

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ

"اگر تم کو کسی طرح کا شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو اس کے مثل ایک سورۃ بنا لاؤ۔"

اس میں رسول اللہؐ کو "عبدنا" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے، لیکن یہ امر کہ "ہمارے بندہ" سے مراد رسول اللہ ہی ہیں قرآن میں تو نہیں لکھا ہے۔

رسول اللہؐ کی عصمت کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:-

ما ضل صاحبکم وما غوی وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ

یہاں "صاحبکم" کے لفظ سے رسول اللہؐ کو مراد لیا گیا ہے مگر کیا اس کی صراحت قرآن میں موجود ہے۔

قرآن میں "انا فتحنا لک فتحا مبینا" "ہم نے تمھیں ایک کھلی ہوئی فتح عطا کی ہے۔"

"یہ تمھیں" کا خطاب رسول اللہؐ سے ہے۔ فتح ان کو دی گئی اور کھلی ہوئی فتح کب اور کس طرح؟ یہ تمام باتیں قرآن میں تو نہیں موجود ہیں۔

جہاں تک دیکھا جاتا ہے جس حد تک سابق امتوں کا اور انبیاء کا ذکر ہے، ایک حد تک قرآن نے تصریح و بیان سے کام بھی لیا ہے مگر جہاں تک رسول اللہؐ اور اس امت کے متعلقہ واقعات کا تذکرہ ہے اس میں اسی طرح کی چیزیں ہیں جن کی تعیین بغیر قرآن خارجی کے ممکن ہی نہیں۔

قرآن مجید کو کھولیے اور شروع سے پڑھتے چلے جائیے:

الٓمٓ اسے تو جانے ہی دیجئے یہ بالکل راز ہے۔ ذلک الکتاب لا ریب فیہ۔ "وہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں"۔ وہ کتاب سے کیا مراد؟ قرآن اگر خود قرآن میں اس مراد کی تو تصریح نہیں ہے —— والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک۔

"وہ جو ایمان لائے ہیں اس شے پر جو تم پر نازل ہوئی اور جو تمہارے قبل کے لوگوں پر نازل ہوئی تھی" یہ کس سے کہا جا رہا ہے؟ رسولؐ سے۔ مگر قرآن میں تو یہ درج نہیں ہے وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا —— اس کے متعلق تو اس کے پہلے تبصرہ کیا جا چکا ہے کہ "عبدنا" کا مفہوم بالکل مبہم ہے اور تعیین قرآن میں موجود نہیں ہے۔

سیقول السفہاء من الناس ما ولھم عن قبلتھم التی کانوا علیہا "کم عقل لوگ کہیں گے کہ یہ لوگ اس قبلہ سے کیوں پلٹے جس پر پہلے تھے"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے کوئی اور قبلہ تھا پھر اس سے عدول کیا گیا۔ مگر وہ پہلا قبلہ کون سا تھا۔ اور اب کس کی جانب عدول ہوا؟ یہ قرآن میں موجود نہیں ہے —— الحج اشھر معلومات "حج کے لیے معینہ مہینے ہیں"۔ وہ کون سے ہیں؟ قرآن میں کچھ پتہ نہیں۔ یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مہینے میں جنگ حرام ہے، مگر وہ کون مہینہ ہے کچھ ذکر نہیں۔

قرآن ایک موقع کی تصویر کھینچ رہا ہے۔

واذ تصعدون ولا تلوون علی احد والرسول یدعوکم فی اخریکم

"جب تم چڑھے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے، اور رسول تمھیں پیچھے سے آواز دے رہا تھا"

بے شک معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا کسی وقت یہ عالم ہوا تھا۔ مگر وہ کون موقع تھا اور کس لڑائی میں ایسا ہوگا؟ یہ قرآن میں صراحت نہیں ہے۔

ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان۔

وہ لوگ جنھوں نے تم میں سے پیٹھ پھرائی اس دن جب دونوں لشکروں میں مڈبھیڑ ہوئی۔

بے شک معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کے لیے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ لیکن وہ لوگ کون تھے اور وہ دن کیا تھا؟ اس کی تصریح نہیں ہے۔

وما اصابکم یوم التقی الجمعان فباذن اللہ" اور وہ بات جو تمھیں پیش ہوئی اس دن جب دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا تھا وہ خدا کی مشیئت سے تھی"

اب وہ بات کیا ہے جو درپیش ہوئی کچھ ذکر نہیں۔

کما اخرجک ربک من بیتک بالحق وان فریقا من المومنین لکارھون "جیسے نکالا تمھارے پروردگار نے تم کو تمھارے گھر سے سچائی کے ساتھ درصورتیکہ ایک جماعت مسلمانوں میں سے کراہت رکھتی تھی۔"

"واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انها لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم۔

"اور اس وقت جب وعدہ کر رہا تھا تم سے خدا دونوں جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمھارے لیے ہوگی اور تم آرزو رکھتے تھے کہ وہ جو شان و شوکت والی نہیں ہے وہ تمھارے لیے ہو"

"دونوں جماعتوں میں سے ایک" کیا معنی؟ غیر ذات الشوکۃ سے کیا مراد؟

فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔

"تم لوگوں نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے ان کو قتل کیا اور (اے رسولؐ) تم نے نہیں پھینکا جبکہ پھینکا، لیکن خدا نے پھینکا۔"

رسولؐ نے کیا چیز پھینکی تھی اور کب؟ قرآن میں تو صراحت نہیں ہے۔

اذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصوی والرکب اسفل منکم ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد ولکن لیقضی اللہ امرا کان مفعولا۔

"جبکہ تم قریب کی جگہ تھے اور وہ دور کی جگہ تھے اور سوار تمہارے ادھر تھے اور اگر تم ایک دوسرے سے وعدہ کرتے تو یقیناً وعدہ میں اختلاف پیدا ہوتا لیکن خدا کو تو پورا کرنا تھا جو کچھ اسے منظور تھا۔"

اذ یریکھم اللہ فی منامک قلیلا ولو اراکھم کثیرا لفشلتم ولتنازعتم فی الامر۔

"جبکہ خدا تمہارے سامنے پیش کرتا تھا انھیں تمھارے خواب میں کم اور اگر وہ تمھیں زیادہ دکھائی دیتے تو تم سست ہو جاتے اور تم میں اختلاف پیدا ہو جاتا۔"

کیا یہ اشارے نہیں ہے واقعات کی طرف جن کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔

ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین وان یکن منکم مائۃ یغلبوا الفا من الذین کفروا۔

"اگر تم میں سے بیس آدمی ثبات قدم رکھنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب آئیں۔" اس کے بعد ارشاد

ہوا ہے۔

الآن خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفاً ۔ "اب خدا نے تم سے تخفیف کر دی اور سمجھ لیا کہ تم کمزور ہو" یہاں کہا گیا "اب" مگر وہ اب کب تھی؟ اس کا پتہ لگانا یہاں مشکل ہے۔

اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن آمن باللہ والیوم الآخر وجاھد فی سبیل اللہ۔

"کیا تم نے قرار دیا ہے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا مثل اس شخص کے جو مبدار و معاد پر ایمان لایا ہوا اور خدا کی راہ میں جہاد کرے۔"

صاف ظاہر ہے کہ دو شخصوں میں موازنہ ہے۔ مگر وہ دونوں فریق کون کون تھے موازنہ کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ یہ نہیں معلوم۔

انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا "مشرک لوگ نجس ہیں۔ یہ لوگ مسجد الحرام کے قریب نہ جائیں اس سال کے بعد" اس سال یعنی کون سال؟ یہ "تاریخ سے حل ہوگا۔

اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا۔

"جب کفار نے رسولؐ کو گھر سے نکال دیا اور وہ دو میں کے ایک تھے۔ جبکہ وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

رسول اللہؐ کے ساتھ دوسرا شخص کون تھا؟ صاحب سے کیا مراد ہے؟ یہ باتیں مسکوت عنہ ہیں۔

وعلی الثلاثۃ الذین خلفوا حتی اذا ضاقت علیھم الارض

بما رحبت وضاقت علیهم انفسهم وظنوا ان لا ملجا من الله الیه
ثم تاب علیهم لیتوبوا۔

”اور خدا نے توبہ قبول کی ان تین کی جو پیچھے رہ گئے تھے یہاں تک کہ جب ان پر زمین تنگ ہو گئی اور خود ان کے نفوس تنگی کرنے لگے اور انھیں یقین ہوا کہ خدا سے بس اسی کی طرف پناہ مل سکتی ہے تو خدا نے ان کی توبہ کو قبول کیا۔“

یہ تین کون؟ اس کا ذکر نہیں۔

ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستاخرین۔ ”ہم نے خوب جان لیا اُن لوگوں کو تم میں سے جو آگے رہنا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جو پیچھے رہنا چاہتے ہیں۔“

کس مقام پر آگے اور پیچھے رہنا رزم میں یا بزم میں، ایمان میں یا عبادت میں؟ یہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ولقد نعلم انهم یقولون انما یعلمه بشر لسان الذی یلحدون الیه اعجمی وهذا لسان عربی مبین۔

”ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں رسولؐ کو ایک شخص تعلیم دیتا ہے۔ زبان اس شخص کی جس کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں عجمی ہے اور یہ کھلی ہوئی عربی زبان ہے۔“

اب بتائیے وہ کون شخص ہے جس کی طرف نسبت دی جاتی تھی۔

سبحان الذی اسریٰ بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حوله۔ ”پاک ہے وہ خدا جس نے سیر کرائی اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف جس کے گرد و پیش برکت قرار دی گئی ہے۔“

یہاں بھی بعبدہ؟ کا لفظ ہے جس سے یہ معلوم ہونے کی ضرورت ہے کہ کون

مراد ہے۔ پھر وہ مسجد اقصیٰ کون سے جہاں تک سیر کرائی گئی تھی؛

ان الذین جاء وا بالافک عصبة منکم لا تحسبوه شرا لکم بل هو خیر لکم لکل امرئ منهم ما اکتسب من الاثم والذی تولی کبره منهم له عذاب عظیم لولا اذ سمعتموه ظن المومنون والمؤمنات بانفسهم خیرا وقالوا هذا افک مبین لولا جاءوا علیه باربعة شهداء فاذ لم یاتوا بالشهداء فاولئک عند الله هم الکاذبون۔

"وہ لوگ جو تہمت لے کر آئے ہیں تمھیں میں سے کچھ لوگ ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ تمہارے لیے کچھ برا ہے بلکہ وہ تمھارے لیے اچھا ہے۔ ہر ایک کے لیے ان میں سے وہ ہے جس کا وہ مرتکب ہوا ہے گناہ سے اور جو شخص اس کا بڑا ذمہ دار ہے ان میں سے اس کے لیے بڑا عذاب ہے کیوں نہ جب تم لوگوں نے اس تہمت کو سنا تو مومنین اور مومنات نے اپنے دل میں اچھا خیال کیا اور یہ کہا کہ یہ کھلی ہوئی تہمت ہے۔ کیوں نہ ان لوگوں نے اس پر چار گواہ پیش کیے۔ اب جبکہ وہ گواہ نہیں پیش کر سکے تو یہ لوگ خدا کے نزدیک جھوٹے ہیں"

اب ملاحظہ کیجیے کہ کیا تہمت؟ کس پر تہمت؟ کون لوگ لانے والے اس کا کچھ ذکر نہیں۔

پھر بھی یہ منصوصات قرآن سے سمجھا جاتا ہے مسلمانوں سے پوچھیئے کہ اگر کوئی قضیۂ افک میں حضرت ام المومنین کو متہم سمجھے تو وہ مومن ہے یا کافر؟ وہ کہیں گے کافر ہے۔ اس لیے کہ نصِ قرآنی کے خلاف اعتقاد رکھتا ہے۔

وعدکم الله مغانم کثیرة تاخذونها فعجل لکم هذه وکف ایدی الناس عنکم ـــــ واخری لم تقدروا علیها۔

"تم سے خدا نے وعدہ کیا تھا بہت سی غنیمتوں کا، پس یہ تمہارے لیے جلدی عطا کردیں اور ان لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا۔ اور اس کے علاوہ دوسری ان پر تمھیں قدرت حاصل نہیں ہوئی۔"

فعجّل لکم ھٰذہ سے کاہے کی طرف اشارہ ہے، دوسری جن پہ قدرت نہیں حاصل ہوئی وہ کیا ہیں۔ یہ تمام باتیں رازِ سربستہ ہیں۔

یا ایھا النّبی لم تحرّم ما احلّ اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک

"اے پیغمبرؐ تم کیوں حرام کرتے ہو اسے جو خدا نے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے تم اپنے ازواج کی خوشی پوری کرنا چاہتے ہو۔"

واذ اسرّ النّبی الی بعض ازواجہ حدیثا فلمّا نبّأت بہ و اظھرہ اللہ علیہ عرّف بعضہ واعرض عن بعض فلمّا نبّأھا بہ قالت من انبأک ھٰذا قال نبّأنی العلیم الخبیر۔

"جب رسولؐ نے اپنی بعض ازواج سے ایک بات چپکے سے کہی۔ جب اس بیوی نے اسے کہہ دیا اور خدا نے رسولؐ پر اس کو ظاہر کیا تو انھوں نے کچھ بتلا یا اور کچھ سے چشم پوشی کی۔ جب انھوں نے اس زوجہ سے اس کی خبر دی تو اس نے کہا کہ آپ کو کس نے بتلایا، کہا، مجھ کو خبر دی ہے خدائے عالم و دانا نے۔"

ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما وان تظاھرا علیہ فان اللہ ھو مولٰہ وجبریل وصالح المومنین۔

"اگر تم دونوں توبہ کرو خدا سے تو اچھا ہے کیونکہ تمہارے دل کج ہو گئے ہیں اور اگر تم دونوں رسولؐ کے خلاف متفق ہو جاؤ تو خدا ان کا مددگار ہے اور جبرئیلؑ اور مومنین میں سے جو صلح ہیں۔"

ان میں یقیناً ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ مجھ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو

سے متعلق ہے۔ مگر وہ دونوں کون تھیں اور وہ راز کیا تھا اور کس نے اس کا کس سے اظہار کر دیا تھا اور اس میں خرابی کیا تھی، یہ سب باتیں بھی کیا قرآن میں موجود ہیں؟

یہ تو واقعات کا عالم ہے۔

اور احکامِ شرعیہ۔ ان میں بھی قرآن نے نماز کا حکم دیا۔ مگر ترکیب قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ روزہ کا حکم ہے مگر کن کن چیزوں سے روزہ میں امساک ہونا چاہیے۔ اس کا قرآن میں پتہ نہیں۔ حج کا حکم ہے مگر مناسکِ حج کی تعلیم نہیں ہے۔ زکوٰۃ کا حکم ہے مگر نصاب و مقدارِ زکوٰۃ کا پتہ نہیں۔

حقیقۃً اگر قرائنِ عقلیہ اور حقائقِ تاریخیہ سے بالکل چشم پوشی کر لی جائے تو الفاظ گنگ ہو جائیں گے اور مفہوم بالکل گم ہو جائے گا۔

اس کے لیے یا تو کہیے کہ قرآن کی متانت اس کی متحمل نہیں تھی کہ اس طرح کے تفصیلات اس میں مذکور ہوں۔ نہیں تو قرآن، توریت کی کتاب پیدائش یا سفرِ خروج کی طرح واقعات کا ایک خشک مجموعہ ہوتا اور اس کی بلاغت باقی نہ رہتی اور یا کہیے کہ اس میں کوئی حکیمانہ مقصد مضمر تھا اور قرآن خود اپنے تئیں "کافی" قرار دینا نہیں چاہتا تھا

اب معلوم نہیں کہ ان تمام آیات میں برقی صاحب کو کوئی "خلا" نظر آتا ہے یا نہیں؟ اور اس خلاء کے پُر کرنے کا ان کے نزدیک کیا طریقہ ہے۔

روایات سے بالکل کنارہ کشی تو ممکن ہی نہیں ہے، قرآن مجید کے مکی و مدنی کی تعیین، ناسخ و منسوخ کی تمیز، مورد و مصداق کی تشخیص اور اگر عبارت نہ سمجھی جائے تو دبی زبان سے کہہ دوں کہ الفاظِ تنزیل میں قرأت کی ترجیح سب روایات ہی پر مبنی ہے۔ اور اگر روایات کو کلیۃً نظر انداز کر دیا جائے تو نقلی استدلال کی عمارت بالکل زمین دوز ہو جائے گی۔ اور ادلۂ شرعیہ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔

شانِ نزول یعنی موقعِ کلام بھی ایک ایسی اہم چیز ہے جس سے الفاظ کے معانی

میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ پھر اس کو بالکل چھوڑ کیسے دیا جا سکتا ہے۔

یہ خیال کر لینا کہ روایات ظنی ہی ہوتے ہیں کلیتہً صحیح نہیں ہے۔ قرائن اکثر وہ ہوتے ہیں جن میں روایت قطعی ہو جاتی ہے اور اس میں شک باقی نہیں رہتا۔ نیز اکثر روایت اور شانِ نزول کے الفاظ قرآن سے بالکل مطابقت بھی اس روایت کے قطعی طور پر صحت کی دلیل بنتی ہے۔ بے شک اس کے لیے عقل کے کام میں لانے کی ضرورت ہے مگر عقل تو احکامِ مذہبی میں اتنی ناگزیر چیز ہے کہ بغیر اس کے نہ خدا کی الوہیت ثابت ہے نہ رسولؐ کی رسالت اور نہ قرآن کی حقانیت۔

شیعوں کا عقل سے کام لینے ہی کا وہ تصور ہے جس کی بنا پر برقی صاحب شیعوں پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے قرآن میں "تاویلات کا دروازہ کھولا۔

ممکن ہے بظاہر یہ اور مجسمہ کی بارگاہ میں اس الزام کو کوئی مقبولیت حاصل ہو۔ اس لیے کہ ان "تاویلات کی بناء پر خدا کا بھاری بھرکم جسم اور لانبے لانبے ہاتھوں کے ساتھ جسمانی تخت پر جلوہ گر ہونا ثابت نہیں ہوتا اور قیامت میں اس کے دیدار کی حسرت بھی پامال ہو جاتی ہے۔ مگر اہلِ عقل جانتے ہیں کہ جلال و جبروت الٰہی ان صحیح "تاویلات کی حقانیت کا پورے طور پر متقاضی ہے اور مذہب و عقل کی جانب سے ان کی ضرورت ہو۔

بہرحال خلافتِ امیر المومنینؑ کے اثبات میں جو ادلۂ قرآنی پیش کیے گئے ہیں وہ تو بالکل اس سے مختلف ہیں۔ وہاں نہ کسی تاویل سے کام لیا گیا ہے اور نہ ظاہری معنی کے خلاف کوئی تصرف بلکہ قرآنی آیت کا بالکل مفہوم ہے جو پیش کیا گیا ہے شانِ نزول بھی بالکل وہ ہے جس کو خود قرآن کے الفاظ صاف بتلا رہے ہیں اور اس کے خلاف جتنے اقوال ہیں ان کی خود الفاظِ قرآنی صاف صاف نفی

کرتے ہیں۔ اس پر سابق کے مضامین میں کافی تبصرہ کیا گیا ہے۔ مگر مصلحۃً زکی صاحب اور "م۔ ح" دونوں ہی بزرگواروں نے ان استدلالات پر بحث کرنے سے بالکل ہی چشم پوشی اختیار کی ہے۔

بساطِ بحث کو پھیلانے کے لیے خواہ مخواہ ادلۂ خلافت میں لیس البر بان تاتوا البیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقی واتوا البیوت من ابوابھا کی آیت کو اپنی جانب سے بڑھا دیا گیا ہے۔ حالانکہ اثباتِ خلافت کے ادلہ میں مستقل طور پر اس کو کبھی ذکر نہیں کیا گیا۔ ایک خطائے اجتہادی کی بحث میں ضمناً اس کو رسول اللہؐ کی حدیث (انا مدینۃ العلم و علیّ بابھا فمن اراد العلم فلیأت الباب) کا موید بتایا گیا تھا۔ لیکن آیت کا کسی حدیث کی تائید کرنا اور چیز ہے اور مستقل طور سے اس کا دلیلِ خلافت ہونا دوسری چیز۔

دوسری آیت

البیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "قرآن کی زیر بحث آیت کے مفہوم میں کوئی ایسا خلا یا نقص نہیں ہے جس کے پیش نظر اسے کسی دوسری بات سے متعلق کرنا یا کسی حدیث کے ساتھ اسے ضم کرنا قرینِ عقل قرار دیا جائے۔"

لیکن ہر عربی دان یہ سمجھ سکتا ہے کہ الیوم میں الف لام عہد کا ہے۔ اور اس سے اشارہ روزِ معیّن کی طرف ہوتا ہے۔ الیوم کے معنی ہوئے "آج" اور اس کا مشارٌ الیہ وہی دن ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی اور پھر اس دن میں کوئی خصوصیت ہونا چاہیئے جس کی بنا پر کہا جائے کہ آج دین کامل ہوا اور آج نعمت تمام ہوئی اور اسلام دینِ پسندیدہ قرار پایا۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن خود بتلا رہا ہے کہ وہ کسی دوسری بات سے متعلق ہے

اب اگر اُس بات کو کوئی حدیث بیان کر رہی ہے اور وہ قرآنی الفاظ کے بالکل مطابق بھی ہے تو اس حدیث کو نظر انداز کرنا کہاں تک قرینِ عقل ہوگا۔

تیسری آیت

انذر عشیرتک الاقربین واخفض جناحک لمن ابتعک من المؤمنین۔

اس پر گذشتہ مضمون میں بہت سیر حاصل بحث کی گئی تھی اور داخلی و خارجی قرائن سے پورے طور پر ثابت کر دیا گیا تھا کہ آیت واقعۂ خاص سے متعلق ہے اور بعثتِ عشیرہ کے واقعہ کے بالکل مطابق ہے۔

برقی صاحب نے ان بیانات کی رد کیے بغیر اس جگہ یورپ و امریکہ کے مستشرقین چین و جاپان کے آدمی، فلپائن اور آسٹریلیا کے انسان ان سب کو اکٹھا کر لیا۔ فرماتے ہیں کہ:۔

> "اگر کسی ایک جگہ سے بھی یہ آواز اٹھے کہ یہ آیت کسی نوع سے بھی کسی واقعۂ خاص سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور بجائے خود کسی مضبوط و مکمل صداقت کی حامل نہیں ہے تو میں سپر ڈالنے کو تیار ہوں۔"

مجھے افسوس ہے کہ تقلیدِ مغرب کے ساتھ دلدادگی مجھے اس حد تک حاصل نہیں ہوئی ہے کہ میں خالص مذہبی مسائل اور قرآن کی تفسیر میں بھی یورپ و امریکہ کے افراد سے فیصلہ کرانے ہی پر حقانیت کا دار و مدار قرار دوں۔ میرے نزدیک تو اسلامی مفسرین کے اقوال ایسے مسائل میں بدرجہا یورپ و امریکہ کے مستشرقین اور چین و جاپان کے افراد اور فلپائن اور آسٹریلیا کے رہنے والوں کے خیالات سے زیادہ مستند ہیں۔

"م - ح" صاحب نے اس مقام پر "آزاد خیال شیعہ" کو "خفض جناح" کے محاورہ پر توجہ دلائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

> "خفض جناح" عربی کا محاورہ ہے جس کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ "فروتنی"

کسرِ نفسی یا خاکساری کے ساتھ پیش آنے کے ہیں۔ مگر انھوں نے "آزاد خیال شیعہ" کے گذشتہ مقالہ کو غور سے نہیں ملاحظہ فرمایا۔ وہاں اس محاورہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اس آیت میں "خفض جناح" کے یہ معنی قرار دینا رسولؐ کے بلند اخلاق پر حملہ ہے۔ وہ رسولؐ ایسا تھا کہ زبان مومنین کا کیا ذکر کفار تک سے حسن اخلاق کے ساتھ پیش آتا تھا۔ پھر خاص اس شخص کے لیے مومنین میں سے جو آپ کا اتباع کرے ان معنوں سے وخفض جناح کے حکم دینے کا حاصل کیا ہوا۔ من اتبعک من المومنین کی خصوصیت بتلاتی ہے کہ واخفض جناحک سے اعزاز خدمات کی کوئی خاص صورت مراد ہے اور اس کے مطابق ہے بالکل وہ تفسیر جو بعثتِ عشیرہ کے واقعہ کے متعلق وارد ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس مقام پر واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ کی آیت کو پیش کرنا بالکل بے محل ہے۔

یہ کون کہتا ہے کہ (واخفض جناحک) کے لفظی معنی ہیں "خلیفہ بنا دو" تاکہ یہی دوسرے مقام پر بھی قرار پائیں۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ مجازی معنی قرینۂ مقام کے پابند ہوتے ہیں اور ان میں عمومیت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔

چوتھی آیت

انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔

مترجم صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے:۔

"تمھارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اس کا رسولؐ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور عجز و انکساری سے زندگی گزارتے ہیں۔"

اس میں حقیقت پوشی کے لیے حسب ذیل تصرفات کیے گئے ہیں۔

۱۔ ولی کے معنی رفیق" حالانکہ آیت کا لب و لہجہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ رفاقت کا درجہ ہر مومن کو بہ نسبت دوسرے مومن کے حاصل ہونا چاہیے۔ اس کے لیے اتنے تاکید و اہتمام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ وھم راکعون کو بجائے اس کے کہ وہ حال کے طور پر پہلے جملہ سے متعلق ہو مستقل جملہ قرار دے کر اسے مستقل صفت قرار دینا یہ بھی اسلوبِ کلام کے خلاف ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیمون الصلوٰۃ یؤتون الزکوٰۃ کی طرح اس طرف بھی وہم یرکعون کہا جاتا۔

۳۔ رکوع کے معنی عجز و انکساری سے زندگی گزارنے کے قرار دینا۔ یہ عرف، لغت اور اصطلاحِ شرع سب کے خلاف ہے۔

ترجمہ میں عبارت اعتراض کی داغ دوزی پورے طور پر کرنے کے بعد تبصرہ میں یہ کہا گیا ہے کہ "اس آیت میں کوئی ایسا ابہام و خلا نہیں ہے جس سے حضرت علیؑ کی خلافت پر استدلال قائم کیا جائے۔

اس میں کیا شبہ کہ الفاظ کے مذکورۂ بالا ترجمہ کے ساتھ خلا باقی نہیں رہے گا۔ مگر آیت اپنے غلط ترجمہ کی پابند نہیں ہو سکتی۔

وہاں صاف یہ کہا گیا ہے کہ "ولی تمھارا بس خدا ہے اور رسولؐ اور وہ مومنین جو نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اس حالت میں کہ وہ رکوع کرتے ہیں۔" یہ چونکہ ایک غیر معمولی بات ہے لہٰذا نگاہ فیصلہ صاف بتلاتی ہے کہ یہاں کسی خاص جماعت یا فرد کی طرف اشارہ ہے جس سے یہ واقعہ عالم وجود میں آیا ہے اور اس کے بعد ابہام و خلا کا ہونا اور شانِ نزول کے ذریعہ سے اس کی تعیین ہونا بالکل کھلا ہوا راستہ ہے۔

"م ۔ ح" صاحب نے اس آیت کے ذیل میں اپنے معیار پر بہت مبسوط بحث کی ہے، اور بڑے جوش و خروش اور غیظ و غضب کا مظاہرہ فرمایا ہے۔

پہلا اعتراض تو ان کا وہی پرانا ہے کہ آیت میں روایت کا پیوند لگایا گیا ہے لیکن یہ امر پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ آیت قرآن میں اس طرح کے پیوند ناگزیر ہیں، ورنہ خلافت علیؑ بن ابی طالب کا کیا ذکر، رسالت محمد مصطفےٰ بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔

پھر دوسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ "روایت کی نقل میں — بڑی خیانت اور بد دیانتی سے کام لیا گیا ہے۔"

یہ بہت بڑا الزام ہے، فوراً اس کو دیکھ کر ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید حوالہ غلط دیا گیا ہوگا یا کوئی جزو روایت کا جو مخالفِ مقصود ہو ترک کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن آپ کو تعجب ہوگا یہ سن کر کہ اس آیت کے ذیل میں چار صفحے لکھے جانے کے بعد بھی اس خیانت اور بد دیانتی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔

لکھا ہے تو یہ کہ "درمنثور کا حوالہ دیا گیا ہے۔ درمنثور وہ کتاب ہے جس میں مصنف نے بلغیر التزامِ صحت دنیا بھر کی صحیح و غلط، رطب و یابس روایات جمع کر دی ہیں کہ جس کا بیشتر حصہ صرف خرافات ہے۔

لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ درمنثور اہل سنت کے بہت بڑے عالم حافظ جلال الدین سیوطی کی کتاب ہے جو کوئی غیر متعصب انسان بھی نہیں تھے۔ اس پر ان کی کتاب "تاریخ الخلفا" گواہ ہے جس میں یزید کو خلفائے برحق میں شمار کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ خیال تو ہو ہی نہیں سکتا کہ انھوں نے صرف خلافت حضرت علیؑ ثابت کرنے کے لیے خواہ مخواہ ایک درجن مصنفین کے نام اپنے دل سے لکھ دیے۔ اس لیے کم از کم ان مصنفین کی طرف اس کی نسبت تو درست ماننا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد ان مصنفین کو دیکھ لیجیے کہ وہ کیسے لوگ ہیں خطیب، عبدالرزاق، ابن جریر

ابوالشیخ، ابن مردویہ، طبرانی، ابن عساکر، عتبہ بن حکیم، ابونعیم۔

یہی لوگ وہ ہیں جن کے روایات دوسرے مسائل میں سرآنکھوں پر رکھے جاتے ہیں لیکن خلافتِ علیؑ کے متعلق اگر یہ لوگ کچھ لکھیں تو لائق گردن زدنی۔

رہ گیا ہم پر یہ اعتراض کہ ہم دوسرے روایات کو کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ جو اس روایت کے متضاد ہیں تو اس کا جواب صاف ہے۔ اس لیے کہ کسی جماعت کے وہ بیانات جو خود ان کے موافق ہوں مخالف پر حجت نہیں ہو سکتے لیکن وہ بیانات جو ان کے مخالف ہوں، مخالف کے لیے دلیل بن سکتے ہیں۔

"ولی" کے معنی صاحب اختیار اور متصرف کے نہیں ہیں تو پھر ولی مجنون اور ولیِ طفل کس اعتبار سے کہا جاتا ہے، کیا وہ صرف مددگار ہی ہوتا ہے۔

نحو کے مبتدی طالب علم بھی جانتے ہیں کہ اضافت کے لیے کسی طرح کی ملابست ہونا کافی ہے۔ اشھد ان علیا ولی اللہ میں "ولی اللہ" کے یہ معنی کیوں نہ لیجیے کہ خدا کی طرف سے حاکم ومتصرف جیسے خلیفۃ اللہ یعنی خدا کی طرف کے خلیفہ۔ اگر یہاں ولی کے معنی ناصر ہی کے ہوتے تو شیعوں کو اس پر اتنا زور دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اور وہ اس کی گواہی کو جزو ایمان کیوں قرار دیتے۔

جمع کے الفاظ سے واحد کا مراد لینا قرآن مجید میں نایاب نہیں ہے۔ سورۂ منافقون ہی میں دیکھ لیجیے ارشاد ہوتا ہے۔

یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منها الاذل۔

"وہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ کی طرف واپس ہوئے تو جو ہم میں زبردست ہوگا وہ کمزور کو نکال باہر کرے گا۔"

یہاں جمع کا صیغہ وارد ہے حالانکہ باتفاق مفسرین اس کا کہنے والا صرف ایک شخص تھا۔

بات یہ ہے کہ جب موصوف کی شخصیت نہ ذکر ہوا وصاف کے ذریعہ سے اشارہ کیا گیا ہو تو واحد اور جمع کی خصوصیت قابلِ لحاظ نہیں ہے۔ کیونکہ اصل تو مصداق ہے وہ اگر ایک ہے تو صفات اس پر منطبق ہوں گے۔ چاہے صیغہ جمع کا ہو اور اگر موصوف متعدد ہیں تو صفات ان سب پر منطبق ہوں گے چاہے صیغۂ واحد ہو۔ جیسے من یعمل سوء یجز بہ "جو شخص برا کام کرے گا اس کو بدلا دیا جائے گا"۔ لکن البرّ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر "نیکی اس شخص کی ہے جو ایمان لائے خدا اور روزِ قیامت پر"

اس سے بڑھ کر شدید غلطی کیا ہو گی کہ وھم راکعون کو حال تسلیم کرنے کے باوجود یہ خیال ظاہر کیا جائے کہ وہ اس کے پہلے کے تمام جملوں سے متعلق ہونا چاہیئے۔ حالانکہ اس قسم کے ضمیموں کے متعلق یہ کلیہ قاعدہ ہے کہ وہ آخر کے جملہ ہی سے ملحق ہوتے ہیں۔ پہلے کے جملوں سے متعلق کیا جانا اکثر اہلِ فن کے نزدیک تو ناجائز ہے اور کم از کم مشکوک تو ضرور ہے۔

"زکوٰۃ کو صدقہ واجبہ ہی کے معنی میں قرار دینا درست نہیں ہے۔ خود زکوٰۃ دو قسم کی ہے واجب اور مستحب۔ مستحبی زکوٰۃ کے لیے نصاب وغیرہ کی کوئی شرط نہیں ہے۔

نماز میں زکوٰۃ ادا ہو جانے سے "فعل کثیر" کا ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ "زکوٰۃ" کا دینا خود عبادت ہے۔ اس لیے اس کی طرف توجہ منافی رجوع قلب نہیں ہے۔

قرآن کے آیات کی ترتیب جب بالاتفاق شان نزول کے مطابق نہیں ہے تو جو بھی "لغویت" اس سلسلہ میں ہو اس کی ذمہ داری خدا پر عائد نہیں ہوتی۔ قرآن میں اس وقت مکی، مدنی آیتیں مخلوط ہیں۔ ناسخ مقدم اور منسوخ موخر ہے۔ ایک واقعہ کی آیتوں میں

دوسری آیتیں درج ہیں۔ یہ لغویتیں کیا واقعی خدا کی تنزیل میں ہو سکتی ہیں؟

یہ پہلے کئی دفعہ کہا جا چکا ہے کہ اس وقت بحث صرف خلافت حضرت علیؑ کی ہے۔ دوسرے ائمہ کی امامت اس وقت معرضِ بحث میں نہیں ہے۔ بار بار اس بحث کو بیچ میں لانا میدانِ بحث سے ہٹنا نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر یہ کہ الٰہی خطابات کی اصل وضع تو اسی کی مقتضی ہے کہ مخاطب وہی لوگ ہوں جو بوقتِ خطاب موجود ہیں۔ اس لیے انما ولیکم کا خطاب براہِ راست اسی طبقہ کے ساتھ ہے جو اس وقت موجود تھا۔

ان کے لیے خدا کی ولایت، رسولؐ کی ولایت، اور ایسے امام کی ولایت جو فصلِ رسول کے بعد امرِ خلق کا ذمہ دار ہونے والا ہو بتلا دی گئی۔ کیونکہ اس وقت اتنے ہی کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد جو ائمہ ہوں گے ان کا تقرر ان ہی رسول یا امام کی زبانی ہو جائے گا۔ پھر انّما کا حصر ان ولایتوں کے خلاف اور ان سے برسرِ مقابلہ ہوں۔ لیکن دوسری ولایتیں اگر خود ان اولیاء کی جانب سے ثابت ہوں تو وہ خود انہی کے ولایت میں داخل ہوں گی۔ ان کی نفی اس سے نہیں ہوگی۔

جواب میں تفصیل و اطناب مدِنظر نہیں ہے ورنہ اس سلسلہ میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اس آیت سے استدلال میں جتنے نقائص بیان کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی درست نہیں ہے۔

رہ گیا بعض متعصب علمائے اہلِ سنت کا انکار۔ تو وہ اس دیرینہ اصول کے ماتحت ہے کہ "میٹھا میٹھا ہپ ہپ کڑوا کڑوا تھو تھو"۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ سب شیعہ ہی نہ ہو جاتے اور اہلِ سنت کے مذہب سے وابستہ کیوں رہتے۔"

پانچویں آیت

یا ایها الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلّغت رسالته واللّٰه یعصمک من الناس۔

برقی صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے "اے رسول وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دے جو تیرے رب کی جانب سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔"

مگر کیا واقعی یہی ترجمہ صحیح ہے ؛ کیا قرآن کی بلاغت اس ترجمہ کی متحمل ہے؟

"تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دے ۔ نہیں تو تو نے کچھ پہنچایا ہی نہیں۔"

اس کے معنی کیا ہوئے ؟ سب کے ذیل میں بھی اگر کسی خاص بات پر زور دینا مقصود ہو تب تو خیر مگر وہ برقی صاحب کے مقصد کے خلاف ہے اور اگر واقعی سب باتوں کو بحیثیت مجموعی ہی تبلیغ کا سوال ہے تو اس کے خلاف نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ پوری رسالت کی تبلیغ نہیں ہوگی۔ سب نہیں پہنچایا تو کچھ نہیں پہنچایا۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر یہ آیت اگر ابتدائے بعثت میں نازل ہوئی ہوتی تو خیر۔ لیکن جب رسول اللہؐ اپنی تبلیغ کی پوری عمر صرف کر چکے تو یہ کہنا کہ وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دو جو تمہارے رب کی جانب سے نازل ہوئی ہیں، یہ بھی اسی وقت درست ہو سکتا جب رسول اللہؐ نے کسی خاص بات کی تبلیغ کو اب تک اٹھا رکھا ہو اور ان الفاظ کے ذریعہ سے اسی بات کی تبلیغ کی تاکید کی جائے۔

اب وہ بات کیا ہے ؟ یہی وہ خلا، ابہام، ایجاز وغیرہ وغیرہ ہے

جس کے دور کرنے کے لیے شانِ نزول کی ضرورت ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو شانِ نزول درج کی گئی ہے وہ وہی ہے جو الفاظ آیت کے بالکل مطابق ہے۔ اور اس درجہ قرینِ صحت ہے کہ "م۔ ح" صاحب کو بھی ان الفاظ میں اس کا اقرار کرنا پڑا ہے کہ "یہ واقعہ ہے کہ اس آیت کی تاویل اس سے بہتر نہیں کی جاسکتی۔" مگر واضح ہونا چاہیئے کہ اس شانِ نزول کے بیان میں کوئی تاویل نہیں ہے۔ کیونکہ آیت کا کوئی لفظ اس کے ظاہری معنی سے ہٹایا نہیں جاسکتا بلکہ اس کی تنزیل ہے جو خلافتِ امیرالمومنینؑ پر منطبق ہے۔

ابن تیمیہ ایسے بعض مصنفین کا اپنی ایسی کتابوں میں جو ردِ شیعہ ہی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں اس روایت کو رد کر دینا تو ایک مناظرانہ پالیسی ہے جو کسی سنجیدہ فیصلہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس سے بدرجہا زیادہ ان محدثین کا قول وزن رکھتا ہے جنھوں نے اہل سنت ہونے کے باوجود اس روایت کو درج کیا ہے اور اس کی تائید کی ہے۔ اصولِ کافی سے جو حدیث پیش کی گئی ہے وہ معترض کے لیے اس وقت کارگر ہوسکتی تھی جب اس میں آیت کو خلافت حضرت علیؑ سے غیر متعلق بتایا جاتا۔ مگر ایسا تو نہیں ہے۔ کما تو اس روایت میں بھی کہا گیا ہے کہ :۔ "کان کمال الدین بولایۃ علی بن ابی طالب" دین کی تکمیل ولایت حضرت علیؑ کے ساتھ تھی۔" جو کچھ فرق ہے وہ تاریخ کا کہ اس میں غدیر کی بجائے یہ واقعہ عرفہ کے دن کا بتلایا گیا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ تاریخ کے اختلاف سے اصل واقعہ میں اختلاف نہیں سمجھا جاسکتا۔

"م۔ ح" صاحب خداوندِ عالم کے مقابلہ میں یہ ایراد وارد فرماتے ہیں کہ "اگر اس کو یہی منظور تھا کہ علیؑ ہی خلیفہ ہوں تو کیوں نہ پہلے سے ایک بڑی جماعت میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جو اس اعلان کے سننے کے بعد اس کے

تسلیم و اعتراف میں بیت و لعل نہ کرتی ۔"

اس کا جواب خود قرآن مجید نے اس آیت کے آخر میں دے دیا ہے کہ "واللہ لا یہدی القوم الظالمین" خدا ظالمین کی جبریہ ہدایت نہیں کیا کرتا ۔"

ورنہ کہا جا سکتا ہے کہ نوحؑ کو نبی بنانا ہی تھا تو ایک بڑی جماعت ایسی کیوں نہ پیدا کر دی جو ان کی تصدیق کرتی ۔ طوفان کے عذاب کی نوبت ہی نہ آتی اور اسی طرح تمام دوسرے انبیاء کے لیے جنھیں امتوں کے ہاتھوں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچیں بالکل ویسے ہی حضرت علیؑ کی خلافت کا مسئلہ ہے ۔

ادھر سے صاف اعلان کر دیا گیا ہے ۔ کہ :-

"لا اکراہ فی الدین قد تبیّن الرّشد من الغی ۔" دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہے ۔ بس اتنا کافی ہے کہ ہدایت گمراہی کے طریقہ سے ممتاز ہو کر سامنے آ جائے ۔" اس کے بعد جبر و تشدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

رہ گیا یہ امر کہ اس معاملہ کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اگر یہ نہیں تو پوری رسالت کچھ نہیں ۔ اس کا راز بالکل صاف ہے ۔ رسول اللہؐ کی عمر محدود اور آپ کی علانیہ تبلیغ کی مدت صرف تیرہ برس ۔ اس میں اسلام بہت پھیلا ۔ لیکن پھر بھی جزیرۃ العرب سے آگے نہیں بڑھا ۔ لیکن آپ کی رسالت کی عمر آخر قیام دنیا تک اور اس کا دائرہ تمام دنیا کے لیے ہمہ گیر ۔ رسول اللہؐ کے زمانہ میں مسلمانوں کی ہدایت براہ راست آپ کی تبلیغ سے متعلق لیکن اس کے بعد کے لوگوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ یہی ہے کہ آپ کی جانب سے جانشینی کا نظام قرار دیا جائے جو آپ کے بعد ہدایت خلق کا ذمہ دار ہو سکے ۔ اگر یہ نہیں ہوا تو آپ کے بعد ہمیشہ کے واسطے مسلمان تاریکی میں مبتلا ہو گئے اور نور سے محروم کر دیے گئے ظاہر ہے

کہ آپ کے بعد کے تمام مسلمانوں کی ہدایت جو رسالت کا مفاد ہے اس کے لحاظ سے صرف اتنے مسلمانوں کی جو رسول کے زمانہ میں تھے وہ نسبت ہے جو اقلیت کے لحاظ سے کالعدم ہے اور اس لیے اگر ان تمام مسلمانوں کی ہدایت کا ہمیشہ کے واسطے کوئی انتظام نہ ہوا تو یہ تیرہ یا زیادہ سے زیادہ بیس برس کی رسالت بھی بے کار ہے۔ اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

خدا نے مسئلۂ خلافت کے متعلق صریح احکام کیوں نازل نہیں کیے؟ صریح سے مراد بظاہر یہ ہے کہ نام کی تصریح کے ساتھ اس کے متعلق پہلے کے مضمون میں کافی تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

یہ ایک حکیمانہ روش تھی جس کی بناء پہ دلائل خلافتِ علیؑ اب تک قرآن میں موجود رہ گئے، ورنہ اتنا بھی نہ رہتا یا آج قرآن مسلمانوں میں متنازعہ حیثیت ہی نہ رکھتا ہوتا۔

اس کے بعد "ولایت علیؑ" کو اگر راز کہا گیا ہو تو اس سے مقصود حضرت علیؑ کی روحانی و معنوی وہ شان اور جلالت ہے جس کو دنیا کے عام افراد سمجھنے کے قابل نہیں ہیں۔ نہ آپ کی خلافت جو قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے اور ہرگز کوئی رازِ درونِ پردہ نہ تھی۔

پانچویں تنقیح

حضرت علیؑ کی رائے خلفائے ثلثہ کے بارے میں

باوجودیکہ حضرت علیؑ کا خلافتِ ثلثہ سے اختلاف ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا اعتراف اکثر دوسرے افراد کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ

بزمی صاحب کا یہ فقرہ پہلے بھی نقل کیا جا چکا ہے۔

"یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت سے ان کو انکار و اختلاف تھا۔"

لیکن پھر بھی خواہ مخواہ اس کی کوشش ضروری سمجھی جاتی ہے کہ حضرت علیؑ کے اقوال سے خلفائے ثلٰثہ کی خلافت کی تائید کی جائے۔

اس سلسلہ میں عام طور پر "نہج البلاغہ" کے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں لیکن اس موضوع پر امامیہ مشن لکھنؤ کی شائع کردہ کتاب "ابوالائمہ کی تعلیمات" میں اتنی مکمل بحث کر دی گئی ہے جس کے بعد کچھ لکھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ ناظرین کو اسی کتاب کے مطالعہ کی دعوت دینا کافی ہے۔

بزمی صاحب نے اس سلسلہ میں جو حوالے دیے ہیں وہ نہایت پُر لطف ہیں۔

۱۔ "کتاب الفتوح ابنِ عاصم کوفی" اس نام کی کوئی کتاب مجھے معلوم نہیں۔ بظاہر اس سے اعثم کوفی کی تاریخ مراد ہے۔ لیکن اعثم کوفی ایک ایسا خوش قسمت انسان ہے جس کے حوالے شیعوں کی کتابوں میں سنی کہہ کر درج ہیں اور بزمی صاحب اس کو شیعہ کہہ کر حوالہ دے رہے ہیں حقیقت میں ایسے مجہول مؤلف کی کتاب نہ ان کے لیے سند ہو سکتی ہے نہ ان کیلئے۔ اس کی شخصیت ہی کا آج تک پتہ نہیں چلا۔ کہ وہ تھا کون؟ اور کس زمانہ اور کس پایہ کا شخص تھا۔

۲۔ "شرح نہج البلاغہ مطبوعہ طہران"۔ اس کے لیے ضرورت تھی، یہ لکھا جاتا کہ کون سی شرح، اس لیے کہ نہج البلاغہ کی متعدد شرحیں چھپی ہیں جن میں سے بعض سنیوں کی ہیں اور بعض شیعوں کی ہیں۔ پھر کیا معلوم ہو سکتا ہے

کہ وہ مضمون کس شرح میں درج ہے۔

۳۔ "اتواق الممایت" از یحییٰ بن حمزہ شیعہ زیدی۔ میں اپنے معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس نام کی کوئی کتاب شیعی مؤلفات میں موجود نہیں ہے۔ "یحییٰ بن حمزہ" بھی شیعی مؤلفین میں کوئی نہیں ہیں۔

۴۔ "فصولِ امامیہ"۔ اس کتاب کا بھی وجود کہیں نہیں ہے۔ "فصول مہمہ" ایک کتاب ہے مگر وہ ابن صباغ مالکی کی ہے جو علمائے اہلسنّت میں سے تھے۔

تفسیر قمی کا ایک حوالہ درست دیا گیا ہے، مگر دیکھئے تو اس میں ہے کیا؟ یہ کہ جناب ابوبکر نے حضرت رسول اللہؐ کے اخبار بالغیب پر شک کا اظہار کیا۔ جس پر حضرت نے معجزہ دکھلایا تو آپ نے کہا۔ یا رسول اللہؐ آپ بے شک سچے ہیں۔ اس سے تو حضرت ابوبکر کے ایمان بالرسول کی بڑی کمزوری ظاہر ہوتی ہے نہ یہ کہ کوئی فضیلت پیدا ہوتی ہو۔

کیا ایسے ہی حوالوں کے ساتھ ان روایات کا معارضہ کیا جا سکتا ہے جو شیعوں کی جانب سے کتب اہل سنّت میں سے پیش کی جاتی ہیں۔ جن کے لکھنے والے مسلّم الثبوت حفاظ و محدثین اور ائمہ تفسیر و مورخین ہیں۔ اور جن کی شخصیت ناقابلِ انکار ہے۔

چھٹی تنقیح

سنّی شیعہ اختلاف میں سیاسی اغراض کی کارفرمائی

افسوس ہے کہ سنّی شیعہ اختلاف کے سلسلے میں مذہب شیعہ پر یہ ذمہ داری

عائد کی جاتی ہے کہ وہ سیاسی اغراض کے ماتحت عالم وجود میں آیا ہے حالانکہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے شیعہ مذہب تو صرف آیات و احادیث پر مبنی ہے لیکن سنی مسلک صرف دنیاوی ڈپلومیسی سے دنیا میں قائم ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس مذہب نے اپنا سنگ بنیاد ہی خدا و رسولؐ سے الگ کر کے قائم کیا ہو، جس مذہب نے پیشوائی کا کوئی معیار ہی قرار نہ دیا ہو بلکہ جیسا رنگ زمانہ کا دیکھا ہو ویسا ہی اصول بنا لیا ہو۔ اس لیے اجماع اور اس کے بعد استخلاف اور پھر شوریٰ، آخر میں قہر و غلبہ اصول اساسی میں قرار دیا گیا ہو، جس مذہب میں بادشاہانِ دنیا کو "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" کے ماتحت خدا و رسولؐ کا ہم پلہ قرار دے لیا جائے وہ تو سیاسی اغراض کا نتیجہ نہ ہو اور جس مذہب میں سوائے "قال اللہ و قال الرسول" کے کچھ اور بات ہی نہ مانی جاتی ہو، جہاں مال و دولت سے کنارہ کشی کی گئی ہو اور ظاہری شان و شوکت کو کوئی چیز نہ سمجھا گیا ہو وہ سیاسیات کا نتیجہ قرار پائے۔

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"

بنی امیہ کے زمانہ میں کس طرح احادیث وضع کیے جاتے تھے، کس طرح وضع احادیث پر انعامات دیے جاتے تھے، کس طرح حضرت علیؑ کے فضائل و کمالات پر پردہ ڈالا جاتا تھا اور کس طرح دنیا کو اہل بیتؑ سے ناواقف بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ بہت مبسوط باب ہے جس کے لیے اب نہ وقت میں وسعت ہے، نہ قلم کو لکھنے کا حوصلہ باقی ہے۔

* * *

ساتویں تنقیح

کیا نفرت وعناد کی اسپرٹ شیعی مذہب کی وہ خصوصیت ہے جو اس کے اصلاحی یا الہامی ہونے کے خلاف ہے؟

یہ وہ اعتراض ہے جو شیعہ فرقہ پر عام طور پر کیا جاتا ہے۔ اسے آزمی صاحب نے بھی بڑی اہمیت دے کر پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ محبت و ہمدردی ہر اصلاحی مذہب کا بنیادی اصول ہے۔ لیکن دنیا میں یہ امتیاز صرف شیعہ مذہب ہی کو حاصل ہے کہ اس کی بنیاد محبت واخوت کے بجائے نفرت وعناد کے جذبات پر قائم کی گئی ہے۔

چونکہ اس بحث میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مبسوط اور پُرزور مقالہ لکھا ہے جو اپنے دلائل کے لحاظ سے اس بحث میں ایک فیصلہ کُن حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس مقالہ کو یہاں درج کیا جاتا ہے اور یہی اس تبصرہ کا آخری جزو ہے۔

⁂

تولّا و تبرّا

(از مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم)

سچ یہ ہے کہ پل صراط کی راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور اس کے نیچے آتشِ جہنّم کے شعلے بھڑک رہے ہیں لیکن اس کا سامنا صرف قیامت پر ہی کیوں اٹھا رکھا جائے۔ الدنیا مزرعۃ الآخرۃ آج دنیا کے سفر میں بھی پُل صراط ہر شخص کے سامنے ہے۔

یہ پل صراط درحقیقت اخلاق کی دشوار گزار راہ ہے۔ جذبات و امیال انسانی کے اعتدال کا لاینحل مسئلہ ہی پل صراط ہے۔ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز۔ اور اس کے نیچے ہلاکت و بربادی کا قعر، آدم کی اولاد میں سے کوئی نہیں جس کو اس پر ایک بار نہ گزرنا ہو۔ وان منکم الا واردھا کان علیٰ ربک حتما مقضیا۔ ”تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر سے نہ گزرے۔ یہ ایک وعدہ اور فیصلہ ہے جس کو خدا نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔“

اخلاق کے سینکڑوں مشکل مسائل میں سے ایک مشکل تر مگر اصولی مسئلہ بغض و حسد، تولّا و تبرّا، تحسین و تذلیل، اور عفو و انتقام کا بھی ہے۔ ایک طرف اخلاق ہم کو تلقین کرتا ہے کہ دل کو محبت کے لیے مخصوص کرو کہ اس گھر کے لیے یہی قانون موزوں ہے۔ انیس سو برس پہلے کا ایک اسرائیلی واعظ کہتا ہے کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو۔ کیونکہ اگر صرف چاہنے والوں کو چاہا، تو تمہارے لیے کیا اجر۔

اخلاق کے اوّلین اور سامنے کے سبق یہی ہیں کہ پیار کرو، خاکسار بنو، کسی سے بغض نہ رکھو۔ سب کی عزت کرو۔ انسان کی انسانیت کا بغیر تفریق ادب کرو۔ اور جس کو سامنے دیکھو سر جھکا دو۔ سوسائٹی نے بھی صدیوں سے ان تعلیموں کو اعتقاداً قبول کرلیا ہے اور اصطلاحی اخلاق، مروّت، پاس و لحاظ، شرم و حیا، شرافت، انسانیت تمام الفاظ ان ہی معنوں میں بولے جاتے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلہ میں اسی اخلاق کا ایک دوسرا پارٹ ہے، جہاں آ کر اس کی یہ غریب و مسکین صورت ایک سخت اور جابرانہ خشونت سے مبدل ہو جاتی ہے اور دنیا میں اگر اس کی صدا پہلی تعلیم دیتی ہے تو خود اس کا عمل دوسری شکل میں سامنے آتا ہے۔ وہ چور کو قید کرتا ہے۔ اتنی ہی بدی کو برا بھی کہتا ہے، زید کو کہتا ہے کہ وہ نیک ہے اس لیے کہ اچھا ہے۔ عمر کو کہتا ہے کہ تم بداعمال ہو، اس لیے برے ہو۔ ظالم سے اس کے ظلم کا اور مجرم سے اس کے جرم کا مطالبہ کرتا ہے۔ پہلی حالت میں جس قدر عاجز تھا اتنا ہی اس حالت میں مغرور و متکبر ہو جاتا ہے۔ پہلے اگر عاجزوں کے جھکے ہوئے سروں کو اٹھا کر اپنے سینہ پر جگہ دیتا تھا تو اب سرکشوں کے سروں کو اپنی ٹھوکروں سے پامال کرتا ہے اور پھر ساتھ ہی حالت یہ ہے کہ اس کی پہلی تعلیم سے اگر صرف معبدوں اور خانقاہوں میں رونق پیدا ہوتی تھی تو اس عمل سے پوری دنیا میں انتظام اور قانون قائم ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں اصول کے لیے ایک سخت تصادم اور کشمکش پیدا ہو جاتی ہے اور فیصلہ ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان متضاد حالات میں راہ تطبیق کیا ہے؟ عفو و درگذر کے اصول سے کام لیجیے تو دنیا سے نیکی و بدی کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ انتقام و پاداش کی راہ اختیار کیجیے تو دنیا سے رحم و محبت نابود ہو جاتی ہے۔ سب کو اچھا کہیے تو صرف اچھوں کے لیے آپ کے پاس ہے، برائی کیجیے

تو اس کے حدود فیصلہ کن اصول کیا ہیں؟

آج ملک میں جو طبقہ شخصی حکومت کے جراثیم سے مریض ہو رہا ہے۔ وہ گو خود جاں بلب ہے مگر اس کی نظر اپنے مرض پر نہیں بلکہ دوسروں کی شکایتوں پر ہے۔ غلامی کے حلقوں کے لیے سب کے کان چھیدے ہوئے ہیں۔ پاؤں برسوں سے بوجھل بیڑیوں کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان حلقوں اور بیڑیوں کے لیے ضرور نہیں کہ وہ تخت و تاج ہی کی طرف سے بخشے گئے ہوں۔ بلکہ ہر چاندی کا ڈھیر، ہر قیمتی کپڑا ہر قیمتی موٹر، ہر ہوٹل کی اعلیٰ ترین منزل کا مقیم اور ہر وہ مدعی جن کے گلے میں طاقت اور جیب میں سکے ہوں ایک قانونی اور موروثی حق رکھتا ہے کہ جس کو چاہے اپنے حلقۂ غلامی کے انتساب کا فخر دیدے۔

رسولِ عربیؐ کے وقت تین سو ساٹھ بُت تھے جس سے بیتِ خلیل کی دیواریں چھپ گئی تھیں لیکن آج اس کی امت میں ہر چمکیلی ہستی لات و منات کی قائم مقام ہے اور ہر حاکم، ہر رئیس، ہر حکام رس اور سب سے آخر مگر سب سے پہلے ہر خوش لباس لیڈر ایک بُت کا حکم رکھتا ہے۔ پوری ملت موحد ان کی پوجا اور پرستش میں مشغول ہے۔ اور بعینہ اس پرستش کا وہ ہی جواب رکھتی ہے جو قریش مکہ کے پاس تھا۔ کہ مانعبدھم الا لیقربوھا الی اللہ زلفی۔ ۳۸ : ۴

ویعبدون من دون اللہ ما لا ینفعھم شیئاً ولا یضرھم ویقولون ھؤلاء شفعاؤنا۔

اس انسان پرستی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ بالعموم طبیعتیں مدح و تحسین کی عادی ہو گئی ہیں۔ نکتہ چینی اور نقد و اعتراض کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ ہر شخص مخاطب سے اگر کوئی قدرتی امید رکھتا ہے تو وہ یہی ہوتی ہے کہ مدح و منقبت کا ترانہ سنائے اور بادۂ تحسین و آفرین کی پے در پے بخشش سے ساقی کا ہاتھ کبھی نہ تھکے۔

شرکت و بت پرستی کے اس عام سکون میں اگر کوئی صدائے توحید خلل انداز ہوتی ہے تو ہر طرف سے اپنے ایک قدیمی پنشنر کی طرح لئن اتخذت الٰها غیری لاجعلنک من المسجونین ۔

"اگر میرے سوا کسی دوسری ذات کو تو نے اپنا معبود بنایا تو میں تجھ کو قید کر دوں گا۔" ۲۶ : ۲۹ - کا غُل مچ جاتا ہے۔ اورصرف یہ معبودانِ باطل ہی نہیں بلکہ ان کے پرستار بھی چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں ۔

یہ ایک قدیمی سنت ہے اور دنیا میں جب کبھی بھی سچائی آتی ہے تو اس کو ہمیشہ ایسے ہی لوگوں سے مقابل ہونا پڑا ہے ۔

فما کان جواب قومه الا ان قالوا حرقوه وانصروا الهتكم ان كنتم فاعلين ۲۱ : ۱۸

ایسے موقعوں پر عموماً اخلاقی مواعظ سے کام لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بڑے آدمیوں پر حملہ کرنا انسانیت اور تہذیب کے خلاف ہے ۔ گالیاں دینا کوئی عادت نہیں ۔ اختلاف رائے ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے ۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ مخالف آراء رکھنے والوں کی تذلیل و تحقیر کی جائے ۔ پھر اگر ایسا کرنے کے لیے آپ مجبور ہیں تو ذرا لہجہ نرم کیجئے اور شکایت بھی کیجئے تو شکر کے لہجے میں کیجیے۔ محبت و نرمی سے کام نکلے تو سختی دکھلانا شانِ شرافت نہیں ۔

آج کل بھی کہ ہشیاری اور بیداری کی نہیں تو خمار و سرشاری کی ایک کروٹ تو مسلمانوں نے ضرور بدلی ہے، نکتہ چینوں کی زبانوں کو ایسے ہی ظاہر فریب اور اخلاقی جملوں سے بند کیا جا رہا ہے ۔

پس ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے اصولاً اس مسئلہ پر غور کریں ، کہ

فی الحقیقت اس بارے میں کوئی فیصلہ ہمارے پاس ہے یا نہیں۔

کسی کو بُرا کہنا یقیناً اچھی بات نہیں۔ دل محبت کے لیے ہے نہ کہ عداوت کے لیے۔ لیکن کیا ایسی صورتیں بھی ہیں جن میں یہ برائی ہی سب سے بڑی نیکی اور بھلائی ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلے اسے اخلاق کے علمِ اصول کے لحاظ سے دیکھیے، جب بھی فیصلہ صاف ہے۔ دنیا میں جس دن اخلاق نے کہا کہ نیکی کو نیک اور نیک عمل کو اچھا کہو کیونکہ بغیر اس کے دنیا میں نیکی زندہ نہیں رہ سکتی، اسی وقت سے اس نے ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ نیکی کی خاطر بدی کو بُرا اور بد عمل کو قابلِ نفرین سمجھو، کیونکہ نیکی کو اس کا حقِ تحسین مل نہیں سکتا۔ جب تک بدی کو اس کی سرزنش اور نفرین نہ مل جائے۔

زیادہ غور کیجیے تو یہ ایک قدرتی اور عام معمولی بات ہے کہ گو اس کا آپ کو حس نہ ہو، دنیا میں اخلاقی محاسن و فضائل کا اگر کوئی وجود ہے، تو صرف ان کے اضداد کے تقابل ہی کا نتیجہ ہے۔ جب تک رذائل انسانی کو نمایاں نہ کیجیے گا فضائل انسانی وجود پذیر نہ ہوں گے۔

اس کے لیے روشنی اور تاریکی کی مثال شاید مقصد میں معین ہو کہ روشنی کا وجود صرف تاریکی کے وجود ہی کا نتیجہ ہے۔ رہا اخلاقی تلقینات اور اعمال کا اختلاف تو یہ تو اخلاق کے ہر مسئلہ میں درپیش ہے۔ مگر درحقیقت دونوں صورتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اخلاق دنیا میں کسی شے کو فی نفسہٖ اچھا یا بُرا کہنے کا فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس کی ہر تعلیم نسبت و اضافت سے وابستہ ہے اور اس کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔ کوئی شے اس کے آگے نہ تو اچھی ہے اور نہ بُری۔ ایک ہی چیز کا بعض حالتوں میں نام نیکی ہوتا ہے

اور بعض حالتوں میں بدی۔ یہی حاصل اس مسئلہ کا بھی عفو، درگذر، آشتی و محبت نرمی و عاجزی، انسان کے لیے سب سے بڑی نیکی ہیں۔ لیکن کن کے سامنے؟ عاجزوں اور درماندوں کے سامنے، نہ کہ ظالموں اور مجرموں کے آگے۔ ایک مسکین اور فلاکت زدہ سے یہ رحم کیجئے تو سب سے بڑی نیکی اور ایک ظالم پر کیجیے تو سب سے بڑی بدی ہے۔ گرے ہوؤں کو اٹھائیے تاکہ وہ چل سکیں لیکن اگر سرکشوں کو ٹھوکر نہ لگائیے تو وہ گرے ہوؤں کو اور گرا دیں گے۔ قانون کو دیکھیے تو وہ جرم کو روکنے کے لیے خود جرم کرتا ہے۔ خونریزی اس کے سامنے سب سے بڑی معصیت ہے۔ لیکن خونریزی کو روکنے کے لیے وہ قاتلوں کے خون بہانے ہی میں امن دیکھتا ہے۔ قاتل کا قتل بدی تھا لیکن عدالت کا فتویٰ قتل نیکی ہو گیا۔

ہم نے بغیر کسی ترتیب کے چند جملے پھیلا دیے۔ کیونکہ یہ اخلاق کے ایسے عام اعمال ہیں جن کو یاد دلا دینا ہی کافی ہے۔ پس جو لوگ کہتے ہیں کہ ہر انسان اخلاقاً نرمی و آشتی و محبت و عفو کا مستحق ہے اور کسی کا برائی کے ساتھ ذکر کرنا اخلاق کے اصول کے خلاف ہے وہ اخلاق کے نام سے ایسی سخت بداخلاقی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس پر اگر ایک لمحہ کے لیے بھی عمل کیا جائے گا تو دنیا شیطان کا تخت گاہ بن جائے گی۔ نیکی اور اعمالِ صالحہ کا نظام درہم برہم ہو جائیگا قانون، اخلاق، مذہب، حسن و قبح کی تمیز، اور نور و ظلمت کی تفریق کوئی بھی خدا کو خوش کرنے والی چیز دنیا میں باقی نہ رہے۔

یاد رکھو کہ ہر محبت کے لیے ایک بغض لازمی ہے اور کوئی عاجزی نہیں کر سکتا جب تک کہ متکبر و مغرور نہ ہو۔ نیکی کو اگر پسند کرو گے تو اس کی خاطر بدی کو برا کہنا ہی پڑے گا۔ خدا کو خوش رکھنا ہے تو شیطان کو [illegible]

البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے فیصلہ کن حدود معین ہونے چاہئیں۔ نرمی و رحمدلی اور عفو و درگذر کے مقامات کیا کیا ہیں اور سخت گیری، پاداش اور انتقام کا حق کس موقع پر حاصل ہوتا ہے۔

عام اخلاق کے اصول بھی ان سوالوں کا جواب شاید دے سکتے ہیں مگر ہم تو دنیا کی ہر شے کو مذہب ہی میں ڈھونڈتے ہیں پھر اس کے بعد نہیں جانتے کہ دنیا میں اور کیا کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاتھ میں قرآنِ کریم ایک امامِ مبین بتیانا لکل شیئ بیان للناس، نور و کتاب مبین۔ اور انسان کے ہر اختلاف و نزاع کے لیے ایک حاکمِ ناطق ہے۔ اور پھر اس کا عملی نمونہ اور وجود ظلی اس کے حامل اور مبین کی زندگی کے اعمال ہیں کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ پس ان سوالوں کا جواب بھی وہیں ڈھونڈنا چاہیئے۔

اسلام نے اپنی تعلیم و دعوت اور اپنی امت کے قیام و بقاء کے لیے اساس اوّلین اور نظام بنیادی ایک اصول کو قرار دیا ہے۔ اور اس کو وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر کرتا ہے۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف
وینھون عن المنکر اولٰئک ھم المفلحون۔ ۳ - ۲۱

"تم میں ایک جماعت ہونی چاہیئے جو دنیا کو نیکی کی دعوت دے۔ بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے وہی فلاح یافتہ ہیں۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بطور ایک اصول کے پیش کیا ہے اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کا اس کو فرض قرار دیا ہے۔ لیکن اس رکوع میں آگے چل کر دوسری آیت ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنھون عن المنکر وتؤمنون باللہِ ۔ ۱۹۶

" تمام امتوں میں تم سب سے بہتر امت ہو کہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

ایک تیسری آیت میں مسلمانوں کا یہ عملی امتیاز اور قومی فرض زیادہ نمایاں طور پر بتلایا ہے :۔

وکذالک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ۔ ۲ : ۱۲۷۔

" اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی اور وسط کی امت بنایا ۔ تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ بنو اور تمھارے مقابلہ میں تمھارا رسولؐ گواہ ہو۔"

الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

اسلام نے اپنی تعلیم و دعوت اور اپنی امت کے قیام و بقار کے لیے اساس اوّلین اور نظام بنیادی ایک اصول قرار دیا ہے ۔ اور اس کو وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے تعبیر کرتا ہے ۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر اولئک ھم المفلحون ۔ ۳ : ۲۰۱

" تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیئے جو دنیا کو نیکی کی تعلیم دے، بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے ، وہی فلاح یافتہ ہیں ۔"

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بطور ایک اصول کے پیش کیا ہے ۔ اور بظاہر مسلمانوں میں سے ایک گروہ

خاص کو اس کا فرض قرار دیا ہے لیکن اس رکوع میں آگے چل کر ایک دوسری آیت ہے:-

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ۔ ۳ : ۱۹۶

"تمام امتوں میں تم سب سے بہتر امت ہو کہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی اور وسط کی امت بنایا تاکہ لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ بنو اور تمھارے مقابلہ میں تمھارا رسولؐ گواہ ہو۔"

تفسیر آیات :-

ان تینوں آیتوں میں خدا تعالی نے خاص طور پر مسلمانوں کا اصلی مشن مقصدِ تخلیق، قومی امتیاز اور شرفِ خصوصی ایسی چیز کو قرار دیا ہے کہ گو دنیا میں اعلانِ حق ہر برگزیدہ ہستی اور جماعت کا فرض رہا ہو مگر مسلمانوں کا تو سرمایۂ زندگی یہی فرض ہے۔ وہ دنیا میں اس لیے کھڑے کیے گئے ہیں کہ خیر کی طرف داعی ہوتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی کو جہاں کہیں دیکھتے ہیں اپنے تئیں اس کا ذمہ دار سمجھ کر روکتے ہیں۔ آخری آیت میں کہا کہ تم کو ایک وسطی امت بنایا گیا تاکہ تم اوّلین و آخرین کے لیے گواہ بن سکو اور اس امر کی کہ تم نے اپنا فرض ادا کیا یا نہیں تمھارا رسولؐ امین، اللہ کے آگے گواہ ہو۔ اخلاق کے تمام دفتر کا تعین قرآن کے اسی اصل اصول پر قائم ہے۔

گو تفصیل کا موقع نہیں مگر ان آیات کے متعلق چند تفسیری اشارات کر دینا فہمِ مقصد میں معین ہوگا۔

امر بالمعروف حکمِ عام ہے۔

دوسری آیت میں اس لیے المعروف اور المنکر پر الف لام استغراق کے لیے آیا تاکہ بقول امام رازی معروف اور منکر میں کوئی تخصیص و تحدید باقی نہ رہے اور ظاہر ہو جائے کہ وہ ہر نیکی کے لیے آمر اور ہر بدی کے ناہی ہیں۔ عام اس سے کہ وہ کہیں پر اور کسی صورت میں ہو۔ وھٰذا یقتضی کونھم امرین بکل معروف وناھین عن کل منکر۔ تفسیر کبیر جلد ۲ ص۲۲۵۔

مسلمانوں کے ملّی شرف و فضیلت کی علّت:۔

خیر امۃ اخرجت للناس کے بعد امر بالمعروف کا ذکر کیا اور یہ اس لیے کہ پہلے وصف بیان کرکے پھر اس کی علّت بیان کی جائے۔ یعنی مسلمانوں کا بہترین امت سے ہونا صرف ان کے وصف پر منحصر ہے۔ کہ وہ آمر بالمعروف و ناہی عن المنکر ہیں۔ خیر کی دعوت دیتے ہیں اور شر سے روکتے ہیں۔

کما یقال زید کریم یطعم الناس ویکسوھم۔ اور یہیں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ وصفِ امتیازی ان سے جاتا رہے تو پھر وہ بہترین امّت ہونے کے شرف سے بھی محروم ہو جائیں اور ان کا وہی قومی امتیاز ان میں باقی نہ رہے۔

تیسری آیت کی تفسیر:۔

تیسری آیت میں ان کو وسط کی امت قرار دیا اور پھر اس کا سبب یہ بیان کیا کیا کہ "تاکہ تم لوگوں کے لیے گواہ ہو۔" افسوس ہے کہ اس صاف اور سلجھی ہوئی بات میں بھی ہمارے بعض مفسرین نے لاحاصل بحثیں پیدا کر دیں اور اس بحث میں پڑ

گئے کہ یہ شہادت دنیا میں ہوگی یا آخرت میں - اسلام کا اصلی کارنامہ غیر فانی دنیا ہی کی اصلاح تھا۔ مگر مفسرین اس کی طرف سے اس درجہ غافل ہیں کہ ہر شے کو آخرت ہی پر اٹھا رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر اسی شہادت کا حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ذکر کیا گیا ہے کہ کنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم "میں اپنی امت پر شاہد تھا جب تک کہ ان میں موجود تھا۔"

اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنی امت میں دنیا کے اندر ہی موجود تھے، نہ کہ آخرت میں۔ بس یہاں بھی شہادت سے وہی شہادت مراد ہے۔ جو دنیا کی زندگی میں انجام دی جاسکتی ہے۔ تاہم علامہ رازی کا ہمیشہ ممنون ہونا پڑتا ہے کہ وہ گو ہر آیت کے متعلق طرح طرح کی توجیہات جمع کر دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی ایک نہ ایک ایسی توجیہہ ضرور اُن میں موجود ہوتی ہے جو اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے اور وہی خود ان کی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ اس آیت کے متعلق بھی انھوں نے دوسرے قول کو بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ بالکل صاف اور غیر پیچیدہ ہے۔ ج ۱ : ۳۴۔

امت وسطا:-

اصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مسلمانوں کا فرض منصبی قرار دیا اور فی الحقیقت ایسا کرنا دنیا میں عدلِ حقیقی کو قائم کرنا تھا برائی اگر روک دی جائے اور نیکی کو رائج کیا جائے تو دنیا کے نظم کے قوام کا اس کے علاوہ اور کیا اعتدال ہو سکتا ہے۔ عدل کے معنی ہیں عدم افراط و تفریط کے یعنی کسی شے کا نہ زیادہ ہونا اور نہ کم ہونا۔ اور درجہ مقام (وسط) اور درمیانی ہے۔

گناہ کی حقیقت اور اصطلاحِ قرآنی میں "اسراف"

دنیا کی جس قدر برائیاں ہیں، غور کیجئے تو وہ افراط یا تفریط کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ انسان کے تحفظ خود امتیازی اور حفظ حقوق کے لیے غیبت، غضب اور ہیجان کا ہونا ضروری تھا لیکن جب یہ جذبات اپنی حد سے آگے قدم بڑھاتے ہیں تو فطرت کی بخشی ہوئی ایک شے جو یقیناً نیکی تھی یکایک بدی بن جاتی ہے۔ اور ان کا نام جرم اور گناہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی اصطلاح میں ہر جگہ معصیت اور گناہ کے لیے اسراف کا لفظ اختیار کیا۔

یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ

"اے وہ میرے بندو کہ تم نے اپنے نفسوں پر اسراف کیا ہے رحمت الہی سے مایوس نہ ہو۔"

یہاں مسرفین سے مراد سخت درجہ کے گنہگار اور معصیت شعار انسان ہیں۔ کیونکہ آیت کا شانِ نزول نیز آگے چل کر ان اللہ لیغفر الذنوب جمیعا کہنا اس کی پوری طرح تشریح کر دیتا ہے۔ اسراف کی تعریف صرف الشئ فیما ینبغی زائدا علیٰ ما ینبغی اور تجاوز الحد فی کل شئی راغب ہے۔

یعنی کسی چیز کو اس کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور ہر شئے کا اپنی حد سے تجاوز کر جانا۔

اس سے بڑھ کر گناہ کی تعریف کیا ہو سکتی تھی کہ وہ قوتوں اور خواہشوں کے بے اعتدالانہ خرچ کا نام ہے۔

اسراف کے علاوہ اصطلاح قرآنی میں ایک لفظ تبذیر بھی ہے۔ جیسا کہ

فرمایا۔ ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔ "بے موقع اور بے ضرورت مال و دولت کو ضائع کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔" لیکن تبذیر اور اسراف میں ایک باریک فرق یہ ہے۔ کسی شے کے خرچ کرانے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض چیزیں خرچ تو کی جاتی ہیں ان کے ٹھیک ٹھیک مصرف میں۔ لیکن تعداد صرف ضرورت اور حد معینہ سے زائد ہوتی ہے۔ اور طریق صرف صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک مجرم پر اس کے قصور سے زیادہ غضبناک ہونا اور مناسب سزا دینے کی جگہ مار پیٹ سے کام لینا۔ بے شک ایک مجرم کو اس کے جرم کی پاداش ملنی چاہیئے۔ اور اسی لحاظ سے آپ کے غصہ کا خرچ صحیح مصرف میں ہوا۔ لیکن جس مقدار اور جس صورت میں غصے کو آپ خرچ کر رہے ہیں یہ اس کے حدود اور اس کی ضرورت سے زیادہ ہے اور اسی کا نام اسراف ہے۔ برخلاف تبذیر کے کہ اس کی تعریف صرف الشیئ فیما ینبغی بیان کی گئی ہے۔ یعنی کسی چیز کو اس کے مصرف کے علاوہ دوسری جگہ خرچ کرنا مثلاً دولت نفس کے ضروری آرام و آسائش اعزا و اقربا کی اعانت اور اعمال حسنہ میں خرچ کرنے کے لیے ہے۔ مگر آپ اسے محض اپنی جاہ و نمائش دنیوی عزت اور حکام کی نظروں میں رسوخ حاصل کرنے کے لیے یا سلسلۂ مختلفہ مٹانا شروع کر دیں تو صرف قرآن کریم اس کو تبذیر سے تعبیر کرے گا۔ اور چونکہ اس میں نقصان اسراف سے شدید تر ہے۔ اس لیے وعید بھی سخت وارد ہوئی ہے۔ مسرف کے لیے صرف ان اللہ لا یحب المسرفین "خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔" فرمایا اور تبذیر کے مرتکبین کو کانوا اخوان الشیاطین کہہ کر شیطان کے اخوان و اقارب میں شمار کیا گیا۔ اسراف اور تبذیر کا یہ فرق خود قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔ تفسیر بالرائے نہیں ہے۔ یہ دونوں لفظ جہاں جہاں بولے گئے

ہیں اگر ان کا استقصار کیا جائے تو خود بخود یہ فرق ظاہر ہو جائے گا۔ مثلاً کلوا واشربوا ولا تسرفوا ان اللہ لا یحب المسرفین” کھایا اور پیو مگر اسراف نہ کرو، اللہ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

بھوک اور پیاس میں غذا اور پانی کا صرف ایک بالکل صحیح مصرف کا خرچ ہے اور اشیاء کا بے موقع خرچ کرنا نہیں ہے۔ غذا کھانے ہی کے لیے ہے اور پانی پینے ہی کے لیے لیکن اگر حد خواہش اور ضرورت سے زیادہ کھایا جائے تو یہ اسراف ہو جائے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ اسراف مت کرو۔ لیکن ایک دوسرے موقع میں صورت خرچ اشیاء اس سے مختلف تھی۔

واٰت ذی القربیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا۔

" اور اقارب کا حق ان کو دو نیز مسکین اور مسافر کے حقوق ادا کرو اور دولت کو بے جا ضائع مت کرو۔"

یہاں چونکہ مقصود یہ تھا کہ دولت کا مصرف صحیح اعزا و اقارب وغیرہ کے حقوق ادا کرنا ہے۔ پس دوسرے کاموں میں اس کو بے موقع خرچ مت کرو۔ اس لیے اسراف نہیں کہا بلکہ تبذیر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

رجوع الی المقصود

حاصل سخن یہ ہے کہ گناہ، معصیت، فسق، جرم اور ہر وہ شے جس کا شمار برائیوں اور بدیوں میں ہے۔ فی الحقیقت بے اعتنائی اور افراط و تفریط ہی کا نام ہے۔ اس کے مقابلہ میں نیکی اور خیر کو صرف ایک ہی لفظ عدل سے تعبیر کیجیے کہ ہر وہ شے جس میں عدل پایا جائے یقیناً نیکی اور عمل خیر ہے۔ قرآن ہر جگہ ہر طرح کے محاسن و فضائل کو ایسے جامع اور مانع لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں صراط المستقیم توازن قسط، میزان الموازین قسطاس المستقیم اور عدم تطفیف اور اسی طرح کے بیسیوں الفاظ

اسی ایک مقام عدل سے عبارت ہیں اور ہر تعلیم میں لا تعتدوا "زیادتی مت کرو" اور اعدلوا "عدل کرو" کے اصول کی دعوت دیتا ہے۔ اور اسی راہ عدل کو اقرب الی التقویٰ تبلاتا ہے۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ ہر شے میں خواہ وہ اس کی عبادت اور بندگی اور خواہ اس کی راہ میں خیرات اور بخشش ہی کیوں نہ ہو یہ ہے۔

ولا تجعل یدك مغلولة الی عنقك ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا۔ ۱۷ : ۳۲

"اور اپنا ہاتھ تو اس قدر سکیڑو کہ گویا گردن میں بندھ گیا ہے۔ اور نہ بالکل پھیلا ہی دو۔ ورنہ تم خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاؤ گے اور لوگ تم کو ملامت کریں گے۔"

ہر کام کے لیے اس آیت میں اعتدال کی ایک جامع مثال بیان کر دی گئی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مقصود قیام عدل ہے پس جیسا کہ ہم نے ابتداء میں اس طرف اشارا کیا تھا جس جماعت کا فرض دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوگا وہ دنیا میں ایک ایسی طاقت ہوگی جو صرف نیکی ہی کی خاطر دنیا میں بھیجی گئی ہے اور چونکہ نیکی عبارت ہے عدل سے اور بدی اس کے عدم سے اس لیے فی الحقیقت وہ عدل کو قائم رکھنے والی اور ہر افراط اور تفریط کو کہ بدی اور گناہ ہے روکنے والی جماعت ہوگی۔

اب عدل کی حقیقت پر غور کیجیے تو وہ فی الحقیقت ہر شے کے واسطہ اور درمیانی حالت کا نام ہے کسی ایک طرف جھک پڑے تو یہ افراط اور تفریط ہے لیکن ٹھیک ٹھیک درمیان میں اس طرح کھڑے رہیے کہ بال برابر جگہ بھی کسی طرف زیادہ نہ بچی ہو تو اس کا نام اعتدال ہوگا۔ قرآن مجید نے اس کی نہایت عمدہ مثال دی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے:۔

وزنوا بالقسطاس المستقیم ذلک خیر واحسن تاویلا ۱۷-۳۷
" جب کسی چیز کو تولو تو ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھو تاکہ وزن میں دھوکا نہ ہو یہ طریق خیر اور نیک انجام ہے ۔"

دوسری جگہ ایک سورت اس جملہ سے شروع کی ہے :-

ویل للمطففین "ناپ تول میں کم کر دینے والوں کے لیے بڑی تباہی ہے ۔"

عدل کے لیے سب سے زیادہ مشاہدہ میں آنے والی اور عام فہم مثال ترازو کی تھی کہ اس کے تمام اعمال کی صحت کا دار و مدار محض اس کے اوپر کی سوئی پر ہے ۔ جب تک وہ ٹھیک ٹھیک اپنے وسط میں قائم نہ ہو جائے وزن کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا ۔ جوں ہی دونوں پلڑوں کا وزن مساوی ہوگا معاً سوئی بھی وسط میں آ کر ٹھہر جائے گی ۔

اسی لیے قرآن نے اکثر مقامات میں ترازو کی مثال سے کام لیا ہے اور قیامت کے دن بھی انسانی اعمال کا فیصلہ اسی کے ہاتھ ہوگا ۔

فاما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ راضیۃ واما من خفت موازینہ فامہ ھاویۃ ۔ یہی سبب ہے کہ وسط کو عدل کے معنوں میں بولا جاتا ہے ۔ اور فی الحقیقت وکذلک جعلنا کم امۃ وسطا میں بھی وسط سے مراد عدل ہی ہے ۔

جس جماعت کا فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو اس سے بڑھ کر اور کون سی جماعت عند اللہ اور عند الناس عادل ہو سکتی ہے ۔ پس خدائے تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تم کو تمام دنیا کے لیے ایک عدل قائم کرنے والی امت بنایا کہ دنیا کے لیے تم ایک گواہ عادل کی حیثیت سے شہادت دے سکو ۔ خود

قرآنِ مجید بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ قال اوسطھم اور وہاں بلا اختلاف اوسطھم سے مراد عدلھم ہی ہے۔ امام رازی نے بروایت قفال ایک حدیث بھی درج کی ہے کہ آنحضرت نے خود اس آیت کی تفسیر یوں فرمائی :-

امۃ وسطا ای عدلا اس کے علاوہ مشہور حدیث خیر الامور اوسطھا میں بھی اوسط یعنی اعدل استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی بہتر کام وہ ہیں جو ان میں مطابق عدل ہوں۔ آنحضرتؐ کی نسبت کہا جاتا تھا کہ اوسط قریش نسبا اور یہاں بھی ظاہر ہے کہ اوسط اعدل ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اسی بنا پر اس آیت سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔ کہ جب امت کی عدالت نص سے ثابت ہو گئی تو اس کا اجماع یقیناً گمراہی و فساد سے محفوظ ہوگا۔

پہلی اور دوسری آیت میں تطبیق

پہلی اور دوسری دونوں آیتوں میں خدائے تعالیٰ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کا ذکر کیا ہے لیکن آیت میں بظاہر الفاظ تمام امت کے لیے نہیں بلکہ امت میں سے ایک جماعت خاص کے لیے اس کا فرض ہونا معلوم ہوتا ہے :-

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف

ان سے ایک جماعت ہونی چاہیئے جو خیر کی طرف بلائے اور نیکی کا علم دے” لیکن دوسری آیت میں کسی ایک جماعت کی تخصیص نہیں ہے تمام امت کا امتیازِ ملی اس فرض کو قرار دیا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف الخ" تم سب میں بہتر امت ہو اس لیے کہ نیکی کا حکم دیتے ہو۔"

دونوں آیتیں ایک ہی سورۃ اور ایک ہی رکوع میں ہیں۔ پھر دونوں میں اختلاف۔ پہلی میں یہ فرض محدود اور مخصوص اور دوسری میں عام ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے جن فرائض کا ذکر کیا ہے ان میں سے ہر فرض اپنی تکمیل کے لیے علم کا محتاج ہے۔ دعوت الی الخیر کے لیے ضرور ہے کہ اعمال خیر کا علم ہو۔

امر بالمعروف کیونکر انجام پا سکے گا جب کہ وہ کام معلوم نہ ہوں گے جن پر معروف کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

نہی عن المنکر تو اور زیادہ علم و فضل اور درس و تدریس کا محتاج ہے کیونکہ منکرات میں تمام محرمات و مکروہات فقہیہ داخل ہیں اور جب تک ان کا علم نہ ہو کیونکر اسے روکا جا سکتا ہے۔

اسی تفسیر کی بناء پر فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ اس آیت ولتکن منکم میں "من" تبعیض کے لیے آیا ہے۔ اس سے صرف ایک گروہ محدود علماء مراد ہے اور یہ تینوں باتیں صرف انہیں کے فرائض میں داخل ہیں۔

علماء نے اس فرض عام کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیا۔

لیکن درحقیقت یہ خیال عملاً اور اعتقاداً ایک ایسی خطرناک غلطی ہے جس کو نہیں سمجھتا کہ کن لفظوں سے تعبیر کروں اس تیرہ سو برس میں اسلام کو ان تمام غلط فہمیوں سے سابقہ پڑا جو اس سے پہلے امم سابقہ کو پیش آ چکی ہیں۔ لیکن کسی سخت سے سخت تحریف نے بھی مسلمانوں کو ایسا لاعلاج نقصان نہیں پہنچایا جیسا اس غلطی سے پہنچا اور پہنچ رہا ہے۔ اسلام کی وہ دعوت الٰہی

جو ایک عالمگیر اصلاح اور دینِ ملّی جامعہ کے قیام کے لیے آئی تھی اسی غلط فہمی سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ خلافت و نیابتِ الٰہی کا وہ شرف جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا اور جس کی وجہ سے بحیثیت ملّی وہ تمام عالم میں خدا کا مقدس دستِ عمل تھے بدبختانہ اسی غلط فہمی سے خاک میں ملا۔ رؤسائے روحانی اور پیشوایانِ مذہب نے جو مشرکانہ اختیارات اپنے لیے مخصوص کر لیے تھے اور جن کی غلامی سے دنیا کو نجات دلانا اس دینِ الٰہی کا اصلی مشن تھا اس کی بیڑیاں پھر اسی غلط فہمی کی لعنت سے مسلمانوں کے پاؤں میں پڑیں اور ایسی پڑیں کہ اب تک نہ نکل سکیں۔ چالیس کروڑ فرزندانِ الٰہی جن کو اپنے اعمالِ حسنہ سے دنیا میں خدا کی تقدیس کا تختِ جلال بننا تھا آج اپنی بداعمالیوں سے تمام قومی جرائم اور ملّی معاصی میں گرفتار ہیں اور قہرِ الٰہی کو مدت سے دعوت دے رہے ہیں۔ یہ وہ ہی معاصی ہیں جن کی پاداش میں اقوامِ گذشتہ سے خدا نے اپنا رشتہ توڑا تھا۔ جن کی وجہ سے داؤد کے بنائے ہوئے ہیکل سے اٹھ کر رحمتِ الٰہی نے اسمٰعیلؑ کی چنی ہوئی دیواروں کو اپنا گھر بنایا تھا اور پھر جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کو اپنی نیابت سے معزول کر کے مسلمانوں کو اس پر سرفراز کیا تھا۔

ولقد اهلكنا القرون من قبلكم لما ظلموا وجاءتهم رسلهم بالبينات فما كانوا ليومنوا كذلك نجزي القوم المجرمين ثم جعلناكم خلائف في الارض من بعدهم لننظر كيف تعملون (۳۵ : ۵

"اور تم سے پہلے کتنی قومیں گزر چکی ہیں کہ جب انھوں نے ظلم و معاصی پر کمر باندھی تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے مگر انھیں ایمان نصیب نہیں ہوا۔ مجرموں کو ہم ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر ان کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے تم کو دنیا کی بادشاہت دے کر ان کا جانشین بنایا

تاکہ دیکھیں کہ کیسے عمل کرتے ہو۔ مگر یہ بدبختی بھی صرف اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

لیکن یہ سب کچھ کیونکر ہوا۔ اس طرح کہ اعتقاد ہی سے عمل وجود پذیر ہوتا ہے اس غلط فہمی کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ امر بالمعروف جو دراصل ہر فرد اسلامی کا فرض تھا اور صحابۂ کرام کی زندگی اس کی عملی شہادت ہمارے سامنے ہے۔ وہ روز بروز ایک محدود دائرہ میں سمٹتا گیا اور سمٹتے سمٹتے ایک غیر محسوس نقطہ بن کر رہ گیا اب اس کے وجود میں بھی شک ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب کے انحطاط و ہلاکت کی ایک بڑی علت رؤسائے مذہبی کا معبودانہ اقتدار ہے۔ اسلام نے اس زہر کا تریاق اس اصل اصول کو تجویز کیا تھا کہ امر بالمعروف کی خدمت کو اس طرح عام اور ہر فرد ملت پر پھیلا دیا جائے کہ پھر کسی مخصوص کو اس ذریعہ سے اقتدار حاصل کرنے کا موقع نہ ملے۔ اور ہندوؤں کے برہمنوں اور عیسائیوں کے رومن کیتھولک فادروں کی طرح مذہبی دعوت و اصلاح کو کوئی جماعت اپنی اقلیم حکمرانی نہ بنالے کہ یفعل مایشاء و یحکم ما یرید۔ لیکن اب صدیوں سے دیکھیے تو مسلمان جن بیڑیوں کو کاٹتے آئے تھے ان سے خود اُن کے پاؤں بوجھل ہو رہے ہیں اس فرضِ الٰہی کو علماء نے اپنا موروثی حق بنا لیا ہے۔ جس میں اور کسی فرد کو دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔ شیطان اپنی قدیمی عادت کی طرح جب ضرورت دیکھتا ہے ان کو اپنے اعمال ابلیسانہ کے لیے آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جگہ امر بالمنکر و نہی عن المعروف کے فرائض ان کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ باقی تمام قوم اپنے اس فرض کی طرف سے غافل و بے خبر ہے اور جہل مذہبی کے سبب سے علماء کے اس غصبِ حقوقِ عامہ پر قانع ہوگئی ہے۔ خدا کی حکومت کوئی بھی اپنے اوپر محسوس نہیں کرتے کیونکہ

کی طرف سے سب کی آنکھیں بند ہیں اور برائیوں پر سے ہر شخص اس طرح گزر جاتا ہے گویا اس کو کان سننے کے لیے اور آنکھیں دیکھنے کے لیے ملی ہی نہیں۔ فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ ۲۲: ۶۴

دونوں آیتوں کا منشاء ایک ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں کا منشاء ایک ہے۔ اور دونوں اس فرض کو بغیر کسی تخصیص و تحدید کے ہر قائل کلمۂ توحید کا فرض قرار دیتی ہیں۔ البتہ پہلی آیت میں ولتکن منکم کا لفظ اشتباہ پیدا کرتا ہے کہ منکم یہاں تبعیض کے لیے ہے۔

یعنی تم میں سے بعض لوگوں کی جماعت اس فرض کو اپنے ذمہ لے لے۔ لیکن چونکہ آگے چل کر دوسری آیت نے اس فرض میں تمام امت کو شامل کر لیا ہے۔ اس لیے یہاں منکم کو تبعیض کے لیے قرار دینا ہی غلط ہے۔ بلکہ وہ یقیناً توضیح و تبئین کے لیے آیا ہے۔ جیسا ہر زبان کے محاورہ میں عموماً بولا کرتے ہیں مثلاً عربی میں کہیں گے "للامیر من غلمانہ عسکر، ولفلان من اولادہ جند" یعنی امیر کے لڑکوں سے فوج کے سپاہی ہیں اور فلاں شخص کی اولاد سے لشکر مرتب ہو رہا ہے۔

تو اس سے امیر کے تمام لڑکے مراد ہوں گے نہ کہ بعض۔ خود قرآن میں ایک موقع پر فرمایا ہے کہ فاجتنبوا الرجس من الاوثان ۲۲: ۳۱۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بتوں کے علاوہ اور کسی شئے کی ناپاکی سے پرہیز نہ کیا جائے۔ غرضیکہ یہاں "من" افادۂ معنیٔ تبئین کرتا ہے نہ کہ تبعیض۔ امام رازی نے دوسرے قول کو بیان کرتے ہوئے اس پر کافی بحث کی ہے۔ فمن شاء التفصیل فلیرجع

البیان۔ جلد ۲ : ۲۲۸

لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہم قرآن شریف کی ایک اور آیت کو اس مضمون کے متعلق پیش کرتے ہیں۔ اگر امام رازی نے اس آیت کو بھی پیش نظر رکھا ہوتا تو ان کو متعدد آرا و توجیہات کے لاحاصل نقل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ سورۂ حج کے پانچویں رکوع میں خدا تعالیٰ نے کافروں کے ان مظالم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن سے آغازِ اسلام کے مسلمانوں کو سامنا ہوا تھا۔ پھر دفاع و حفظِ نفس کے لیے قتال کی اجازت دی ہے اور اس کے بعد کہا ہے۔

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔

" اگر ہم ان مظلوم مسلمانوں کو حکومت اور خلافت دے کر زمین میں قائم کر دیں تو وہ نہایت اچھے کام انجام دیں گے۔ یعنی نماز پڑھیں گے، زکواۃ دیں گے اور برائی سے روکیں گے اور سب کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔"

یہ آیت اس بارہ میں بالکل صاف اور فیصلہ کن ہے۔ خدائے تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیاب کرنے کی علامت یہ بیان کی ہے کہ وہ زمین پہ حکمران ہونے کے بعد اچھے اور نیک کاموں کو انجام دیں گے۔ پھر ان کاموں کی بالترتیب تشریح کی ہے اور سب کو مسلسل عطف کے ساتھ بیان کیا ہے جو معطوف اور معطوف علیہ میں تسویہ ثابت کرتا ہے۔ پہلے نماز کا ذکر کیا۔ پھر زکواۃ کا۔ اور یہ دونوں عمل ہر جگہ قرآن میں ایک ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام آیا ہے۔ اور اسی سلسلۂ اعمال میں جس میں نماز اور زکواۃ بہ لہجۂ وجوب و فرض بیان کیے جاتے ہیں اس سے ثابت ہو گیا کہ :-

۱۔ مسلمانوں کو جو نصرت و فتح اور دنیا میں کامیابی عطا فرمائی اس کی علت یہ تھی کہ تا کہ وہ اعمالِ حسنہ انجام دیں۔

۲۔ وہ اعمالِ حسنہ علی الخصوص قیامِ نماز، ادائے زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہیں۔

۳۔ نماز اور زکوٰۃ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ پس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہر مسلمان کے فرائض میں داخل ہے۔

امر بالمعروف

عمل و اعتقاد:۔

گو یہ تحقیق ہو چکا کہ اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنے ہر پیرو پر فرض کر دیا ہے۔ لیکن اصل بحث ابھی باقی ہے۔ ایسی تعلیم کو اصولاً اور اعتقاداً کون نہیں مانتا۔ لیکن اخلاق و مذہب کی ہر تعلیم میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اعتقاد اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں جو اصول قابلِ عمل نہ ہو وہ کاغذ کے صفحوں پر کتنا ہی دلفریب ہو مگر انسانی مصائب کے لیے کیا مفید ہو سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دنیا اس اصول پر عمل بھی کر سکتی ہے یا نہیں۔

اسلام یکسر عمل ہے۔ مذہبی تاریخ میں جو انقلابات ذہنی اصول سے عمل کے مخالف ہوئے ہیں۔ اور جن کی ابتدائی حالت کا مکمل نمونہ گوتم بدھ اور آخری صورت مسیحی تحریک تھی۔ اسلام اس کے انقلاب آخری کا نام ہے جس کے بعد مذہب ایک خالص عملی قانون کی شکل میں مبدّل ہو گیا۔ اور وہ تمام چیزیں نکل گئیں جو اس کی عملی طاقت کو مضرت پہنچاتی تھیں۔ پس اگر یہ سچ ہے کہ امر بالمعروف

ایک اسلامی اصول ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ وہ محض ایک ذہنی زندگی رکھنے والا اصول ہی نہیں بلکہ انسانی عملی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے والا قانون ہے۔

حبّ وبغض، عفو وانتقام:-

سب سے بڑی مشکل جو اس اصول کو عملی راہ میں پیش آتی ہے وہ اخلاقی تعلیمات کی دورنگی ہے۔ ایک طرف عفو و درگزر اور محبت و عاجزی کی تعلیم ہے دوسری طرف نیکی و بدی کے احتساب کی سختی اور انتقام و عقوبت ہے۔ خود قرآن کریم کی تعلیمات میں بھی مشکل پیش آتی ہے۔ ایک طرف عفو و نرمی اور حکمت و موعظت کا حکم ہے۔ دوسری طرف سختی و انتقام اور تشدد و جبر کے احکام پر زور دیا گیا ہے۔ یورپ کے مورخین جب تعصب و جہل کی تاریکی میں اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس اختلافِ تعلیم کی تہ میں انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر پریشان ہوکر اس اختلاف کو مکی اور مدنی زندگی کے اختلاف حالت کا نتیجہ بتلاتے ہیں کہ جب تک اسلام بے بسی اور محتاجی کی حالت میں تھا۔ نرمی اور عفو و درگزر کی تعلیم سے زندگی کا بہانہ ڈھونڈھتا تھا۔ لیکن مدینہ میں آکر جب تلوار ہاتھ آگئی تو پھر حکومت اور طاقت کی حالت میں عاجزی اور مسکینیت کی ضرورت نہ تھی لیکن واللہ یعلم انّھم لکاذبون۔

عفو وانتقام کا اصل اصول:-

اس بحث کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اسلام نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو جن اصول پر قائم کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے:-

فقہا کا ایک عمدہ اصول ہے کہ اصل ہر شے کی اباحت ہے تاآنکہ کوئی

سببِ حرمت پیدا نہ ہو۔ انگور کا عرق فی نفسہ ایک مفید اور عمدہ شئے ہے لیکن جب اس میں نشہ پیدا کر دیا جائے اور نشہ کی وجہ سے انسان کے دماغ اور اخلاق کو نقصان دے اور اس نقصان کی وجہ سے امنِ عامہ میں خلل اور سوسائٹی کا حرج ہو تو وہ پھر قطعی حرام ہے۔

بالکل اسی طرح اخلاق میں بھی اصل عمل محبت ہے تا آنکہ کوئی سبب لاحق ہو کر بغض سے تبدیل نہ کر دے۔ یعنی دنیا میں ہر شئے محبت کے زیرِ قانون ہے اور کوئی نہیں ہے جو محبت و پیار کا مستحق نہ ہو۔ لیکن اس محبت کے اوپر بھی ایک قانونِ عام کی حکومت ہے۔ یعنی نفع رسانی اور حقوق العباد کی نگہداشت پس اگر کوئی علت ایسی پیدا ہو جائے جس کے سبب سے محبت کی صورت اپنی محبوبیت کو مسخ کر دے تو پھر ہر شئے کو اپنی نظروں میں مبغوض بنا لو اور جس قدر محبت کی راہ میں محبت کا جوش رکھتے تھے۔ محبت ہی کی خاطر بغض کی راہ میں بغض کا جوش ظاہر کرو۔

غور کرو، قانون دنیا میں کیا چاہتا ہے۔ محبت یعنی امن کو قائم کرنا۔ لیکن محبت کی خاطر عداوت اور امن کی خاطر بدامنی اس کو بھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ اس کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ انسان کی زندگی کو ہلاکات سے نجات دے۔ لیکن زندگی بخشنے کے لیے اسے موت ہی کے حربہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ انسانوں کو پھانسی پر چڑھا کر مارتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ تاکہ انسان گلا گھونٹ کر نہ مارے جائیں۔

پارلیمنٹ اور جمہوریت امن اور آزادی مانگتی ہے۔ مگر امن کی خاطر اسے شخصی حکومت میں بدامنی پیدا کرنی پڑتی ہے اور آئندہ قتل روک دینے کے لیے بہتوں کو قتل کرنا پڑتا ہے۔

قرآن نے حب و بغض اور نرمی و سختی کے اصول کو اسی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ اس کی عام تعلیم یہ ہے :۔

خذ العفو وأمر بالمعروف واعرض عن الجاهلين واما ينزغنك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله انه سميع عليم۔

"خطاؤں سے درگذر کر، اچھی باتوں کا حکم دے اور جاہلوں سے کنارہ کش ہو جا۔ اور اگر اے پیغمبرؐ تیرے دل میں انتقام اور بدلہ لینے کا ولولہ پیدا ہو تو خدا سے پناہ مانگ۔ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

ایک دوسرے موقع پر احسان عام اور عاجزی و فروتنی کو اس پیرایہ میں فرمایا :۔

ولا تمش فی الارض مرحا انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا کل ذالک کان سیئہ عند ربک مکروها ۱۷ : ۴

سورۂ فرقان میں اپنے نیک بندوں اور سچے مومنوں کی جہاں خصلتیں گنائی ہیں وہاں پہلا وصف یہ لکھا :۔

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض هونا واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما۔ ۲۵ : ۶۵

اور رحم کرنے والے خدا کے رحم طینت بندے وہ ہیں جو زمین پر نہایت فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور جب جاہل ان سے جہالت کی باتیں کرتے ہیں تو سلام کرکے الگ ہو جاتے ہیں۔

سورۂ شوریٰ میں ایک ایسے ہی موقع پر مومن کا سب سے بڑا وصف یہ قرار دیا ہے کہ :۔

اذا ما غضبوا هم یغفرون ۴۲ : ۳۔ اور جب انکو غصہ آجاتا ہے

توخطاؤں سے درگزر کرتے ہیں۔"

قرآن میں "عزم امور" ایک انتہائی وصف ہے جو انبیائے جلیل القدر کی مدح میں آیا ہے۔ لیکن عفو اور صبر کرنے والے کے لیے بھی اسی کو استعمال کیا۔

ولمن صبر و غفران ذلك لمن عزم الامور ۴۲ ۴۲:۴۲ "اور جو صبر کرلے اور خطاؤں کو بخش دے تو بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔"

احساناتِ عام کی ان تعلیمات کا استقصار کیا جائے تو اس طرح کی جیبوں آیتیں اور ملیں گی۔

یہ تعلیم تو عام اور گویا اصل اخلاقی کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن جب عوارض سے حالات متغیر ہو جائیں اور عفو و درگذر کی جو علت تھی یعنی نفع خلائق اور عدم مضرت رسانی، عفو و درگذر سے خود وہ مفقود ہونے لگے تو اس حالت میں پھر شرائط عدل و دسطیت نے انتقام اور بدلے کی سختی کو جائز کر دیا۔

جزاء سیئة سیئة مثلها۔ "برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی سے کرو۔" آگے چل کر اس کو صاف کر دیا۔

ولمن انتصر بعد ظلمه فاولئك ما عليهم من سبيل انما السبيل على الذين يظلمون الناس ويبغون على الارض بغير الحق - ۴۲ : ۳۹ -" اور اگر کسی پر ظلم ہوا ہو اور وہ اس کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگ معذور ہیں۔ ان پر کوئی الزام نہیں۔ جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ بغیر کسی حق کے زیادتی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

دوسری مثال اس سے زیادہ واضح ہے۔

عام حکم کفار و مخالفین کے ساتھ نرمی و رافت عفو، درگذر اور بطریق

احسن نصیحت و موعظت کا ہے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلهم بالتی هی احسن - ١٦ : ١٢٧

" خدا کی راہ کی طرف حکمت و وعظ کے ساتھ بلاؤ اور اگر بحث بھی کرو تو وہ اس طرح کہ وہ پسندیدہ طریقہ ہو۔"

دوسری جگہ مخصوص طور پر یہود و نصاریٰ کی نسبت کہا :-

ولا تجادلوا اهل الکتاب الا بالتی هی احسن ۔ ٢٩ : ٤٥ "اہل کتاب کے ساتھ بحث نہ کرو، مگر بطریق پسندیدہ۔"

لیکن پھر دوسرے موقعوں پر جہاد فی سبیل اللہ کو ایک فرض دین قرار دیا۔ اور سورتوں کی سورتیں اس کے احکام کی نسبت نازل فرمائیں۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ۔ ٢ : ١٨٧ "جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے قتال کرو۔"

اسی آیت کے بعد فرمایا۔

فاقتلوهم حیث ثقفتموهم واخرجوهم من حیث خرجہ ٢ : ١٨٨

"ان کو جہاں پاؤ قتل کرو اور جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے تم بھی انھیں نکال باہر کرو۔"

پہلے عام طور پر نرمی اور آشتی کا حکم دیا تھا لیکن قتل پر بھی بس نہ کر کے ایسے شدید طریقہ سے سختی پر زور دیا۔ حیث قال قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃ۔

" اپنے آس پاس کے کافروں سے لڑو۔ چاہیئے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔"

دونوں تعلیموں میں کس درجہ تباین وتباعد ہے ۔ مگر دراصل دونوں کا منشا ایک ہی ہے ۔ پہلا حکم احسانِ عام، محبتِ عمومی اور اصل اخلاق پر مبنی تھا۔ لیکن جب عوارض و لواحق سے حالات بدل گئے تو جس طرح پہلے انسانوں کی راحت اور جلبِ نفع کے لیے نرمی کا حکم دیا تھا اسی طرح اور اسی مقصد سے یہاں سختی اور قتل کا حکم دیا اور اس کی علت کو کھول کر بیان کر دیا کہ :۔

" الفتنۃ اشدّ من القتل "

" فساد خونریزی سے بڑھ کر برائی ہے "

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ۔ ۲ : ۱۸۹

" ان کو قتل کرو، یہاں تک کہ ملک میں فساد باقی نہ رہے "

جس طرح قانون قتل کی برائی کو روکنے کے لیے خود قتل کی برائی کو مجبوراً اختیار کرتا ہے اسی طرح قرآن نے فتنہ وفساد سے ارضِ الٰہی کو پاک کرنے کے لیے تلوار سے مدد لینے تک کی اجازت دے دی ہے ۔ بے شک نرمی اور نرم رفتاری کو خداوندِ عالم دوست رکھتا ہے ۔ لیکن سخت گیروں اور ظالموں کو سختی سے باز رکھنے کے لیے جب تک سختی نہ کی جائے نرمی قائم نہیں ہو سکتی۔ فتنہ وفساد اسے پسند نہیں ۔ مگر فتنہ و فساد کو روکنے ہی کے لیے اسے فتنہ سے علاج بالمثل کرنا پڑتا ہے ۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم لبعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ۲۲: ۴۲

" اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہتا تو تمام صومعے اور گرجے اور تمام عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کی منہدم ہو گئی ہوتیں "

یعنی مقصدِ الٰہی مشفقت و احسان عام ہے۔ لیکن جب ایک گروہ اس کی زمین کو فتنہ و فساد سے آلودہ کرتا ہے۔ بغیر کسی جرم کے محض عبادتِ الٰہی کی وجہ سے اس کے نیک بندوں پر ظلم و سختی کرتا ہے۔ ان کو گھروں سے نکالتا ہے، اللہ کی عبادت گاہ میں جانے سے روکتا ہے پھر جب وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر وطن سے بے وطن ہو کر ایک دوسرے شہر میں پناہ لیتے ہیں تو وہاں بھی ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ تو ان حالتوں میں مجبور ہو کر پیغمبر کو فتنہ روکنے، مظلوموں کو بچانے، شعائرِ الٰہی کی حفاظت اور حرمت کو قائم رکھنے اور رافت و رحمت سے دنیا کی محرومی کو مٹانے کے لیے سختی سے کام لینا پڑتا ہے اور تلوار کو کاٹنے کے لیے "تلوار بلند کی جاتی ہے۔ وکذلک جعلناکم امۃ وسطا۔

اس موقع پر پچھلے نمبر کے اس ٹکڑے پر ایک نظر ڈال لینی چاہیئے جس میں "امۃ وسطا" پر بحث کی گئی ہے۔ خدائے تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنی خلافت و نیابت بخشی تھی۔ پس ضرور تھا کہ وہ بھی صفاتِ الٰہی سے متصف اور متخلق باخلاق الٰہی ہوں خدا رحیم و محبت کرنے والا ہے۔ پس حکم دیا گیا کہ ارحموا علی الارض یرحمکم من فی السماء زمین پر رحم کرو تاکہ وہ جو آسمان پر ہے تم پر رحم کرے۔ لیکن رحیم ہونے کے ساتھ وہ عادل بھی ہے۔ پس رحم و محبت میں بھی عدل و وسط کا ہونا ناگزیر تھا۔ اس بنا پر تعلیم دی گئی کہ جب افراط و تفریط حد سے بڑھ جائے تو افراط کو روکنے کے لیے تم بھی افراط کرو۔ صفرا بڑھ گیا ہے تو تم بھی بہت زیادہ ترشی کھلا دو۔ تم پر تلوار اٹھائی گئی ہے تو اسے تلوار ہی سے کاٹو تم ذلیل کیے گئے ہو تو تم بھی ذلیل ہی کرو۔ تاکہ تسویہ و اعتدال پیدا ہو۔

یہ سب کچھ عین رحم و محبت ہے۔ نہ کہ سختی و جبر۔ ڈاکٹر مریض کے عزیز سے کم مریض پر مہربان نہیں۔ اس کے تلوے میں چبھ کر چبھن پیدا کر رہا ہے۔ لیکن اس چبھن کے دور کرنے کے لیے نشتر کی نوک کی چبھن ہی سے اسے کام لینا پڑے گا۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس۔

"ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ مبعوث کیا اور ان کے ساتھ کتاب و ترازو بھیجی۔ تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں اور نیز لوہا پیدا کیا جو ہتھیاروں کی شکل میں سخت خطرناک بھی ہے اور ساتھ ہی بہت سی منفعتیں بھی انسانوں کے لیے اپنے اندر رکھتا ہے۔"

اس آیت میں قرآن نے پوری تشریح کے ساتھ نظام عالم کے قوانین اساسی کو بیان کر دیا ہے۔ خدا ہدایت و اصلاح کے لیے انبیاء کو بھیجتا ہے اور ان کو میزان قیام عدل کی ناقدانہ قوت دیتا ہے۔ تاکہ دنیا میں اللہ کے عدل کو قائم کر دیں لیکن چونکہ اس کے لیے اکثر اوقات تمرد عقوبت کی ضرورت تھی اس لیے ان کو عدل قائم کرنے کے لیے جنگ و قتال کی بھی اجازت دی اور لوہا پیدا کیا جو طرح طرح کے ہتھیاروں کے اشکال اختیار کرتا ہے۔ پس وہ مضر بھی ہے اور مفید بھی۔

تشبہ باللہ و تخلق باخلاق اللہ

پس امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی صفاتِ الٰہیہ میں سے ایک

صفت ہے۔ اسلام انسان کے آگے ایک ارتقائے روحانی کی راہ کھولتا ہے۔ جو گو عبدیت کے مقام تذلل و تکثر سے شروع ہوتی ہے۔ مگر اس کا انتہائی نقطہ تشبہ باللہ یعنی خدا کی صفات سے مشابہت پیدا کرنے کا مقام ہے۔ اور اسی طرف اس مشہور حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ خدا کا اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔ پس ضرور تھا کہ جس ملت کو خدا نے دنیا میں اپنی خلافت و نیابت بخشی تھی۔ وہ بھی اس صفتِ الٰہی سے متصف ہوتی۔ خدا اطاعت و عبادت سے یعنی ہر ایسے کام سے جو قوائے فطریہ کا صحیح استعمال ہو۔ خوش ہوتا ہے۔ پس ایک انسانِ مومن کو بھی خوش ہونا چاہیئے۔ خدا کفر و ضلالت اور بداعمالی سے یعنی ان تمام کاموں سے جو قوائے فطریہ کا اسراف و تبذیر ہو ناخوش ہوتا ہے۔ اور اپنی نارضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ پس مومن و مسلم کو بھی ناخوش ہونا چاہیئے۔ اور اپنی نارضامندی کا اعلان کرنا چاہیئے ہم نے پچھلے مقالہ (نمبر) میں اسراف و تبذیر کی حقیقت سے بحث کی تھی۔ خدا عادل ہے اور رحم و محبت، نرمی و آشتی میں بھی اسراف و تبذیر پسند نہیں کرتا۔ اگر بائبل کا ابن العبد رحم محض کا مجسمہ ہے اور عدل کی ترازو کو ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا تو نہ سے مگر چھوٹے پغیبر تو اسے بھی چارہ نہیں، تمام انسانی جرائم و معاصی کو شانِ محبت کے جوش میں معاف کر دینا چاہا۔ لیکن پھر بھی بدی کو قابلِ عقوبت ثابت کرنے کے تمام ابنِ آدم کو نہ سہی مگر اپنے عزیز بیٹے کو تو تین دن تک لعنت میں گرفتار رکھ کر خونی مجرموں کی طرح سولی پر چڑھانا ہی پڑا۔

یہ ناگزیر ہے کہ دنیا سے یہ محبت کی صورت مٹتی ہو مگر افسوس

کہ سودمند نہیں۔ عدل کی پیشانی پر اگرچہ خوش نمائی کی بلندی کی جگہ سختی وخشونت کی لکیریں ہیں۔ لیکن دنیا کا تمام نظام صرف اسی کے دم سے ہے۔ پس خدائے تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بھی اپنی صفات کی دعوت دی۔ اور اپنی شان عدل کی طرح اسے بھی امۃ وسطا قرار دیا تاکہ وہ اس کی زمین پر ایک عادلانہ خلافت اور اس کی طرح کسی جذبہ میں نہ تو اسراف کرے۔ یعنی رحم کے موقع پر رحم کو اور سختی کے موقع پر سختی کو اس کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور نہ تبذیر کا طریقہ اختیار کرے۔ یعنی رحم کی جگہ قہر اور قہر کی جگہ رحم۔

مقام محبت الٰہی ۔ یحبھم ویحبونہ

یہی راز ہے کہ خدا نے تمام اقوام کو اپنے اپنے دور میں اپنی خلافت بخشی اور ہر صالح جماعت کو اس ورثہ الٰہی کا حقدار بنایا۔ ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔ مگر کسی کو اپنی محبوبیت اور معشوقیت کا درجہ عطا نہیں فرمایا۔ حضرت داؤد علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی نسبت ضرور کہا کہ یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض ۳: ۸۴
”اے داؤدؑ ہم نے زمین پر تم کو اپنی خلافت بخشی۔ بنی اسرائیل بھی مدتوں اس پر سرفراز رہے۔ لیکن ان کی نسبت یہ کہیں نہیں کہا کہ خدا کے دوست اور محبوب بنائے گئے۔ اس امت مرحومہ پر مزید خصوصیت تھی کہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ ۵ : ۵۹۔
”عنقریب اللہ ایک ایسا گروہ پیدا کرے گا۔ جن کو وہ اپنا محبوب بنائیگا اور وہ خدا کو محبوب رکھیں گے۔“ لیکن اس جماعت کی یہ علامت بتائی

گئی کہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ۵: ۶۔

” مومنوں کے ساتھ نرم مگر کافروں کے ساتھ سخت، اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہ کھائیں گے۔“ یہ مختصر آیت اس مشکل کا پورا حل ہے۔ مومن محبوبِ الٰہی ہے۔ کیونکہ ایمان باللہ سے بڑھ کر اور کون سی شے حاصل ہو سکتی ہے؟ لیکن خدا نے اپنی محبت کے ساتھ صرف مقابل کی محبت کا بھی ذکر کیا کہ میں انھیں چاہتا ہوں اور وہ مجھے چاہتے ہیں۔ یحبھم ویحبونہ۔

محبت کی شرطِ اولین فنا فی المحبوب ہے۔

اس لیے مومن مخلص بھی وہی ہے جو اپنی تمام خواہشوں اور قوتوں کو بھول کر صرف خدا کی مرضی و ارادہ پر اپنے تئیں چھوڑ دے۔ خدا کی مرضی اس کی مرضی اور خدا کی خوشی اس کی خوشی ہو۔ یہی معنی خلافتِ الٰہی کے ہیں کہ وہ دنیا میں اللہ کی صفاتِ کاملہ کا مظہر ہے اور اس لیے اس کا جانشین الحب فی اللہ والبغض فی اللہ پس جب مقام ایمان محبتِ الٰہی ہے اور محبت بغیر حصول فنا فی المحبوب محال ہے۔ یہیں سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض بے نقاب ہو جاتا ہے۔ مومن کی یہ تعریف ہے کہ اس کی نہ کسی کے ساتھ دوستی اور نہ دشمنی۔ نہ کسی کی مدح کرے اور نہ مذمت بلکہ وہ دستِ الٰہی میں ایک بے جان آلہ بن کر اپنی محبت و دشمنی کو راہِ محبوب کے لیے وقف کر دے۔ جو خدا کے دوست ہیں وہ اس کے دوست ہوں اور جو اس کے دشمن ہیں وہ اس کے دشمن اسی

کی راہ میں دوستی اسی کی راہ میں دشمنی ۔

الحب فی اللہ البغض فی اللہ ۔

خدا نیکی اور اعمالِ حسنہ سے خوش ہوتا ہے۔ پس یہ بھی جہاں کہیں نیکی کو دیکھے اپنا سر جھکا دے ۔ وہ بدی اور بداعمالی پر غضب ناک ہوتا ہے۔ لا یرضی لعبادہ الکفر۔ پس اس کو بھی جہاں کہیں بدی نظر آئے صفاتِ الٰہی کی چادر اوڑھ کر قہرِ مجسم بن جائے۔ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین ۔ نیکی کے سامنے جس قدر عاجز اتنا ہی بدی کے آگے مغرور اور سخت ہو۔

* * *

Knowledge for All

SABIL-E-SAKINA

۷۸۶

۱۱۰-۹۲

یاصاحب الزماں ادرکنیؑ

DvD
Version

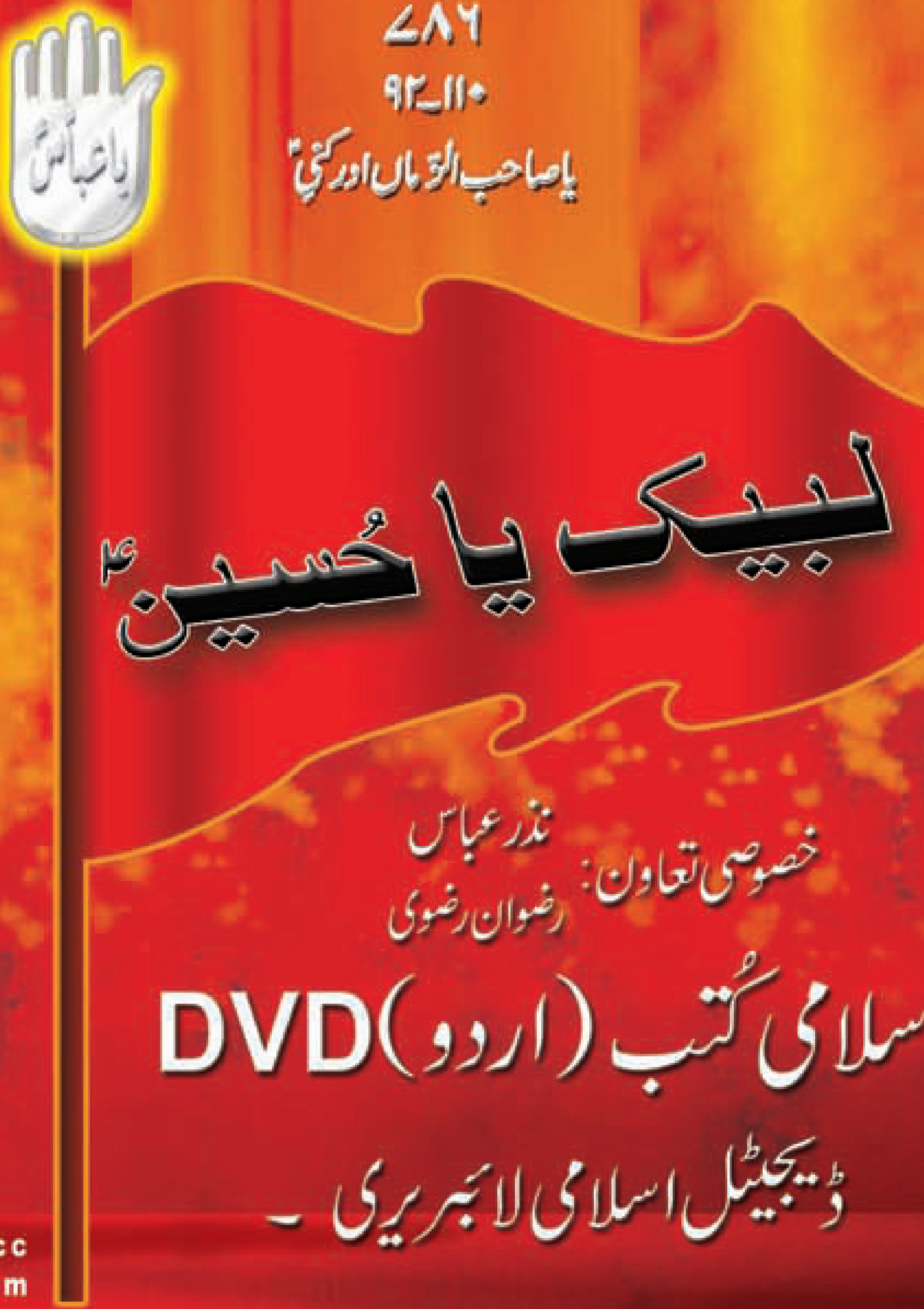

لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

www.ziaraat.com

SABEEL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.co.cc
sabeelesakina@gmail.com

NOT FOR COMMERCIAL USE